

# انٹرمیڈیٹ کالج میگزین

گڑھ

جلد (۱) فروری سنہ ۱۹۲۹ء شمارہ (۲)

## CONTENTS

# فہرست مضامین

## انٹرمیڈیٹ کالج میگزین



### حصہ اردو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# انٹرمیڈیٹ کالج میگزین


| جلد (۱) | بابت ماہ فروری ۱۹۲۹ء مطابق شعبان و رمضان ۱۳۴۷ھ | نمبر (۲) |
|---|---|---|


## شذرات

ہمارے میگزین کا گزشتہ نمبر جس آن بان کا ہونا چاہیئے تھا وہ کئی وجوہ سے نہ ہو سکا، دسمبر کے وسط میں یہ فیصلہ طے پایا کہ انٹرمیڈیٹ
لج کا میگزین مادر میگزین سے جدا کر دیا جائے، جناب قریشی صاحب کا حکم تھا کہ جنوری میں اس کا پہلا نمبر نکل جائے، مگر
تعطیلات کی وجہ سے طلبا اور اساتذہ کی ایک کثیر تعداد کچھ دنوں کے لئے علی گڑھ سے منتشر ہو گئی اور مضامین خاطر خواہ
ہو سکے، دستور عام ہے کہ رسالہ کا پہلا نمبر بڑی شان سے نکالا جاتا ہے، افسوس ہے کہ ہم اس سنتِ دیرینہ کی تقلید نہ کر سکے
قلید میں فرہاد کی تنگ ظرفی کا شائبہ آجاتا۔

---

۸ | الماس ہماری کوشش ہوگی کہ اس رسالہ کا معیار بتدریج بلند ہوتا جائے اور ہمیں یقین ہے کہ اگر حالات

گردوپیش نے ہماری مساعدت کی تو قریب مستقبل میں یہ رسالہ ہندوستان کے بہترین رسالوں میں شمار کیا جا
لگے گا، مگر اس کے معیار کو بلند کرنے سے زیادہ ضروری، اور اس کو ہندوستان کا ایک بلند پایہ رسالہ بنانے
زیادہ اہم بات یہ ہوگی کہ ہم اس کے ذریعہ سے طلبائے کالج میں ذوق سلیم اور وجدان صحیح پیدا کر دیں، او
اُن کے دلوں میں وہ جوش عمل لہریں مارنے لگے جس کی ہماری قوم اور ہمارے ملک کو اشد ضرورت ہے، میگ
کی حیثیت اس وقت ایک چھوٹے سے پودے ایک نوزائیدہ بچے کی سی ہے، اسے جس عنوان سے چاہیے پروا
چڑھائیے، اس کی فضا کو جن جن روایات سے چاہیے معمور کیجئے، اس وقت یہ سب آپ کے اختیار میں ہے، ہمیں توقع
ہے کہ علم دوست ممبران اسٹاف اور طلبا اس اہم کام میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے، اور جہاں تک بن پڑے گا میدا
عمل سے قدم اعانت نہ ہٹائیں گے یہ میگزین کسی خاص فرد، یا کسی خاص انجمن کی ملکیت نہیں، اس سے ہر شخص
کا تعلق یکساں ہے، ہر شخص اس کے رشتۂ محبت میں جکڑا ہوا ہے، ہماری آرزو ہے کہ آپ اس رشتہ کو اور زیادہ
مستحکم بنائیے، اور اپنی مساعی جمیلہ سے اس رسالہ کو اُس بلندی تک پہونچا دیجئے، جہاں سے ذاتی منافقات، او
چھوٹے چھوٹے کم مایہ جھگڑے بے حقیقت نظر آتے ہیں۔

---

یہ میگزین آپ سے اور کچھ نہیں چاہتا، اس میں اگر کشش ہوگی تو خود بخود آپ کا دل اپنی طرف کھینچ لے گا
مگر براہ کرم "میگزین نوازی" کے سلسلہ میں بخل، انکسار، نیازمندی، اور تساہل کو دخل نہ دیجئے، اس پودے کو پر
بنانے میں آپ جس قدر بھی مدد دے سکیں، بہ رضا و رغبت دیجئے، یہ سب کچھ ممکن ہے اگر آپ مغائرت ترک کر دیں
اور اس رسالہ کو اپنی ہی ملکیت تصور کریں، کسی زمانہ میں لڑکوں کا یہ دستور تھا کہ "علی گڑھ منتھلی" کے اوراق
اپنی اپنی انگیٹھیاں روشن کراتے تھے، خدا کا شکر ہے کہ میگزین کا وہ دور ختم ہوگیا، ہمیں یقین ہے کہ اس نئے د
حیات میں بھی میگزین ایک حد تک طلبا کی دلچسپیوں کا مرکز بنا رہے گا - ہماری خواہش ہے کہ دلکش افسانہ
اور تازہ تازہ غزلوں اور نظموں کے علاوہ ہر نمبر میں چند علمی مضامین بھی شائع ہوتے رہیں، جن سے طلبا میں
ذوق پیدا ہو سکے، افسانوں کی دلکشی سے ہمیں ذرا بھی انکار نہیں، مگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ یہ میگزین محض تفریح و تفنن
آلہ سمجھا جائے، زندگی میں سے آپ سنجیدگی اور متانت نکال دیجئے، تو ہمیں یقین ہے کہ صفحۂ دہر ایک سادہ ورق رہ جا

ارتقائی منازل پر یکلخت جست کرنے سے بدرجہا بہتر یہ ہے کہ ہم اُن مراحل کو رفتہ رفتہ طے کریں، مگر ہماری انتہا سے زیادہ دلشکنی ہوگی، اگر اس تگ و دو میں طلبائے کالج نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا، یہ ممکن ہے کہ ہم اس رسالہ کو ماہ بہ ماہ بیرونی حضرات کی مضامین سے پر کرکے شائع کرتے رہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ ہم ممبران اسٹاف کو گھیرتے رہیں، اور اُس کے ہی افکار عالیہ سے رسالہ کے صفحات کو مزین کریں، لیکن اس رسالہ میں سب سے زیادہ حصہ طلبا کے مضامین کا ہونا ہماری کامیابی کی دلیل ہوگا، طلبا کی سرد مہری کا قصہ ایک قصۂ پارینہ ہے، اس قصہ کو از سر نو چھیڑتے ہوئے ہمیں شرم آتی ہے، ہمیں جناب خواجہ غلام السیدین صاحب کی رائے سے بالکل اتفاق ہے کہ اس مرض قدیم کا علاج اگر ہو سکتا ہے تو صرف اسدی گروپس Study groups قائم کرنے سے، ہم نے جناب خواجہ صاحب سے درخواست کی ہے کہ وہ اس خیال کو ایک مکمل اسکیم کی صورت دیدیں، ہماری بہترین کوشش ہوگی کہ یہ اسکیم جلد سے جلد سرسبز ہو جائے، اور ہمیں یقین ہے کہ ممبران اسٹاف ہماری پوری مدد فرمائیں گے،



جسم سے جان کا جدا ہونا، تن سے روح کا علیحدہ ہونا ایک نہایت تکلیف دہ اور روح فرسا منظر ہوتا ہے، ہم اسی قدر کرب اور روحانی بے چینی کے ساتھ اس کا اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے محترم بزرگ جناب سید سجاد حیدر صاحب یلدرم ہم سے جدا ہو رہے ہیں، اور فی الحال اُس رسیلی سرزمین کی جانب گامزن ہونے والے ہیں جہاں حافظ اور خیام کے پرستاروں کی آرزوئیں رہا کرتی ہیں، یلدرم کی شرافت، عالی حوصلگی، اور بے نفسی روز روشن کی طرح ہویدا ہے، اُن کی شعلہ نوائی نے دراصل بزم اردو میں اُجالا کر دیا ہے، اس سے کوئی انکار نہ کرے گا کہ یلدرم ادب لطیف کا بلا شرکت غیرے مالک ہے، اور "خیالستان" اور "حکایات و احتسابات" غیر فانی ہیں، یلدرم کو علی گڑھ سے سچا عشق ہے، اس کی تلافی فطرت نے خود کر دی، آئندہ چار ماہ وہ ایران کی سیر و سیاحت کریں گے!———
ایران! جس نے کیسے کیسے باکمال شعرا پیدا کئے، اور جس کی زیارت کی آرزو ہر صاحب ذوق کے دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے، اس عزم سفر پر ہم یلدرم کی خدمت میں مؤدبانہ مبارکباد پیش کرتے ہیں، اور اُن کے رخصت ہونے کے موقعہ پر اپنے دلی رنج کا اظہار!



یونیورسٹی کی بلند ترین سیاست افسوس ہے کہ آئے دن پیچیدہ تر ہوتی جا رہی ہے، ہم نے دلی افسوس کے ساتھ یہ خبر سنی ہے کہ عالی جناب نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب او۔بی۔ای نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دیدیا ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ آیندہ چلکر کیا کیا واقعات رونما ہوتے ہیں، اور کون صاحب اس کشتی کے ناخدا بنتے ہیں ۹۔فروری کو کورٹ کی اہم ترین میٹنگ ہے جو ہمیں اُمید ہے کہ سارے معاملات حسن وخوبی کے ساتھ طے کرکے برخاست ہوگی۔

---

۱۴۔جنوری ۲۹ء کو انٹرمیڈیٹ ہاکی کلب نے ایک پلٹن کی ٹیم سے میچ کھیلا اور دو گول سے فتحیاب رہا، مگر ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے کھلاڑی اُس قدر بہتر نہ کھیل سکے جیسی کہ اُن سے توقع تھی، کھیل میں بھی اشتراک عمل اُسی قدر ضروری ہے جس قدر کہ کسی اور کام میں، اور اسی اشتراک عمل کا فقدان کھیل کو نہ دلچسپ بنا سکا، اور نہ زیادہ کامیاب اس اشتراک عمل کے پیدا کرنے کے لیے مشق کی اشد ضرورت ہے، مگر ہمیں اُمید ہے کہ آگے چلکر یہ نقص دور ہو جائیگا خدا کا شکر ہے کہ امسال ہاکی کلب کا کارنامہ نہایت شاندار رہا۔

---

ہسٹاریکل سوسائٹی کی وہ جماعت جو سانچی، آگرہ، ایجنٹا گئی تھی مع الخیر واپس آگئی، ہمیں اس کی نہایت مسرت ہے کہ یہ سفر نہایت کامیاب ثابت ہوا، اور طلبا تاریخی مقامات اور مصوری کے وہ بیش بہا نمونے دیکھ آئے جن کو دیکھنے کی آرزو ہر شخص کے دل میں ہوگی، ہم اس سفر کی کامیابی پر جناب پوری صاحب کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں، سنا گیا ہے کہ آیندہ تعطیل گرما میں جناب پوری صاحب "کشمیر" کی سیاحت کا انتظام فرمانے والے ہیں، اس سیاحت لطیف کا پلاؤ ہر سال پکتا ہے، مگر لذت یاب ہونے کی نوبت نہیں آتی، کچھ عجب نہیں کہ امسال جناب پوری صاحب کی حسن تدبیر کامیاب ہو جائے، ہم میں سے کون ایسا ہوگا جو وہاں جانے کا آرزومند نہ ہوگا۔ اس لحاظ سے پچیس (۲۵) تیس طلبا و ممبران اسٹاف کی پارٹی طیار کر لینا کچھ بھی مشکل نہیں۔

فروری کا مہینہ علی گڈہ میں گوناگوں مصروفیتوں کا مہینہ ہوتا ہے، اول اول تو نمائش، نمائش کے سلسلہ میں کیا پڑھئے، خرید فروخت، پھر دنگل، گھوڑ دوڑ، ازاں بعد تھیٹر، وسینما، اس نشۂ عشرت کا خمار اُترنے نہیں پاتا کہ امتحان قریب آجاتا ہے، پھر وہی ہم ہیں اور وہی صیاد کا گھر، کتابوں کا ڈھیر، مطالعہ، رٹنا اس سے بھی کام نہ چلا تو گریۂ نیم شبی

..ـے سحری، ورد و وظائف، نماز روزہ، رات رات بھر ہوسٹلوں میں دیوالی کا منظر رہتا ہے۔ ہر طالب علم بجائے
ؤ خائف، پراگندہ دل، پشیمان، ایک حد تک ناامید، مگر ہمیشہ متفکر و پریشان، کشاں کشاں امتحان کے ہال میں پہونچے، ہفتہ
ـشرہ میں امتحانات سے فارغ ہوئے، اور پھر

چل بسے اہلِ جنوں خالی بیاباں رہ گیا

یہ ہی ایک اجمالی خاکہ اُس زندگی کا جو طلبا ان ایام میں یہاں گذارتے ہیں، اس طوفانی بھاگ دوڑ اور شدید بدحواسی کی
ـلی وجہ صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ ہم خدا جانے کن اسباب کی بنا پر با قاعدہ طریقہ سے پڑھنا کفر سمجھتے ہیں، باقاعدہ پڑھنے
ـے مطلب یہ ہے کہ روزانہ پابندیٔ وقت کے ساتھ نوشت و خواند کا سلسلہ قائم رہے۔ اس سے چاہے اور خرابیاں کیوں نہ پیدا
ـوں مگر کم از کم اتنا ضرور ہوتا ہے کہ لڑکے بالعموم مرتب، پابند، صاف اور پُر صحت زندگی گذارنے کے اہل نہیں رہتے، اور
ـتہ رفتہ یہ عادت، اس قدر راسخ ہو جاتی ہے کہ آیندہ چلکر بھی اُن کی زندگیوں میں ترتیب، پابندی اور صفائی کے عناصر پیدا
ـیں ہوتے، یہ ہماری زندگیوں کا ایک نہایت غیر خوشگوار اور غمگین رخ ہے، ہم اپنی پوری قوت سے اس کے خلاف
ـدائے احتجاج بلند کریں گے، اور اپنے برادران کالج کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کریں گے۔

سردست ہمیں بین الاقوامی سیاست سے کوئی بحث نہیں، مگر باور کیجئے کہ ہم نے دلی رنج و اندوہ کے ساتھ وہ
ـش رُبا خبریں پڑھیں جو آجکل افغانستان سے آرہی ہیں، صدیوں کی دعاؤں کے بعد فضل ایزدی سے وہاں آزادی
ـمع اولین روشن ہوئی تھی، غلامی کا طوق گردن سے نکال کر پھینک دیا گیا تھا، جہالت کے تاریک پردے چاک کر دیئے گئے
اور تعصب و تنگ خیالی کے قلعے مسمار کر دئے گئے تھے کہ یہ یک گردشِ چرخِ نیلوفری وہاں کی کایا پلٹ ہو گئی اور غازی
ـن اللہ خاں کو تخت و تاج سے سبکدوش ہونا پڑا، اس زمانہ میں اسلامی دنیا کی نگاہیں اسی روشن ستارے کی جانب لگی
ـی تھیں جس نے اپنے تدبر اور فرزانگی سے اقصائے عالم پر اپنا سکہ جما لیا تھا لیکن، افسوس!

خوش درخشید، ولے شعلۂ مستعجل بود

ـیں ذرا بھی شک نہیں کہ امیر موصوف نے اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے میں غیر معمولی اور بے جا سرعت سے کام لیا،
ـس سے اُن کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، مگر ہمیں یقین ہے کہ افغانستان کی روشن خیال پارٹی خاموشی سے اپنا کام کرتی
ـر رفتہ رفتہ ملک تعلیم یافتہ اور مہذب ہو جائے گا۔ یہ سب کچھ سہی، لیکن امیر مذکور کی ناکامی نے ہزار ہا بندگانِ خدا کی

دل آزاری کا سامان مہیا کر دیا ہی، افغانستان کے کسی بادشاہ کو شاید کبھی یہ بین الاقوامی ہر دلعزیزی حاصل نہیں ہوتی تھی

فروری کے پہلے ہفتہ میں گذشتہ سال کے مانیٹر اور کپتان صاحبان نے اپنی اہم ذمہ داریوں سے سبکدوشی کی، اور اُن کی بجائے نئے تقررات ہوئے۔

| | |
|---|---|
| ۱۔ کرکٹ | محمد صدیق صاحب طوری |
| ۲۔ فٹ بال | نصیر خاں صاحب |
| ۳۔ ہاکی | سردار عبدالعزیز خاں صاحب |
| ۴۔ ٹینس | (دیکھیے کون ہوتا ہی؟ قوم فیصلہ کی منتظر ہے) |
| ۵۔ اسپورٹس | احمد اللہ صاحب |
| ۶۔ والی بال | احمد اللہ صاحب |
| ۷۔ باسکٹ بال | غلام سرور صاحب |

ہم ان اصحاب کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں، اس توقع کے ساتھ کہ ان کا دور ہر حیثیت سے کامیاب ہوگا۔

امسال یونین کلب کے انتخاب چند وجوہات کی بنا پر نہایت دلچسپ اور سنسنی خیز ثابت ہوئے، جن کا تفصیل ہم آیندہ نمبر میں پیش کریں گے، انتخابات کے نتائج یہ ہیں۔

| | |
|---|---|
| ۱۔ ایس۔ اے رفیع صاحب | وائس پریسیڈنٹ |
| ۲۔ رضا حسین زیدی صاحب | سکرٹری (بلا مقابلہ) |
| ۳۔ زوار حسین صاحب | لائبریرین |

میگزین ان اصحاب کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہی، اور اُمید کرتا ہی کہ ان کا دور حکومت ہر طرح کامیاب ہوگا۔

# چاہ کن را چاہ درپیش

(۱)

نرسنگھ پور کوئی بڑا گاؤں نہ تھا۔ چند خس پوش مکان تھے۔ جن کی آبادی تین سو سے زیادہ نہ ہوگی۔ بلدیو کا شما
ں کے آسودہ حال لوگوں میں تھا۔ سو سوا سو بیگھے کی موروثی کاشت تھی۔ مویشی پلے ہوئے تھے اور زمانہ موافق تھا۔
سے بڑی بات یہ تھی کہ بلدیو کا برتاؤ نہایت اچھا تھا۔ وہ سب کے ساتھ مروت و اخلاق سے پیش آتا تھا اور آڑے وقت
ہر ایک کی مدد کرتا تھا۔ زبانی جمع خرچ کے بدلے وہ عملی ہمدردی کا قائل تھا۔ گاؤں والے بھی ایسی ہی ہمدردی کو عزت کی
ے دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ تمام نرسنگھ پور بلدیو کا دم بھرتا تھا۔ اکثر ایسا ہوا ہی کہ اس نے اپنے آپ کو خطرے میں
کر مقدمات میں گاؤں کے پٹواری یا چوکیدار کی منشاء کے خلاف شہادت دی جس سے اس کا مقصد محض کسی بے گنا
چایا تھا۔ کسی کے یہاں آگ لگے اور بوڑھا بلدیو آگ بجھانے کے لئے سب سے آگے موجود۔ کوئی ملنے والا بیمار پڑے
بلدیو تیمارداری کے واسطے حاضر۔ پچھلی مرتبہ جب گاؤں میں کال پڑا اور غریب غربا بھوکوں مرنے لگے تو بیچارے
شتکاروں کو اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ مزدوری کی تلاش میں باہر نکلیں اور اس کے ذریعے سے بال بچوں کا
پالیں۔ بڑے بڑے آبرودار اسامی جو ناک پر مکھی بیٹھنے کے روادار نہ تھے بیوی بچوں کو لے کر محنت مزدوری کے لئے
کھڑے ہوئے۔ یوں تو اس وقت گاؤں کا ہر فرد گرفتار بلا تھا مگر بہاری سنگھ کی حالت سب سے زیادہ تباہ تھی۔ چند
پیشتر اس کا زمانہ بنا ہوا تھا اور اس کے یہاں چار ہل کی کھیتی ہوتی تھی۔ دروازے پر مویشی۔ گھر میں غلہ۔ غرض
بافراط موجود تھی مگر انقلابات روزگار و حوادث آسمانی سے اب اس کی حیثیت ایک ادنیٰ کاشتکار سے زیادہ
تی۔ رہا سہا اس قحط سالی نے اور بھی بدحال کر دیا۔ اس وقت زمیندار کی طرف سے اس پر ڈیڑھ سو روپئے کا
یہ تھا مگر غریب کے پاس ڈیڑھ روپیہ بھی مشکل سے ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کھیت سے بے دخل کر دیا گیا اور
کا تمام اثاث البیت قرقی میں آگیا۔ آخر بیچارہ بیوی اور چار برس کے بچے کو لے کر اپنے موروثی مکان کو

حسرت کے ساتھ ہمیشہ کے لئے چھوڑنے پر مجبور رہوا۔ یہ منظر بھی کس قدر دل خراش تھا جس کو دیکھکر ہر اپنے پرائے
نکل آئے۔ بھاری سر جھکائے بچے کا ہاتھ پکڑے چلا جارہا تھا اور پیچھے پیچھے اُس کی بیوی رادھا تھی۔ اُس وقت
نہیں ہوتی تھی
متنفس نہ تھا جو اُس کی مدد کرتا اور اتنی مقدرت بھی کس میں تھی۔ سب کے سب ایک ہی ناؤ میں سوار تھے۔ عین اُس
بلکہ دشمنی
بلدیو اپنے گھر سے آتا دکھائی دیا۔ وہ تمام واقعہ سن چکا تھا۔ ایک طرف تو وہ خود قحط کے اثر سے پریشان تھا۔ دوسری طرف
بھاری اور بلدیو میں صفائی بھی نہ تھی۔ کیوں کہ کئی سال ہوئے ایک کھیت کے معاملے میں بھاری اُس سے سخت
کر چکا تھا۔ لیکن اس نازک موقع پر اُس کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ ایک پڑوسی کی تباہی کو بیٹھا دیکھا کرے۔ وہ آ
ڈیڑھ سو کی رقم جو اُس نے لڑکی کے بیاہ کے لئے جمع کی تھی نکالی اور جاکر بھاری کی نذر کردی۔ یہ کہنا بے سود
بھاری کو دیر تک اپنے آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ اور رادھا اس غیر متوقع فیاضی پر بے اختیار رو پڑے۔ یہ گریہ
تھا جب زبان اظہار جذبات سے قاصر رہتی ہے تو آنکھیں ترجمان دل بن جاتی ہیں۔

(۲)

اس واقعہ کو زمانہ گزر گیا۔ فصل کی حالت بھی اب پہلے سے بہتر تھی۔ گاؤں میں ہر طرف چہل پہل نظر آتی تھی کھ
میں اناج جمع تھا۔ بلدیو اور اُس کی بیوی تارا اپنے مکان کے اسارے میں بیٹھے باہم باتیں کررہے تھے۔ تارا
تھی کہ روپ متی اب سیانی ہوگئی ہے۔ اس لئے اُس کی سگائی میں جلدی کرنی چاہیئے۔ مگر بلدیو کو عذر تھا کہ لڑکی
دان کے لئے کافی رقم درکار ہے جس کا سردست فراہم ہونا مشکل ہے۔ آخر دیر تک گفت وشنید کے بعد یہ بات
بلدیو اپنے مضبوط بیلوں کی جوڑی گنگا پار رام نگر کے نخاسہ میں لے جاکر بیچ آئے اور اُس رقم سے بیاہ کی ضرورتیں
کرے۔ دوسرے دن علی الصباح بلدیو گھر سے روانہ ہوگیا۔ رام نگر ۱۶ - ۱۷ میل کے فاصلے پر تھا۔ ۲ بجے کے
بلدیو وہاں پہنچ گیا۔ گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے کچھ کھانا جو گھر سے ساتھ لایا تھا ایک کنوئیں کے قریب
[illegible] ڈور لگا کر پانی پیا کھانے پینے سے فارغ ہو کر اُس نے نخاسہ کی راہ لی۔

(۳)

کلیان نے رات ... بڑا گاؤں تھا جس میں ہر منگل کو بازار لگتا تھا۔ قرب وجوار کے دیہات سے سیکڑوں
او ... عار ... نے اُس ... فروخت کرتے۔ جس وقت بلدیو نخاسہ میں پہنچا ہے ۳ بج چکے تھے۔ اُس نے چند آدمیوں

بابت بات چیت کی اور تھوڑی دیر کی حجت کے بعد دو سو قیمت قرار پائی۔ بلدیو نے جوڑی حوالے کی اور روپئے گنوانے شناخت کے لئے اُس کو اپنے گاؤں کا ایک برہمن مل گیا جو سلیم پور اپنے کسی قرابت دار کے یہاں جا رہا تھا۔ اب شام قریب تھی اور بلدیو نقدئے کر شب میں اپنے گاؤں کو واپس جانا مخدوش سمجھتا تھا۔ وہ منتظر تھا کہ کوئی شناسا ملے تا کہ رات بھر اُس کی چوپال میں قیام کرے اور سویرے تڑکے نرسنگھ پور کی طرف روانہ ہو جائے۔ اسی جستجو میں وہ بازار میں اِدھر اُدھر چکر لگا رہا تھا اور ہر چیز پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتا پھر رہا تھا۔ حسن اتفاق کہو یا سوء اتفاق کہ عین اُسی وقت اُس کے دو ملنے والے ٹھاکر کلیان سنگھ اور بھوپ سنگھ ایک سمت سے آتے نظر پڑے۔ بلدیو کی جان میں جان آئی۔ بڑھا اور دونوں سے رام رام کی۔ وہ دونوں بہت تپاک سے پیش آئے اور مزاج پرسی کے بعد آنے کی وجہ دریافت کی۔ بلدیو نے بے کم و کاست تمام ماجرا کہہ سنایا۔

———— (۴) ————

روپئے کا نام سن کر دونوں ٹھاکروں کے ذہن میں عجیب نفسیاتی ہیجان برپا ہو گیا۔ کلیان سنگھ اور بھوپ سنگھ کا شمار موضع ہردیو گنج کے باثر اور سربرآوردہ آدمیوں میں تھا۔ یہ موضع رام نگر سے صرف ۲۰ میل کے فاصلے پر تھا۔ گاؤں کے لوگ اِن ٹھاکروں سے ڈرتے زیادہ تھے، محبت کم کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ان دونوں کی زندگی کا بڑا حصہ مردم آزاری اور ایذا رسانی میں بسر ہوا تھا۔ اُن کے لئے دوسرے کا مال مارنا یا عزت اُتارنا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بلکہ اگر ضرورت مقتضی ہوتی تو کسی کی جان لینے میں بھی باک نہ تھا۔ بشرطیکہ قانونی گرفت کا اندیشہ نہ ہو۔ گاؤں میں تو یہاں تک مشہور تھا کہ کلیان اور بھوپ کئی بار قتل اور ڈاکے کے مرتکب ہوئے تھے اور ایک آدھ بار ماخوذ بھی ہوئے تھے۔ مگر اُن کی چالاکی سمجھو یا پولیس کی کمزوری کہ قانون کے شکنجے میں پھنس کر صاف نکل آئے۔ اب دونوں سنِ کہولت کے قریب پہنچ چکے تھے اور "وقت پیری گرگ ظالم می شود پرہیزگار" کے مطابق اس براہ روی اور آزادی کی زندگی سے کنارہ ہو چکے تھے۔ تاہم "عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت" کیوں کر چھوٹتی۔ کچھ نہ کچھ سلسلہ سنگھ کی بابت ہم نے سنا ہے کہ وہ ایک حد تک ان افعال سے تائب ہو چکا تھا مگر کلیان اب بھی موقعوں سے نہ چوکتا تھا۔ کچھ اپنی موروثی حیثیت تھی۔ کچھ ذاتی اثر۔ حلقے کے تھانہ دار جب آتے کلیان ہی کی "عتیقی" ہی ہوتے۔ کلیان کی ذہنیت کا شخص اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتا۔ قطعاً ناممکن۔ وہ اہل معاملہ کو تیقن د... اتفق طے کرادے گا

اور اس طریقہ سے فریقین سے کافی رقم اینٹھ لیتا۔ بلکہ اکثر مواقع پر تھانہ دار صاحب بھی اُسی کے ذریعے سے اپنا "حق" ٹھیراتے۔ بھوپ سنگھ کچھ تو طبعی افسردگی اور کچھ غیر معمولی انحطاط قویٰ کی وجہ سے اپنی زندگی کی سابق سرگرمیوں سے دستکش ہو چکا تھا۔ وہ اُس ذہنیت کا آدمی تھا کہ بغیر خرخشہ اور محنت کے اگر شکار ہاتھ آ جاتا تو چنداں تامل بھی نہ کرتا البتہ کسی منظم اسکیم میں حصہ لینے اور تکمیل تک پہنچانے کے قابل نہ تھا۔ اُس کی حیات کے بعض پہلو اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ اگرچہ نیکی کی روشنی اُس کے قلب سے بڑی حد تک زائل ہو چکی تھی۔ تاہم ایک خفیف سی جھلک باقی تھی اس کے علاوہ وہ بلدیو جیسے شریف النفس انسان کو جس کی جوہر شرافت کی تعریفیں وہ اپنے رشتہ دار بہاری سنگھ سے اکثر سن چکا تھا، نقصان پہنچانا خلاف انسانیت تصور کرتا تھا۔

(۵)

آخر دونوں بلدیو کو اپنے گاؤں لے گئے اور رات کو چوپال میں ٹھیرایا۔ بلدیو اطمینان کے ساتھ رات کے کھانے سے فراغت پا کر وہیں دراز ہو گیا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ بالآخر بلدیو دن بھر کا تھکا ماندہ پڑ کر سو گیا۔ اب کلیان اور بھوپ میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ کلیان کی رائے تھی کہ روپیہ چرانے یا چھیننے کی صورت میں بلدیو کی طرف سے افشائے راز کا کھٹکا رہے گا اور اگر بلدیو کو وہیں ٹھکانے لگا دیا گیا تو پولس کو اُنھیں پر اشتباہ ہوگا۔ اس لئے مناسب ہے کہ راہ میں کسی آدمی کو متعین کر دیا جائے اور جس وقت اندھیرے مُنہ بلدیو سفر کی غرض سے روانہ ہو اُس کا کام تمام کر دیا جائے۔ مگر بھوپ سنگھ نے نہایت جرأت سے اس میں حصہ لینے سے انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ میں اب یہ کام چھوڑ چکا۔ مددگار نہ پا کر کلیان ذرا فکر مند ہوا۔ مگر فوراً ہی اُس کے ذہن رسا نے ایک نئی تدبیر سوچ لی۔ اُسے خیال آیا کہ گاؤں کا پاسی بگھو دھر ایسی خدمات اجرت پر انجام دے سکتا ہے۔ فوراً اُس سے ملا اور کل امور طے کر لئے اور سمجھا دیا کہ وہ نرسنگھ پور جانے والی سڑک کے کنارے ایک میل کے فاصلے پر صبح کے ۳ بجے انتظار کرے اور گزرنے والے کا کام تمام کر دے اور آخر میں اپنی کارگزاری کی خبر آ کر سنائے۔

(۶)

اِدھر کلیان نے رات بے چینی کے ساتھ آنکھوں میں کاٹی۔ اگرچہ گناہ کی زندگی نے اُس کے ضمیر کو بے حس کر دیا تھا مگر نتیجے کے انتظار نے اُس کو ایک محشر خیال بنا رکھا تھا۔ اندھیرے مُنہ اُس نے بلدیو کو اُٹھا دیا اور ہدایت کی کہ اپنی

منزل کھوٹی نہ کرے۔ بلدیو نے گٹھڑی سنبھالی اور اپنی راہ لی۔

اُدھر قاتل اپنے معینہ فرض کے انجام دہی کا بے تابی سے انتظار کر رہا تھا۔ ایک طرف اُس کا جرائم سرشت دماغ اپنے ناپاک محنت کے معاوضہ کی خوشی میں خیالی پلاؤ پکا رہا تھا۔ دوسری طرف اُس کی متجسس نگاہیں کسی آنے والے کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ آخر اندھیرے میں آنے والی ایک دُھندلی تصویر نے اُس کے انتظار کے لمحوں کا خاتمہ کر دیا اور وہ پھرتی کے ساتھ جھاڑی کے پیچھے سے برآمد ہوا۔ بدنصیب نو وارد کے سر پر اچانک شمشیر برق دم چمکی اور آناً فاناً سر کٹ کر زمین پر آ رہا۔

——— ( ۷ ) ———

نتیجہ کے انتظار کی گھڑیاں جوں جوں گزرتی جاتی تھیں کلیان کا اضطراب بڑھتا جاتا تھا۔ اُس کو اندیشہ تھا کہ قاتل کہیں بلدیو کو مار کر کل روپیہ ہضم نہ کرے۔ پھر وصول ہونے کی کوئی صورت بھی نہ تھی۔ اُس نے دیر ہو جانے پر اپنے بیٹے کو خبر لانے کے لئے بھیجا اور جب اُس کی واپسی میں تاخیر ہوئی تو خود چلدیا۔ آسمان پر سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا اور اگرچہ راستہ میں کسی آنے جانے والے کا پتا نہ تھا تاہم افشائے راز کا خوف دامن گیر تھا۔ اُس وقت کلیان کو ایک ایک قدم اُٹھانا دوبھر تھا۔ چند ہی قدم چلا ہوگا کہ گجودھر آتا ہوا نظر آیا اور کہنے لگا کہ میں نے اُس کو ٹھکانے تو لگا دیا مگر تعجب ہے کہ اُس کی کمر میں ایک پیسہ بھی نہ نکلا۔ یہ سُننا تھا کہ کلیان کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ گھبرا کر اُس مقام کی طرف لپکا جو اُس خطرناک تجویز کی تکمیل کے لئے معین کیا گیا تھا۔ دفعتہً اُس کی نظر مقتول کے سر پر پڑی۔ اُس کے مُنھ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی اور بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔

یہ کلیان کے اکلوتے بیٹے منوہر کا سر تھا !!

——— ( ۸ ) ———

قصہ یہ ہوا کہ بھوپ سنگھ نے بلدیو سے کہہ رکھا تھا کہ دوسرے راستہ سے نرسنگھ پور جائے کیوں کہ متعارف راہ خطرناک تھی۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا۔ اِدھر منوہر خبر لینے کو پہنچا اُدھر گجودھر نے رات کی تاریکی میں نہ پہچانا اور اُس کو بلدیو سمجھ کر تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔

"عتیقی"

# غزل

(از قطب عالم صاحب متعلم سکنڈ ایر)

گرینگی ٹوٹ کر کیا بجلیاں پھر خرمنِ جاں پر
سنہری بدلیاں چھائی ہوئی ہیں پھر گلستاں پر

محبت کام اپنا کر گئی جو کچھ بھی کرنا تھا
زلیخا ہاتھ رکھے رہ گئی یوسف کے داماں پر

نہیں معلوم کیا بلبل کو فطرت ابرِ باراں کی
نشیمن اور پھر کمزور اسی شاخِ گلستاں پر

سناؤں دردِ دل کیوں کر کسی کا دل نہ دکھ جائے
میں خود ہی رو لیا کرتا ہوں اپنے سوزِ پنہاں پر

# صبحِ صحرا کے تاثرات

(از جناب حمید کاظمی بی اے علیگ)

---

شب ڈھلی فطرتِ مخمور نے لی انگڑائی — نیل گوں اپنی ردا مُنھ سے ذرا سرکائی

گوشۂ چشم سے کی کچھ نگرانی اُس نے — آخری کچھ سُنی تاروں کی کہانی اُس نے

چھا گیا سکر کا انداز گھڑی بھر کے لئے — ڈھک کے مُنہ سانس وہ لینے لگی گھرے گھرے

آخرش ہنستی ہوئی خواب سے بیدار ہوئی — روح سے اس کی فضا دشت کی سرشار ہوئی

قُم کہا اُس نے تو گھبرا کے اُٹھا ابن سبیل
کان میں گونج گئی بن کے وہ آوازِ رحیل

---

# ترکی جذبۂ وطن

ترجمہ

## الوطن فوق الحب

## باب دوم

### سامی کی پریشان حالی

(از جناب مولانا ابرار حسن صاحب فاروقی بی اے (علیگ)

جمعہ کا دن ہے۔ سامی شام کو مدرسہ جانے پر مجبور ہے اور گویا اگلی جمعرات تک وہاں قیدی رہے گا۔ اس خیال نے اُس کو پریشان کر رکھا تھا لیکن مدرسہ کے قواعد کی پابندی ضروری تھی۔ تین بجے کپڑے بدل اور اپنی والدہ کے ہاتھ پر بوسہ دے کر رخصت ہوا۔ گھر سے مدرسہ جانے کے لئے نکلا۔ چوں کہ مدرسہ میں پہنچنے کا آخری وقت ۵ بجے تھا اس لئے اس نے چاہا کہ اس قلیل مدت میں قبل اس کے کہ ایک ہفتہ کی نظربندی ہو پھر جمال جہاں آرا کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کر لے۔

یہ خیال آتے ہی بجائے اس کے کہ وہ اپنے "قید خانہ" کی طرف جاتا۔ سیدھا اپنی محبوبہ کے مکان کی جانب ہولیا۔ یوروپین محلہ میں اُس کے مکان پر پہنچ گیا لیکن دیکھا تو گھر کا دروازہ بند اور گھر والے خاموش۔ مکان کے آگے پیچھے پھرا۔ اوپر کھڑکیوں کی طرف نظر دوڑائی لیکن نہ تو اپنی محبوبہ کو دیکھا اور نہ کسی اور گھر والے کو۔ یہاں تک کہ وقت گزر گیا۔ اور اُس نے کوچۂ یار میں اپنا دل چھوڑ کر مدرسہ کا رُخ کیا۔

ٹھیک حاضری کے وقت مدرسہ میں پہنچ گیا۔ اپنی حاضری بول اور مطالعہ کی کتابیں بغل میں دبا دار المطالعہ میں اپنے دوستوں سے الگ ایک کونے میں جا بیٹھا اور کتاب کھول کر پڑھنے لگا۔ سطریں پڑھ رہا تھا مگر مطلب خبط۔ ہر سطر محبوبہ کی زندہ تصویر تھی اُس کے الفاظ و زبر، زیر آسی کے قد و قامت و چشم و ابرو کی نمایندگی کر رہے تھے۔ اب آنکھیں اُس نے بند کرلیں اور دن کے منظر اپنے خیال میں چکر دینے لگا اور بار بار سوچتا تھا کہ اُس دل رُبا نے کیسا غضب ڈھایا۔

مطالعہ کا مقررہ وقت گزر چکا لیکن اُس سے ایک سطر بھی نہ دیکھی گئی اور نہ کتاب کا ایک صفحہ لوٹ سکا۔ انھیں خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ گھنٹے کی آواز سے چونکا اور اپنی جگہ سے اُٹھکر درجہ کی طرف چلا مگر چیونٹی کی چال۔ بہرحال اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ پوری جماعت آگئی اور ماسٹر نے پڑھانا شروع کر دیا۔ نقشہ اور جغرافیہ کا گھنٹہ تھا۔ مقررہ سبق مدرس نے پڑھایا اور پوری طور پر سمجھایا۔ خط استوا اور افق کو خصوصیت سے زیادہ واضح کیا۔ علاقوں اور ملکوں کے حدود پر بھی روشنی ڈالی۔ غرض کہ اُس کا تمام لکچر اُس کی فن دانی پر دلیل تھا۔ اپنے اقوال اور دلیلوں کو پرانی تاریخی واقعات سے منطبق کرتا جاتا تھا۔

یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور سامی بھی موجود تھا لیکن وہ صرف اپنے جسم سے تھا اور روح غائب تھی۔ اسی وجہ سے وہ اس لکچر کا ایک حرف نہ سمجھ سکا۔ یہاں تک کہ گھنٹہ بج گیا اور لکچر ختم ہو گیا۔ رات کے کھانے کی گھنٹی بج گئی۔ تمام طلبا ڈائننگ ہال (کھانے کے کمرہ) میں چلے گئے وہ بھی ساتھ ساتھ گیا اور سب کے ساتھ کھانے پر بیٹھ گیا۔ اول تو کم کھایا اور جو کچھ کھایا بھی تو اُس کا مزہ نہ پایا۔ مُنھ میں لقمہ لیتا ہے مگر چبائے کون۔ ویسا کا ویسا ہی مُنھ میں رکھا ہے۔ سب کھا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ آخر میں یہ بھی اُٹھا لیکن کھانا آدھے سے زیادہ چھوڑ دیا۔

بیداری تو اس طرح سے کٹی کہ عشق کی آگ نے اُس کو جلایا اور محبت کے غم نے گھلایا۔ اب سونے کا وقت آیا تو سوائے کروٹ بدلنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ غرض کہ ؎

دن کٹا فریاد میں اور رات زاری میں کٹی
عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری میں کٹی

یہ کیا ہوتا ہے کہ وہ ایک پردیسی عورت پر فدا ہے اور پھر نہ اُس کی قومیت معلوم اور نہ وطن۔ حتیٰ کہ اُس کے نام سے بھی ناآشنا ہے۔ اُدھر اُس محبوبہ کو اُس کی محبت اور عشق کی خبر تک نہیں۔ اُس کو اچانک جنگی خانہ پر دیکھ لیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کے تیر مژگاں کا نشانہ بن گیا اور اُس پری وش نے اپنے حسن کی کمند اس کے ارادہ پر ڈال کر اس کو اپنے حسن و جمال کا قیدی بنا لیا۔

عشق کی کٹھن منزل کو وہی شخص پہچان سکتا ہے جس نے اس سوزش کو بھگتا ہو اور اس دریائے بے پایاں میں غوطہ لگایا ہو جس کی موجیں کبھی تو اُمید کے کنارے پر لے جاتی ہیں اور کبھی ناامیدی کے گھاٹ اُتارتی ہیں۔ سامی کے لئے رات بھی اتنی لمبی ہو گئی کہ جاگتے جاگتے اُکتا گیا۔ عاشق کی رات اسی طرح سے لمبی ہو جاتی ہے۔ ادھر قواعد

مدرسے کے اعتبار سے وہ اُٹھ کر پلنگ پر بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ جونہیں کہ صبح ہوئی اور طلبا کے نماز کے لئے گھنٹی بجی وہ بے انتہا خوش ہوا اپنے پلنگ سے جھپاک سے اس طرح اُٹھا جیسے کوئی قیدی نکل بھاگتا ہے اور سیدھا مدرسہ کی مسجد میں جا کر وضو کیا اور قبلہ رو بیٹھ کر نہایت عاجزی اور نیازمندی سے بارگاہ ایزدی میں دعا مانگنی شروع کی تاکہ محبوب کے وصال میں آسانی پیدا ہو اور اس راستہ میں جتنی رکاوٹیں ہیں وہ سب دُور ہو جائیں۔

دن ختم ہوا۔ اور وہ غم و الم سے ہم آغوش جماعت میں ہم جماعتوں کے ساتھ جاتا بھی اور آتا بھی ہے۔ وقت پر کھیل میں بھی شرکت کرتا ہے۔ لیکن ایک بت کی طرح سے کہ جس میں نقل و حرکت کی طاقت نہیں۔ کھڑا ہوتا ہے۔ بیٹھتا ہے۔ آتا ہے جاتا ہے۔ لیکن نہ تو سبق سمجھ میں آتا ہے اور نہ جغرافیہ وغیرہ کے لکچر۔ جو اُس کی موجودگی میں ہوتے ہیں اُس کے پلے پڑتے ہیں۔ گویا سامی قالباً مدرسہ میں تھا لیکن قلباً کوچۂ یار میں تھا۔

دوسری رات آئی اور گزشتہ رات کی طرح اُس کی وہی کیفیت۔ غرض کہ تمام ہفتہ اسی طرح سے غم و الم میں گزرا۔ چوں کہ دوستوں سے الگ تھلگ رہنے لگا تھا اس لئے وہ لوگ بھی اس کے ظاہری حال سے آگاہ ہو چلے تھے اور اسی وجہ سے اُس سے اس کا سبب پوچھتے رہتے تھے جس کے جواب میں یہ آئیں بائیں عذر بیان کر دیا کرتا تھا۔ ہفتہ گزرا اور جمعرات کا دن پھر آیا اور اُس کی خوش قسمتی سے کسی اُستاد نے اُس کو امتحان کے لئے نہیں بلایا۔

اب وہ وقت آگیا کہ طلبا اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے تاکہ اپنے اعزا و اقربا سے ایک ہفتہ کے بعد ملیں۔ چنانچہ مدرسے سے ہشاش بشاش اپنے اپنے گھروں کا رُخ کیا۔ لیکن ان میں صرف ایک سامی ایسا ہے جو وہاں سے چھوٹتے ہی سیدھا یوربین محلہ کی طرف ہو لیا تاکہ اپنی محبوبہ کے مکان پر پہنچے۔ چنانچہ وہاں پہنچ کر مکان کے سامنے سڑک کی پٹری پر کھڑا ہو گیا اور گیس کے ہنڈے کے کھمبے سے جو وہاں نصب تھا ٹیک لگائی اور دروازہ کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا کہ شاید وہ نکلے۔ کبھی کبھی کھڑکیوں پر بھی نظر ڈالتا تھا کہ شاید شیشوں میں اُس کی جھلکی پائے۔ لیکن وہ گھنٹوں کی طویل اُمید بے کار ثابت ہوئی۔ وہ بُت بنا ہوا خاموش کھڑا ہے اور دل کو اُس کے دیدار کی اُمید دلا رہا ہے۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہونے لگا اور اب اُس کے دیدار کی اُمید ٹوٹ گئی۔ اسی حالت میں ایک محلہ والے کو اس کی طرف سے شبہ ہوا جس کو محسوس کر کے یہ اپنے کھڑے ہونے پر شرمندہ ہوا اور سیدھا وہاں سے اپنے گھر کا رخ کیا۔ تمام رات شوق و محبت میں آنکھوں میں گزر گئی اور ایک منٹ کو بھی آرام نہ ملا۔ آنکھیں

نیند کے خمار میں سرخ تھیں۔ آہیں دل کی دہکتی ہوئی آگ کا پتا دیتی تھیں۔

جونہیں کہ صبح ہوئی اُس نے ایک لمبا سانس لیا اور فوراً اپنے بستر سے اُٹھا اور کپڑے بدل کر پھر اُسی پریوش کے خیال میں ڈوب گیا جس کے حسن نے اُس کو تمام چیزوں سے مستغنی کر دیا تھا۔ ہر چند کہ وہ نفس کو ملامت کرتا تھا اور سمجھاتا تھا کہ یہ عشق اور بالخصوص ایک پردیسی سے آیندہ زندگی اور جوانی کو برباد کر دے گا۔ اُمیدوں کو خاک میں ملا دے گا۔ مگر یہ دُنیا کی بے سود تھیں۔ یہ نصیحتیں عشق کی قوت کو ذرا جنبش نہیں دے سکتی تھیں۔ گھر سے پھر نکلا اور یوروپین محلہ کی طرف پیدل چلا اور جب اُس کے گھر کے سامنے پہنچ گیا تو گیس کے ہنڈے کے کھمبے کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا اور دروازہ اور کھڑکیوں کی طرف دیکھنے لگا یہاں تک کہ دس بجنے والے ہوئے کہ دفعتاً دروازہ کھلا اور وہی مہ جبیں نکلی اور اُس کی ماں بھی اُس کے ساتھ ساتھ۔ یہ دیکھتے ہی خوشی سے ایسے ہوش و حواس جاتے رہے کہ اُن کے پیچھے پیچھے ہو لیا لیکن وہ دونوں اس سے بے خبر تھیں۔

دونوں قریب کے بازار میں جاکر ایک کپڑے والے کی دوکان میں چلی گئیں۔ سامی بھی اُن کے پیچھے پیچھے گیا۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے اپنا کام کیا اور اُلٹے پیروں اپنے گھر واپس چلی آئیں۔ سامی پھر بھی اُن کے پیچھے پیچھے ہے اور اُسی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ غرض کہ اُن کو گھر تک پہنچا دیا اور عشق کی بارگاہ سے جو کچھ اُس کو آج ملا تھا لئے ہوئے واپس گھر چلا آیا۔

---

# تیسرا باب

## سچّا دوست

سامی پر یہ ہفتہ پہلے سے زیادہ سخت گزرا۔ اپنے جی کو یہ اُمید دلاتا تھا کہ وہ جمعہ کو اسے دیکھے گا اور اُس کے دیدار سے عشق کے دل سوز شعلہ کو بجھائے گا۔ ہفتے کے دنوں کو ہی نہیں بلکہ اُن کی گھڑیاں گنا کرتا تھا۔ چنانچہ جوں جوں جمعرات قریب آتی جاتی تھی اُس کو پڑھنے میں ایک خاص لطف پیدا ہوتا جاتا تھا۔ جمعرات کا دن آیا اور مدرسے سے نکل کر وہ سیدھا گھر گیا اور جی ہی جی میں خوش ہو رہا ہے کہ کل صبح وہ اپنی محبوبہ کے دیدار سے لطف اندوز ہو گا یہ خیال آتے ہی

وہ پھولے نہیں سمایا اور اُس زمانہ کی مشہور غزلیں باقی ماندہ وقت کاٹنے کی غرض سے گانے لگا تاکہ حسب مراد صبح ہو جا

جمعہ کی صبح ہوئی۔ سورج نے اپنی مسرت آمیز روشنی پھیلائی۔ یہ اپنے بستر سے اُٹھا۔ تھوڑی بہت چائے پی علیٰ
لباس (Civil Dress) پہنا اور گھر سے نکل سیدھا محبوبہ کے مکان کی طرف لپکتا ہوا چلا۔ چنانچہ وہاں پہنچکر حسب
عادت گیس کے کھمبے کے پاس کھڑا ہو گیا اور کبھی کھڑکیوں پر نظر ڈالتا تھا تو کبھی دروازہ پر۔ ادھر شوق دیدار تھا کہ
بڑھ رہا تھا۔

طویل انتظار کے باوجود مقصود کا کوسوں پتا نہیں اب تو دل قابو سے باہر ہونے لگا۔ چہرہ کا رنگ اڑنے لگا۔ سارا
شوق فنا ہو گیا۔ اُسی جگہ ٹہلنے لگا تاکہ جسم کو تکلیف دے کر خیال کو کچھ تو آرام دے۔ لیکن نگاہ دروازہ ہی کی طرف لڑی
تھی۔ اتنی دیر تک کھڑے رہنے کے بعد دل بیٹھ گیا۔ صبر کا پیالہ چھلک اُٹھا۔ ایک لمبا سانس لے کر اس زور سے آہ کی
آگ کے شعلے نکلنے لگے۔ پھر یہ کہکر اپنے جی کو سمجھایا۔

"لاؤ دیکھیں تو سہی کہ ہماری محبوبہ اب کیا کر رہی ہے آیا وہ گھر میں ہے یا باہر ہے۔ کاش میں آج دیدار
سے مشرف ہو جاؤں۔ افسوس میرے دل پر کیا گزر رہی ہے"

ظہر کے وقت تک وہ وہاں کھڑا رہا لیکن وہ نہ نکلی۔ اب اُس کی مصیبت اور پریشانی کا کیا پوچھنا۔ اسی عرصہ میں
راہگیروں نے اُس کے اتنی دیر تک کھڑے رہنے پر تعجب کرکے اُس کو گھیر لیا اور تماشا دیکھنے لگے۔ جب جمگھٹا زیادہ
تو وہ چونکا اور بے انتہا شرمندہ ہوا چنانچہ وہ وہاں سے چلدیا اور سیدھا اپنے گھر آیا۔

تیسرا ہفتہ اس سے زیادہ سخت گزرا اور چوتھا پھر پانچواں اُس سے بھی زیادہ کیوں کہ دیدار محبوب کی ہوا بھی نہ
اب حالت غیر ہونے لگی۔ رنگ بدل گیا۔ جسم گھلنے لگا۔ نیند اور بھوک سب حرام ہو گئی۔ پڑھنا لکھنا غائب۔ غرض کہ اُس
حالت میں عبرت ناک تغیر ہو گیا۔

مدرسے کے ایک استاد افسر نے اُس کی حالت پر غور کیا۔ اُس نوجوان افسر کی عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہیں تھی ا
سیکنڈ لفٹنٹ کے عہدہ پر فائز تھا۔ ہمت آفندی نام تھا اور سامی سے انتہائی محبت کرتا تھا محض اس لئے کہ سامی
باپ اُس کے آڑے وقت پر کام آیا تھا اسی وجہ سے وہ اُس کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا تھا چنانچہ سامی کی یہ حالت دیکھکر
افسوس بھی ہوا اور تعجب بھی کیوں کہ وہ اُس سبب سے بالکلیہ بے خبر تھا جس نے اُس کو اس حالت پر پہنچا دیا تھا چنا

اُس نے اُس بھید کو معلوم کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا تاکہ اصل معاملہ کا پتا چل جائے۔

ایک روز وہ مطالعہ کے گھنٹے کی نگرانی کر رہا تھا کہ اُس نے سامی کو ایک کمرہ میں الگ بُلایا اور اپنے پاس بٹھا کر کہنے لگا۔

**ہمت آفندی** - میرے پیارے سامی! اس مہینے میں میں تمھیں انتہائی متغیر دیکھتا ہوں جس سے تمھاری تندرستی پر بھی اثر پڑا ہے اور تمھاری تعلیم و میل جول پر بھی۔ آخر تم کو کیا شکایت ہے اور اس عام تغیر کا کیا سبب ہے؟

**سامی** - جناب! مجھے خود بھی معلوم نہیں کہ وہ کیا بات ہے جس کی وجہ سے آپ مجھ سے اس قسم کا سوال کر رہے ہیں۔ میں تو جیسا تھا ویسا ہی ہوں۔

**ہمت آفندی** - تم اصلیت کو مجھ سے چھپانا چاہتے ہو۔ تم کو ٹھیک ٹھیک بتانا ہوگا۔

سامی اس پر خاموش ہو گیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ ہمت آفندی نے پھر کہا۔

**ہمت آفندی** - سامی! کیا تم کو میری دوستی میں شک ہے۔ کیا تم کو یہ شبہ ہے کہ میں تمھارا ہمدرد نہیں ہوں؟

**سامی** - معاذ اللہ۔ جناب! ایسا تو میں گمان بھی نہیں کر سکتا ہوں۔

**ہمت آفندی** - تو پھر کیوں وہ بات چھپاتے ہو جس نے تم کو گھلا رکھا ہے۔

**سامی** - لیکن مجھے تو کچھ معلوم نہیں کہ مجھے کس چیز نے گھلا رکھا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی ایسا مرض لاحق ہو گیا ہو جس نے میری تندرستی پر اثر کیا ہو جس کی مجھے خبر نہیں ہے۔ لیکن میرے چہرے پر اُس کے اثرات ظاہر ہو گئے ہوں اور اُن سے یہ گمان پیدا ہو گیا ہو۔

**ہمت آفندی** - سامی! ہرگز نہیں۔ صرف تمھارے چہرے ہی پر نہیں بلکہ تمھارے حرکات و سکنات میں تبدیلی ہے لہٰذا اپنا اندرونی بھید مجھے بتاؤ اور اس کا یقین کر لو کہ میں تمھارا سچا دوست ہوں اور تمھاری مصیبتوں کے ہلکا کرنے میں اپنی تمام کوشش صرف کر دوں گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ عشق کی مصیبت ہے کیوں کیا ایسا نہیں ہے؟ بے خوف و خطر کہو۔ بے شک عشق اُن تمام مشکلوں سے زیادہ مشکل ہے جو انسان کی زندگی میں آڑے آتی ہیں۔ یہ وہ سخت مرض ہے جس سے شفا اُسی حالت میں ہوتی ہے

جب کہ محبوب مل جائے۔ تم یقین مانو کہ میں تم کو اس معاملہ میں برا نہیں کہوں گا کیوں کہ میں خوب جانتا ہوں کہ یہ تم نے جان بوجھ کر نہیں کیا ہوگا۔ بلکہ آنکھ دیکھ لیتی ہے اور دل مرمٹتا ہے۔ چنانچہ محبت وہ آگ ہے جو بھوبھل میں چھپی ہوتی ہے اگر ہوا نہ چلی تو وہ بجھ جاتی ہے اور جو کہیں ہوا سے مڈبھیڑ ہو گئی تو بھوبھل اڑ جاتی ہے اور آگ دہک اٹھتی ہے اور اس کے شعلے بھڑکنے لگتے ہیں۔ تم ان حالتوں میں سے کس حالت میں ہو؟

**سامی۔** میں دوسری حالت میں ہوں۔

**ہمت آفندی۔** اب تم نے اقرار کیا۔ یہ تو میں پہلے ہی جانتا تھا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم نے دل کس کو دیا ہے۔

**سامی۔** اگر میں یہ بتا دوں گا تو آپ مجھ پر ملامت کریں گے۔

**ہمت آفندی۔** اس کا خیال بھی مت کرو۔ محبت کی حالت نرالی ہوتی ہے۔ کیا کسی بدنسل پر فریفتہ ہوئے ہو یا کسی غریب گھر میں دل دیا ہے۔

**سامی۔** اگر ایسا ہوتا تو اچھا ہوتا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے جیسا کہ آپ خیال کر رہے ہیں۔

**ہمت آفندی۔** کیا وہ کوئی بڑے گھرانے کی ہے یا کسی بادشاہ کی بیٹی ہے۔

**سامی۔** نہ یہ ہے اور نہ وہ بلکہ وہ پردیسی ہے۔

**ہمت آفندی۔** یہ بے شک برا ہے۔ مگر خیر بتاؤ تو سہی۔

سامی نے اس کو پورا قصہ سنا دیا کہ وہ کس طرح سے ساحل پر سیر کے لئے گیا تھا اور وہاں اس ماہ وش کو دیکھ کر کس طرح اس کے پیچھے پیچھے اس کے گھر تک گیا۔ جہاں وہ اب اپنے والدین کے ساتھ رہتی ہے اور پھر ہر جمعہ کو اس کے گھر کی طرف جانا اور سوائے ایک بار کے پھر کبھی اس کا نہ دیکھنا وغیرہ وغیرہ یہ ساری کہانی اس کو سنا دی۔

ہمت آفندی تھوڑی دیر تک خاموشی سے اپنے دوست کے معاملہ میں سوچتا رہا اور پھر سر اٹھا کر کہنے لگا۔

**ہمت آفندی۔** اگر تم اس راستہ پر چلے تو نقصان اٹھاؤ گے۔

**سامی۔** میرے پیارے! خدا کے واسطے مجھے بتائیے کہ میں کیا کروں۔ مدرسے کے قواعد کی پابندی ضروری ہے ایسا راستہ بتائیے کہ ان مصائب سے نجات پاؤں۔

**ہمت آفندی** ۔ بحیثیت طالب علم کے تم کس بات کے خواہش مند ہو۔

**سامی** ۔ میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں چاہتا ہوں کہ اُس کو دیکھ کر میں شوق کی بھڑک کو ٹھنڈا کروں۔

**ہمت آفندی** ۔ اچھا۔ چوں کہ وہ عیسائی ہے اور عیسائی بالخصوص ہر اتوار کو سیر کے لئے باہر جاتے ہیں اور اُس روز تمھارا مدرسہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں تمھارے لئے اُس کا دیکھنا ناممکن ہے۔ چوں کہ مجھے بھی اُس کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوگیا ہے۔ اس لئے میں تم کو سنیچر سے تین روز کی چھٹی دلوا دوں گا اور تمھارے ساتھ چلوں گا تاکہ تم مجھے اُس کا مکان بتا دو۔ اُن کو دیکھنے کے بعد میں کوئی ایسی تدبیر سوچوں گا کہ جس سے تم کو راحت ہو اور اللہ تم کو اس گرداب سے چھڑائے۔ خواہ تمھارے دل سے اُس کی محبت کو دُور کرے یا ایسا ذریعہ پیدا کردے کہ تم کو اُس تک پہنچا دے ۔

**سامی** ۔ آپ نے یہ وعدہ فرما کر میرے غمگین دل کی تسلی کی۔ میری زبان آپ کے برادرانہ شفقت کا شکریہ ادا کرنے سے عاجز ہے۔

**ہمت آفندی** ۔ یہ میرا فرض ہے۔ کیوں کہ تمھارے والد کی مہربانیاں جو اُنھوں نے مجھ پر کیں میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا ہوں۔ اس لئے شکریہ کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اچھا اب اُٹھو اور پڑھنے میں جی لگاؤ۔ اور اپنے کسی اُستاد کو اس شکایت کا موقع نہ دو کہ تم پڑھنے میں غفلت کرتے ہو۔ یہ میرے ذمہ ہے کہ میں تمھارے مصائب اور غموں کو کم کردوں گا ۔

**سامی** ۔ اے سچے دوست ! میں آپ کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

پھر اُن دونوں نے مصافحہ کیا۔ سامی اپنے درجہ میں چلا گیا اور اپنے دوست کے وعدہ پر بہت ہی خوش ہو رہا تھا۔

---

# خمسہ

بہ چشمِ نرگسِ مستانہ در بستاں خمار آمد    بیا ساقی بدہ بادہ کہ باز ابرِ بہار آمد
چرا گویم بہار آمد کہ دورانِ خمار آمد    بہ بیں مستانہ وار آمد صبا ز ر لالہ زار آمد
بگرداں جامِ مے ساقی بہار آمد بہار آمد

بہ فصلِ گل بہارِ باغ و تاثیرِ ہوا خوشتر    بساغر بادہ خوشتر بر فلک ابرِ سیہ خوشتر
کنارِ جوئے خوشتر، سبزہ زارِ پُر فضا خوشتر    سرے بر زانوئے خوشتر، خیالِ آشنا خوشتر
تماشا ایں چنیں رنگیں کہ بر لب جانِ زار آمد

شکوہِ من بصحرا بیں گلِ رنگیں ادائے من    چہ خوش باشد اگر روزے بیائی در قفائے من
بہ چشمِ آبلہ با شوکتِ شاہانہ پائے من    تماشا کن کہ باشد دیدنی اے دلربائے من
باستقبالِ من از بہرِ پائے بوس خار آمد

ربابِ ہستیٔ برباد، مملوئے غمِ ہجراں    بہ شکلِ سنگِ خارا آتشے در سینہ ام پنہاں
چناں بد حال گردیدم بعشقِ شاہدِ ناداں    کہ از فرطِ غمِ ہجراں نباشد ربطِ جسم و جاں
”بیا زارِ محبت نقدِ ما کامل عیار آمد“

بہ شب از خوابِ شیریں یک بیک بیدار گردیدن    بچشمِ خوں فشاں در جستجوئے یار گردیدن
ز غم در ہجر کاہیدن نحیف و زار گردیدن    بگو جانم چنیں ہم تا بکے بیمار گردیدن
مسیحِ من مدوا کنوں کہ بر لب جانِ زار آمد

بہ ہجرِ یار از سوزِ نہاں خونِ جگر سوزد    گرفتہ خانۂ دل آتشے، دیوار و در سوزد
بہ چشمِ منتظر ہر لمحہ یک تارِ نظر سوزد    سپند آسا اگر یہ قطرہائے اشکِ تر سوزد
مرا اے شورؔ چوں افزود ایں آتش بخار آمد

منظور حسین شورؔ

# وہ

مثل مشہور ہے "جتنے منہ اُتنی ہی باتیں" لیکن یہاں دیکھنا یہ ہے کہ باتوں کا وزن و مقدار مونہوں کے تکمیل پر منحصر ہے۔ یا کثرت تعداد پر تعدد انواع سخن کا مدار ہے؟ بہر حال کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ میں 'وہ' کے متعلق تمام مختلف الوضع جماعتوں کے چھوٹے بڑے مونہوں کو چیلنج دیتا ہوں کہ وہ اپنی اور اپنی باتوں کی کثرت کے بل پر 'وہ' کو نہ صرف کسی ایک جامع و مانع تعریف کے دام میں پھانسیں، بلکہ حق شناسی کا اس طرح فیصلہ کریں کہ یہ لفظ ہمیشہ کے لئے اسی جماعت کا طغرائے امتیاز ثابت ہو۔

دیکھئے منادی کے ہوتے ہی سب سے پہلا قدم کسی اسکول کے قواعد داں ماسٹر کا ہے۔ بیچارہ نے آتے ہی اپنی زبردست تقریر سے حاضرین کو مرعوب سخن کرنا شروع کر دیا ہے۔ کبھی ضمیر واحد غائب پر زور دیتا ہے کہ کسی شخص کے نام کی جگہ جو لفظ حق قائم مقامی کو ادا کرتا ہے' وہ لفظ 'وہ' ہے۔ کبھی اسم اشارہ کی طرف اشارہ کرکے بتاتا ہے کہ

'وہ' ایک لفظ ہے، جو ریلوے سگنل کے دستِ فرو ہشتہ یا بازار کے چوراہے پر پولیس کنسٹبل کے لٹکے ہوئے ہاتھ کی طرح اشارہ میں شرم سے کام نہ لے کر اپنے مقاصد کو اٹھے ہوئے ہاتھ کی انگلی یا ابرو کی حرکت عروجی سے مدد لے کر صحیح راہنمائی کے فرائض بجا لاتا ہے۔ کبھی 'وہ' کو اسم موصول مان کر آئندہ جملہ کو جواب صلہ قرار دینے سے اس کے غیر منفک خطاب کا حاضرین پر اعلان کر رہا ہے۔ زور تقریر کا وہ عالم ہے کہ ہزاروں نعرہ ہائے آفریں بلند ہو رہے ہیں۔ آخر ایک صوفی صاحب سے نہ رُکا گیا، آگے بڑھے۔ اور باں ریش وفش مقرر پر ایسی تیز نظر ڈالی کہ اس کا تمام سرمایۂ علم ایک ادنےٰ توجہ کی نذر ہو گیا۔ فرمانے لگے 'وہ' ہُوَ کی ترکیب مقلوب کل کا نتیجہ ہے۔ 'وہ' ہُوَ میں اور ہُوَ 'وہ' میں ایسے باہم گر پیوستہ ہیں کہ لاہوتی ہُو، ناسوتی 'وہ' میں مدغم ہو کر بطون میں ایک اور ظہور میں دوئی سے ہمکنار ہو گیا۔ تقریر کیا تھی کہ درمیان میں ہُو حق کے نعروں سے وہ محفل گونج اُٹھی۔

صرفی سے بھی نہ رہا گیا، ماسٹر کی تقریر نے نحو و صرف میں بولنے کی گنجائش ہی نہ چھوڑی آخر کب تک ضبط کیا - فوراً ہی علم معانی کے لیکچرر کو پکڑ لایا۔ لیکچرر کی معقولیت و متانت، شہرت و شوکت کو دیکھ کر صوفی صاحب تو محو مراقبہ ہو گئے۔ اور لیکچرر نے " الکنایۃ ابلغ من التصریح "کو موضوع بحث قرار دیکر 'وہ' کو اس کا مصداق صحیح ثابت کیا۔ جب اس مقام پر پہونچا کہ " 'وہ' ایک ایسا جامع لفظ اور جادو کا منتر ہے کہ جہاں زبان تشریح مطالب سے اور ذہن و تعقل کسی مناسب لفظ کے پیش کرنے سے قاصر و معذور ہو جاتے ہیں۔ جہاں سامعین کسی عمدہ شعر یا منظر کا لفظی فوٹو دیکھنے، یا ایک نغمۂ کیف و تاثر کے سننے کو بےتاب ہوتے ہیں۔ وہاں صرف یہی دو حرفی لفظ الف لیلہ کے 'سمسم' کی طرح طلسم ابہام کے پرزے اُڑا کر طلاقتِ لسانی کی لاج رکھ لیتا ہے" تو تمام خطیب چونک پڑے اور سب نے اپنی اپنی نوٹ بکیں ہاتھوں میں لے کر فی الفور اس تشریح کو درج کر لیا۔ پھر تو شاعر صاحب نے بھی اسٹیج پر آنے میں سبقت کی اور چاروں طرف سے 'وہ' 'وہ' کی صدائیں بلند ہو گئیں۔ شاعر صاحب نے فوراً ساز شاعری کا تار چھیڑ کر پردہ عشاق میں سب سے پہلا جو شعر الاپا وہ یہ تھا۔

'وہ' آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

پھر کیا تھا، غالبؔ بھی محبوب کی کج ادائیوں سے تنگ آکر چیخ اُٹھے۔

'وہ' اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سربن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

ذوقؔ بھی آرزوئے دیدار میں مریضِ ذوق رہے۔ اس لئے کہ بیٹھے

اب وہ آئے جب نگہ کو ضعف سے
کم نہیں مژگاں کی صف دیوار سے

غرض تمام شعرا نے یک زباں ہو کر کہا کہ یہ لفظ ہماری شاعری کی جان، اور سخن کا روح رواں ہے۔ صرفی، صوفی، اہل معانی، تو صرف لفظی دام میں گرفتار ہیں۔ اس کے صحیح استعمال سے عملی فائدہ سوائے ہمارے کسی کو نہیں پہونچا۔ ہم اسی ایک لفظ سے پژمردہ دلوں میں شگفتگی، دماغ میں تازگی تخیل میں وسعت پیدا

ر کے قلب عاشق کے رگ و پے کو تاثرات کی بجلیوں سے معمور کر دیتے ہیں۔ عاشق کا لفظ کہتا تھا کہ صحرا سے
ر کی جانب سے شوریدہ سران کوئے لیلیٰ کا گروہ لپکا۔ اور کہنے لگا کہ شاعر جھوٹے ہیں۔ ان کی عیر
متبری کے لئے کلام الٰہی کی نص بہت کافی ہے۔ یہ محض ہمارے ترجمان ہیں۔ ان کو 'وہ' کی لذات سے
ا سروکار۔ یہ انتظار کی روح فرسا تکالیف، شب فراق کے فلک دوز نالوں، زندگی کی بے شمار تلخ کامیو
و کیا جانیں۔ انہی کا کلام ہے۔

'وہ' جو پہلو سے اٹھے درد کچھ ایسا اُٹھا
تھام کر دل کو کئی بار میں بیٹھا اُٹھا

لیکن ذرا ان سے دریافت کیجئے کہ پہلو سے کون اُٹھا جس نے درد پیدا کر دیا۔ یہ درد فراق سے
و نکر واقف ہوئے۔ چونکہ شعرا ہمارے دائمی وکیل ہیں اس لئے ان کا قول ہمارے جانب سے متصور
ا جائے۔ یہ ہم ہی ہیں کہ جہاں ہوں، جس حالت میں ہوں۔ "وہ گئے" کی آواز آئی اور ہما ے
اس پر بجلیاں گریں۔

ان تمام تقاریر سے صنفِ نازک بھی متاثر ہو رہی تھی۔ کچھ کہنا بھی چاہتی تھی مگر شرم کے ہاتھوں
ور تھی۔ آخر چودھویں صدی کی ایک شریف اور تعلیم یافتہ عورت نے ہمت کر کے ایسا معنی خیز لکچر دیا
سب کو سنے جھانکنے لگے۔

اس کا دعوےٰ تھا کہ 'وہ' صرف ہماری نسوانی اصطلاحات کا خاص اور مقررہ لفظ ہے۔ کیونکہ یہ لفظ
نے اپنے قابلِ تعظیم شوہر کے لئے صرفیوں سے ہمیشہ کے لئے خرید لیا ہے۔ جس پہ ہم متصرف کامل ہیں۔
ب آپ صاحبان ہماری تقریر میں شریک ہوں۔ تو 'وہ' اور "انھوں نے" سے ہمیشہ شوہر مراد لیں۔ دیکھئے!

'وہ' مرے خط کی چٹکیاں یاد دلائیں گے مجھے
چھیڑنے کو ہنسیں گے 'وہ' اور ہنسائیں گے مجھے

دل میں بسے ہوئے ہیں 'وہ' اس میں خیال اُنہی کا ہے
دل مرا ہے 'وہ' آئینہ جس میں جمال اُنہی کا ہے

غور فرمائیے کہ اس لفظ سے اصلی اور حقیقی فائدہ اُٹھانے کے تین گروہ مدعی ہیں۔ شعرا، عشاق اور صنفِ نازک، نحویوں نے تو سوائے لفظی بحث کے اس سے کوئی استفادہ ہی نہیں کیا۔ نہ یہ لفظ ان کے کام ہی کا ہے۔ رہے صوفی اور اہل معانی تو وہ بھی عشاق ہی کے زمرہ سے تعلق رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شعراء کا دعوے تو قطعاً غلط ہے۔ کیونکہ ان سے فائدہ اُٹھانے والے صرف عشاق ہیں۔ اور یہ کسی طرح ایک گراموفون سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ اب یہ لفظ ہمارے اور عشاق کے درمیان قابل بحث رہتا ہے۔ جس کا فیصلہ بآسانی ممکن ہے۔

ہم اپنے شوہر کو قابل تعظیم و محبوب سمجھ کر اس کا نام لینے سے ادباً و حجاباً پرہیز کرتے ہیں اور ایسے مواقع پر ایک لفظ مبہم کا استعمال مناسب سمجھتے ہیں۔ تاکہ ہر نا اہل ہمارے اشارات کو سمجھ نہ سکے۔ اگرچہ عشق ہمارے عشاق کے درمیان وجہ مشترک ہے۔ مگر دوسرے خصوصیات کثیرہ ہمارے لئے باعثِ تفوق ہیں۔ بنا بریں لفظ 'وہ' کا استحقاقِ ملکیت محض ہماری ذات کو حاصل ہے۔ صنفِ نازک کے دلائل نے تو سب کو مبہوت کر دیا۔ زمانہ کا رنگ دیکھ کر شعراء وغیرہ تو دست بردار ہو گئے۔ عشاق نے مصالحت کر لی۔ پھر تو کثرت رائے سے بالاتفاق 'وہ' کا جسم زیب جامہ صنفِ نازک ہی کے قدِ رعنا پر چسپ و درست ثابت ہوا۔ اور سب اپنا اپنا مونھ لے کر گھروں کو سدھار گئے۔

محمود زماں خاں محمود (رام پور اسٹیٹ)

(ادیب فاضل)

# الماس

(جناب ایم اسلم صاحب)

گھٹاٹوپ اندھیرا۔ طوفانِ برق و باد۔ اور پھر طلاطم خیز سمندر کی حشر آزمائیوں نے اہل جہاز کو زیست سے
س کر دیا تھا۔

جہاز کو طوفان سے بچانے کی جس قدر کوشش ممکن ہو سکتی تھی۔ ناخدا برابر کئے جا رہا تھا۔ عورتوں اور بچوں
غ پکار اور مردوں کا شور و غل اور اس پہ موج طوفاں خیز کی خوفناک یورش جری سے جری آدمی کے دل
بی خوف و ہراس پیدا کر رہی تھی۔ سب سے زیادہ خطرہ یہ تھا کہ جہاز ایسے مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں سے سمندر
ڈوبی ہوئی چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

---

تختۂ جہاز پر تو ایک طوفان بے تمیزی برپا تھا۔ مسافروں کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے لیکن ایک
ے میں دو بچے اور دو مرد جن میں سے ایک جوان اور دوسرا بوڑھا تھا بیٹھے تھے بچے سہم کر سو گئے تھے۔

نوجوان بولا!

"آج تو لعز نگ اجل ہو نا یقینی نظر آتا ہے۔ لیکن افسوس تو اس معصوم جان پر ہے...... ہائے یہ مرحومہ کی
ی یادگار میرے پاس تھی... میری معصوم الماس...."

بختیار کی آواز رک گئی اور وہ آنسوؤں میں ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے سوئی ہوئی بچی کی طرف دیکھنے لگا۔

بوڑھا یا زیہادر بولا

"بختیار! تم نے تو تمام عمر بھری سفروں میں کاٹی ہے۔ اتنے بے حواس کیوں ہوئے جاتے ہو۔ اٹھو ہمت کرو"

بختیار۔ "کیا کروں!! اس وقت ہو ہی کیا سکتا ہے!"

زیہادر۔ "آؤ بچوں کو بچانے کی کوشش کریں۔ دیکھو میرا جگر گوشہ نوبہار کیا آرام سے پڑا سوتا ہے۔

اگر ہم مرد ہو کر ان معصوم جانوں کو بچانے کی کوشش نہ کریں تو حیف ہے"

بختیار:۔" ان معصوم جانوں کا اللہ ہی نگہبان ہے"

باز بہادر:۔" سچ کہتے ہو۔ لیکن کوشش کرنا بھی تو انسان کا فرض ہے۔ لو سنو جہاز کی پچھلی جانب ایک بہت بڑی کشتی رسوں سے جکڑی رکھی ہے آؤ جس قدر ضروری سامان فراہم ہو سکے اس میں لاد دیں اور پھر کشتی پانی میں اُتار کر قسمت آزمائی کریں"

بختیار اور باز بہادر دروازہ بند کر کے باہر نکلے۔ اور رسوں اور سلاخوں کو پکڑتے ہوئے جہاز کے گودام میں جا پہنچے۔ یہاں سے اُنھوں نے خورد و نوش کا بہت سا سامان ادھر ادھر سے اکٹھا کر کے گٹھریوں میں باندھا اور بڑی مشکل سے کشتی میں جا کر رکھ دیا۔ پھر واپس آ کر اُنھوں نے اپنے اور بچوں کے تمام کپڑے صندوقوں سے نکال کر پیٹھ پر باندھ لئے۔ اور سوئے ہوئے بچوں کو گود میں اُٹھائے کشتی کی طرف چلے۔ تختۂ جہاز پر کہرام مچا ہوا تھا۔ کسی نامعلوم سوراخ سے پانی جہاز میں آ رہا تھا۔ مسافر ادھر اُدھر بھاگے پھرتے تھے۔ بچے دہشت زدہ ہو کر ماؤں سے لپٹ گئے تھے۔ ناخدا نے ملاحوں کو کشتیاں سمندر میں ڈالنے کا حکم دے دیا تھا۔

---

اس وقت پچھلا پہر تھا۔ آسمان پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ گاہے گاہے رعد کی کڑک اور بادل کی ہولناک گرج اس شدت سے سنائی دیتی تھی کہ قہر و غضب کے فرشتوں کا آسمان سے اُترنے کا گمان ہونے لگتا تھا۔

لوگوں کے شور و غل سے الماس اور نوبہار بھی جاگ پڑے۔ جس مقام پر کشتی بندھی تھی یہاں پہونچ کر باز بہادر اور بختیار نے بچوں کو ایک طرف بٹھا دیا اور پھر بڑی احتیاط سے رستے کھول کر کشتی سمندر میں ڈالی جب کشتی پانی پر پہنچ چکی تو سب سے پہلے ایک رسے کے ذریعہ باز بہادر نیچے اترا اور پھر بختیار سے کہا کہ بچوں کو یکے بعد دیگرے رسے سے باندھ کر نیچے لٹکا دے۔ یہ کام بہت مشکل تھا کیوں کہ بچے جب ان کی کمر میں رسہ بندھنے لگا تو خوف زدہ ہو کر چیخنے چلانے لگے۔ بہر کیف بختیار نے پہلے نوبہار کو اور پھر الماس کو سینے سے لگا کر نیچے لٹکا دیا۔

جب بچے کشتی میں اُتر چکے تو اب بختیار کی باری تھی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ نیچے اُتر سکے ایک زور

دھماکا ہوا اور جہاز خطرناک طور پر ڈگمگانے لگا۔ ساتھ ہی مسافروں کے سمندر میں کودنے کا شور سنائی دینے لگا۔
بازبہادر نے عجلت کر کے ایک تیز چاقو سے کشتی کے رسّے جس سے وہ جہاز سے بندھی تھی کاٹ دیئے۔
کشتی جہاز سے علیحدہ ہوئی تھی کہ بختیار بھی سمندر میں کودا لیکن اندھیرے میں بازبہادر اس کی کچھ دستگیری نہ کرسکا
اب بوڑھا نہایت بردباری کے ساتھ چپو سنبھال کر موجوں کا مقابلہ کرنے لگا۔

---

سپیدۂ سحر اوڈے اوڈے بادلوں میں سے دھیرے دھیرے نمودار ہو رہا تھا۔ طوفانِ برق و باد تھم چکا تھا، اور موجِ بحر رات بھر کی حشر آزمائیوں کے بعد آسودۂ خواب تھی۔ بازبہادر کشتی کی سلامتی کے لئے برابر چپو چلا رہا تھا اور بار بار بڑی حسرت بھری نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا تھا۔ الماس اور نوبہار کمبل میں لپٹے آغوشِ خواب میں پڑے سوتے تھے۔
جب نیلے نیلے بادلوں پر سنہری لہر دوڑتی نظر آنے لگی تو اس وقت بازبہادر کو دور فاصلہ پر اونچے اونچے پہاڑ دھندلے دھندلے سے نظر آنے لگے۔ خشکی کے نشانات دیکھ کر اس کی ہمت بڑھ گئی اور وہ بڑی ہوشیاری سے اُسی سمت کشتی کھینے لگا۔
اب بچے بھی بیدار ہو چکے تھے اور حیران ہو ہو کر ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔
نوبہار بولا
"بابا جان ہم کب گھر پہنچیں گے؟"
اور الماس بسورنی صورت بنا کر بولی "
"میرے ابا جان کہاں گئے؟"
بازبہادر نے بچوں کو کھانے کے لئے کچھ مٹھائی نکال کر دی اور باتوں باتوں میں ان کو بہلانے لگا۔
ابھی سورج لیل و نہار پر نہ پہنچا تھا کہ کشتی ایک جزیرے کے قریب پہنچ گئی۔
نوبہار نے پوچھا
"بابا جان! کیا ہمارا گھر آگیا؟"

اور الماس بولی

"میرے ابا بھی تو وہاں ہی ہوں گے"؟

"ہاں بیٹا گھبراؤ نہیں" بازبہادر نے کہا" وہ تو تمھارے لئے کھلونے اور مٹھائی لینے گئے ہیں"

"اور ہمارے لئے؟" تو بہار نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں تمھارے لئے بھی"

کشتی اب چٹانوں کے سلسلہ میں داخل ہو چکی تھی اور یہاں امواج بحر کے خوفناک تھپیڑوں سے محفوظ تھی۔ جوں جوں آگے بڑھتے پانی کی گہرائی بھی کم ہوتی جاتی۔ سمندر دور فاصلہ پر سیماب کی طرح بے تاب و بے قرار نظر آتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں جو میٹھے پانی میں کثرت سے ہوتی ہیں کشتی کی دو جانب قلیلیں کرتی پھرتی تھیں اور بچے بڑے شوق سے انھیں دیکھ رہے تھے۔ آخر کشتی پایاب پانی میں جا کر رک گئی۔ بازبہادر نے ایک آہنی زنجیر سے کشتی ایک بڑے پتھر کے ساتھ باندھ دی اور دونوں بچوں کو کندھوں پر اٹھا کر خشکی پر لے گیا۔

جزیرہ بہت سرسبز تھا۔ پتھریلے کنارے پر خودرو پھولوں کی بیلیں بکثرت پھیلی ہوئی تھیں۔ اور خوب صورت چمک دار پروں والی تیتریاں مستانہ وار پھولوں پر تصدق ہو رہی تھیں۔

خشکی پر اترتے ہی بچے تیتریوں کے پیچھے بھاگنے لگے اور بازبہادر کشتی میں سے سامان اٹھا اٹھا کر لانے لگا۔ جب سب سامان آ چکا تو بازبہادر نے ایک بہت اونچے پیڑ پر چڑھ کر ادھر ادھر نگاہ ڈالی۔ جزیرہ غیر آباد معلوم ہوتا تھا اور اسے نزد و دور پناہ کی کوئی جگہ نظر نہ آئی۔ ایک جانب اونچے اونچے پہاڑ تھے جو چوٹی سے دامن تک سبزے سے ڈھنپے ہوئے تھے۔ دن ڈھل چکا تھا اور رات سر پر آ رہی تھی۔ بچے دوڑ دھوپ سے تھک کر ایک درخت کے نیچے آ بیٹھے تھے۔ اور الماس پھر اپنے اباجان کے لئے ضد کرنے لگی تھی۔

بازبہادر نے بچوں کو مٹھائی اور پھل جو جزیرے میں بکثرت موجود تھے ادھر ادھر سے فراہم کر کے دیئے۔ اور طرح طرح سے ان کا دل بہلانے لگا۔ بچے جب ذرا اپنے دھیان میں لگے تو وہ ایک کلہاڑا لے کر ادھر ادھر سے سوکھی لکڑی کاٹ لا اور ایک جگہ انبار لگا دیا۔ شام ہوتے ہی اس نے ایندھن کو آگ لگا دی۔ اور بچوں کو کمبلوں میں لپیٹ کر ایک سایہ دار پیڑ کے نیچے سلا دیا۔

وہ بہت دیر تک صورت حالات پر غور کرتا رہا۔ اور آخر بچوں کے پاس ہی کمبل اوڑھ کر پڑ گیا اور خراٹے بھرنے لگا۔

---

صبح اُس نے سامان تو اسی پیڑ کے نیچے چھوڑا اور بچوں کو ساتھ لے کر سر چھپانے کا آسرا ڈھونڈنے لگا آخر سلسلۂ کوہستان کے دامن میں ساحل سے بہت دور فاصلہ پر اُسے سایہ دار درختوں کا ایک بہت گھنا جھنڈ مل گیا۔ شاخوں نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال کر سقف کی صورت پیدا کر دی تھی۔ یہ جگہ باز بہادر کو بہت پسند آئی لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ بچوں کو اب پھر اتنی دور ساتھ لے کر اس جگہ نہیں جا سکتا تھا جہاں اسباب رکھا تھا۔

جزیرہ گو غیر آباد تھا لیکن پھل اور شکار کثرت موجود تھا اور اس تمام عرصہ میں اسے ایک بار بھی کسی درندے کی آواز سنائی نہ دی تھی۔ اس نے میٹھے میٹھے پھل درختوں سے اُتار کر بچوں کو کھانے کے لئے دیئے اور پانی کی بوتل سے جو ہر وقت وہ اپنے پاس رکھتا تھا انہیں میٹھا پانی پلایا۔

بچے جب کھیل میں مشغول ہوئے تو اس نے پھر سوکھے درختوں کو کاٹ کر ایندھن جمع کر دیا اور شام ہوتے ہی آگ روشن کر دی تاکہ ایک تو بچے سردی سے محفوظ رہیں دوسرے جنگلی درندے ڈر کر پاس نہ آئیں۔ آج رات اُنھوں نے درختوں کے جھنڈ کے نیچے کاٹی۔

نو بہار کی طرف سے تو باز بہادر کو بالکل اطمینان تھا لیکن غریب الماس نے اپنے ابا کے لئے رو رو کر آنکھیں سرخ کر لی تھیں۔ باز بہادر اسے گود میں اُٹھا کر ساتھ لئے پھرتا تھا اور ہر طرح اسے بہلانے کی کوشش کرتا تھا۔

اگلے روز اُس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بچوں کو کھلانے پلانے کے بعد اُس نے درختوں سے بہت سی بڑی شاخیں کاٹ کر جمع کر لیں اور جہاں رات کاٹی تھی اس جگہ کے گرداگرد ایک بہت مضبوط کٹہرہ کھڑا کر دیا اور پتلی پتلی شاخوں کو درختوں کی ان شاخوں پر جو اس جگہ کے اوپر سایہ کئے ہوئے تھیں ڈال کر بارش سے محفوظ رہنے کا آسرا بنا لیا۔

دو چار دن کی محنت کے بعد یہ جگہ ایک جھونپڑی سی معلوم ہوتی تھی جو ہر طرح سے محفوظ تھی۔ باز بہادر کو جب موقع ملتا تھوڑا تھوڑا اسباب بھی اُٹھا کر لے آتا۔ وہ اکثر الماس کو کندھے پر اُٹھا کر اور نو بہار کی انگلی پکڑ کر ادھر ادھر

انھیں لئے پھرتا اور رات کے وقت کبھی گیت گا گا کر اور کبھی لوریاں اور کہانیاں سُنا سُنا کر ان کو بہلا کر سُلا دیتا۔ جنگل کا پھل اور شکار ان کی عام خوراک تھی۔

---

پانچ سال کا طویل عرصہ اسی تمنا میں گزر گیا کہ شاید کسی جہاز کا ادھر سے گزر ہو۔ اور وہ پھر ایک بار وطن کی صورت دیکھیں لیکن ساحل سے بہت دور دامن کوہسار میں رہنے کے باعث انھیں کبھی کوئی جہاز نظر نہ آیا

الماس اب اپنے باپ کو بھول چکی تھی اور نوبہار کی طرح باز بہادر کو بابا جان کہہ کر پکارتی تھی اور بوڑھا بھی اپنی حقیقی بچی کی طرح اسے پیار کرتا تھا۔

باز بہادر نے مچھلیاں اور ہرن پکڑنے کے لئے مختلف قسم کے پھندے بنا لئے تھے۔ اسی شغل میں وہ تمام دن کاٹ دیتے تھے۔ سدا بہار گلاب کی بیلیں اب ان کی جھونپڑی کو ہر طرف سے محیط کئے ہوئے تھیں۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی ندی جو جھونپڑی کے پاس سے گزرتی تھی اس میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں بکثرت موجود تھیں الماس سارا سارا دن ان کے پکڑنے میں لگی رہتی تھی۔ پہاڑی بکری کے دو بچے باز بہادر کہیں سے پکڑ لایا تھا۔ یہ دونوں الماس اور نوبہار سے بہت ہل گئے تھے اور پالتو کتے کی طرح ان کے پیچھے پیچھے لگے پھرتے تھے۔

جھونپڑی کے پاس ہی جو پہاڑ تھے ان پہاڑوں کی ایک سر بفلک چوٹی پر ایک بہت بڑا پتھر پڑا ہوا تھا اس پتھر کے وسط میں ایک چھوٹا سا گول سوراخ تھا۔ اتنا بڑا کہ انسان آسانی سے گزر سکے۔ چاند جب اپنا طولانی سفر طے کر کے جزیرہ کی جانب آتا تو پہاڑوں کے عقب سے نکل کر سب سے پہلے اسی سوراخ میں سے نظر آتا۔ الماس یہ نظارہ دیکھنے کے لئے پہروں جھونپڑی کے باہر پتھروں پر بیٹھی رہتی اور دل میں حیران ہوا کرتی کہ چاند کیوں ان کے پاس نہیں آ کر رہتا اور کس لئے اتنے دن غائب ہو جاتا ہے۔

باز بہادر بہت تجربہ کار اور جہاں دیدہ آدمی تھا۔ وہ اس جلاوطنی کو خوب سمجھتا تھا۔ اس لئے وہ بچوں کی ضروری تعلیم کی طرف سے بھی غافل نہ تھا۔ افسانوں اور کہانیوں کی صورت میں وہ ان کو اکثر باتوں کی تعلیم دیا کرتا تھا اور زندگی کی مختلف حالتوں کا فلسفہ دل پذیر پیرایہ میں سمجھایا کرتا تھا۔ بوڑھے باز بہادر کو بنسری بجانے کا بہت شوق تھا۔ الماس اور نوبہار نے بھی بانس کی ایک شاخ میں سوراخ کر کے ایک بنسری بنائی تھی اور

ونوں نے بازبہادر سے بنسری بجانا بھی سیکھ لیا تھا۔ جس قدر گیت بازبہادر کو یاد تھے وہ سب ان دونوں بچوں کو بھی یاد تھے جب وہ باہر جاتے تو اپنی بنسریاں بھی ساتھ لے جاتے اور طیور صحرا کی طرح جنگل کی خاموش فضا میں بنسری کے دل آویز نغموں سے حیات جاوداں کی ایک روح پھونک دیتے۔

زمانہ اسی طرح گزرتا گیا۔ بازبہادر اب بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور الماس زندگی کی پندرہ منزلیں طے کر چکی تھی۔

---

ایک روز الماس اور نوبہار جب جنگل سے پھل اکٹھے کر کے جھونپڑی میں آئے تو بازبہادر کو موجود نہ پایا آج یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ جھونپڑی اکیلی چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔ سائے ڈھل گئے اور افق فلک پر سیاہی پھیلنے لگی لیکن بڈھا بازبہادر ابھی تک واپس نہ لوٹا۔ طیور ادھر ادھر سے آ آ کر بڑے بڑے پیڑوں پر بسیرا کر چکے اور ندی کے کنارے کرمک شب تاب اچک اچک کر چمکنے لگے۔ لیکن بازبہادر کا ابھی کوئی پتہ نشان نہ تھا۔ الماس اور نوبہار نے مل کر آگ جلائی، گوشت بھونا اور پھر پکے پکے میوے پانی سے دھو کر صاف کر کے ایک کھال پر رکھ دیئے۔ بحری عقاب جس نے اپنا نشیمن ایک بہت اونچی چٹان پر بنایا ہوا تھا رات کے پہرہ دار کی طرح گھونسلے میں آ بیٹھا اور جزیرہ پر ایک خاموشی طاری ہو گئی۔ گاہے گاہے سمندر کے پھنکاروں کی آواز یا کسی پرندے کی کرخت چیخ اس خاموشی کو برہم کرتی تھی۔

آخر لیلائے شب نے اپنی زلف عنبریں کے جال میں جزیرے کو چھپا لیا اور الماس اور نوبہار بازبہادر کا انتظار کرتے کرتے سو گئے۔

---

جب چاند ستارے ماند پڑ گئے اور مشرق کے شاہ سوار کی آتشیں رتھ کی ہلکی ہلکی سرخی بادلوں پر پڑنے لگی تو بحری عقاب نے ایک خوفناک چیخ مار کر ساکنان جزیرہ کو ہنگامہ آرا ہونے کا پیغام دیا اور پھر جوں جوں فضائے آسمان پر سرخی پھیلنے لگی۔ ڈال ڈال اور پات پات سے گلبانگ ترنم کا شور برپا ہونے لگا۔

الماس اور نوبہار جو ہرنوں کی کھالوں میں لپٹے پڑے سوتے تھے۔ آنکھیں ملتے ہوئے بیدار ہوئے۔ بازبہادر کے رات بھر غائب رہنے پر دونوں سخت حیران اور بے چین تھے۔ آخر کچھ کھا پی کر وہ اس کی تلاش میں نکلے۔ پہلے

تو وہ جنگل کی سمت دیکھ بھال کرنے لگے۔ گاہے گاہے وہ اونچے اونچے پیڑوں پر چڑھ کر چاروں طرف نظر دوڑاتے
جب یہاں کچھ سراغ نہ ملا۔ تو پھر وہ کھاڑی کی طرف آئے کشتی ویسے ہی پتھر سے بندھی تھی لیکن ریت پر کوئی تازہ
نشان موجود نہ تھا۔ پھر وہ پھلانگ پھلانگ کر ان چٹانوں پر جو ساحل کی جانب دور تک چلی گئی تھیں تلاش کرنے لگے
ابھی وہ کچھ دور ہی گئے تھے کہ اُنھوں نے ایک چٹان پر بازبہادر کو لیٹے پڑے ہوئے دیکھا۔ دونوں کے چہروں پہ
مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی اور وہ وہیں کھڑے ہو کر کچھ مشورہ کرنے لگے۔ نوبہار بولا۔

" ذرا دبے پاؤں چلو۔ میں چپکے سے باباجان کے کان میں زور سے چیخ ماروں گا "

الماس بولی

"ذرا یہیں رُک جاؤ۔ مجھے پھولوں کا ایک ہار بنا لینے دو۔ جب باباجان اُٹھیں گے تو میں ان کے گلے میں ڈال دوں گی۔"

دونوں نے بھاگ کر ادھر اُدھر سے پھول فراہم کئے اور لمبے لمبے سبز گھاس کی ایک شاخ لے کر عجلت سے رنگا رنگ کے پھولوں کا ایک ہار تیار کر لیا۔

پھر دونوں دبے پاؤں اس چٹان کی طرف جہاں بازبہادر پڑا سوتا تھا چلے وہ اس کے بالکل قریب پہنچ گئے لیکن اسے خبر تک نہ ہوئی۔ نوبہار نے جھک کر اس کے کان میں زور سے چیخ ماری۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا اب دونوں حیران ہو کر اس کے پاس بیٹھ گئے اور آہستہ آہستہ ہلا ہلا کر اور باباجان کہہ کہہ کر اسے خواب سے بیدار کرنے لگے۔

لیکن اسے یوں بے حس و حرکت اور خاموش پا کر وہ سہم سہم کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

" باباجان بولتے کیوں نہیں ؟" الماس نے بھرائی ہوئی آواز سے پوچھا۔ " یہ اس طرح تو کبھی غافل نہ سوتے تھے "

" الماس باباجان کو اس نیند سے جگانا ہمارے بس کی بات نہیں "

" وہ کیوں ؟" الماس نے حیران ہو کر پوچھا

" تمھیں یاد نہیں "۔ نوبہار نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا " باباجان کہا کرتے تھے کہ انسان ایک وقت ایسی میٹھی نیند سوتا ہے کہ پھر وہ کبھی بیدار نہیں ہوتا "

"ہاں ہاں ٹھیک ہے...... لیکن وہ کچھ اور بھی کہا کرتے تھے" الماس خوف سے کانپنے لگی۔

"الماس! تمھیں یاد بھی ہے وہ اس نیند کو کیا کہا کرتے تھے؟"

"نہیں نہیں۔ مجھے تو یاد نہیں۔ بھلا کیا کہتے تھے۔ نوبہار تم ہی بتلا دو نا"

"موت"

موت کا نام نوبہار کے منہ سے نکلنا تھا کہ دونوں ایک نامعلوم خوف سے کانپنے لگے اور بازبہادر کے پاس سے ہٹ کر کچھ فاصلہ پر جا کھڑے ہوئے۔

دونوں کچھ دیر تو یوں ہی کھڑے رہے پھر نوبہار بولا:۔

"لو آؤ بابا جان کو پتھروں سے ڈھانپ دیں۔"

"کیوں اُٹھا کر گھر کیوں نہ لے چلیں" الماس نے حیران ہو کر پوچھا

"نہیں گھر لے جا کر کیا کریں گے۔ اب ان کا گھر یہی ہے۔"

الماس اور نوبہار نے اِدھر اُدھر سے پتھر اٹھا کر بازبہادر کے چاروں طرف ایک دیوار چن دی اور پھر بہت سی گھاس اکٹھا کر کے اس کے اوپر ڈال دی اور پھر گھاس کے اوپر بھی پتھر رکھ دیئے۔ اس غیر مانوس کام سے فارغ ہو کر دونوں بے تحاشہ جھونپڑی کی طرف بھاگے۔ اور جب تک جھونپڑی میں نہ جا پہنچے ایک بار پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ اس جگہ کا جہاں بازبہادر مرا تھا انھوں نے موت کی چٹان نام رکھا اور دل میں عہد کر لیا کہ کبھی ادھر کا رُخ نہ کریں گے۔

---

اس خوفناک حادثہ کے باعث وہ اس قدر ہراساں اور پریشان تھے کہ آج کا تمام دن اور پھر رات تک دونوں نے کچھ نہ کھایا۔ جھونپڑی ان کو کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی اور ہر چیز سے وحشت آتی تھی۔ رات کے وقت وہ بہت دیر تک جھونپڑی سے باہر ہی پڑے رہے۔ آخر جب سردی لگی تو ناچار اندر چلے گئے۔

بازبہادر کی زندگی میں الماس نوبہار سے بہت کم بات چیت کیا کرتی تھی لیکن اس کی موت کے بعد وہ اس خاموشی اور تنہائی سے گھبرانے لگی۔ الماس اب ایک بچہ نہ تھی بلکہ ایک سرو قد نہایت خوب صورت حسینہ تھی۔ قدرت نے اس کی آنکھ کو نرگس شہلا سے مستی شبنم سے چمک۔ بدن کو سنبل سے لچک غنچہ سے چھین لا لا اٹھان۔ تندرق کو ...

سے درازی ۔ چاند سے نور اور پھول سے لطافت مستعار لے کر دی تھی ۔ اس نے بادِ صبا سے خرامِ ناز ۔ شورشِ امواج سے نغمہ اور گلیا تگ طیور سے ترنم سیکھ لیا تھا ۔ اب کچھ دنوں سے یہ حال تھا کہ جب ندی سے پانی بھرنے جاتی تو اپنا عکس پانی میں دیکھ دیکھ کر مسکراتی اور آپ اپنی اداؤں پر لوٹ پوٹ ہو جاتی ۔ اب جو کبھی نوبہار کی نگاہ اس کی طرف اٹھتی تو وہ خود بخود شرما جاتی ۔

الماس اکثر ادھر اُدھر سے پھول اکٹھے کر کے انھیں گھاس کی ہری ہری پتلی پتلی شاخوں میں پرو کر ہار بناتی اور انھیں خوب صورت ہاروں سے اپنے سر اور بدن کی عریانی کو ڈھانپتی جھونپڑی کے سامنے جو پہاڑیوں کا سلسلہ تھا شب کے وقت دونوں پاس پاس کی دو چٹانوں پر چڑھ جاتے ۔ الماس ہمیشہ اس چٹان پر بیٹھتی جس کے عقب میں سے نورانی چہرے والا چاند نمودار ہو کر سوراخ میں سے نظر آیا کرتا تھا ۔ یہاں بیٹھ کر دونوں مزے مزے سے بنسری بجاتے پہلے الماس کوئی نغمہ بجاتی اور پھر نوبہار اس کا جواب دیتا ۔ شب کی خاموشی اور جزیرے کی سنسان فضا میں بنسری کے نغمے پہاڑوں میں گونج گونج کر زندگی کی ایک لہر پیدا کر دیتے ۔ آسمان پر چاند اور ستارے الفتِ معصوم کے اس طرفہ نظارے کو جی بھر بھر کر دیکھتے

---

کچھ روز سے ایک جنگلی چڑیا کا جوڑا جھونپڑی کی چھت میں آ رہا تھا ۔ برسات کا موسم آتے ہی نر اور مادہ ادھر اُدھر سے تنکے چن چن کر لاتے اور اپنا گھونسلہ بناتے ۔ جب محنت سے تھک جاتے تو پھر چونچ میں چونچ ڈال کر ایک دوسرے سے اختلاط کرتے ۔ الماس اور نوبہار جھونپڑی میں بیٹھے بڑے غور سے ان کی طرف دیکھا کرتے ۔ کچھ بعد چڑیا نے دو انڈے دیئے ۔ اب نر اور مادہ باری باری ان کو سینے لگے جب مادہ گھونسلے میں بیٹھتی نر باہر سے اس کے لئے دانہ دنکا لاتا اور اسی طرح مادہ نر کے لئے لایا کرتی رات کے وقت تو مادہ اپنے ا[illegible] پر پھیلا کر بیٹھ جاتی اور نر پاس ہی کسی جگہ بیٹھ کر رات گزار دیتا ۔ ایک روز الماس اور نوبہار باہر سے آ کر بیٹھے کہ ان کو گھونسلے میں سے چوں چوں چہچہوں کی آواز سنائی دینے لگی ۔ نوبہار نے گھونسلے میں جو دیکھا تو دو [illegible] پڑے تھے ۔ اس نے ایک بچہ وہاں سے اٹھا کر الماس کو دکھایا اتنے میں دونوں نر اور مادہ بھی آ گئے ا[illegible] اپنے بچے کو نوبہار کے ہاتھ میں دیکھ کر بہت شور کرنے لگے ۔ الماس نے [illegible]

رکھ دیا۔ تب کہیں مامتا کو کل آیا۔

جب جزیرے کو رات کی تاریکی نے اپنی آغوش میں لے لیا تو الماس اور نوبہار چٹانوں پر بیٹھ کر بنسری بجانے لگے۔ لیکن آج الماس کچھ اداس اداس معلوم ہوتی تھی۔

رات بہت جا چکی تھی، نوبہار پر نیند کا غلبہ ہونے لگا تھا۔ وہ آج تک اتنی دیر کبھی پہاڑیوں پر نہ بیٹھے تھے۔ لیکن آج تو الماس اُٹھنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ آخر نصف شب کے بعد ماہ منیر چٹانوں کے عقب سے نمودار ہو کر اس سوراخ میں سے نظر آنے لگا۔ جہاں الماس ایک دیوی کی طرح اس کا نظارہ دیکھنے کے لئے دامن کوہسار میں پھرا کرتی تھی۔ چاند کو دیکھتے ہی وہ جھوم جھوم کر بڑے سوز و گداز سے بنسری بجانے لگی اور پھر دو زانوں ہو کر اور چاند کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر بولی

"چندر دیوتا! تو مجھے جنگل کی اس چڑیا کا سکھ اور محبت عطا کر۔

جس نے میری جھونپڑی میں اپنا گھر آباد کر رکھا ہے"

یہ کہہ کر اس نے سر جھکا لیا۔ نوبہار جو پاس ہی کھڑا تھا کچھ دیر تو تعجب سے الماس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا۔ اس وقت بادل کا ایک سیاہ ٹکڑا کہیں سے آ کر چاند کے سامنے حائل ہو گیا اور تمام منظر پر ایک ہولناک تاریکی چھا گئی۔ الماس خوف زدہ ہو کر نوبہار سے چمٹ گئی اور اپنا سر اس کے سینہ پر رکھ دیا۔ لیکن جب چاند پھر پردۂ سحاب سے نمودار ہوا تو اس وقت الماس جلدی سے نوبہار سے علیحدہ ہو کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن نوبہار کے چہرے پر تبسم تھا اور وہ شرمائی ہوئی تھی۔ نوبہار مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور ایک ہاتھ الماس کی کمر میں ڈال کر بنسری بجانے لگا۔ کچھ دیر تو الماس سر جھکائے اپنی بنسری ہاتھ میں لئے خاموش رہی۔ پھر وہ بھی بجانے لگی اور اس طرح دونوں بنسری بجاتے ہوئے پہاڑیوں سے اُتر کر جھونپڑی میں آ گئے۔ اس وقت تمام جزیرہ چاندی کے لباس میں ملبوس نظر آتا تھا۔

---

اس رات کے واقعہ کو پورا ایک سال گزر چکا تھا۔ الماس کی دعا قبول ہو چکی تھی، اور اب اس کی گود میں ننھی منی بچی کھیلتی تھی۔ چڑیا کے گھونسلے کی طرح ان کی جھونپڑی بھی آباد تھی۔ اب انھیں [illegible]

بنسری بجانا ترک کر دیا تھا۔ وہ ننھی منی بچی کو جھولے میں ڈال کر ان کے پاس بیٹھ کر بنسری بجایا کرتے تھے لیکن جس روز سے بچی پیدا ہوئی تھی ان کے اطمینان اور سکون میں گونہ بے کلی سی پیدا ہونے لگی تھی۔ اب وہ یک لخت اس زندگی سے اُکتا گئے تھے۔ پہلے انھیں جزیرے کی ہر چیز سے محبت تھی لیکن اب ہر ایک چیز سے وحشت آتی تھی۔

ایک روز وہ رات کو سوئے ہوئے تھے کہ اچانک ان کی آنکھ کھل گئی۔ تمام جزیرہ لرزاں تھا۔ چٹانوں پر سے پتھر لڑھک لڑھک کر نیچے گر رہے تھے۔ ایک خوف ناک زلزلہ کے جھٹکے قیامت برپا کر رہے تھے۔ نمود سحر کے ساتھ ہی بڑی شدت سے آندھی چلنے لگی۔ بڑے بڑے دیو قامت درخت جڑوں سے اُکھڑے جاتے تھے اور پھر سمندر کی بے پناہ موجیں جزیرے پر تاخت و تاراج کرنے لگیں۔ پانی کی رَو آتی دیکھ کر الماس اور نوبہار بچی کو اُٹھا کر جھونپڑی سے نکل بھاگے لیکن پناہ کا کوئی آسرا نظر نہ آتا تھا۔ دونوں متوالوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگے پھرتے تھے۔ اسی طرح بھاگتے بھاگتے وہ ان چٹانوں کے پاس جا نکلے جہاں اُن کی کشتی بندھی تھی۔ اس جگہ ہوا کا زور کم تھا۔ لیکن پانی بہت چڑھ آیا تھا۔ جوں توں کر کے دونوں کشتی میں جا بیٹھے۔ الماس تو روتی ہوئی بچی کو سینہ سے لگا کر ایک طرف بیٹھ گئی اور نوبہار چپو پکڑ کر کشتی کو چٹانوں سے ٹکرانے سے بچانے لگا۔ لیکن پانی کی تیز رو کشتی کو دھکیل کر چٹانوں سے باہر نکال کر لے گئی۔ سامنے طلاطم خیز سمندر تھا۔ اب نوبہار بے دست و پا تھا۔ پانی کی تیز رو کا مقابلہ کرنا اس کی ہمت سے باہر تھا۔ کشتی تنکے کی طرح پانی کی رو کے ساتھ سمندر کی طرف بہی جاتی تھی لیکن وہ ہمت نہیں ہارا تھا۔ برابر چپو چلا رہا تھا۔ اور کشتی کو موجوں کے تھپیڑوں سے بچا رہا تھا۔ گاہے گاہے الماس بھی اس کا ہاتھ بٹاتی۔ لیکن آج قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دونوں تھک کر چور ہو گئے۔ سر پر کالی رات بڑھی چلی آ رہی تھی۔ دونوں دن بھر کے بھوکے پیاسے تھے۔ اور اب ہمت بھی جواب دے چلی۔

---

جہاز کی تباہی کو گو ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا لیکن بختیار جو اس طوفان خیز شب کو ایک تختہ پر بیٹھ کر جان بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ الماس کی تلاش سے غافل نہ تھا۔ اس تمام عرصہ میں کئی جہاز اس جزیرے کے پاس سے گزرے لیکن کبھی ایسا اتفاق نہ ہوا کہ اہل جہاز جزیرے پر اُتر کر قیام کریں اور نہ باز بہادر اور نوبہار چٹانوں کا طویل اور دشوار گزار سلسلہ طے کر کے ہر روز ساحل سمندر کی طرف جاتے جب کبھی بختیار [illegible]

تینوں گم شدوں کا حال دریافت کرتا۔ ایک دفعہ وہ ایک سرائے میں بیمار پڑا ہوا تھا۔ اور بھی بہت سے مسافر اس جگہ مقیم تھے باتوں باتوں میں ایک ملاح نے اس سے کہا کہ ایک بار ان کا جہاز بحر اوقیانوس میں ایک غیر آباد جزیرے کے پاس لنگر انداز تھا۔ رات کا وقت تھا، اور ہوا کا رُخ سمندر کی جانب تھا۔ اس وقت انھیں کئی بار پہاڑوں پر سے بنسری کی آواز سنائی دی تھی۔ ملاح نے جس جزیرے کا پتہ نشان دیا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جس کے قرب وجوار میں وہ جہاز غرق ہوا تھا جس پر بختیار اور اس کے ساتھی سوار تھے۔ بختیار کو خوب یاد تھا کہ" باز بہادر" کو بنسری بجانے کا بہت شوق تھا۔

بختیار اب اس جستجو میں تھا کہ کوئی جہاز اُدھر جانے والا اسے مل جائے تو وہ بھی سوار ہو کر اس غیر آباد جزیرے میں جاکر بچوں کو تلاش کرے۔ آخر کچھ روز بعد اسے ایسا موقعہ مل گیا۔ سوداگروں کا ایک قافلہ جہاز میں سوار ہو کر چلا۔ چوں کہ ان کا راستہ اسی غیر آباد جزیرے کے قرب وجوار میں تھا اس لئے وہ بھی سوار ہو گیا مسافروں نے جب اس کی سرگزشت سنی تو سب کو اس سے ایک خاص ہمدردی پیدا ہو گئی۔ بختیار سارا سارا دن جہاز کے تختہ پر بیٹھا بچّوں کی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتا تھا موسم خوشگوار تھا اور سمندر پر سکون۔ سفر آرام سے کٹ رہا تھا۔
ناگہاں ایک روز رات کے وقت سمندر کے پانی میں ایک غیر معمولی جوش پیدا ہونے لگا۔ مسافر کچھ مضطرب و بیقرار سے ہونے لگے لیکن ناخدا نے جو ایک تجربہ کار ملاح تھا ان کو اطمینان دلایا اور کہا کہ خشکی پر کہیں خوفناک زلزلہ آیا ہو صبح کے وقت تیز ہوا چلنے لگی۔ جس سے سمندر میں طلاطم آگیا مسافر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ سارا دن یہی حالت رہی۔ اگلے روز ابھی جھٹ پٹا ہی تھا کہ ایک ملّاح نے جو جہاز کے سب سے اونچے مقام پر کھڑا ہو کر پہرہ دیتا تھا ناخدا کو اطلاع دی کہ پہاڑوں کے دھندلے دھندلے نشان نظر آتے ہیں پو پھٹتے ہی کوہسار کا دلکش نظارہ دور فاصلہ پر نظر آنے لگا۔ اُس وقت بختیار ملاح کے پاس جاکھڑا ہوا تھا اور بڑے شتیاق سے پہاڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ناخدا خود دوربین لگائے دیکھ رہا تھا اچانک بولا

"وہ دیکھو ایک کشتی بہی جاتی ہے .... شاید ماہی گیر ہوں گے"

لیکن مسافروں کو ابھی تک کوئی کشتی نظر نہیں آئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد پھر ناخدا بولا

"تعجب ہے کہ کشتی چلانے والا کوئی نظر نہیں آتا"

اب لوگوں کو بھی دور فاصلہ پر ایک کشتی نظر آنے لگی جو لہروں کے ساتھ ساتھ ڈگمگاتی ہوئی بہی جا رہی تھی۔

ناخدا کے حکم سے چند ملاح ایک کشتی میں بیٹھ کر اس کشتی کی طرف چلے۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد کشتی کو جہاز کی طرف لاتے نظر آئے جب وہ پاس پہنچے تو ناخدا نے پوچھا

"کشتی میں کیا ہے؟"

"مسافر"

"زندہ ہیں؟"

"ہاں ابھی تک تو زندہ ہیں لیکن بے ہوش پڑے ہیں"

"کتنے آدمی ہیں؟"

"ایک عورت۔ ایک مرد اور ایک بچہ"

اس اثنا میں کشتی جہاز کے ساتھ آ لگی۔ مسافر اچک اچک کر دیکھنے لگے۔ ایک نہایت حسین نوجوان عورت جس کے سینہ سے لگی ہوئی ایک خوب صورت ننھی سی بچی تھی ایک طرف بے ہوش پڑی تھی اور ایک نوجوان آدمی چپو ہاتھ میں پکڑے دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک طرف کو جھکا ہوا پڑا تھا۔

بختیار جو بڑے غور سے کشتی کے ساکنوں کو دیکھ رہا تھا۔ ایک چیخ مار کر جہاز کے تختہ پر سے سمندر میں کود ا سمندر میں گرتے ہی ملاحوں نے اسے پکڑ کر اسی کشتی میں سوار کر لیا۔ وہ اس نوجوان عورت کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور پھر دو زانوں ہو کر ننھی بچی کو اٹھا کر سینہ سے لگا لیا اور جھک کر بڑی محبت سے عورت کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ یہ اس کی گم شدہ الماس تھی۔

# امتحان

## (ایک کہانی)

BOYS OWN PAPER (ماخوذ از)

BY

**KHWAJA AHMAD ABBAS**

**CLASS X A**

---

## امتحان

اینڈی کارلٹن' دریائے موریا کے کنارے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے پریشانی اور مصیبت کا اظہار ہوتا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک خط تھا جو ابھی اس کے پرانے آقا کے پاس سے آیا تھا۔ اس نے اس خط کو لفافے میں سے نکال کر دسویں بار پڑھا۔

پیارے کارلٹن'

تم کو اطلاع دی جاتی ہو کہ ہمارے کارخانہ میں تمھاری ضرورت نہیں ہو۔

راقم

لسٹن لمبر۔ منیجر'

"تین سال کی نوکری کے بعد" اینڈی نے کہا۔

اس کو نکالے جانے کی کوئی وجہ نہ بتائی گئی تھی۔ اس کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کی جگہہ پر کوئی اور آدمی آگیا ہے اور اینڈی وہ لڑکا جس کو ترقی کی بڑی بڑی امیدیں تھیں آج بیکار لوگوں میں سے تھا تین سال کی فرماں بردارانہ نوکری کے بعد نکالے جانے سے اینڈی کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ اُس نے اپنی جیب ٹٹولی لیکن اتنا بھی نہ پایا کہ کرایہ کے لئے بھی کافی ہو اس لئے اپنے گھر کی طرف پیدل روانہ ہوا تھا۔

خط کو جیب میں ڈالتے وقت اس کے ہاتھ میں ایک اور کاغذ آیا۔ کاغذ کو نکال کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ ایک خط کی نقل تھی جو کہ مسٹر لمسڈن نے ایک دوسری کمپنی کو لٹھوں کی قیمت کی بابت لکھا تھا "اُفوہ! میں اس خط کو فائل کرنا بھول گیا" اینڈی نے افسوس کرتے ہوئے کہا "میں نے اس کو حوالہ دینے کے واسطے نکالا تھا۔ لیکن اس کو واپس رکھنا بھول گیا"۔

جب کہ وہ سوچ رہا تھا کہ اس خط کو کیا کرے اس نے ایک بوڑھے آدمی کو جنگل کی طرف سے آتے ہوئے دیکھا۔ بڈھا بہت تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا اس لئے اینڈی نے اس سے پوچھا "کیا میں آپ کی کوئی مدد کرسکتا ہوں"۔ بڈھے نے اینڈی کے تھیلے کی طرف لالچی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "کیا تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟" اینڈی نے جواب دیا "جی ہاں۔ میں آپ کو کچھ کھانے کو دے سکتا ہوں"

یہ کہہ کر اُس نے آگ جلائی اور تھوڑی ہی دیر میں کھانا تیار کر کیا جس کو اُس بھوکے آدمی نے پیٹ بھر کر کھایا۔

"اس کی حرکات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہفتوں سے کھانا نہیں کھایا" اینڈی نے آگ بجھاتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا "بچارے کے پاس اتنے دام بھی نہیں ہیں کہ ان وحشیانہ سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو بھی کٹوا سکے" کھانے سے فراغت پاکر وہ بڈھا آدمی ایک درخت کے سائے میں بیٹھا ہوا اینڈی کو برتن جمع کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"تمام دن چلے ہو"؟ بڈھے نے پوچھا "جی ہاں مجھے کل گلمور پہنچنا ہے" اینڈی نے جواب دیا "کوئی ضروری کام ہوگا" بڈھے نے کہا جی ہاں نوکری کی تلاش میں" اینڈی نے جواب دیا "نوکریاں اور خاص کر اچھی نوکریاں آج کل نایاب ہیں" بوڑھا بولا۔

اینڈی جلدی سے بولا! میں ایک معقول تنخواہ پر لسٹن لمبر کمپنی کے یہاں کلرک تھا لیکن آج صبح ہی مجھ کو علٰحدگی کا نوٹس مل گیا ہے" بوڑھے نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا "یہ تو بہت بُری بات ہے"

بوڑھا تھوڑی دیر تک لڑکے کو گھورتا رہا اور پھر بولا "اچھا تم بتا سکتے ہو کہ لسٹن صاحب نے کیمبل کمپنی کو لٹھوں کی کیا قیمت لکھی تھی" اینڈی نے یہ سوچ کر کہ کاروبار کے معاملات کسی کو نہ بتانے چاہئیں یہ جواب دیا "لیکن یہ سوال آپ مسٹر لسٹن ہی سے کیوں نہیں کرتے" "اچھا تو تم مجھ کو نہ بتاؤ گے" بوڑھے نے گھورتے ہوئے پوچھا "نہیں" اینڈی نے زور دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن کیوں نہیں اس سے تم کو کوئی نقصان نہ پہونچے گا" بوڑھے نے دوبارہ سوال کیا "شاید مجھ کو نہ پہونچے لیکن مسٹر لسٹن کو تو پہنچ سکتا ہے" اینڈی نے جواب دیا۔

"خوب ماشاءاللہ آپ اب تک لسٹن کے وفادار ہیں جس نے تمھیں بلاقصور نکال دیا۔ تم اس سے اسی کے ہتھیاروں سے بدلہ کیوں نہیں لیتے"

آخری جملہ سے اینڈی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا۔ میں کیوں نہ مسٹر لسٹن سے اس کا بدلہ لوں کہ اس نے مجھے بے قصور نکال دیا۔ لیکن پھر اُس نے سوچا کہ اگر ایسا کیا تو اس کا ضمیر ہمیشہ اس کو ملامت کرتا رہے گا۔ یہ فیصلہ کر کے اس نے جواب دیا "نہیں میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا" جب بڈھے نے دیکھا کہ اینڈی داؤ پر چڑھنے والا نہیں ہے تو وہ خداحافظ کہہ کر چلا گیا۔

اتنے میں اینڈی آسمان کو جو دیکھتا ہے تو گھٹا تلی کھڑی تھی۔ وہ ابھی شہر سے صرف تین میل آیا تھا اور اگلا مقام وہاں سے سات میل تھا اس لئے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ شہر واپس جائے اور اگلے دن کسی سے روپیہ قرض لے کر ریل میں گھر جائے۔

جب وہ واپس اپنے کمرہ پہنچا تو میز پر اپنے نام کا خط پایا جس کا مضمون یہ تھا۔

لسٹن لمبر کمپنی - مورخہ ......

پیارے اینڈی،

میں تم کو اپنے دفتر میں ترقی دینا چاہتا تھا لیکن مجھے شبہ تھا کہ تم کاروبار کے معاملات

لوگوں کو بتا دیتے ہو۔اس لئے میں نے تم کو برخاست کر کے اور بوڑھے کا بھیس بدل کر تمھارا امتحان لیا جس میں تم پورے اترے ۔میں تم کو اپنی کمپنی کا ہیڈ کلارک مقرر کرتا ہوں۔امید ہے کہ تم پیر کے روز صبح اپنے کام پر حاضر ہو گے ۔ فقط

لمسڈن

( ماخوذ )

وہ کیوں نہ حاضر ہوتا۔



# رواںؔ کی رباعیات

(جناب عبدالشکور صاحب ایم۔ اے)

سہیل میں عرصہ ہوا میں نے ہندو شعرا کے ادبی کارناموں پر چند مضامین لکھے تھے، اس سلسلہ میں جناب رواںؔ صاحب کی رباعیات، نظمیں اور غزلیں دیکھنے کا اتفاق ہوا، اس کے بعد اُن کا دیوان روحِ رواںؔ کے نام سے شائع ہوگیا، اور کل مجموعہ ایک نہایت دلکش نسخہ میں ہاتھ آگیا۔ یہ دیوان اسقدر عمدہ ترتیب اور تہذیب کے ساتھ شائع کیا گیا ہے کہ بیساختہ اُسے پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ گذشتہ آل انڈیا مشاعرہ علی گڑھ منعقدہ ماہ دسمبر ۱۹۲۸ء کے موقعہ پر جناب رواں کی زیارت بھی نصیب ہوئی، حالانکہ میری شومیٔ قسمت تھی کہ میں اُن کی صحبت میں شریک نہ ہوسکا، پھر بھی پڑھنا سُنا، بڑے درد اور سوز و گداز کے ساتھ اپنا کلام پڑھتے ہیں، جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ پہلو میں دل دردمند ایک درد آفریں ساز کا کام دے رہا ہے، چہرہ مہرہ سے بے انتہا شرافت اور صداقت ہویدا تھی جو ایک بلند پایہ شاعر کے لیے اہم ترین جوہر ہیں۔ روحِ رواں چھوٹی تقطیع کے ۲۱۲ صفحات پر مشتمل ہے، ابتدا میں ۹۷ صفحات تک نظمیں ہیں، اس کے بعد غزلوں کا سلسلہ صفحہ ۲۲۳ تک چلا گیا ہے، باقی صفحات میں رباعیات ہیں، شروع کتاب میں لسان الہند مولانا عزیز لکھنوی کا مقدمہ ہے جو جناب رواںؔ کے اُستاد ہیں۔ کتاب نامی پریس لکھنو میں بڑی خوبی اور صفائی کے ساتھ طبع ہوئی ہے۔

مجھے ان صفحات میں جناب رواںؔ کی رباعیات کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے جنھیں میں اُن کا بلند ترین کارنامہ خیال کرتا ہوں، اس سے ناظرین یہ نہ سمجھیں کہ اُن کی نظمیں بے مزہ اور غزلیں پھیکی ہیں، بلکہ میں اب تک محض رباعیات ہی کو غور سے پڑھ چکا ہوں اور اس لیئے جو کچھ عرض کروں گا رباعیات ہی سے متعلق ہوگا۔

ایک انگریزی کہاوت ہے کہ کسی ملک کی تمدنی حالت کا اندازہ کرنے کے لیے اُس کے جرائد اور اخبارات کا جائزہ لینا کافی ہے، اسی طرح میرا خیال ہے کہ شاعر کے اندرونی جذبات اور خیالات جس قدر اُس کے کلام سے ظاہر ہوتے ہیں اور کسی شے سے معلوم نہیں ہوتے، میں نے اسی نقطۂ نظر سے ان رباعیات کا مطالعہ شروع کیا تھا، اور اس سلسلہ میں میں جن نتائج پر پہونچا ہوں وہ ناظرین کی خدمت میں پیش کئے دیتا ہوں

رباعیات کا لکھنا جس قدر آسان ہے اسی قدر اس کا کامیاب بنانا دشوار ہے، فارسی لٹریچر میں ہزار رباعیاں اور غزلیں موجود ہیں، اس کے علاوہ اور اصناف شاعری کے خزانے مالامال ہیں لیکن صدیوں کی علمی جدوجہد کے بعد فارسی شعرا رباعیات کے سلسلہ میں محض چند ہی سربرآوردہ نام پیش کر سکتے ہیں، مثلاً عمر خیام اور ابو سعید ابوالخیر وغیرہ اس فقدان عظیم سے صاف ظاہر ہے کہ رباعی کا سرسبز ہونا بہت دشوار ہے، رباعی کی مخصوص بحریں ہوتی ہیں لیکن ان بحور میں رعنائی خیال اور شوکت ترکیب پیدا کرنا زور بازو کی سعادت پر موقوف نہیں ہے، بلکہ عطیۂ الٰہی پر۔ پوری رباعی میں ایک خاص فلسفیانہ خیال یا کوئی نہ کوئی علمی نکتہ پیش کیا جاتا ہے، لیکن ہر رباعی کا بجائے خود مکمل ہونا ضروری ہے، رباعی کا چوتھا مصرع خاص طور سے رفیع الشان اور پرشکوہ ہونا لازمی ہے، اُردو لٹریچر پر ایک سرسری نظر ڈالئے، میر تقی میر، مومن، تغزل میں یکتائے روزگار رہیں، قصائد میں سودا اور ذوق کا کوئی ہم پلہ نہیں، مرثیہ گوئی انیس اور دبیر کی ملکیت خاص ہے، مثنوی حسن، نسیم، اور مومن کی مخصوص جولانگاہ قرار پائی، کیا آپ بلاغور و خوض کسی اُردو شاعر کا نام لے سکتے ہیں جو رباعیات میں ممتاز درجہ رکھتا ہو، ویسے کہنے کو سب نے کہی لیکن اس صنف شاعری میں کوئی شاعر ممتاز کامیابی حاصل نہ کر سکا، رباعی میں میرا خیال ہے کہ ایک خاص سادگی ٹھیراؤ، ایک خاص قسم کی سکینیت اور بے تکلفی ہوتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ رباعی میں فلسفیانہ رنگ کسی نہ کسی نوعیت سے موجود ہونا ضروری ہے اس سکینیت اور معصومیت کے ساتھ بندش میں رعنائی اور تخیل میں فلسفہ کا لمس پیدا کرنا دراصل وہ راز ہے جس پر رباعی کے کامیابی کا دارومدار ہے۔ مثال کے طور پر لیجئے۔

راز قدرت کسی کو معلوم نہیں — اُس کی نیت کسی کو معلوم نہیں

سب محو ہیں آج کی مشاغل میں رواں — کل کی حالت کسی کو معلوم نہیں

اس رباعی کو آہستہ آہستہ ٹھیر ٹھیر کر دو تین مرتبہ پڑھئے، آپ فوراً محسوس کریں گے کہ یہ رباعی ایک ایسی فضا سے گھری ہوئی ہے جس میں سکینیت اور معصومیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے، فلسفہ کا رنگ و روغن موجود ہے، ایک خاص نکتہ، ایک خاص خیال ہے جو شاعر نے نہایت سادگی کے ساتھ ہمارے سامنے پیش

ہے، چوتھا مصرع خاص طور سے صاف اور بے تکلف ہے، اور یہی رباعی کی جان ہوتا ہے، دنیا کے مشاغل اس قدر دلچسپ اور دل لبھانے والے ہوتے ہیں کہ ہم باوجود اس کے کہ ہمیں نہ ابتدا کی خبر ہوتی ہے اور نہ انتہا معلوم لیکن ان دلچسپیوں میں ہمہ تن محو ہو جاتے ہیں، حافظ نے اسی خیال کو ایک نہایت دلکش اور ترنم ریز شعر میں یوں ادا کیا ہے،

کس نہ دانست کہ منزل گہ مقصود کجاست　　　　ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

اب ذرا اس رباعی کو پھر غور سے پڑھیئے، رواں اگر محض اسقدر کہتے:۔

راز قدرت کسی کو معلوم نہیں　　　　کل کی حالت کسی کو معلوم نہیں

تو گمان غالب ہے کہ مطلب اگر پورا نہیں تو اُس کا بیشتر حصہ ادا ہو جاتا، اس سے ظاہر ہوا کہ رباعی میں پھیلاؤ کی ضرورت ہوتی ہے یعنی بعض اوقات اُس میں مثالیں دیکر مضمون کو واضح کر کے چار مصرع پورے کئے جاتے ہیں، اگر یہ بھرتی کے مصرع ڈھیلے اور پھُس پھسے رہ گئے تو رباعی شان سے گر جاتی ہے،۔

رباعی کی اس خصوصیت اور ظاہری ہیئت کو ذہن میں رکھئے اور غور کیجئے کہ رباعی کہنے والے شاعر کے دل و دماغ کی کیا خصوصیت ہونی چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ انشا۔ میر، سودا، کبھی کامیاب رباعیاں نہ کہہ سکتے تھے ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ شاعر کی طبیعت میں ٹھیراؤ، قناعت، صبر و سکون، نکتہ سنجی ہو، مربع میں اگر ذرا بھی اشتعال انگیزی موجود ہے لازم ہوگا کہ رباعی کی شان ختم ہو جائے گی، طبیعت میں غور و فکر کا مادہ ہونا بھی ضروری ہے، ایسے شاعر کو چاہیئے کہ وہ یا تو خوب مطالعہ کرے، یا دنیاوی تجربہ حاصل کرے اور ہر تجربہ پر تنقیدی نظر ڈالتا جائے، بہ الفاظ دیگر اُس کے پاس وہ مواد ہونا چاہیئے جس پر غور و فکر کیا جائے اور جس پر غائر نظر ڈالی جائے،۔

مضمون کے گذشتہ حصہ میں سلسلۂ مقصد قائم نہ رہ سکا، میرا مدعا یہ تھا کہ میں اُن خیالات عالیہ کو جمع کر دوں جو رواں نے اپنی بے مثل رباعیات میں قلمبند کئے ہیں، اس کی بجائے میں رباعی کی خصوصیات بیان کرنے لگا، مگر اُس سلسلہ میں جو خیالات میں نے بیان کئے ہیں، وہ میرے ذاتی ہیں، مگر چونکہ وہ ایک لحاظ سے نفس مضمون سے متعلق تھے اس لئے لکھ دیئے گئے۔

سب سے پہلے میں رواں کی جوشش جوانی کی تصویر ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں، جس میں "بادۂ شبانہ کی سرمستیاں" اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں،۔

فطرت کی ہماہمی نہ بھولے گی ہمیں نکھری ہوئی چاندنی نہ بھولیگی ہمیں
جب ہم تھے، جگر تھے اور بزمِ بادہ وہ رات رواں کبھی نہ بھولیگی ہمیں

عمر گذشتہ کی یاد، عیش رفتہ کی ٹیس دل میں ایک ہوک پیدا کر رہی ہے اور شاعر آلام و مصائب سے تنگ آکر ایک آہ جگر دوز کھینچتا ہے اور عشرت کی اُن گھڑیوں کو یاد کرتا ہے جب "عیش با فراغت" کے مزے اُٹھائے جاتے تھے، اور دین و دنیا کا ہوش نہ تھا، یہ ایک عام جذبہ ہے، شاید ہی کوئی ایسا بدنصیب ہوگا جو ماضی پرست نہ ہو، گذرا ہوا زمانہ، مرا ہوا انسان، الغرض ہر وہ شے جو آنکھ سے اوجھل ہو جاتی ہے مرغوب تر ہو جاتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کے عیوب ختم ہو جاتے ہیں اور محض اُس کی بھلائیاں پیش نظر ہوتی ہیں۔

رباعی بہت خوب ہے، مگر مجھے پہلے مصرع میں کچھ سقم نظر آتا ہے، "فطرت کی ہماہمی" "نکھری ہوئی چاندنی" سے مربوط ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی، چاندنی کا لطف سکون اور خاموشی میں ہوتا ہے، جہاں ہماہمی ہوگی وہاں چاندنی کا احساس تک ناقص ہو جائے گا، تیسرا مصرع بہت پرکیف ہے، "بزم بادہ" ایک ایسی جامع ترکیب ہے جس میں ساقی ماہوش کے ساتھ ساتھ مے ارغوانی، جام بلورین اور قلقل مینا سب کچھ شامل ہو گئے، یہی شاید وہ تنہا رباعی ہے جس میں رواں کی شبابیات کا ایک صاف پرتو نظر آ رہا ہے، ورنہ بیشتر حصہ رباعیات کا ایسا ہی جو حقائق اور فلسفیانہ نکات سے مملو ہے۔

اس "شبابیات" کے سلسلہ میں وہ رباعی بھی درج کی جاتی ہے جس میں رواں "جوانی" اور "لڑکپن" کا تقابل کرتے ہیں اور فطرتاً آخر الذکر کو ترجیح کے قابل بتاتے ہیں:۔

مانا کاوش تھی، کاوش غم تو نہ تھی گریہ تھا، مگر نوائے ماتم تو نہ تھی
بچپن میں جو بات تھی جوانی میں کہاں خندہ بھی تھا، یہ فغان پیہم تو نہ تھی

بالعموم مانا جاتا ہے کہ جہاں کہیں جوانی آئی گویا سر پر ایک بلا لائی، جوش و خروش، آزاد منشی، بے لوث استحکام، اور سرفروشی کے حوصلہ کے ساتھ ساتھ ناتجربہ کاری، تیزی، طراری، خودسری، خودرائی کا آنا بھی بدیہی

ہے، جس قدر نوجوان مفید ہو سکتا ہے اُسی قدر اُس کا مضرت رساں بھی ہونا ممکن ہے خدا نہ کرے کہ کوئی نوجوان بدراہ ہو، ورنہ پھر اُس کی جوانی یقیناً ایک بلائے آسمانی ثابت ہوگی، اسی عالم شباب میں عشق کی ابتدا ہوتی ہے، اور پھر عشق کے ساتھ ساتھ کاوشِ جگری، سوزشِ دلی، ناکامی، نامرادی، اور رسوائی کا دور دورہ شروع ہوتا ہے، مگر نوجوان جوشِ محبت میں بھی پکارتا رہتا ہے،

ہوئیں رسوائیاں ناکامیاں، بدنامیاں کیا کیا — نہ چھوٹی ہم سے لیکن کوئے جاناں کی ہواداری

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سوزشِ دلی میں ایسی شدت پیدا ہو جاتی ہے کہ نوجوان مجبور و معذور ہو کر رونے لگتا ہے، اور اپنی عمر کے اُس حصہ کو یاد کرتا ہے کہ جب وہ ان آفات سے بیگانہ تھا، اور ایک سادہ اور بے تکلف آب و ہوا میں سانس لیتا تھا، نہ غمِ روزگار تھا، نہ عشقِ بتاں اور نہ یادِ رفتگاں، اس جذبۂ نامرادی کی یہ تصویر ہے جو رواںؔ نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ اس رباعی میں پیش کی ہے۔

ان "شبابیات" اور "طفلیات" (جن کے متعلق رواں کہتے ہیں "بچپن کیا چیز تھا، جوانی کیا تھی، یہ گل کی مہک تھی وہ ہوا کا جھونکا") کو چھوڑ کر آگے قدم اُٹھائیے، اور اُس مقام پر آئیے جہاں رواںؔ نے ایک بلند مرتبہ شاعر ہونے کا ثبوت دیا ہے، میرے خیال میں ایک عالی رتبہ شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ فطرت کے سربستہ راز افشا کرے اور انسانی خصائل کا ایک کامل مبصر ہو، اگر ایسا نہیں ہے تو ہم اُسے محض "ناظم" کہیں گے وہ شاعر کے لقب کا سزاوار نہیں، ہمیں دیکھنا ہے کہ رواںؔ اس جانچ میں کس حد تک پورے اُترتے ہیں۔

مخفی کوئی، کوئی برملا دشمن ہے — ظالم دنیا کی ہر ادا دشمن ہے
بچتا تا ہوں ہٹکے راہ کیکی ہے رواںؔ — جلادِ ضمیر جان کا دشمن ہے

آزاد ضمیر ہو فقیری یہ ہے — دل بے پروا رہے امیری یہ ہے
زنجیر نہیں ہے باعثِ قید رواںؔ — محدود رہے خیال اسیری یہ ہے

ان دونوں رباعیوں کو غور سے دیکھئے، آپ کو رواںؔ کے خصائل کا بھی پتہ لگ جائے گا، اور اُن حقائق سے بھی آگاہی ہو جائے گی جو ایک ذی ہوش شاعر نے دنیا کی رہنمائی کے لیے قلمبند کئے ہیں، عالی جناب مولوی سید امداد امام صاحب اثرؔ نے بہت عرصہ ہوا ہندوستان کے شعرا پر ایک نہایت دلچسپ مقالہ سپرد قلم کیا تھا، اُس

میں سید صاحب موصوف نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ایک کامیاب شاعر کے لیے نیک - پرہیزگار - سادہ؛ برشتہ دل، سوختہ سامان، ناکام، اور بلند نگاہ ہونا ضروری ہے، اگر وہ ایسا نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ اُس کلام میں نہ سوز و گداز ہو، اور نہ ایسی تعلیم جو ناظرین کی جادۂ مستقیم کی جانب رہبری کر سکے، اس نظریہ کو نظر رکھکر ان رباعیات کو پڑہیے، اور دیکھئے کہ اگر دنیا رواں کی بلند نظری، اور حقیقت پژوہی پر ایمان لے آئے تو کیا گناہ ہے؟ ہر انسان خیالات کی حد بندی کی وجہ سے اسیر فطرت ہے، اور یہی وہ حد بندی ہے جس نے انسان کو خدا بننے نہ دیا، اس اسیری میں اگر آزادی حاصل کرنا مقصود ہے تو ضمیر کو بے لوث رکھئے اور مدعاؤں کے انبوہ کو دل سے نکال دیجئے، خدا کے سامنے ہزارہا بندگان الٰہی روزانہ سر بسجدہ ہوتے ہیں شاید دو چار ہی ایسے ہوتے ہونگے جو "دل بے مدعا کی آرزو کرتے ہوں، جس کو یہ حاصل ہوگیا، اُس کو کسی شے کی حاجت نہیں - حتیٰ کہ خواہش جنت بھی بے حقیقت ہو جاتی ہے، جن کی اطاعت گذاری، اور شب بیداری مدعا سے دست و گریباں رہتی ہے وہ نہایت کمتر درجہ کے عابد ہوتے ہیں، اسی نہج سے غالب کہتا ہے -

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ ‏ ‏ ‏ ‏ دوزخ میں ڈالدے کوئی لیکر بہشت کو

ہر شخص جانتا ہے کہ انسان ضعیف البنیان ہے، اُس کا علم اُس قدر محدود ہے کہ اُسے خود اپنی حقیقت کی خبر نہیں،

مصروف تمام عمر کاوش میں رہا ‏ ‏ ‏ ‏ مجھ پر بھی نہ کچھ کھلی حقیقت میری

اگر اُس کو علم ہے تو محض اپنی بے بضاعتی اور بے مائگی کا،

"انساں کمزور ہے، حقیقت یہ ہے"

ہزارہا فلسفی ابتدائے آفرینش سے آج تک ان نکات پر دفتر کے دفتر سیاہ کر چکے ہیں، جن کی اگر تلخیص کی جائے تو صرف اُسی قدر معلوم ہوگا جو رواں نے اس مصرع اور گذشتہ شعر میں نہایت سادگی، صفائی اور زور کے ساتھ بیان کیا ہے - اس سلسلہ میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ رواں کے یہ خیالات مانگے کے نہیں معلوم ہوتے، میں محسوس کرتا ہوں کہ ان نتائج پر رواں تجربہ کے بعد پہونچے ہیں، اور جو کچھ کہتے جاتے ہیں اُسے فیل بھی کرتے جاتے ہیں، اور اسی تلخ کامی کے عالم میں وہ بار بار اسے دہراتے جاتے ہیں -

ہے چشم حواس کور، آفت یہ ہے　　　ہم راہ رووں کو رنج غربت یہ ہے
آتے ہیں کہاں سے اور جانا ہے کہاں　　　اس کی بھی خبر نہیں، مصیبت یہ ہے

اس کا ملحض وہی ہے جو ہم سب جانتے ہیں، لیکن ہم میں سے بہت کم ایسے ہونگے جنہوں نے اس مسئلہ پر غور کیا ہوگا اور جو اس غیر خوشگوار حقیقت کو دل میں محسوس کرتے ہونگے، میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ رواںؔ ایک نہایت بالغ شاعر کی حیثیت رکھتا ہے، جس نے ہر مسئلہ پر کافی غور وخوض کیا ہے، اور کسی نتیجہ کو خواہ کیسا ہی ناگزیر کیوں نہ ہو بغیر سوچے سمجھے نہیں باور کیا،

دنیا کو دنیائے دوں، اور دنیا کے جھگڑوں کو غم واندوہ کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے، اسی لئے شاید "نگاہ عبرت"، کے اس فیصلہ پر رواں پہونچے ہیں کہ

عشرۃ کدۂ جہان میں غم ہے غم ہے
اور
عنوان خوشی بھی سرخئ ماتم ہے

اسی لیے اُس فریب نظر پر رواں نے تبصرہ کیا ہے جس سے ہمیں اس دنیا میں قدم قدم پر دوچار ہونا پڑتا ہے، نگاہیں اٹھتی ہیں اور سراب دہر سے جا جا کر ٹکراتی ہیں،

اُف باغ اُمید کے نمو کی تاثیر　　　پتے پتے کے رنگ وبو کی تاثیر
کانٹوں میں بھی دلکشی گلوں کی سی ہے　　　اللہ رے فریب آرزو کی تاثیر

لیکن اس "فریب نظر" کو فلسفی گلشن حیات کی چمن بندی کے لیے ناگزیر جانتے ہیں، کسی عنوان سے اس فریب کو معدوم کر دیجئے صفحۂ دہر کے نقش ونگار یکلخت ختم ہو جائیں گے،

ہے معجزۂ حیات، اُمید حیات　　　ہے لطف وغم زمانہ تنقید حیات
ہیں جان کے ساتھ آرزوئیں بھی رواںؔ　　　بیشک ان سے ہوتی ہے تائید حیات

ظاہر ہوا کہ "دل بے مدعا" جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں، ایک خواب وخیال ہے جس کو حاصل کرنا اُسی قدر دشوار ہے جس قدر کہ عرفان حقیقی، پھر بھی جس قدر آرزوئیں کم ہو سکیں کم کرنا ضروری ہیں، گو اس تہذیب کے دور میں اس سعی کا ناکام رہنا تعجب خیز نہ ہوگا۔

گذشتہ رباعی میں لطف و غم کو "تنقید حیات" سے تعبیر کرنا رواں کی جدت طرازی، ذہن کی رسائی، اور نازک خیالی کی ایک روشن دلیل ہے، مگر ہمیں افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ "عنوان خوشی" اور "سرخیٔ ماتم" کی ترکیبیں ہمیں ناقص معلوم ہوتی ہیں جو بہتر تھا کہ رواں کے کلام میں نہ ہوتیں، بہرحال یہ جزوی اور ظاہری آرٹ کے نقائص ہیں جن سے شاعر کی بلند خیالی پر زیادہ اثر نہیں پڑتا۔ ظاہری آرٹ کو میں محض ایک خاص حد تک اہمیت دیتا ہوں، اور حقیقی شاعری کو اس آرٹ کے قیود سے بے نیاز مانتا ہوں،

رواں کی پیدائش ۱۸۸۹ء میں ہوئی تھی، اس حساب سے اب اُن کی عمر ۳۰ سال کی ہوئی گویا جوانی کے آخری منزلیں طے کر رہے ہیں، اور اسی لیے کہتے ہیں،

| | |
|---|---|
| برداشت نہیں غم نہانی ہم سے | اٹھتا نہیں بارِ زندگانی ہم سے |
| کچھ ایسی ہی بات ہے کہ بیزار ہیں اب | ہم اپنی جوانی سے، جوانی ہم سے |

ایک حقیقی جذبہ ایک وجدان صحیح ہے جس کے تحت میں یہ رباعی کہی گئی ہے جوانی دیکھ چکے، جوانی کے مزے اُٹھا چکے، جوانی کی اُمنگوں سے دوچار ہو کر اور ناکامیوں سے عاجز آکر اُکتا گئے ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب رواں کو سکوت مطلق اور خموشیٔ عمیق کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے، جوانی جنگ کرنے، اور بڑھنے کا زمانہ ہوتا ہے، حوصلہ بلند اور ہمت مضبوط ہوتی ہے، جی چاہتا ہے کہ ہر شعبۂ حیات میں پیش قدمی کی جائے، اس کے بعد عناصر کا اعتدال کم ہونا شروع ہوتا ہے، حوصلہ پست اور ہمت کمزور ہوتی جاتی ہے، یہ زمانہ مطالعہ اور تلقین کا زمانہ ہے، جی چاہتا ہے کہ اس دنیاوی کشمکش سے آزادی مل جائے اور صبر و سکون کے ساتھ زندگی گذرنے لگے،

فلسفۂ غم کس قدر پیچیدہ ہے، ایک جان اُس سے پناہ مانگتا ہے لیکن ہر حیات کی تکمیل کے لئے غم اُسی قدر ضروری ہے جس قدر کہ جوش عمل، اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

حادثات غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے

اس حقیقت کو رواں نے ان رنگین الفاظ میں پیش کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| رکھتے ہیں سرِ نک جامِ جم کی تاثیر | مرغوب ہے میرے دل کو غم کی تاثیر |

وجہ تکمیل نوع انسانی ہے　　　اللہ، اللہ! یہ الم کی تاثیر

یعنی

"ع تخریب حیات میں ہے تعمیر حیات" یا ع "غم کی عظمت کسی کو معلوم نہیں"، اسی سلسلہ میں دنیا کے متعلق کہتے ہیں۔

ظاہر میں اگرچہ بالکل ہی دنیا　　　آئینۂ اضطراب دل ہی دنیا
کہتا ہی یہ کون مستقل ہی دنیا　　　ہر وقت گریزپا ہی نیرنگ نمود

مگر

اس کے بعد ہی رواں کے دل نے یہ نکتہ خاص ترتیب دیا ہے۔

ہم سب فانی ہیں مستقل ہے دنیا

ایک جگہ دنیا کو غیر مستقل کہا جاتا ہی، اور دوسری جگہ مستقل، اس معمہ کو غالباً اس نقطۂ نظر سے واضح کیا جا سکتا ہی کہ پہلے دنیا کو خدائے برتر کی ازلیت اور ابدیت کے مقابلہ میں لایا گیا، اور دنیا کو غیر مستقل اور فانی سمجھا گیا، دوسری جگہ دنیا کے مقابلہ میں ہم آپ ہیں، ہم مرتے، فنا ہوتے چلے جاتے ہیں، دنیا کی وہی رونق باقی رہتی ہے، ہمارے مقابلے میں دنیا، دنیا کی رونق، دنیا کی ہنگامہ آرائیاں اور دنیا کی شورش انگیزیاں ایک حد تک مستقل سی ہیں، لیکن جوں ہی کہ اُن کو خالق اکبر کے سامنے لایا جاتا ہے ان کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے، اور ہم بلا پس وپیش اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ یہ کل کاروبار عالم دراصل فانی ہی۔ لیکن اس سے زیادہ کچھ اور پتہ نہیں چلتا، صدیاں گذر گئیں بہتر سے بہتر دماغ اور روشن سے روشن ذہن صرف ہوگئے، لیکن اب بھی رواں کو یہی کہنا پڑتا ہے۔

آخر یہ طلسم آب وگل کیا معنی　　　اے ناظم کائنات! کچھ تو بتلا

دل جستجو میں محو ہے، اس قدر عقدہ کو لاینحل تو مان لیا، پھر ایک سوزش، ایک بے چینی، ایک کھٹک کارفرما ہے۔

اُس کی نیت کسی کو معلوم نہیں　　　راز قدرت کسی کو معلوم نہیں
کل کی حالت کسی کو معلوم نہیں　　　سب محو ہیں آج کے مشاغل میں رواں

یہ تلاش اور جستجو کے علامات قدم قدم پر آموجود ہوتے ہیں، لیکن کہیں نکلنے کی راہ نہیں ملتی، آخر کار ناامید

کی داد نہ دینا انتہا درجہ کا ظلم ہوگا ۔ رواں اگر ان رباعیات کے علاوہ اور کچھ نہ لکھتے تو ہمیں یقین ہے کہ یہی ر
انھیں حیات جاودانی بخشنے کے لیے کافی ہوسکتی تھیں ۔ رباعیات کو غور سے پڑھنے کے بعد آپ یقیناً اس نتی
پہونچ جائیں گے کہ رواں شاعر بھی ہیں اور فلسفی بھی، وہ حقیقت طراز بھی ہیں اور رنگین بیان بھی، ان کی رباعیات
جواہر ریزوں کی ایک کان ہے جس میں قیمتی سے قیمتی اور حسین سے حسین جواہر پارے کثرت سے موجود ہیں، رباعیہ
کے صفحات ایک پر بہار گلشن کی حسین کیاریاں ہیں جس میں رنگ برنگ کے دلکش پھول موجود ہیں ناممکن ہے
آپ اس چمن کی سیر کو نکلیں اور آپ کا دماغ پھولوں کی عطر بیزی سے معطر نہ ہو جائے، ناممکن ہے کہ آپ ان کا ا
ہاتھ ڈالیں اور آپ کے ہاتھ میں چند گہرہائے آبدار نہ آ جائیں ۔

# نقد و نظر

(مرتبۂ جناب عبدالشکور صاحب ایم۔ اے)

**گڑیا کا گھر** یہ ابسن کے مشہور و معروف ڈرامہ "ڈالس ہاؤس" کا مشرقی چربہ ہے، اور جس پر جناب بشیر احمد ہاشمی صاحب نے ایک نہایت مفید مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ ترجمہ خوب ہے اور ہماری ستایش سے بے نیاز۔ مگر "گڑیا کا گھر" خود ایک مختصر سا دیوان غالب معلوم ہوتا ہے، یعنی بہت سی تعبیرات کا حامل ہو سکتا ہے۔ چاہے اس کو اک صدائے احتجاج سمجھ لیجئے اُس نیم غلامانہ اطاعت کے خلاف جو عورتوں کے ساتھ ہر ملک اور قوم میں مخصوص تھی۔ چاہے اُس کو ایک شکایت سمجھ لیجئے اُس طریق تربیت کی جو عورت کو زندگی کے سخت و سرد واقعات سے ناآشنا رکھکر ایک وجود بیکار بنا دیتا تھا یا پھر یہ فرض کر سکتے ہیں کہ عورت کی دو سطحی فطرت کا یہ ایک مرقع پیش کیا گیا ہے۔ اور دکھایا گیا ہو کہ ہنستی، کھیلتی۔ ناچتی، گاتی، نوشابہ محض بالائی رُخ تھی اُس صمیم العزم، غیور اور متین نوشابہ کا جو نادر مرزا کے ہاں آخری رات کو یک لخت اپنی تاریک پنہائیوں سے نکل کر آنکھوں کے سامنے آگئی۔ بہر حال قصہ کچھ نہ کچھ سبق دیتا ہے، اور ہر شخص اپنے مذاق کے مطابق اُس کی تعبیر کر سکتا ہے۔ جو ہمارے خیال میں تصنیف کی اک خوبی ہے۔ تصنیف کے مقصد کی نسبت کتنی ہی رائیں سہی، مگر ترجمے کے متعلق اختلاف آرا کا امکان نہیں۔ ہم جناب شکور صاحب کے اس ادبی کارنامہ پر اُنھیں مبارکباد دیتے ہیں۔ اور اُمید کرتے ہیں کہ اردو پبلک اُس کی قدر کریگی، قیمت درج نہیں۔

ملنے کا پتہ:۔ شیخ عبدالرشید صاحب ایم اے ال ال بی علی گڑھ

**حرم** یہ ایک ماہواری زنانہ رسالہ ہے جو لیڈی ڈاکٹر بیگم عبدالغفور صاحبہ کی اڈیٹری میں پیلی بھیت سے شائع ہوتا ہے۔ رسالہ کامیاب اور مفید ہے اور ہمیں اُمید ہے کہ آیندہ چلکر اس سے زیادہ نام آوری

حاصل کریگا۔ اس رسالہ میں طبی مضامین کا ایک ایسا سلسلہ شائع ہوتا رہتا ہے جو ہمارے خیال میں عورتوں کے لیئے نہایت مفید ثابت ہوگا۔ اور اسی خصوصیت کی بنا پر ہم ناظرین سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ اس رسالہ کو پڑہیں، اور اُس سے فائدہ اُٹھائیں۔

ملنے کا پتہ:۔ **لیڈی ڈاکٹر بیگم عبدالغفور صاحبہ محلہ ٹکھان، پیلی بھیت**

---

**چوگان ہستی** یہ منشی پریم چند کا وہ سحر آفریں ناول ہے جس نے ادبی دنیا میں ہل چل ڈالدی ہے۔ اور ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اُردو زبان کا خزانہ ایسے انمول موتی سے اب تک سراسر خالی تھا۔ قصہ کی دلکشی، خیالات کی بلندی، اور افراد قصہ کے کردار کا تسلسل، یہ ایسی خصوصیات ہیں جو اس تکمیل کی صورت میں آپ کو کسی اور اُردو ناول میں نہ ملیں گی۔ ہم جناب پریم چند صاحب کی خدمت میں اس چکا چوند کر دینے والی کامیابی پر اُنھیں مبارکباد دیتے ہیں، اور ہمیں خوشی ہے کہ جناب عبدالشکور صاحب ایم اے آجکل اس ناول کو نہایت غور و خوض سے پڑھ رہے ہیں، اور اُس پر ایک بسوط تنقید لکھنے والے ہیں جسے ہم اس رسالہ کے دوسری اشاعت میں درج کریں گے

ملنے کا پتہ:۔ **دارالاشاعت پنجاب۔ لاہور**

---

**تذکار سلف** یہ ہمارے محترم جناب مولوی ضیاء احمد صاحب ایم اے کے چند تاریخی و اخلاقی نظموں کا ایک دلکش مجموعہ ہے، جو جناب موصوف نے حضرت شبلی کی تقلید میں تصنیف فرمائی ہیں، اور ہمارے لیے یہ امر باعث مسرت ہے کہ جناب ضیاء احمد صاحب اس پیروی میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ اغلباً اُن کے سوا اور کوئی صاحب اس کامیابی کے ساتھ ایسی نظموں میں "شبلیت" نہیں پیدا کر سکے۔

یہ مطبوعات لٹریری سوسائٹی کی پہلی کڑی ہے، اور "گڑیا کا گھر" دوسری یہ کتاب بھی جناب شیخ عبدالرشید صاحب ایم۔ اے ال ال بی سے مل سکتی ہے۔

## *A Pressing Need.*

We are about six hundred lives in both the circles and the medical aid at our disposal can very well be judged from the couplet attributed to the medical man incharge of us.

In reality there is much truth in this couplet, the poor fellow toils from morn till eve parading the verandhas, creates no noise being pussy-foot and to every patient is given the medicine poured out from the two bottles or packets that have become inseparable accidents with him. His capacity as a physican is limited to Tincture Quinine Amonia, Cardamum mixture, Soda salicylas and Spirit Amonia Araomatic, and his surgery does not go further than Tincture Iodine and lead lotion. We wish that the authorities could take some steps in the enlargement of the Minto Circle dispensary so that we may be able to have full, and adequate medical aid at hand, and should suggest that this enlarged dispensary should in no case whatsoever be incharge of a man less than an Assistant Surgeon.

## *An Apology.*

It is a matter of great regret and pity that on account of the haste involved in the publication of the first issue, the proofs could not be very carefully gone through. This has resulted in some very bad misprints and in some places the mistakes have hopelessly spoiled the sense. We apologise and hope to be excused by the readers in general and contributors in particular. Our special apologies are due to Mr. Mushtaq Ahmad whose article suffered the most.



them. The election is over and let us again unite as one and throw off the garb of resentment, if any and work with the best of wishes of the Union.

## Exhibition.

The exhibition is over and just so soon, there has hardly been any gap between its opening and finishing. The whole ground appeared as a street from 'The Arabian Nights'. The heavy programme of the Cinemas, the variety of the theatre and the heavy supper at the 'Puratha Circle' gave us indeed a busy time. Inspite of our unlimited resources we have been completely exhausted, and the financial disaster met is not hoped to be made good before March. We already adapted our innocent means, and have written home complaining of the shortage of this thing and the breakage of that and have tried to mislead our parents who very well know and understand us, and if some of them comply with these untimely wishes, it is not because they have been mislead, but because for the sheer sake of love and the thought of avoiding our sadness. We wish it a lingering Good-bye and wish it to come back soon again that we may be able to extend the same hearty and enthusiastic welcome.

## Proctorial.

With fear, hesitation and trembling hands I dare to write anything against authority. In infancy as our journal is, it has to evade hard undertakings but then again what is the primary duty of our journal? I put it in simple words without using any metaphorical, ambiguous or courtly language.

Proctorial monitors were appointed in the beginning of last summer session, but ever since their appointment they were neither told or asked to perform their duties. We were silent throughout the year thinking that some reform had been introduced and their services would only be needed in the exhibition, but that week has even passed without their knowing their positions. What does this mean? Is it something concerning the Proctor or the notice announcing the appointments of the proctorial monitors was a clerical mistake. Let it be anything, but we hope next time the authorities won't have space for questioning what it is.

Election was as always is, a game of heated diplomacy, many parties were dissolved and many formed but as both sides say they were only formed to meet an end.

But the germs of provincialism to which these parties have given birth are very injurious to the interest of the Union Club, if further developed, these germs may give place to wrong men in the Union Ministry. It was sad to hear at the polling station people shouting out 'Vote for U. P. Ministry' and others convassing at rooms because you are a Non-U-Pean you must support the Non-U-Pean candidature, and the couplet on the printed paper of one of the ministeries was deplorable, what does ·········and mean? Are we two? No, not all, we are all one and the same. Aligarh was a place where provinces have always been thrown away and everybody at all times has styled himself an Aligarian. From early morning, cars of the various candidates, garlanded with flowers and bearing posters on radiators, stepanies and on all other things; and in the cars stood students dressed in their college uniform. And in one of these cars went the band which played the anthem, which was a mixture of all the national anthems of the world. These processions paraded the various hostels of both the circles and by the time fixed for polling they were in the front of Marris Hall. The scene of the polling station was even more interesting. Students with posters hanging from their necks and coats, and cards fixed in each of the seven buttons that our uniform coat has, some with the number of their candidate written in chalk on their coats and caps were shouting nothing of which could be followed. One of them who of course appeared to be a pacca Aligarian, solved the mystery of making his shout distinctly audible, in a very nice way. He began to sing musically 'vote for number four—number four—number four!' We extend our most hearty and cordial welcome to the ministry and hope from them much better work than done by any preceding ministry. We also expect the support the ministry that has failed, to give whole hearted co-operation to the ministry elected by majority. Before, this ministry represented its supporters only, but now it represents the whole house and all are bound to own

The following are the captains for the new session:—

| | | |
|---|---|---|
| Cricket | ... | M.S. Toori. |
| Football | ... | Naseer Khan. |
| Hockey | ... | S. Abdul Aziz. |
| Basket Ball | ... | S.Ghulam Serwar. |
| Volley Ball | ... | Ahmadullah Husaini. |
| Kabbaddi | ... | S. Abdul Aziz. |
| Tennis | ... | The previous Secretary will continue for the time being. |
| Sports | ... | will be notified later on. |

During the month of January, all the clubs have remained very inactive, probably because their term is coming to an end and they have lost interest.

We have a great complaint against the unsportsmanlike manner of the Presidents of the various clubs. On the co-ordination of the clubs and the appointment of a general games Secretary, they seem to have lost all interest in the welfare of the games.

Now, is their neglect a protest or negligence of duties? They should not wrongly think that the newly appointed General Games Secretary is to do everything for them. He was made not for that but to work jointly, and to give the games maximum efficiency. Among our innumerable needs, the need of a games pavilian stands foremost. A pavilian with cricket lawns on one side, and Hockey and Football lawns on the other would be highly valued and would do much towards glorifying the name of games at Aligarh.

Funds are to be considered with regard to this. One way that we could suggest would be of arranging that one rupee of the every five rupees paid for admission to the college, should go for this fund. The authorities know better ways and means and it is earnestly hoped that they will try and seriously think over this project. This time our teams are much stronger than of the people on the other side of the road. Recently our Hockey club defeated them by 3—1. Their football has also sustained a defeat at our hands and their cricket team has fared no better.

***Union.***

The only important activity of the Intermediate College Union Club during this period was of the election of the new ministry.

felt tired of this and one of them even expressed it publicly in his after dinner speech on the occasion of the I'd Dinner. If asked why they borrow players, they plead the old reputation of their institution in games, and put forward their most pathetic plea " we don't wish to spoil our previous prestige and reputation and thereby bring a bad name to the institution." That's no sportsmanlike reply; games are not played for winning only, but for the games themselves and for building up character, and if they don't satisfy either, they fail to serve their purpose.

We do not realise the harm we are doing by cutting at the root of the sport which has been so very characteristic of Aligarh. The spirits of the young, energetic and budding players are benumbed, because whenever a chance comes, their interest is sacrificed for the players from the University and the old boys. Now the psychological effect of this is not only that we suppress the enterprise of the rising players, but we never feel confident and never estimate our strength. A single instance will make the problem clear. Take the instance of the match we played against the Delhi Hindu College, the team of which College was no match for ours, but even then we felt weak and in order to keep the vague tradition we had to borrow the services of University players. On the other hand, a chance was given to a new man and how well did he prove worthy of it by putting up the best show of the day.

This is not for the authorities to meddle with, because they are not responsible for it. Full power has been invested in the hands of our captains and they can set it right if they care to. If the authorities interfere and put a check on the powers of the captains then we will be shouting out, and will begin kicking again.

Slaves of traditions as we all are, however injurious they may be, once we adopt them they become sacred with us, therefore, though I know these few lines of mine won't have much weight, yet one must say his say.

We extend our most hearty and cordial welcome to the newly appointed captains of the various clubs and wish them a happy and successful term of office.

# AN ALIGARH CAUSERIE

BY

Akram Riaz Faruki.

It is a matter of great joy and pride that our journal has received as warm a reception as was anticipated. That the Magazine has satisfied a long felt need is evident from the overwhelming response to our call for contributions, and we can safely say that the material we have at hand is enough for another three issues. This time, however, I had not to go ringing my cycle bell for thirty seven minutes, nor was I damned and flattered in the same breath by being called an early bird at ten o'clock of a morning.

***Games:—***

A residential institution aims not only at preparing students for the various examinations, but also at building physique and creating sportsmen. And especially at Aligarh games are given the place they deserve in any educational system. Dr. Ziauddin Ahmad is reported to have said that in other institutions, if students are introduced to a visitor they are introduced thus—this is the student who stood first in the First Year, and that man secured distinction in the Intermediate examination or this man is son of such a prince and that man is the son of so and so, and so on. But at Aligarh the ways are quite different. Here they are introduced as—this is the Cricket Captain, this the Hockey Captain, and that the Football Captain, and so on.

When games are given so much importance, it is a matter of regret and pity that some parasites may be allowed to grow, and give birth to germs which are very injurious.

The parasites are the wrong traditions, and the germs are the false representation in games. You would naturally ask what I mean by the term, false representation. It is a new term but applied to an old problem. Various clubs are seen playing at and outside Aligarh, but they have never been purely represented by the people whose name they bear. If the Intermediate College Day Scholars' Club enters a tournament, people from the Intermediate College and University Clubs are invited and especially the cricket people are very fond of extending invitations to the Old Boys who have even

*Suspected person*—"Well you see, officer, we ain't got no side board at 'ome."

"Smith is a man who keeps his word!"
"Never!"
"Yes, no one will take it."

*Builder*— "And are you fit for hard labour?"
*Applicant for Job*—"Well, several judges in the country have thought so!"

*Master*— "Have you anything to say before I cane you? This is going to hurt me more than you."
*Boy*— "Well, as you've done nothing, wrong, Sir, suppose you let yourself alone.

The teacher was giving his class a lecture on charity. "Willie," he said, "if I saw a boy beating an ass, and stopped him from doing so, what virtue should I be showing?"
Whillie— (promptly) — "Brotherly love."

"Boy," said the boss as he entered the outer office, "did you tell that caller I had gone to Australia?"
"Yes, Sir, I said you started this morning."
"God! And what did he say?"
"He wanted to know when you'd be back, Sir, and I told him immediately after lunch."

*Old man*— (outside picture house)— "Don't push in like that. This isn't your place."
*Small Lad*—"Oh, yes, it is. I only went for some sweets."
"And how do you know you've come back to the right place?"
"Because I chalked a big white cross on your coat."

*Employer*— "Isn't it rather strange that yaur grandfather should be seriously ill every time there's a big football match on?"
*Office boy*— "Yes Sir, I sometimes wonder if he's shammin."
(From 'Punch').

(*Answers and Questions*).

What is the official name of Mesopotamia? (Iraq).

Who is the British film star who has insured her eyes for £ 30,000? (Mabel Poulton).

When will the population of the world double itself at the present rate of increase? (In 104 years).

Where Electricity is being used to catch fishes. (In parts of Germany.)

# STUDENTS SHOULD TAKE PART IN POLITICS.

BY
**Khwaja Ahmad Abbas,**
*Student of Class X, A.*

WHETHER or not sudents should take part in politics, has been a very contreversial subject during the last few years and arguments have been advanced to support both views. But it seems ridiculous that the educated and modern minded people should say that the students should not take part in politics. They tell us very patronisingly "If you will take part in political affairs you will not be able to study which is your real business. But we do not say, "Give us seats in Assembly or make us the presidents of your leagues and congresses." What we, the students, want, is that we must have the right to hold and express our free opinions on every political matter. We do not want that our opinions should be formed or influenced by the authority of either the Government or the colleges or the elderly political leaders. Let us listen to what our young leader Jawahar Lal Nehru says on the this subject. He says, "the true business in a students life should be to study and learn how to deal with the affairs of the country, political or otherwise. They must be trained to socialist ideas and face all happenings in the country.'

The people, who say that the students should not take part in politics, are merely afraid of the Government, because they know if once they have decided to free their minds, they will easily be able to free their country also.

The students of the world are taking a keen interest in the politics of their respective countries. In India also our Hindu brethern have realised the importance of student's share in politics, but we the Muslim students are still enjoying beuty sleep and do not realise what we owe to our country and community.

We are so unaware of the political happenings that some days ago I heard a student saying 'Simon is a merchant who gives commission to Indians.' Such pitiful ignorance is due to students, keeping aloof from politics.

A child of today is a man of tomorrow. We the students should always be uptodate in our

heart. Though sometimes he might have felt dejection, but that was transitory. It disappeared as soon as he could see the slightest flash of hope. The day he ascended the throne of Farghana he found the country seething with faction and feud. All around him was spread a scene of turmoil and bloodshed. But the boy of eleven was not a whit daunted by the threatening aspect of affairs. Time and again was he turned out of his own land and driven to a state of pauperism, but it produced no effect on his unyielding nature. As soon as he could master a few hundred followers, he would proceed to win back what he had lost. Had the uneven circumstances that befell him in his way of life been the lot of a man of weaker temperament, they would have certainly driven him to commit suicide.

Not only was he a daring and restless advanturer, but also an affectionate leader and a prudent general. He loved his people dearly, and could not tolerate to see them being molested by anyone, no matter whoever he might be. His justice and magnanimity shone alike upon the rich and the poor.

His efficiency as a general it is hardly necessary to mention. The tactics he employed in course of battles, both in India and his own country, have won admiration and regard for him from the skilful strategists of even modern times. But one of the most fascinating characteristics of his was his sagacity towards the beaten foe. These qualifications as a king and as a soldier, were combined with considerable literary attainments as well. And it can rightly be remarked about him that his facile pen was quite at par with his unyielding sword.

He took especial delight in gardening which developed into a sort of hobby with him. He prepared one at Agra after the model of those at Kabul. Babur was well known for his joviality. In a social gathering he could always be relied upon to regale the audiance with his humours and witty remarks.

This was Babur and it was the early part of his career.

---

attack and drove them helter skelter towards the river. In reckless hurry they abandoned Karashi, left Bokhara and Samarkand and fled into the deserts of Turkistan. Once again Babur captured Samarkand (Oct. 1511.)

Unfortunately, he could not enjoy it very long. He had become an honest follower of Ismail Shah; on his coins the name of the Persian monarch appeared; His dress was that of a Persian. This embittered the feelings of his subjects, who were orthodox Sunnis. They seemed to lose their former sense of loyalty, and their honour and respect for him became less. Soon after an Uzbeg army of 3,000 veterans, under the command of Ubaiduallah Khan, successfully overcame his forty thousand men and drove him and his army pell mell into Hisar. Even here peace was denied to him. He contrived by hook or by crook to flee towards Qundaz.

Now the Uzbegs took possession of Hisar, and Babur, losing all chance of recapture, returned to Kabul in 1513 or 1514.

This was the end of Babur's career. From this time onwards we find him enjoying a constant rise in fame and a regular extension of his Kingdom. So long he had been struggling with the unruly mountain tribes ; but the year 1515 saw the opening of a new era in his career. He abandoned the expectation of ruling his own land and took up seriously the task of Indian conquest. (This change in his programme was the direct cause of the turning of the wheel of his fortune. His early life is a voluminous book of failure ; while his old age is an unceasing tale of success).

But the simple truth cannot be denied that his triumph in life was due to his personal qualifications. Babur the great empire builder of the 16th century, the founder of the great line of the Moghol Kings, was a man of indomitable will, iron resolution 'lofy judgment, noble ambition, possessing the art of victory, the art of government, the art of conferring prosperity upon his people, the art of ruling mildly the people of God, ability to win the hearts of his soldiers and love of justice.'

Throughout the thirty six years of his reign which were so full of intrigues and plots he never gave vent to dismay, nor ever lost

## SAMAR KAND ONCE MORE.

On hearing the news of Shaibani's approach, Babur had marched towards India to escape the struggle. As soon as the scourage passed away, he returned. On reaching Kabul he found himself confronted with a new kind of difficulty.

While leaving for India he had left it in charge of one Abdur Razzak, son of Ulugh Beg, who had taken advantage of his absence and had declared independence. Resolved on punishing the rebel, Babur attacked him and after a severe exchange of blows brought him to sub-mission; but no sort of punishment was inflicted.

A period of relief followed. In the midst of this uneventful interval, he received information from Wais Khan Mirza, the officer whom he had stationed at Badakhshan, that Shaibani had ventured to approach Persia then ruled by Ismail, the great founder of the Safavi dynarty, and that he had suffered reverses, himself having been killed. The report further stated that his men were fleeing from Khurasan over the Amu towards Kundaz in an agony of distress and fear.

Babur thought this to be a golden chance, and determined to deliver a sudden blow against the Uzbegs, at this moment of chaos. Accordingly, be assigned Nasir Mirza with the charge of Kabul and marched towards Qundaz to see Wais Mirza. After a short stay he advanced towards Hisar and crossed the Amu, but found the Uzbegs still too strong for him. He had, therefore, to wait for allies.

Things soon happened which enabled him to come in contact with Ismail Shah. In order to benefit himself from this acquaintance, he sent an envoy to the Persian court with favourable presents, and agreed to admit himself as a vassal of the Shah in action, though not in name. The Shah became pleased and sent a small detachment of military.

Babur had already marched to Hisar. He was now laying his camp by the side of the river Surkhab and on the other side of it stood dotted the camps of the Uzbegs. After a little time the Uzbegs, impatient of waiting, crossed the river and vigorously attacked Babur's left, but failing to make any impression, soon retreated their steps. As soon as they fell back, Babur's men made a violent

Soon, however, he awoke to the sterner things of life. Anxiety about Kabul began to oppress him. With this was mixed the realisation that his cousins were in no hurry about directing an attack against Shaibani. These causes exhorted him to march down to Kabul, and he did accordingly.

After a toilsome and tedious march, the accounts of which will be better read in the admirable renderings of Mrs. Beveridge, he at last found a place of safety. He gave his troops a little rest and then invaded the winter camps of the Turkuman Hazares who had revolted in his absence. A sudden attack repulsed the insurgents and drove them to flight.

In the meantime, intelligence came that Md. Husain Mirza Daughlat (father of Mirza Hyder, the author of Tarikhi Rashidi) who had married Babur's maternal aunt, Sultana Nigar Khanam, had rebelled in Kabul, and lay besieging the Royal palace, which was held out by a pose of his most faithful servants. After a sharp but confused skirmish, Babur defeated him and took him prisoner. He treated them with usual clemency, and spared their lives and property. But this had no effect upon the traitors, and sometimes later, Babur had to taste the bitterness of their treachery.

Meanwhile, in Khurasan things were moving quickly. Realizing the calibre of the two sons of Husain Mirza, Shaibani invaded their land and drove them asunder. Babur saw in this, all hope of regaining his *paternal heritage melting away.* The two sons of Zunnun Beg, who were the owners of Kandhar, invited him to accept the allegiance of their people. Young and spirited as Babur was, this call infused into him a breath of encouragement. On reaching his destination, he found himself sadly deceived by his hosts, who would rather submit to Shaibani than to him. All his attempts to remind them of their promise failed. In an infuritted mood he surrendered the city and brought it down to submission within a short period.

Babur was glutted with spoils. Overladen with huge treasures he toiled his way back to Kabul, leaving the charge of Kandahar in the hands of Nasir Mirza. Soon after Shaibani invaded it, but could do no harm.

direct it on Khilatu Gilzai, the strong fortress between Ghazni and Kandahar. This fortrees was subjugated after a considerable amount of difficulty, but as it proved a difficult task to hold long, he relinquished it.

For some time Babur got an opportunity to breathe freely. He immediately dismissed Baki Beg who had become very impertinent, and rather odacious. Next he undertook to put down the turbulent Hazara tribe. which had again raised the standard of rebellion. After several skirmishes he suppressed them and inflicted a severe punishment upon them. There were many such petty outbursts and as Erskine observes, it would lead to a monotonous detail if any one was to follow Babur in all his exploits.

He now determined to rescue his paternal state from the clutches of Shaibani. This difficult enterprise was insurmountable unless all the surviving fragmants of the Timurid family combined together for a common cause and interest. With this object in view he marched to Herat.

### HERAT.

At the end of 1505 when all the land between Sir and Amu, from Aral to Badakhshan was his, Shaibani resolved to try his luck with Persia as well, and began by besieging Balkh. Sultan Husain was thoroughly aroused, and in spite of his infirmity and old age determined to take the field against him and sent invitations to all the princes of Timur's family. Babur who was already lying in wait for such a golden opportunity, rose equal to the occasion and marched with his troops towards Hirat.

But as malignant fate would have it, death suddenly overtook Sultan Husain on May 5, 1506. The news of this fatality reached Babur after he had left Kabul far behind ; but he went on working in accordance with the original programme. He marched on till he joined the two sons of Sultan Husain at Marghlan on October 26th, 1506.

Here he, for the first time in his life, became acquainted with the luxuries of the Persian Court. A few days later, on the approach of winter, he marched with his cousins towards Herat and passed 20 days there in revels. It was here that he fell deeply in love with his cousin, Mausuma sultana.

finding the aspect of affairs around them threatening, sided with him. Thus undisturbed and unmolested. Babur reached Kabul and laid siege to the town. For some time Muquim Beg held out, but was at last outwitted by a sudden and violent charge of the besieger's cavalry. A skirmish followed, and then came surrender. The vanquished king was received with great honour.

At the beginning of October, 1504, Babur entered the city. The kingdom of Kabul at that time did not comprise what we call Afganistan to-day and the sway of its ruler did not extend much beyond Adinapore, in Khaibar. The climate was very good and fruits like melons and grapes, abounded, but in spite of all these the country was far from rich. Its entire revenue was only £35,000. Its inhabitants were unlettered and rude. After a brief survey of the city, Babur was convinced that if he wished to maintain peace and order in the country and if he really wanted to keep his position intact, then he must rule 'by the sword,' not by the pen, nor by harangues. Soon after a rebellion broke out among the Hazara tribes which, though put down, confirmed in his belief.

Then, and not till then, the stories of Timur's expedition, told him by an old woman of hundred among the Ailak tribes where he had taken shelter after his first flight from Samarkand, recurred to his memory. He marched along Peshwar,—Attock road, went through the Khyber, and instead of crossing the river, Sind, marched on Kohat. Then he passed through Banna and the turbulent Bangash district to Isakhail. After this, skirting the foothills by Desht or Daman, he crossed the Gomal and reached Indus. For a couple of days he marched along the bank of the frontier river, and then turned inland, crossed the Sulieman range to the great lake called Abi-Istuda, occupied Ghuzni and returned to Kabul.

On his return he found a "budget" of news awaiting him. But of all the happy and dismal tidings, one that stood most conspicuous was the intelligence concerning Nasir Mirza. He had left him and made himself prince of Badakhsan. This irritated Babur very much but he soothed himself, and in order to change the trend of thought, wished to undertake an expedition. He was advised by Jahangir aand Baqui Mirza to

## BABUR A STUDY

BY

S. Moinul Ahsan XII—B.

*(Continued from Our January Number.)*

### KABUL.

Babur was now homeless. There was little chance of his recovering Farghana. Then it came to his mind that it would be better to 'depart out of Farghana any whither rather than go on staying thus without a foothold'. At the time of his distress there was no king or prince, who held out his hand of sympathy towards him. While wandering he had met a certain Amir named Abubakar, at Tirmiz, whom he had asked as to the position which would be the most promising base from which to undertake operation against the Uzbegs. The Amir had suggested the name of Kabul, which he thought to be the most suitable place for such an enterprise. Babur began to look about for an opportunity to lay hands on it.

In the year 1501 Ulugh Beg, the King of Kabul and Babur's paternal grandfather died and left one infant child, Abdur Razzak. Consequently, anarchy soon followed and Zakir Beg seized upon the throne; but his despotic rule gave rise to discontent and he was soon assasinated. These internal factions and feuds began to absorb the attention of outsiders. Mohd. Moquim a son of Zunnun Beg Arghun, a feudatory chief of the neighbouring district of Garmsir, now took hold of the kingdom. Thus Kabul passed from the hands of the Timurid princes to that of the Arghuns.

This supplied an excuse for Babur to invade the land. He proceeded through Hisar and Ounduz, which were than under the direct sway of Khusru Shah. On his way he received no checks, but on the contrary, got an addition in his resources. This gave him a great impetus, which almost doubled his energy.

After taking Andijan from Tambal, the Uzbeg chiefs were rapidly advancing towards Ounduz and Hisar. This sent a thrill of fright in the mind of Khusru, and when Babur penetrated his territory and proceeded through it towards Kabul, he could not venture to wield arms against him. To avoid any outbreak, he admitted Babur as the sovereign lord and himself as a mere vassal. Many of his troops including his brother Baki Beg

as much as in the country invaded. And this remarkable military leader completely ignored the fact that the development of economic resources and the progress of commerce and industry were indispensable for stability of a state.

No state could last long on war and its gains; and war was the main occupation of the Marathas. The very nature of Marathas State, therefore, guaranteed for it but a short duration. A born soldier, gifted with a keen sense of discipline, a supreme power of organisation, a clear understanding and an aptitude for working out the details, Shivaji had really dazzled his contemporaries with his success but lacking as he was in originality of conception, length of political vision he could not educate his people in the principles of far-sighted statesmanship nor build a state on strong and firm foundations.



intolerance but these were the exceptions and not the rule. It is to the credit of mediæval Indian governments that they carried into practice the policy of universal toleration when the west was experiencing the horrors of persecution and bigotry. Moreover Shivaji never discriminated between the Hindus and the Musalmans when he was out on his campaigns.

In 1668 he had attempted the capture of Goa by a strategem which however, failed. Admitting his personal faith in the religion, it is to be noted that he like many a military leader knew how to play upon the religious sentiments of the people whom he wanted to gather round his standards.

At the end we might discuss how far Shivaji succeeded in building up a nation. As stated before, the Marathas as a people were living an obscure life, they were scattered and disunited. Shivaji gave them cohesion and inspired them with the spirit of self-consciousness ; he taught them how they could harrass even the poweful Empire of Delhi by pursuing the tactics of the guerilla warfare. But the fundamental principles on which he tried to build his state were defective and he signally failed to educate his people in the precepts of nation hood. His theory was reactionary in its essence, and resuscitation of the ancient culture. Under his patronage the caste system returned to its primitive glory and brought in its train the usual consequences. It accentuated the differences of the various castes thus totally ruining all chances of homogeniety. "Shivaji aimed at preserving the rents ; he wished to save from Mughal attacks a Hindu society to which ceremonial distinction and isolation of caste are the very breath of life. He wanted to make his heterogeneous society triumphant over all India ! It is beyond the power of any man, it is opposed to the divine law of the universe, to establish the swaraj of such a caste-ridden, isolated, internally torn sect over a vast continent like India†."

Nor his policy of regular campaigning in other countries and, making the army live on plunder it brought to him, was less destructive of the growth of a national state. War kills industry and trade in the country of the invaders

† Quoted by Sarkar from Modern Review, April, 1916.

against the Bijapur government. His father Shahji was a devoted and loyal servant of the Adilshahi kings, and in recognition of his services a jagir was given to him. The Muslim sultanates of the Deccan had always utilised and duly rewarded the services of the distinguished Maratha families. They held posts of distinction, confidence and trust.

Party strife at the court and the unceasing attacks of the Moghals, had shaken the very foundations of Bijapur kingdom Shivaji's rising therefore simply completed the process of dissolution and its fall became only a question of time. At the expense of his patron he established a new monarchy which could neither itself stand the attack of the mighty Emperor, nor, join hands with the mother kingdom to repel the common enemy.

The very essence of Shivaji's policy of conducting regular campaign and of blackmailing the neighbouring countries, exposed him to the hostility of formidable enemies whom he could give an open battle under no circumstances. He naturally resorted to treacherous dealings. His murder of Afzal Khan can never be justified even if it is judged with the lowest standard of public morality. The treacherous assassination of Chandra Rao, the chief of Javli, and the acquisition of his property and territory will always remain a standing proof of the fact that he could stoop to basest possible means for the aggrandisement of his power and wealth.*

It would be idle to argue that he had taken upon himself the noble task of emancipating Hinduism from the yoke of Islam. A close study of the basic principles of the Muslim kingdoms of mediaeval India would clearly illustrate that they were in no sense an alien government. The Musalmans had come to India and made it their home ; they did not rule it as a dependency but as their own country with the help, co-operation and confidence of the people whom they conquered. Here and there were witnessed cases of religious

* An attempt is being made by some writers that in both the cases Shivaji acted in self-defence; but this is a monstrous untruth. For Shivaji's treachery against Afzal Khan see my article "Shivaji and Afzal Khan," printed in the Aligarh Magazine, Vacation Number, 1927. For the Javli murder see Sarkar's 'Shivaji and His Times' Chapter II. His criticism of the whole affair begins with the words. "The acquisition of Javli was the result of deliberate murder and organised treachery on the part of Shivaji."

close examination of the brief sketch of his administration given above, with a careful study of the numerous other activities of his short but eventful career, lead one to a different conclusion. By instinct as well as by training he was a religious man. Throughout his life he showed great respect to the Brahmans and the cows, revived the traditions and learning of the Hindus, and listened to their sacred scriptures with keen interest. But his supreme devotion to that faith had not stiffened him into bigotry. He took enjoyment in the society of Hindu as well as Muslim saints. Although having several wives and a number of concubines for himself, he had a great regard for women.

The systematic organisation of the various departments of administration in his territory, the thorough knowledge of details, the precise information about all things, and the discipline maintained therein, leave an impression of his supreme administrative acumen. There seems little orginality in his institutions, but in a ruler practicability and not originality is the greater gift. His greatness lies in adopting these institutions to his own conditions and cricumstances in a manner which made their practical working easy and sourceful. His army regulations and the method of warfare he adopted against the Moghals, which so well suited his country and countrymen, amply prove that he was a born military leader. Above all he had risen amongst a people who were living in obscurity, scattered here and there with no spirit and no aims in life. The Marathas were employed in the armies of the Deccan kingdoms and several families had risen to eminence, but barring these individual cases, they had no position in the country.

Shivaji welded them into a community, inspired them with the spirit of united action and made them conscious of the great work they could do. He died shortly after his coronation and his kingdom did not survive him more than ten years, but the spirit of bold defiance and persistent action he had left behind brought forth its results in the establishment of the Maratha supremacy, short-lived though it was.

In the face of his brilliant but transient success, however, we cannot lose sight of the means and methods he adopted to form his career. It would be hard to gainsay that he started as a rebel

for eight months troops plundered the territories of others, levied contributions and extracted money from rich zemindars, Hindus as well as Muslims.* The soldiers, however, were not allowed to keep any share of the plunder, but were to surrender every article to the State; if any one was found to have secreted something, he was severely punished and had to make good the cost of the same. It was a standing order that cows should not be seized and Brahmans should not be put to any trouble. No soldier was permitted to take women with himself when going on march.

It is remarkable that Shivaji's system did not possess a Judicial department, organised and conducted with the same care and attention as the army and revenue. Cases of a civil nature were left to be decided by the village punchayats, appeals from whose decisions could be brought to the king. Here the appeals were heard by the Nyayadesh. Criminal cases were in the first instance decided by the Subah officers, and appeals again taken to the king where Pandit Rao the ecclesiastical member of the Council gave his decisions in accordance with the Shastras. The Punchayat system certainly had its own advantages; it was cheap, and the knowledge of the arbitraters about local affairs gave them very fair opportunities of imparting justice to the entire satisfaction of the parties. Although personal relations and obligations distorted justice in certain cases the Punchayat system was undoubtedly a popular institution.

Shivaji's work has always been viewed in two different lights and so wide is the difference that the two classes of critics hardly agree on any salient point. It would be absurd to accept the traditional view and dismiss him as a mere free booter, an unscrupulous leader of the brigands given to plunder and rapine, selfish beyond limits and treacherous to the core. Nor could the efforts recently made by some writers to present his character as a pattern of greatness and purity, and make him the forerunner of Indian nationalism be appreciated by a serious student. A

* Mr. N. S. Takakhan who has laboured hard to defend every act of Shivaji admits that "The Sir-i-Naubat of the horse went forth on these campaigns for eight months in the year. He levied the Chauth and Sirdesh Mukhi dues in the Bijapur and Moghal dominions and sacked the wealthy towns in the hostile territories." All land outside the Swarajya was "hostile territory for the purpose."

the Pagah (household troops) and enjoyed greater confidence than the Silahdars who brought their own horses. Being suspicious of the fidelity of the Silahdars, Shivaji had certain Pagah troopers intermixed with them so that he might be kept in the know of their activities and movements. A pair of tight breeches covering the knees, a cotton frock with a turban having one of its folds under the chin and a scarf round the waist to gird the sword formed the dress of a Maratha horseman. Although the spear was his national weapon, he carried with it a sword and a shield as a rule, and sometimes a match lock too.

Twentyfive horse-soldiers were under one Havaldar; over five such Havaldars there was one Jumladar and over five Jumladars there was a Subahdar. There was one Panj-Hazari* over ten Subahdars and the chief command lay with the Sar-i-Naubat. Each Subahdar had an accountant and auditor of accounts; while there were one Majmuadar and one Ameen with a Panj-Hazari officer. In addition to the Government agents, officers of high rank invariably had their own Karkuns whom they payed themselves. Besides the infantry and the cavalry, Shivaji had a personal bodyguard of about 5,000 horse, who were given a rich uniform and arms by the State. At the time of recruitment he was very strict, and thoroughly satisfied himself with the conduct and capacity of a person before he could be taken into employment. Some officer in the army must stand a guarantee for the loyalty and devotion of a novice.

In October, when the monsoons were over, the Daserah festivities† were arranged with great pomp and show. It was on this occasion that musters and reviews were held, the accoutrements of the soldiers examined and an inventory of the same drawn up. Then the armies left their country on the expeditions which had been planned for it by the Rajah. Shivaji had made it a rule of his policy to send out his soldiers every year to draw supplies from other countries, and

* Ranade (Rise of the Maratha Power Vol. I, p. 1??) and Professor Sarkar (Shivaji and His Times, p. 415) mention a Hazari over 10 Jumladars thus he commanded 1,?60 men.

† The Daserah festival is regarded by the Hindus as "auspicious for the commencement of any new business, and in Bombay children attend school for the first time on this day ........" It was in keeping with this centuries old tradition of India that this was selected as the suitable time to start on the annual expeditions.

had become more extensive, that a regular and strong cavalry which naturally proved more useful and indispensable in the wars with the Moghals, was maintained.* The recruitment of the infantry was made chiefly from the Mawlees in the ghats and the Hetkauris in the Concon territory, and being bred and brought up in the hills, they admirably served the purposes of their employer for, with a wonderful agility and ease, they could scale the precipitous rocks and penetrate into the inaccessible valleys of the neighboring country.†

At the head of every nine foot-soldiers (paiks) there was one Naik: and five such decuries were under one Havaldars over two Havaldars there was a Jamadar and over ten Jamadars there was a Hazari or Commander of one thousand. Five thousand troops were commanded by a Punj-Hazari officer who was directly under the Sar-i-Naubat.‡ They were to bring their own arms while the ammunition was supplied by the State. Generally speaking, their dress consisted of "a pair of short drawers coming half way down the thigh, a strong narrow band of considerable length tightly girt about the loins, a turban, and sometimes a cotton frock."

Most of them wore a cloth round their waist, which likewise answered the purposes of a shawl.§ A sword, a shield, and a match lock were their usual arms; while one out of every ten men had a bow and arrows for night attacks and surprises. The Mawlees were skilful in hand to hand figthting with swords; the Hetkauris were excellent marksmen.

The cavalry was of two kinds, the Bargirs and the Silahdars; the former class being provided with horses from the State were called

* Anant Sabhasad says that there were 1,200 house-hold cavalry (pagah) and 2,000 mercenary horsemen (Silahdars) in the beginning. The number kept on growing, till after the murder of Afzal Khan (1659) Shivaji had 7,000 pagah, 8,000 Silahdars, and 12,000 infantry. In 1680 there were 45,000 pagah, 60,000 Silahdars and one lac infantry. Other writers give much lower figures; the Bhakkars as usual seem to have exaggerated them.

† "The Hetkauris, who may have comprised a certain number of Konkoni Marathas, were chiefly Bandharis, between whom and the Marathas there is a distinct ethnological affinity. The Bandharis are divided into several endogamous and exogamous sects bearing the same names as the corresponding Maratha divisions, *e.g.* Gavade or Gaude, and Shinde, Jadhav, Kadam, and Chavan.................. " (From a footnote of the editor of Grant Duff). *Vide*, Indian Gazetteer, Bombay. II. 150.

‡ Ranade and Kincaid say that the Sar-i-Naubat had seven thousand men in his charge.

§ Grant Duff. Vol. pp. 176.

"However, under the king of Bijapur the taxations were much milder, and they lived with far greater comfort."

This was written about 1673 and things must have greatly improved in latter years.

The new reforms were still in their infancy and the results of their practical working could not be seen. Moreover, Shivaji had a very bad reputation of extracting wealth by torturing people, and to a certain extent this must have been responsible for such accounts.

*The Army*:—Shivaji's territory contained about 240* hill forts, and he gave his utmost attention to their up-keep. He fully appreciated their significance in his wars and utilized them as "points of resistance against attack" as well as centres of aggression. They were the sheltering place of the Maratha soldier after his skirmishes in the plains below and a depository for his plunder; once within the four walls of a hill fort, he and his belongings were as safe as a ship in the harbour. Three officers of almost equal status held the charge of a fort. The Havaldar who was usually a Maratha of tried loyalty and trustworthy character, was mainly responsible for its safety. It was with him that the appointment and dismissal of the lower staff rested, and he was to see that the gates of the fort were safely locked before he slept with the keys under his pillow. The garrison in the fort was commanded by the Sar-i-Naubat; while the accounts and correspondence were in charge of the Sabnis. Another officer, the Kar Khana Navis kept supervision over the stores and provisions.

These officers were selected from different castes, and were therefore a check over each other†. In the vicinity of the forts there were out posts which were watched over by men of the Parwari Ramushi, Mang, and Mahar castes. These people, too, secretly carried to the fort the intelligence of the movements of the enemy in time of war.

Evidently the infantry must have been the foundation of the Maratha power in its early days; it was later on when the activities

* Anant Sabhasad gives the number as 240 while other Bakhars say 280.

† Havaldar and Sar-i-Naubat were Marathas; Sabnis was a Brahmin and Kar Khana Navis was a Kayastha.

the Jagir-system Shivaji abolished that institution altogether, allowing nobody to live in a fortified palace or directly collect the revenue through his own agents.

No servant of the State was paid in assignments of the land. Before the days of Shivaji, it was a common practice that high military officers were given lands for their services, where they enjoyed entire proprietary (mokasa) rights. They collected the revenue through their own men, and contributed the Government share which was fixed according to the area of the land. Forced labour, severe extortion and other oppressive measures are inevitable in a feudal organisation of society. Hence he discontinued that mode of payment and all his servants got their salaries from the government Exchequer. Similarly, no public office, civil or military was to become hereditary. Merit and not birth was the criterion.*

*Having discussed the main features of the new regime, Mr. N. S. Takakhav says, "No prototype of it can be found in the contemporary Mohammadan governments of Shivaji's time or in the fossilised systems of Hindu medievalism that had preceded it" (The Life of Shivaji Maharaj pp. 897). His words betray the author's utter ignorance of the Moghal system. None of the measures so exultantly dilated upon by the Maratha biographer, was an improvement upon the Moghal regulations.

Shivaji's reign was too short and his activities too multifarious to leave him time enough to see that the practical working of these institutions was as smooth and satisfactory as he would. A fairly large amount of success was achieved on account of the spies and the checking authorities. Still it appears, much was needed for a successful working of the whole organisation. Dr. Fryer, a contemporary English traveller speaks in very strong terms of the miserable condition of the people. "It is a general calamity" he says "and much to be deplored to hear the complaints of the poor people that remain, or are rather compelled to endure the slavery of Shivaji. The Desais (head men of districts or petty chiefs) have land imposed upon them at double the former rates, and if they refuse to accept it on these hard conditions (if monied men) they are carried off to prison, where they are famished almost to death; racked and tortured inhumanly till they confess where it is ……………… And after this fashion the Desais deal with the Kunbis (an agricultural caste); so that the great fish prey on the little, as well as by land as by sea, bringing not only them but their families into eternal bondage."

than Sher Shah did. Annual agreements (Kabuliats) about the payment of Government dues were signed by the ryots. In times of scarcity the taqavis were advanced and their payment was facilitated by the introduction of the instalment method. A significant change that characterised the system was the total elimination of the intermediaries between the Government officials and the ryots. The extinction of these revenue lords variously designated as Desh-mukh, * Deshpandya, Patels, and Kool Karmis, must have proved highly unpalatable to that class as a whole. None-the-less, advantageous as the measure was to the ryot and the Government it was strictly and punctually acted upon and was naturally popular with the former. It cannot be doubted that the extortions of these local chiefs must have told heavily upon the income of the ryot. Shivaji's reforms greatly relieved the cultivators of this irksome burden. On the other hand we should not be too sanguine about the institution of the government paid collectors of revenue. Hard dealings and severe extortions are equally possible, nay probable, in either case. But a close scrutiny and ceaseless instructions from the central authority improved the matters to a large extent.

Another important feature of Shivaji's revenue reforms was the suppression of the jagirs. That the big jagirdars have always been a source of danger to the government is beyond doubt. They have a fatal tendency to develop themselves into feudal lords living in castellated residence and maintaining a militia of their own. This, undoubtedly, they bring to the help of the central authority in moments of need; but no unfrequently they have "proved a trumpet-call to mutiny and rebellion." In the interests of the Crown it has ever been found advisable to do away with these hereditary landlords. Fully realising the evil consequences of

(5) Conjectures have been made as to the origin of the words Desh-Mukh and Desh Pande. It has been suggested that Desh means ten and Mukh means fist; and the term signified a tenth handful. The Marathas say that Desh means a country, Mukh means a mouth; and the term was used for the spokesman of the district.

Wilson (Glossary of Indian terms) explains Desh Mukh as derived from Desh, 'Country' and Mukhya 'a leader.' He was the "chief police and revenue authority of a district containing a number of villages." The Desh pande is derived from Desh, and Pandu, 'White-coloured', the great pandava family of Northern India, and hence is equivalent to a ruler. He was the hereditary revenue accountant of a district.

He was also to see that the rewards given to the learned for their piety and punishments awarded to the defaulters were in order.

8. The Nyayadish:—He was the Chief Justice and heard civil and criminal appeals from the local Punchayats and the courts of the Subahdars.

9. Excepting the last two ministers all were required to serve in the army and could be sent at the head of an expendition at any moment. When absent on active service they left their departmental functions to their deputies called the Karbaris.

It would be absurd to think that this Council of Eight was like a modern cabinet. The members were not only appointed and dimissed at the pleasure of the king but they were merely a consultative body having no initiative and no powers. They could neither dictate nor influence the policy of their master; they were rather hard-working, obedient and loyal secretaries in peace, and active and capable commanders on the field. What the king ordered them to carry out they performed unhesitatingly and to the best of their ability. Clearly enough, then, this council of the ministers was not a solid representative body to advocate the popular cause but it was an effective instrument to regulate and facilitate the execution of governmental business. The people's salvation lay in the benevolence of the king's nature rather than the constitution of the country as such.

*Revenue Administration*:— A Karkun was appointed to superintend the revenue affairs of every two or three villages. He worked under the Turufdar or the Talukadar who had the charge of a district.

The next higher post was that of the Subahdar or Muamlatdar* who supervised the revenue of his division and secured it in a fort near by. After a careful assessment † of the Swarajya territory the government's share was fixed at two fifth of the whole produce and the remaining three fifth was left to the cultivator. Thus Shivaji took about seven per cent more than Akbar and about 15 per cent more

* The term is still in use in the Bombay Presidency.

† The measuring rod was the Kathi, about six cubits long (actually five cubits and five muthis) and containing 60 tasus. Twenty Kathis made one bigah and 120 bigahs made one chavar.

given absolute power to the king.* However, inspite of the absence of a constitutional check on the powers of the king, neither the Maratha ruler nor any other Indian monarch enjoyed unlimited powers with no restraint whatsoever. An "Oriental despotism" in the literal sense of the term is conceiveable. In days of old the rajah had his eight councilors—seven ministers and one learned Brahman—whom he consulted on all important occasions. The kings of mediæval India had their own councils and ministries. Like the ancient rajahs, Shivaji also ruled with the assistance of a council of eight persons; and his Ashta Pradhan comprised of the following ministers:—

1. Mukhya Pradhan (Persian "Peshwa"):—He was the Prime Minister of the State and had the charge of the administration in general. His seal was stamped on all royal charters just below that of the king.

2. The Senapati (Persian "Sar-i-Naubat"):—He was the commander-in-chief of the forces. There were two senapatis, one for the cavalry and the other for the infantry; but the former had a precedence over the latter who had no seat in the Council.

3. The Pant Amatya (Persian "Majmuadar"):—He was in charge of the finances. All accounts were checked and countersigned by him. His recommendations and advice had much weight in the sanction of extraordinary grants for public expenditure.

4. The Pant Sachiv Persian "Shuru-Navis"):—He was the superintendent of the department of correspondence and had to read and draft the letters. He also kept a record of the grants, sanads, inams etc., given by the king.

5. The Mantri (Persian "Waqai-Navis"):—He had to keep a record of "the king's doings and court incidents." Besides this he had to look after the stores and treasures etc.

6. The Sumant Persian "Dabir"):—As foreign secretary he advised the king on matters of foreign policy. It was his duty to receive and dispose off the envoys from other States.

7. The Panditrao:—He was the ecclesiastical head and [illegible] tended [illegible] and [illegible] ous charities from the public [illegible]

*Manu. Chapter VII.

At the time of Shivaji's death, the Swarajya (or territory directly governed by him) extended from Ramnagar (modern Dharampur State) in the north, to the Gangavati river in the south, while the eastern boundary was formed by an irregular line reaching up to Baglana in the north; to this was added the newly-conquered portion of the Western Karnatik. For purposes of administration the country was divided into mahals, two or three of which made a *prant* or a subah.* The governor of a subah was known as the Subahdar or Mamlatdar; under him were the Mahalkaris or the Talukdars. The Mahalkaris in their turn supervised the work of the Kamavisdars who had two or three villages in their charge. There was a regular office of the Subahdar equipped with record-keeper, accountant and an adequate clerical staff. In addition to the collection of revenue, the Subahdar heard the criminal cases; the civil cases being decided by the local Panchayats. A Subahdar drew four hundred pagodas annually, while the Mujmuadar of a subah was paid at the rate of one hundred and twenty five pagodas per annum. Besides this directly administered territory there was the Moghlai or that portion of the Moghal Empire which was annually raided by Marathas who levied black-mail upon the people there. It was known as the Chauth, because it amounted to one-fourth of the assessed revenue of the place. It may be noted that the levying of the Chauth has been defended as the real beginning of the system of a subsidiary alliance. But the analogy is incorrect; for, the Marathas little cared for the protection and defence of the people once the money had been safely squeezed into their coffers and it was only "a means of buying off one robber, and not a subsidiary system for the maintenance of peace and order against all enemies." (Sarkar)

*The King and the Council*:—Obviously in the Maratha system of Government the king was as despotic in his powers as in any mediaeval monarchy. Shivaji was very particular in his attempts to revive the theories and practices of ancient India; and the early propounders of Hindu Law have

*Sarkar gives Moro Trimbak Pingle, Annaji Datto, and Dattaji Pant as the names of the governors of the three provinces; while Kanade [illegible] *prants* (divisions) and mentions the [illegible] of [illegible] situated in each.

# GOVERNMENT AND INSTITUTIONS OF SHIVAJI

BY

Syed Moinul Haq, M. A.,

*Lecturer in History, Intermediate College, Muslim University, Aligarh.*

SHIVAJI'S character and achievements have excited enthusiastic praise on one side and adverse criticism on the other. Like his great contemporary Aurangzib, he has elicited greater admiration and provoked harsher calumnies than he deserved. One could hardly believe that a person who according to some writers triumphed through "treachery, assassination, and hard fighting" bore a character so noble "that it is idle to make a comparison." A student of history, however, knows too well that both the views do equal amount of injustice to historical truth and the character of the man himself. In our pursuit of knowledge we should be very cautious to avoid such extremes and draw our conclusions after a close observation of facts and circumstances. At present we do not propose to sketch the development of his stormy career; how he was kept away from the guardianship of his father and received his early training under his mother and the manager of his patrimony, how he started his depredations on neighbouring territories and persisted in them in spite of the threats of his father; how he defied the authority of the Bijapur king and then finally took arms against the Moghal Emperor himself. We shall confine ourselves to briefly outlining the system of administration which he had set up in the territory that was under his direct rule. It is not really the extension of the jagir that had devolved upon him from his father, nor the military conquests he made at the expense of his resourceful neighbours, nor his bold defiance of the authority of Delhi and the Bijapur Governments that can give him a place among the prominent figures of Indian history; but his name will always be carried down to posterity as one who, although he rose among a people who could not boast of a glorious past and had no traditions at their back, gave them a government and organisation which may not have possessed much originality but is certainly to be credited for its successful working and happy results.

the sufi doctrines in their more advanced forms and some of the Indian systems, notably the Vedantasutra. This similarity shows that these systems have a common origin which must be sought in India. The strongest objection to this view is the historical fact that though in Sasanian times, notable in the 6th century of Christian era, during the reign of Nausherwan, a certain exchange of ideas took place between Persia and India, no influence can be shown to have been exerted by the latter country on the former, still less on the lands of Islam during Mohammadan times, till after the full development of the sufi system, which was practically completed when Al-Biruni, one of the first Musalmans who studied the Sanskrit language and geography, history, literature and thoughts of India, wrote his famous memoirs on these subjects. In much later times, it is likely enough as shown by Von Kremer, that considerable influence was exerted by Indian ideas on the development of sufism. The other theory regards sufism as of an essentially Persian nationality, some of the most notable and influential mystics of later times such as Sheikh Mohiuddin Ibni Arabi and Ibnul Farid being men of Arabic speech in whose veins there was not a drop of Persian blood.

3. Next we come to the Theory of New Platonist Origin. Sufism has some connection with this theory when the human mind continues to concern itself with the problems of the wherefore, the whence, and the whither of the spirit.

4. Lastly we arrive at the Theory of *Independent Origin*. As it has been seen, there exists the possibility that sufi-mysticism may be of an entirely independent and spontaneous growth. "The identity of two beliefs" as Mr. Nicholson well remarks, "does not prove that one is generated by the other, they may be the results of a like cause."

Now we should not regard Sufism as a doctrine equally definite and systematised. The Sufi is essentially an ecclesiastic and generally a latitudinarian: "The way of God" says one of his favourite aphorisms, "are as the number of the souls of men" while the tradition, "seek knowledge, were it even in China," is constantly on his tongue.

*(To be continued.)*

the service of the Almighty"—these were the fundamental doctrines of Sufism which prevailed among the Musalmans of ancient times.

The keynote of Sufism is disinterested, selfless devotion, in a word, Love. Though not wholly strange, this idea was far off from being familiar to holy Mohammadans who were more deeply impressed by the power and vengeance of God than by his goodness and mercy.

Al-Qushayri explicitly states: "the term safa was firstly used a little before A.H. 200, and the earliest sufi writer known to the author of the Fehrist seems to have been Yahyah-bin Muadh of Ray. Still earlier mystics, who were essentially Sufis, were Ibrahim Adham Daud at Tai and the woman Rabia. The commencement of Sufism may, in short, be pretty certainly placed at the end of the 8th and the beginning of 9th centuries of the Christian era."

There are various theories concerning sufism.

1. The theory, that sufism really represents the Esoteric Doctrine of Prophet. This is the prevalent view of the sufis themselves, and of those Mohammadans who sympathise more or less with them. The basis of the doctrine is partly the traditions constantly cited by the sufis, such as God's alleged declaration: "I was a Hidden Treasure and I desired to be known, therefore, I created Creation that I might be known," or "God was and there was naught beside Him"; or "Whosoever knoweth himself knoweth his Lord", and partly on the Kuranic texts which lend themselves to a mystical interpretation as for example, the words addressed to the Prophet concerning his victory over the heathen at the battle of Badr: "Thou didst not shoot, when thou didst shoot, but God shot." All these above cited texts explicitly indicate that the Almightly God strengthened the arms of the Muslims against their inveterate adversaries, but it involves no great straining of the words to deduce therefrom that God is the Absolute Agent, and Man but as the pen between the fingers of the scribe, who turns it as He wills.

2. The other is the Aryan Reaction theory. It has two forms, the Indian and the Persian. The Indian theory takes note of certain evident resemblances which exist between

# MYSTICISM.

By
J. B. Kadri, Student of Class XII.

MYSTICISM, like Romance, cannot be defined accurately, simply because its province is so wide that it admits of innumerable definitions. An approach to a definition however is possible and I shall deal, at full length with that in the following pages.

Mysticism may be provisionally deemed as a phase of thought, nay, an aspect of feeling. It came into being because of man's endeavour to find out the ultimate reality of things, or to grasp the essence of the Almighty who created them and the Universe. Mysticism was considered by early thinkers, and by those who are seekers after truth as a bridge which carries one from the Known to the Unknown; as a wave which by tossing the unreal gradually turns it into the real; and like the magical rod which by its constant usage carries away what is unreal, vividly brings before the mental eye the scene of realism, and the glimmering throne of the Most Exalted God, and plays unvisible broad-casting between the mystic and the Lord.

Mysticism has two aspects, one the philosophic, the other the religious; the former being theoretical or speculative, while the latter practical. The most predominating idea or the stand point of mysticism is the one concerning the supreme, all-pervading and induelling power in whom all things are one. For this very reason, mysticism is more or less of pantheistic character. The foremost and the most important function of mysticism is, that, "It maintains the possibility of direct intercourse with this Being of beings—intercourse, not through any external media, such as historical revelation, oracles, answers to prayer and the like; but by a species of ecstatic transfusion of identification, in which the individual becomes in very truth 'partaker of the divine nature' God ceases to be an object to him and becomes an experience." This closeness of union has ever been attempted in the writings of mystics, but the phraseology used is so extensive that it is scarcely possible to confine the brimming enormity of thought in a nut-shell.

Mysticism displays a predominatingly philosophical bent; it starts from the divine nature rather than from the human and takes the

is the matter with you? You built castles in the air and esteemed yourself high. Now where is all your valour and cunningness." Narendra was angry and replied in rage, "Don't talk nonsense." He changed his dress and made all possible haste to reach the office, yet he was very late.

The superintendent of the office was very cruel though funny. He occupied a prominent place in the central hall, where this Babu along with other clerks used to work. When he entered the hall, the officer called out to him and began to rebuke him, asking him to explain why he was so late. At this poor Narendra lost his wits. He tried to speak and give a reply but could not. In his faltering voice he said, "Sir, as I was coming the chickly piclyroad ·······so·················so, Sir, Sir, the husband cow gave me Dhakka, went home Kapre badel came."

There was a general laughter among those that were present and poor Narendra felt inexpressibly small and humiliated.



"Lives" of great men oft remind us
As we o'er their pages turn
That we too may leave behind us
Letters that we ought to burn.

---

One doctor single, like the scullier plies,
The patient struggles, and by inches dies;
But two physicians, like a pair of oars,
Waft him right swiftly to the Stygian shores.

## PERPLEXED AND FRIGHTENED.

by

C. K. Shrimauli, Student of Class XI.

IT was the grey of the morning, the whole horizon being murky. The air was motionless. Birds had begun their melodious warble. Owls and bats began to repair to their respective nests. As the day drew on, the storm rose to its height. The lightening began to flash and thunder began to clash as if a battle of gods and demons was raging in the skies. The army of black clouds swayed like the flags of Doom. Just then the rain poured in torrents for an hour, and gradually subsided, until the sky became clear. The morning now became bright. The rays of the sun looked like pure gold. So bright were they, that they made the gloomy brick walls of the city flame radiantly.

A fashionable clerk, Navendra came out of his house in a very neat and tidy dress. He, being a little late was going to office like a whirl wind with his hands in the pockets of his pantaloon. Unfortunately a long black snake came across him, while he was passing along the road. At the sight of the snake, he got so startled and terified that in the hurry to get aside, he clashed against a bull and fell down. His neat clothes were altogether spoiled.

At that very spot a witty and humorous man was standing. He cried out "Well done, ! bravo! Don't care, you have killed many ants on the ground with your hips in your attempt to pick up a pice."

As he was retracing his steps to his house, finding himself unfit to attend the office in that wretched state, he met another funny person, who twitted him with the taunt, "Hello! friend, where have you been for such a long time? I know you well, you are the same man, who swallowed the sweets voraciously in that feast. Hark! the sweets were got gratis, but the stomach was your own. Why did you gulp down so much that you spoiled even your pantaloon?"

Thus putting up with these jokes and taunts patiently, poor Narendra reached his house. As he entered the door, the wife saw her poor husband and smiled. She said, "Dear, I well perceive tumult of feeling raging in your mind. What

He had invested almost all of his money in a rash commercial venture of Dr. Allen which failed completely, and left the poet absolutely penniless. It was at his suggestion that his brothers and sisters had also invested all what they had, and consequently his remorse at the disaster was unbounded. "I have drunk one of the most bitter draughts out of the cup of life, which go near to make men hate the world they move in," are the words in which he tries to describe his anguish and affliction. He stood in need of immediate financial help and that help came from Sir Robert Peel who placed his name upon the Civil List for a pension of £ 200 a year on the recommendations of Lord Houghton and Carlyle.

In 1847 "In Memorium" and in 1850 "The Princes" were published, which established his reputation beyond doubt as one of the greatest living poets of England. The year (1850) was assuredly the most auspicious period of his life. In this year he was married to Emily Sarah Shellwood, whom he had ardently loved for the last several years. In this year Wordsworth died, and Tennyson was made the Poet-Laureate in his place, and the seal of national recognition was placed upon his growing fame and developing talents. "From this year until that of his death, Tennyson's career was a summer of unbroken splendour, clouded only by the death of his brother, Charles, in 1879, and his son, Lionel, in 1885. Unlike most poets he lived a long life through the sunshine of critical as well as popular favour, honoured by all, and reverenced by many, as among the very greatest of English poets. No such supreme lot has perhaps ever fallen to a poet of any race or country in the history of the world".

*(To be continued.)*



There is a devil in every berry of the grape

—THE HOLY KORAN.

J. P.

else. Tennyson was still at home, like a country gentleman, reading voraciously, walking for miles and miles on foot, and smoking all the while his "infinite" tobacco. He had definitely decided to stay at home, and was keenly reading books on poetry with the zeal of a laborious and hardworking examinee. For many years he had given nothing to the world, and his reputation as a poet based on his youthful attempts was still just like a twinkling star ready to disappear in a moment. That was a cause of anxiety for his friends. It was during these days that Wordsworth said:—

"He ought to have done greater things by this time".

It appeared that a poet of bright talents and sparkling genius was rusting away his powers by indulging freely in his own peculiar whims and idiosyncrasies. During these days he frequently visited London, walked a great deal on foot and saw his friends (including Carlyle) often. Carlyle liked the man very much, in as much as he has given a word-picture of Tennyson in his own masterly style, but he did not like his poetry nor could he appreciate the classical themes so lovingly written upon by Tennyson in those days. In 1842 he published two volumes of his well-chosen poems containing simple pictures of domestic life, and several idylls and eclogues based on Arthurian legends and other classical fables. It is evident that Hallam's unexpected death gave a considerable amount of gravity and philosophical touch to his thoughts, as much as Carlyle's influence enlarged his sympathies and developed his latent intellectual powers. It is an admitted fact that Carlyle was no less than an institution by himself, influencing all those who came in contact with him, and turning every thing within his reach into pure gold with his magic wand. No doubt Tennyson was still working hard at his formal art, but equal attention was paid to the loftier and deeper topics that came within his ken. This change in the outlook of the poet was the outcome of these two important events of his life. Locksley Hall, Ulysses, and Morte D'Arthur had greatly enhanced his reputation; the flame of fame was gradually growing brighter and brighter, and a magnificent future awaited the poet.

For the last several years Tennyson's purse had been dwindling away.

extremely touchy, and probably it was on account of this fact that he could not become popular at Cambridge, nor could he deal amicably with the men of the world in later years. The circle of his friends was always small, and within this circle he was all love and kindness.

In 1831 his father fell seriously ill and he had to leave the University, as there was none at home to look after the patient. His father after a protracted illness of one and a half months died. His father's death brought to a close the University career of Tennyson, as it greatly altered the financial condition of the family. The poet without caring to take up any profession settled quietly at home, and took seriously to poetry and literature. The life he led was both cheerful and quiet; he continued to receive visits from Hallam who was now engaged to his sister Emily. It was in 1833 that a terrible shock, came, which in fact plunged the whole family into acute grief and deep sorrow. The shock was as sorrowful as it was sudden. Arthur Hallam while on a trip died suddenly at Vienna, without any apparent previous ailment and one can imagine how keenly Tennyson must have felt the shocking grief. Arthur was in fact his idol, and he cherished him, and loved him with the unflagging adoration of an enthusiastic devotee.

"—In Vienna's fatal walls
God's finger toucht him, and he slept."

This was another important event in the life of Tennyson. It directed his thoughts into a proper channel. It induced him to ponder over the eternal questions of Death, Life, Human Existence, the Universe, the Omnipotent God, and kindred problems that are the favourite topics of thoughtful philosophers. When the effects of the first blow were over, Tennyson began to write his immortal elegy "In Memorium," which is ranked among the best elegies in English literature, and is deservedly considered as the best literary monument erected by a loving and noble soul on the death of a beloved friend. "While it outlines no system of thought, no philosophy of consolation, *In Memorium* is pre-eminently a poem strong in soothing influences, in assuaging remedies for the pain of loss."

In 1836 the family moved to High Beech, then to Turnbridge Wells, and settled down at Cheltenham with the idea of going no where

partnership, and so Tennyson had to go to the press without them. In the same year there appeared a volume of poems "Sonnets and Fugitive Pieces" by his brother, Charles. Wordsworth gives credit to the rising stars in the following words:—

> "We have also a respectable show of blossom in poetry—two brothers of the name of Tennyson; one in particular not a little promising."

The testimony of Wordsworth is both weighty and valuable. It shows how truly he appreciates the actual worth of these two young poets, Charles and Alfred. The poems in themselves richly deserve to be called a "respectable show of blossom in poetry," and Wordsworth rightly calls "one in particular not a little promising."

> "The air is damp, and hush'd and close,
> "As a sick man's room when he taketh repose
> "An hour before death;
> "My very heart faints, and my whole soul grieves
> "At the moist rich smell of the rolling leaves
> "And the breadth
> "Of the fading edges of box beneath,
> "And the year's last rose
> "Heavily hangs the broad sunflower
> "Over its grave i' the earth so chilly
> "Heavily hangs the holly-hock,
> " Heavily hangs the tiger-lily."

The early lines contain in a remarkable degree choice drops of poetry, so charming and so sweetly delicious for the general reader who is competent enough to distinguish between real poetry and pure versification. A year after this another collection of his poems was published. As usual the Black-wood and the Quarterly severely criticised these poems and described Tennyson as "the pet of cockney coterie."

On the whole the criticism was unsympathetic and harsh, though we shall have to admit that it was not wholly undeserved, but at the same time it was couched in bitter and unfriendly terms. The editors of the two journals made it a point never to administer sugar-coated pills. The result was that Tennyson being highly sensitive felt it very much, although he was wise enough to take up the suggestions that were put forward by his unrelenting critics. Tennyson was

by his poem on "Timbuctoo." Some other friends of Tennyson including Hallam took part in the competition, but the prize was won by the future Poet-Laureate of England. Although the poem in itself is not of the first order, still it contains seeds of future poetic developments. The imaginative power and the pictorial effect which gradually became the distinguishing features of Tennyson's poetry can be discerned from the following lines :—

> "The man's white cities, and the opal width
> "Of her small glowing lakes, be silver hides
> "Unvisited with dew of vagrant cloud,
> "And the unsounded, undescended depth
>
> "Of her black hollows"—

No doubt the lines contain a powerful imaginative picture, but the poet is still too weak to maintain the force of his imagination; he is still unripe, unpractised, but all the same symptoms of future greatness are evident on the very first sight.

In 1830 a rising in the Pyrenees was organized against King Ferdinand of Spain by Torrijos, and Tennyson in the company of Hallam went there to study the local conditions, and to sympathise with the revolutionaries. This event throws significant light on the political views of these two undergraduates, but we do not know definitely their real aim in taking up this long and tedious journey. Probably they wanted to get first hand information on the subject, and educate the public opinion in England in favour of Torrijos. To them it was a secred duty imposed upon them by the dictates of liberty and freedom. The same thing was done by Wordsworth when he went over to France to sympathise with the ring-leaders of the French Revolution, and very probably the same was the impulse that carried off Lord Byron from England to Crimea, and brought about his untimely death. Shelley also was another torch-bearer of liberty and freedom, but the political conceptions of these poets differ in certain respects which should be discussed in a separate paper.

In 1830 Tennyson brought out the first independent volume of his verses called "Poems Chiefly Lyrical." He had a mind to include some of Hallam's poems in this volume, but the old historian did not approve of this poetical

was both deep and lasting. His remarkable personality and handsome features were readily noticed by the leading students of the University, while Thompson, afterwards Master of Trinity, exclaimed "that must be a poet" on seeing Alfred for the first time.

The circle of his friends at Cambridge was remarkable in many respects, and several members of the circle obtained distinctions in the field of literature in after-life. Spedding who devoted a very considerable portion of his time to "The life of Bacon" was one; Lord Houghton, the chief literary figure of his days was another; Trench, the poet, and Alfred, the writer of noble rhymes were also included in the same group. The most brilliant genius of the circle was Arthur Hallam (the son of the historian, Henry Hallam) who exerted a very powerful influence on his friends and was rightly considered as the best debater, the most well-read and talented undergraduate of his days. He was considered to be "as near perfection as mortal man could be" by his friends and admirers. The ideal and immortal friendship that grew up between Tennyson and Arthur Hallam though cut short after five years on account of the premature death of Hallam continued to mould the thoughts and feelings of the poet for very many years even after his shocking death.

Tennyson's studies at Cambridge were haphazard and unsystematic. He was inclined towards Science, Classics, and History. There was a private debating club called "The Apostles" of which Tennyson and all of his friends were enthusiastic members. Meetings of this club were held every week, and all the social, political, and literary topics were freely discussed and talked over by the members. Tennyson attended all the meetings of the club, but he could not take any prominent part in the discussions; he was too backward to read his paper, and join the general discussion that came after it, and he was too shy to propose any subject, and invite his friends to refute his arguments. But he seldom missed the sturdy speeches of Hallam and Milnes. His silence hardly stood in his way; his friends eagerly admired the gravity of his manners, the nobility of his soul, and the wealth of his humour.

In 1829, a year after he had joined the University he carried off the Vice-Chancellor's gold medal

great deal of his time in writing smaller poems on his slate, his note-books, and other pieces of rough paper. Soon after this the two brothers, Charles and Alfred joined hands and succeeded in inducing a publisher to publish their book-let "Poems by two Brothers" and give them £ 20 for the copyright. This first literary venture must have been a source of impetus to both of them.

The quiet village in which the Tennysons lived was surrounded by green meadows and rugged hills. High-towered churches, antique buildings, and the changing hues of the clouds on the hills filled the landscape. The beautiful scenes stuck deep in the memory of Alfred, and are occasionally hinted at by the young poet in his early poems. Memories and scenes of early childhood always leave a lasting impression upon the imagination of the poet, and

> "......... woods, that belt the gray hill-side,
> The seven elms, the poplar's four
> There stand beside my father's door."

in fact present an accurate picture of the country-side where Alfred spent the early days of his life. The last two of the above lines are peculiarly significant, and give promise of the future greatnes of Alfred. They could not have been written by a child who was not destined to make his mark in the realm of poetry.

Alfred and Charles passed the Matriculation Examination in 1828, and went over to the Trinity College, Cambridge, for further studies. This was an important event in the life of Tennyson. Uptill now he had been basking under the sun of paternal love and domestic affection, but now he was thrown into the midst of undergraduates in one of the leading educational centres of England. The University failed to produce any wholesome impression upon him, and for years and years in after life he could never develop his love for the Alma Mater. The activities of the University were considered by Alfred to be worn out and spiritless while he found the academic atmosphere to be both dull and uninspiring. In fact he could never love Cambridge, and he never liked the institution in any of its aspects. Of course, he dearly valued the powerful and life-long friendships that he contracted there. But the impression produced by Tennyson at Cambridge

# ALFRED TENNYSON.

BY

Mr. A. Shakoor, M. A.

ALFRED Tennyson was born in 1809 at Somersby Rectory in the village of the same name in Lincolnshire. His father was the Rector of the village, and vicar of Great Grimsby. It was very fortunate for the future poet that both his father and mother were highly cultured and well educated, and the family was well-known for its bright intellect and powerful imagination. Two of his brothers, Fredrick and Charles, obtained poetic distinctions in after life, although they could not rise as high as Alfred did. The Tennysons were physically strong and healthy as is evident from the fact that ten of these children of the same family lived to be sixty, while our poet died at the ripe age of eighty-six. Two main characteristics are particularly prominent in the family—physical strength, and a deep vein of morbid melancholy. The father of our poet was not an exception to this, and his dark moods frequently clouded the whole atmosphere of his family, and temporarily embittered the early days of the children.

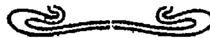
The Rector was himself a versifier of no mean order, although he did not allow his children to write poems. The children, particularly Charles and Alfred, were afraid of their father, and could only recite their own poems to the kind and indulgent goddess of the house, their sympathetic mother. The father was both stern and harsh; he failed to give any love to his children, but he no doubt paved the way of their future intellectual development by maintaining a strict discipline and an academic atmosphere in the family.

Alfred's education began early, and for three years he read in the Grammar School at Louth, where he had the further advantage of private coaching. From his very childhood Alfred was passionately devoted to poetry, and a considerable amount of his time was spent in reading and writing frivolous and childish poems. When still a child he wrote a poem on the death of his grandmother, and was rewarded half a sovereign by his grandfather, who remarked rather innocently that that was the first and the last money which he would get for his versification. In spite of this Alfred was still spending a

dark blue eyes and a pure white skin went well with her soft red mouth.

Angel, cursing himself for not being able to express his love and admiration for her, walked along quietly for some time; until at last he ventured to take her hand and imprint a loving kiss upon it. She seemed to be confused at this incident, for it had been accomplished too suddenly; but in the childlike manner, peculiar to young folk, readily returned this caress by a slight press of his hand which still rested in hers. He seemed to understand the meaning of this caress, for the next moment they seemed to seal each other's sweet lips with a long, fierce caress. By this time they had arrived at the School Cathedral and these two innocent children, even though they knew nothing of the holy bonds of marriage, going up to the altar hand in hand swore undying affection and love for each other.

As it is true that a woman whom one should marry, ought to have affection and opinions moulded upon his, her studies ought to be his studies;—her wishes, her feelings, her hopes, her fears, should all mingle with his, and that she should enhance his pleasures, share his sorrows, and cheer his melancholy; we can but hope that these children will keep faith in each other and enjoy eternal bliss. For the time being, as none can deny that until the day when God will deign to reveal the future to man, all human wisdom is contained in these two words, 'Wait and hope', let us hope that theirs will be a happy union.



And others' follies teach us not,
Nor much their wisdom teaches,
And most, of sterling worth, is what
Our own experience preaches.

—TENNYSON.

Being carried away by the spirit of this lively hobby, the girls unconsciously wander away from each other, and it is when our young heroine is on her way back to the convent that she meets Angel Navarro. We think it better to relate what passed between these two innocent children at their first interview.

"A hail and hearty morning to you, my Coz" said Angel to Rose Marie, as he saw her hovering here and there like a butterfly " Will you show me the way to St. Helenas? I am new to this place and know nothing of the road." She listened to him with the tiniest quiver of smile and blushed to the root of her hair at the question. And Angel, looking at her delicate face, felt his heart beat in the real romantic way. How light she was! How like those white butterflies so delicate and fragile? If we were to believe in love at first sight, there is no doubt that the hearts of these two innocent children had been created for each other, they felt a sudden charm hover over them, surrounding and enveloping them. Was it the spirit of the past or the present, or the all-powerful sweetness of the only one thing in the world that never dies—love? Whatever it was, there is no denying the fact that Heaven had created two hearts—that of Angel and Rose—which harmonised with each other.

"Love that is root and fruit of terrine things,
Love that the whole world's waters shall not drown,
The whole world's fiery forces not burn down."

The girl, on her side, could not bear that burning ardent look in his dark eyes, which at first sight had shown her visions of an earthly heaven such as she had never dreamed before.

She blushed repeatedly and being unable to speak out, promised by her gestures to usher him to the convent and beckoned to him to follow. Though they were silent, their souls seemed mutually to say to each other, 'As the dawn loves the sunlight, I love thee.'

With buoyant steps they went through the woods side by side, where the gossamer threads sparkling with dew, made a silver splendour. She looked exquisitely pretty. Her hair was soft and glossy like spun gold in the Sun, with a wonderful sheen on every golden curl of it; wide, sparkling,

And the pleased lake, like maiden coy,
Trembled but dimpled not for joy;
The mountain-shadows on her breast
Were neither broken nor at rest;
In bright uncertainty they lie,
Like future joys to Fancy's eye'

Our young hero after having enjoyed the scenery for a while, realized that he would miss the train if he waited there any longer and started away at a brisk pace. It should not be forgotten that Angel was too wise and clever for his age, and unlike other children, had begun to realise his responsibility at the early age of ten. This might sound a little superfluous, but if one were to realize the strict training which his parents had given him from his babyhood and the discipline under which he had been brought up, the reader cannot help believing our narrative. Our young hero had a great taste for natural beauty and this desire for all that was lovely in nature was obviously developing—quietly and unceasingly, but none the less surely. In order to dismiss all painful thoughts of home, sweet home, which every young lively heart feels when leaving his native town, he kept on chanting songs of ancient folklore and reaching the station in time, took the train for Oxford.

II.—'THE MAIDEN':

Rose Mary, a mere child, fair and slender, with great innocent eyes which mirrored the pure, naive soul within—eyes...which still looked the outer world boldly in the face, which had learnt neither to shrink in terror nor yet to waver in deceit—a child with rosy, moist lips which had not yet tasted the sweet and bitter savour of a passionate kiss, was on the merrier side of six; and was also descended from a high family. Her mother, whose beauty she had inherited had paid the last debt of nature a year ago; and hence, being deprived of the training which every child receives at home, she was sent by her father to the same convent-school at Oxford to which Angel was destined—it being the best in the vicinity. At this time on a fair summer day, we see her, along with a number of her playmates, Mona, Eveline, Lydie d'(Aumont,) Elfride, Nora and Alba Collonna engaged in the childish hobby of catching butterflies. She hovers about like a butterfly herself, here and there, and spreads charm wherever she goes.

# THE ROMANCE OF A SCHOOLBOY.

BY

Abbas Sayeed, Xth Class.

## I.—THE YOUTH:

It was in the beginning of the month of December when an English child, who had not numbered more than ten summers left his native town of Northampton after bidding adieu to his loving parents. He was on his way to a convent-school in Oxford. As regards the tree of his geneology, it can only be remarked that it was emblazoned with many an emblematic marks of honour and heroic achievement and that honour and generosity were the hereditary attributes of the house of Waverly to which he belonged.

Angel Novarros' looks themselves certified his high birth and parentage, for they seemed to seek glory, power—all that could exalt him above others in the race of humanity. He strolled along to the railway station, which was about three miles distant, humming:

'Arm and up! The morning beam
Hath called the rustic to his team,
Hath called the falc'ner to the lake,
Hath call'd the huntsman to the
brake;
The early student ponders o'er
His dusty tomes of ancient lore.
Soldier, wake! Thy harvest fame;
Thy study, conquest ; war, thy
game.
Shield that would be foeman's
terror,
Still should gleam the morning's
mirror.

The landscape was indescribably beautiful. A thousand flitting hues of light and shade played over the expanse of wild moor, rocks, and inlets. The lilac was is bloom, the hedges and trees were clothed in their early green, all things seemed full of promise. The fresh air was clear, bracing, cool. Our young traveller stopped beside a lake to quench his thirst but as everything around him seemed to be chanting a low melodious music, he could not help admiring the glory of the atmosphere and the charms which Dame Nature had spread around him; and gazed wonderingly at the calm waters of the lake which

'Mildly and soft the western breeze
Just kiss'd the lake, just stirr'd
the trees;

which was raised an uproar of pity."

Now it is needless for me, to go on pouring in proofs after proofs contradicting and shaking the very bases of the so-called tragedy.

It is a heart-rending story to read and write and hear, how the sons of the old Sea-king robbers, brought the assassination of humane and noble Sirajuddaula, and thus practically established the so-called British Empire in India, by raising to the throne of Bengal the traitor, the puppet of Col. Clive, Meer Jafar to the throne.



In a few hundred thousand years, no doubt, a new and superior variety of the human species will have been evolved. In the meantime perhaps it may not be a mistake to cultivate a friendly feeling for the sort already in existence.

—New York Tribune.

---

"Social unrest" is the uneasy feeling that you might get a little more if you would howl a little louder.

—Eugene Daily Guard.

---

A clue is something a detective finds when he can't find the criminal.

—Grenville Piedmont.

---

A literary critic is a person who can find a meaning in literature that the author did not know was there.

—Cleveland Times.

---

In England there is a movement to make insanity a cause for divorce. It is already the cause of many marriages.

---

merely invented to get possession of the finest land of India.

Mr. S.C. Hill remarks about the tragedy ; ' probably the reference to the Black Hole is an amplification, for the careless folk of Calcutta the Black Hole and Fort William seem to have been often confounded.' Now this statement shows the real colour of the story. I made it clear that only the sick and wounded were left behind, who were unable to escape, and were consequently taken prisoners; who might have expired on account of their sickness and wounds during the capture of Calcutta. Even the minute and microscopic search has failed to find out the names of those alleged prisoners who perished in the Black Hole.

Mr. C. S. Hill says:— "In Black Hole 123 perished of whom we can trace the names of 56 only. (Ibid. Vol. I.)

Now the question of the questions is 'why the names of the remaining 67 are not traced.' It means that the 56 persons were those who died on account of their wounds and sickness, during the capture of Calcutta. In other case the English must have taken pains to trace out the names of the remaining persons too. Neither any compensation was made to the survivors. As the Black Hole Tragedy did not actually happen neither the compensation could be made nor the names of 67 could be traced. Taking into consideration all the facts, which I have above discussed I, with all my good sense, come to the conclusion that the so-called tragedy never happened; and it was a fabrication, a myth, which was the outcome of the politic and wicked brains of one of the descendents of the old Sea-king robbers—Mr. Holwell. Now I conclude it with the following opinion of a worthy Bengali gentleman Dr. Bhola Nath Chandra.

> "As to the Black Hole tragedy I have a very doubtful faith in its accounts ............I have always questioned myself, how can 146 beings be squeezed into a room 18 ft. square, even if it were possible to closely pack them like the seeds of a pomegranate or like the bags in a ship's hold, made into one mass by pakets shoved in here and there into the interstices ? Geometry contradicting Arithmetic gives lie to the story. It is little better than a bogey against

the assassination of the noble Siraj-uddaula and the elevation to the throne of a traitor, Col. Clive's donkey—Meer Jafar. In this bloody and paltry bargain, Mr. Holwell was the ringleader of these free-booters, who according to Mr. Basu never found the word gratitude, ike the words of honour, honesty and veracity in their voca-bulary.' This gentleman (Mr. Holwell) engineered a new plan o dethrone the traitor, Meer afar, from whom he had most hamefacedly accepted 1,00,000 upees. According to the report of the Committee of the House f Commons (1772), he received ,00,000 from Meer Kasim. But Ir. Holwell neither scrupled nor hrank to circulate lies and blacken e character of his benefactors. nce he accused Meer Jafar of aving maltreated the kith and kin f the late Nawabs *i. e.*, Sirajuddau-'s, Alivardi Khan's and Shaukat ing's. Such other charges and es were heaped on Meer Jafar y this blackguard before the irectors.

But on the 1st October, 1765, a tter was addressed to the Direc-s by Clive and others at Fort illiam regarding the charges brought against Meer Jafar, which runs thus:—

> "26. In justice to the memory of the late Meer Jafar we think it incumbent on us to acquaint you, that the horrible massacre, herewith he is charged by Mr. Holwell in his "Address to the Proprietors East India Stock," (p. 40) are cruel aspersions on the character of the Prince, which had not the least foundation in truth. The several persons there affirmed and who have been generally thought to have been murdered by his order are all now living except two."

Now we have got some idea about the character of Mr. Holwell, the inventor of this tragedy. So we should not wonder at the paltry measures which this gentleman adopted to blacken the very name of the noble Sirajuddaula; because he spared no pains to propagate barefaced lies against his benefactors, Meer Jafar and Meer Kasim. It will be foolishness on our part to take into considera-tion any account given by Holwell in general, and regarding the Black Hole in particular. The story was

prisoners was 200. The statement of the Captain materially differs from the account of the English writers as to the number of the prisoners and the size of "the Black Hole."

Dr. C. R. Wilson says that "the area of Black Hole is 18 ft. by 14 ft. 10 in. This allows just 267 sq. ft. for 146 persons, or less than 2 sq. ft. for each."

It shows that these Englishmen never knew the elementary rules of Arithmetic and Geometry. How they were to place 146 persons in a room the area of which was not more than 267 sq. ft. "Geometry contradicting Arithmetic" gives lie to the story. So it is surely a tissue of gross falsehood, because there is no mention of the incident in Muslim chronicles of the time, *e. g.* Syed Ghulam Husain's Searul Mutaakhareen. It is neither mentioned in the proceeding-book of the English who had fled and taken refuge at Fulta, nor in the Report of the debate of the Madras Council. Clive does not mention in his letters to Watson and to the Nawab (in which he threatens to realise all the material damages committed by his sepoys, during the capture of Calcutta), or in the treaty of Alinagor. Clive in his letter to the Court of Directors explaining the reason why Sirajuddaula was dethroned, does not even refer to the Black Hole incident.*

There is no mention in the Note read by Holwell before the Select Committee on the 4th of August, 1756.

Now it was this notorious Holwell, (who was one of the prisoners, but was subsequently released) who invented this story, after the expiry of 8 months, since the capture of Calcutta. On the 28th February, 1757, on board while sailing to England, he wrote a letter of 32 pages, and therein this paltry knave manufactured this horrible tragedy. It will be a sheer injustice to Indian History if we place any implicit faith in the writings of Mr. Holwell, who was reputed to be a big liar, and who never blushed to spread lies. His co-religionists and compatriots considered him a letter of specious fibs.

Pen shrinks from recording the fraud and treachery displayed by these descendents of the old sea-king robbers which resulted in

* In case of occurrence of the incident this would have been considered the chief cause of his dethronement.

provided it was filled with the heads of the Moors.

There upon the insulted and enraged Nawab marched against the English at Calcutta, to punish them. Mr. S.C. Hill admits, "It will be seen therefore that Sirajuddaula had a show of reason in all the pretexts he alleged for his attack on the British." (Ibid) On the 24th May, 1756, without any damage on either side, the cowardly knaves surrendered the factory of Kasim Bazar to the Moors. Mark the humanity of Sirajuddaula that he treated the rebel robbers very kindly. From Kasim Bazar he marched on Calcutta and captured the fort of Tannah.

Over and over again the peace-loving and humane Nawab tried to bring the English to terms, but he misunderstood the knavish spirit of his opponents, who were determined to cross swords with him.

On Friday the 19th June, 1756, in the month of Ramzan, Calcutta was captured after a short fight. The English took to flight, most disgracefully leaving behind the sick, wounded and the natives to the mercy of the Nawab. The Nawab captured the besieged foreigners, but did not maltreat them. Even S. C. Hill Says:—'The native soldiers have plundered the Europeans of their valuables, but have not ill-treated them.'

Mr. Thortons says: "It was due to the generosity and magnanimity of the Nawab, that he did not totally annihilate the besieged (the English) but made them prisoners, who as a matter of fact must have been then and there put to sword; but they were captivated." The British have attributed a horrible story to the name of the humane Sirajuddaula, designated as the 'The Black Hole Tragedy.' If we go into the details of the so-called tragedy with careful attention and impartial judgment, then this story appears to be no more than a myth. The story is that after the fall of Calcutta 146 persons were confined in a room 18 feet square for the night and on the next day it was found that 123 had perished and only 23 survived. The exact measurement of the room and the number of the prisoners are uncertain.

Captain Grant says that the area of the room was 16 ft. square and the number of the

sort of arrangement reduced the Nawab to the verge of bankruptcy; so these insolent and undue inroads of the descendent of the sea-king robbers, on the pocket of the Nawab, simply roused his spleen. In order to do away with all the connecting links of their friendship with the Nawab, they backed up a rebel chief, a near relative of Sirajuddaula, named Nawab Shaukat Jung of Purnea, who at the instigation of the British raised the standard of insurrection. But Sirajuddaula a brave and an experienced general of his age, immediately subdued the rebel and treated him very kindly.

Shaukat Jung being affected by his humanity, became his sincere friend and handed over to him some letters, which he had recently received from the British for the continuation of the revolt. Sirajuddaula became very much furious, but he soon mastered his wrath.

But the disordered and intrigue-loving British were bent upon widening the gulf. They gave protection to Kishan Das, son of Raja Ballabh, who had incurred the displeasure of the Nawab. The immediate surrender of Kishan Das, which the Nawab demanded was insolently refused by the English at Calcutta. For a time the broad-minded and humane Nawab pocketed all these insults which were heaped on him by the English. After a short time the English began to raise new fortifications round the city of Calcutta, without the proper sanction of the Nawab, which brought the interests of the Company into direct conflict with the suzerainty of the Nawab. The Nawab being their overlord, ordered them to stop building the fortifications. But the officials of the Company who had reached the deepest abyss of depravity, inspite of the strict orders of the Directors to them 'to engage the Nawab to give you his protection, as the only and most efficient measure for security of the settlement and property' treated the messenger of the Nawab in a most ignoble and ungentlemanlike way, which brought a sudden rio of blood in the eyes of the Nawab.

The rumour ran that Mr. Drake replied to the spies that since the Nawab wanted to fill up the ditch, they consented to it,

son, Sirajuddaula—his successor; (which is the vivid proof of his farsightedness and statesmanship).

"Keep in view the power, the European nations have in the country. On the pretence of a private contest between their kings, they have siezed the country of the king (the Mughal Emperor) and the goods of his people. Think not, to weaken all three. The power of English is great, reduce them first; the others will give you little trouble, when you have reduced them. Suffer them not my son, to have fortifications and soldiers; and if you do, the country is not yours."

But a simple-minded and God-fearing Oriental is apt to lose his country, wealth and life by sheltering the insatiable gluttons of the earth. 'If you give an Englishman an inch he will ask for all,' is a well known maxim and the day is not far off, when he will become the sole master of your country. The English had a great desire to get possession of the 'paradise of India'; so they despised the ruler of Bengal.

The English hatred and jealousy was the ominous cloud on the horizon of unlucky Sirajuddaula This when he came to the throne of Bengal in 1756.

William Tooke in his narrative of the capture of Calcutta wrote:—"This is the first place we neglected him, *i. e.*, to make presents to the Nawab, when he came to the throne, (which is a custom in the East to offer presents to the king, when he is enthroned) and a man of infinite pride and ostentation (although abandoned to all manners of vice) gave him no small vexation, not only by slighting him as we did, but as there were very strong parties against him in the country, which made him apprehensive we favoured some of them."

The English looked upon the Nawab as their arch enemy and spared no pains to molest and insult him; for this purpose they adopted such paltry and mean measures which boiled his blood with indignation and wrath. They gave him offence by abusing their trade privileges, issued passes for free trade, (in the domain of the Nawab) to the Indian merchants too, from whom they extracted huge sums. These sums as a matter of fact, must have gone to the Imperial Treasury, instead of the pockets of these freebooters.

not reliable, because they have been written and magnified with a purpose. As Grant Duff says, "Many services performed without any great degree of exertion or ability, have in consequence of their results been extravagantly praised, and given a tone to Indian despatches which prejudices sober judgments."

In order to acquire an intimate and true knowledge of these facts, we should, to a great extent, rely on the contemporary Indian writers, such as, Syed Ghulam Husain, the author of 'Searul Mutaakhareen' and 'Rozatus Salateen', etc., whom Mr. Freeman styled the 'Original Authority.' While studying the history of British India we should be very careful and cautious, and should never place any implicit faith in the writings of the British people; for, they have left no stone unturned to paint the non-Christians in the blackest colour possible. Those humane and enlightened Christians, who tried to do some justice to Indian History, and at the same time endeavoured to show the colour of the descendents of the 'old sea-king robbers,* were severely dealt with, *viz*, Captain Cunningham, (the author of the Sikh Wars) and Major Worse Bell, etc. They expect every writer to white-wash the blackest deeds of their so-called heroes, at the expense of the Orientals. They never allowed any body to unravel the tangled veil of Indian History during the British period. If any body tries to shed some light on the misstated facts, it is condemned as a criminal offence; because they are not pleasant reading and hearing to the self sufficient and assertive inhabitants of England.

Alivardi Khan, the governor of Bengal, made himself practically independent of Delhi about the year 1740. He was a very capable and farsighted ruler, and thoroughly understood the intriguing nature of the British. He might have punged these robbers out of his territory, had he lived longer. On his death-bed he made the following speech to his grand-

* The well known English politician Sir Charles Dilk writing in the early seventies of the nineteenth century was forced to say that listening to the conversation at mess tables in India, they remembered their descent from the old Sea-king robbers; centuries of education had not purified their blood. (Basu's "Rise of the Christian power in India, Vol. I.)

# SIRAJUDDAULA AND THE 'BLACK HOLE TRAGEDY.'

By

**Mohammad Anwar Sheikh, Student of Class XII, B.**

*Intermediate College, Muslim University, Aligarh.*

"We must try to separate fiction from falsification, and strain our gaze so as to recognize the lineaments of truth liberated from those retouchings. The removal of the fabulous, the destruction of what is deceiving, may satisfy the critic; he only desires to expose a deceptive story......... The historian, however, requires something positive; he must discover at least some probable connection and put a more plausible narrative in the place of that which he has had to sacrifice to his conviction."—
Niebuhr.

As students of History, it must be our foremost duty to seek after truth, with impartial eye and unprejudiced mind, particularly when we are dealing with the British period in India. It should be incumbent on us to blot out all the myths and legends from the pages of History, so far as their scientifical, philosophical and critical study is concerned.

The historical accounts of the British supremacy in India have most shamefacedly been exaggerated and disfigured, by the European historians. The historical value attached to their records dwindles into insignificance when brought under the searchlight of impartial and critical investigation.

Every nation has its own peculiarities and points of view. The English historians of the British period have always been one-sided and prejudiced, on account of the absence of love for truth in their very nature. It is an admitted fact that the true historians are philosophers too, but unfortunately the English do not come under the same category; hence they are not reliable and trustworthy. One is grieved to express, that, it is an undeniable stain on the British character, that the British do not shrink from ignoring the historical facts and manufacturing strange stories to vilify the noblest characters of the East. I feel it my most pleasant duty to shed some light on the true historical narratives, regarding the establishment of the British Raj in India.

The main sources of the English historians are the records of the East India Company, which are

account of their development and evolution. Every student should be familiar with the prolonged, hesitant and difficult stages through which his special subject has passed before attaining its present comparatively perfected form.

Above all, we should be careful not to narrow down our interest in reading to any special branch. Myopia is a defect—even for intensive concentration on one object. To see our special subject in its proper proportion and context, our eyes should be open and able to see far and wide. The Science students should be given a glimpse into the glories of literature which unveils the incessant, creative activity of the human mind. The "Arts" students should know something of the wonders and mysteries of nature, of the ordered Universe revealed by Science, Biographies of eminent Scientists, a book like Gregory's "Discovery, or the Spirit of Science" would enthuse them and open out their mind to new worlds of thought and activity.

True culture does not discourage specialization—in fact, it postulates it. But it always stipulates that specialization should come after the foundations of a broad liberal education have been laid and interests have been quickened in the various domains of human life.



A widow bird sat mourning for her love
  Upon a wintry bough;
The frozen wind crept on above,
  The freezing stream below.

There was no leaf on the forest bare
  No flower on the ground,
A little motion in the air
  Except the mill-wheels' sound.

——P. B. Shelley.

for a man is rarely the unified, harmonious being he seems to be ; he is much oftener "a civil war," full of thrilling, fascinating and tragic possibilities. A play like Hamlet, with its subtle psychological analysis and insight, or a story like that of Dr. Jekyll and Mr. Hyde, which is more crystallized but gives much less attention to finer shades and complications, represents this class of human literature.

The students should try gradually to rid themselves or, at any rate, resort less frequently, to literature of a comparatively inferior quality and cultivate a taste and appreciation for the study of human character and personality and how they grow and develop. For, true culture, in so far as it can be gained through books, comes from the study of this class of literature—"the proper study of mankind is man." After they have read fairly extensively and found themselves and their real interests, they will begin to specialize in certain directions. Some will find themselves drawn to the vast and intriguing field of sociology, others will incline to the study of the natural sciences, while still others will seek in psychology the solution of problems presented to them in their study of literature. For it is in the bosom of literature that all the various studies find their natural and common meeting ground.

It should be the business of the various literary societies and groups in the college to encourage private and group reading. The literary societies, and the College and Union libraries should provide books for the further and advanced study of subjects in which their members are interested. There should also be popular books on various subjects which would be useful for those who are studying some special subjects, but want to make a general acquaintance with other fields of human thought as well. Moreover, special attention should be given to the History section, for the study of History should be an essential part of the equipment of every cultured and educated person. By history I do not mean only the political history of countries and nations. I include within the term accounts of development of all fields of knowledge. There is a history of Literature, a history of Mathematics, a history of Scientific thought *i. e.* a reasoned

*through writing.* These are the three main aspects of intellectual activity amongst students which I would like to discuss. But, for the time being, I shall confine myself to making a few suggestions with regard to the first, that is, study or private reading by the students.

To be useful and gripping, reading should be based on genuine personal interest and should yield pleasure. This is only possible when the College Library is sufficiently equipped to cater for the varied and graded interests of students with different tastes and psychological ages. But the teachers should try tactfully and unobtrusively to improve their taste and their standards of literary and human appreciation. In the early school age, boys would feel keenly interested in fairy tales and stories of pirates and adventures; then they would probably switch on to detective fiction and sensational plots, then pass on to heroic fiction, loving and identifying themselves with the living portraits of great figures of the past whom the magic pen and creative imagination of the writer invest with life. In course of time, with proper guidance and selection, the student begins to appreciate the play of the forces that make and mar human character, and feel the fascination of the tremendous drama of human life, going on around him every day, and portrayed vividly by some of his favourite authors.

This drama turns round the conflict or mutual interaction between various forces. It may be a representation of the conflict between man and man or between men and society, showing how they act and react, modify or destory one another. You may see this tremendous impact of human personality on its environment in a book like Ibsen's "Enemy of the People" or Hardy's "Tess," or Romain Rolland's "John Christopher." Or, it may be the study of the conflict between man and Nature—how man has gradually conquered Nature and how Nature has often easily and effectively put an end to the ambitions and schemes of men. The works of H. G. Wells or Knut Hansun's "Growth of the Soil" or some of Hardy's powerful studies of Wessex life belong to this category. Or, it may be the great psychological drama that is always going on within man—the play, the clash, the organization or the disruption of the great dynamic forces which are working with him,

possibly kill intellectual life, because they would be deprived of the stimulus and inspiration of contact with richly endowed and fertile brains. On the other hand, with a good teacher class work may become the nucleus for the initiation and suggestion of new interests and lines of inquiry, which, developed out of school, become healthy leisure pursuits and hobbies. I have seen how, under the inspiring guidance of capable and enthusiastic teachers students get interested in various things—a historical character or drama or the collection, say of botanical specimens—and then go on to do specialized research work on a small scale, in connection with them. It is a great tragedy, however, that usually our school and college education creates a positive distaste for reading and intellectual work generally. Naturally, therefore, it fails to vitalize and enrich the genuine out-of-school life and activities of the children and adolescents.

This point should be carefully noted. Education must cultivate in the boys worthy leisure interests and pursuits which would survive to the end of their days. Taste for good literature is one of the most pleasant and profitable acquisitions for one's leisure. It introduces us to a world, which is richer, fuller, more concentrated and more idealized than the drab everyday world which surrounds us. And yet how few of our students acquire this habit of reading in their spare time or make intelligent study of books a part of their life in the after-school period! Of those who do somehow get into the habit the vast majority lives on third class novels and soft, sentimental stories—poor food, indeed, for the growing and enlarging mind of adolescence.

The result is that their intellectual growth becomes stunted and their interests get cramped. The taste is spoilt for ever, because they get used to the trash that they read, unable to appreciate the finer shades of feeling and thought which great literature evokes and satisfies.

Intellectual life, in itself, is an elusive, spiritual activity and it is not possible to define it in concrete terms. But, in a college or any educational institution generally, it expresses itself in three forms or directions. It is cultivated through study or reading, stimulated and refreshed through discussion and crystallized and communicated

# THE DEVELOPMENT OF INTELLECTUAL LIFE IN COLLEGES.

BY

**Khwaja Ghulamus Saiyidain, B. A. (Alig), M. Ed. (Leeds)**

*Principal, Training College, Muslim University, Aligarh.*

I DESIRE, in this short article, to discuss briefly how intellectual life can and should be developed amongst the students of our colleges. It is a commonplace, only too true unfortunately of Indian Colleges, that most of our students do not develop any intellectual power or literary taste during their college careers. The result is that these institutions have degenerated into centres for coaching students to pass examinations and obtain certificates.

Now this obviously falls far short of the ideal which a college should place before itself. It should aim at evoking the best out of every one who enters its portals, giving him broad and wide interests, healthy and cultured tastes and generous, human sympathies. He should, moreover, be equipped for earning a livelihood or, at any rate, the beginnings of specialization should be laid along lines of dominant interest. He should be mentally alert, and keenly alive to questions of public import, with a moral sense of duty, and capacity to suffer personal inconvenience and loss in the pursuit of what he considers to be the truth or the right in any matter. He has in short, to be made a responsible, wide-awake citizen, with all the implications of the term. These are not extravagant claims to make, even after allowing for the weaknesses to which human flesh is subject. No institution imparting higher education is worth anything if it does not consciously and in an organized manner seek to achieve these aims.

Here, however, I am concerned only with one aspect of the many-sided interests and development which a college has to secure. I mean, with intellectual life. This should not be confounded with the routine teaching that goes on in the class rooms. This life is an outgrowth, a spontaneous expression of the interests and capacities of the students themselves. It cannot be forced upon them by their professors. If their teaching is mechanical and lifeless, it might

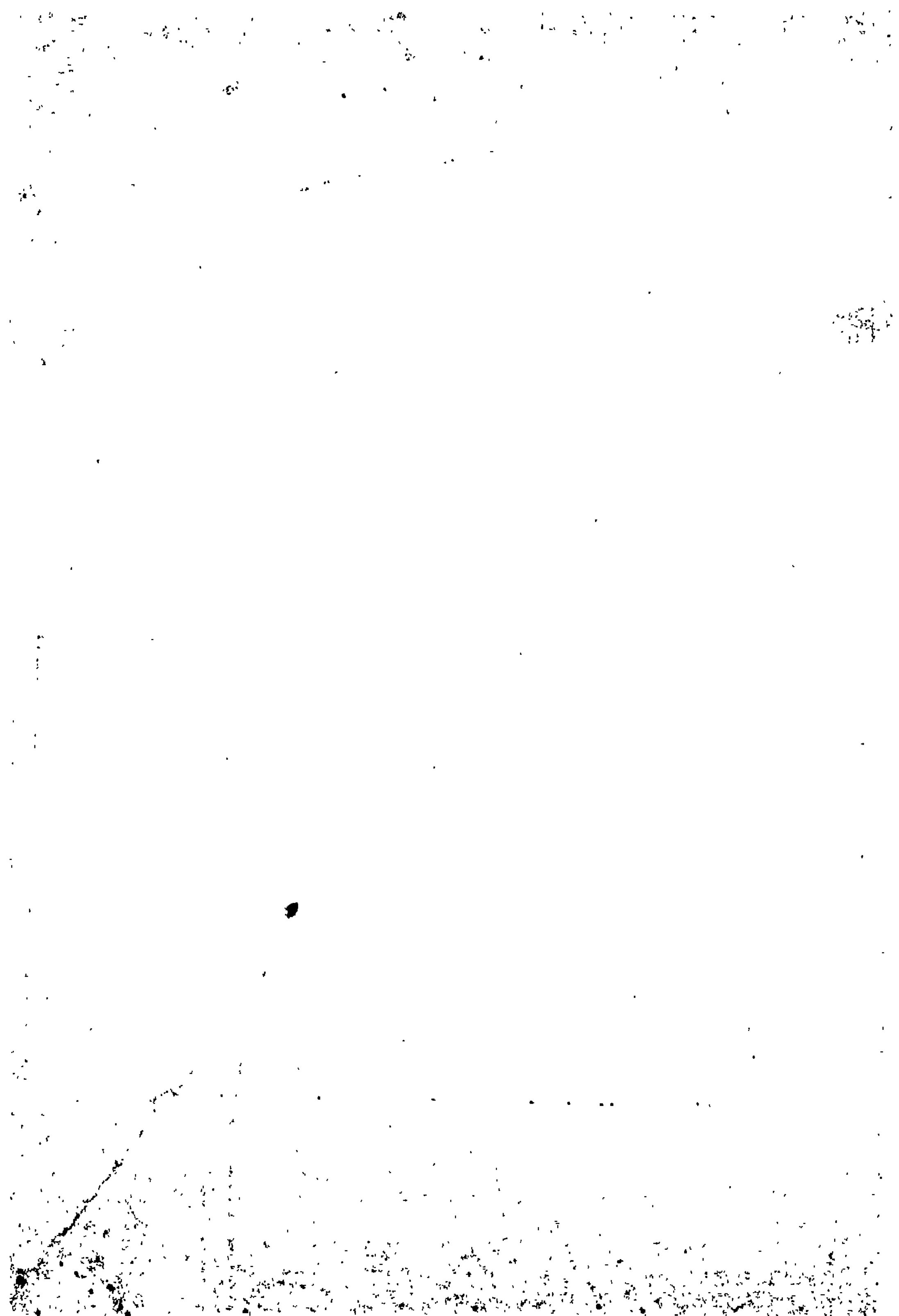
## CONTENTS.



# The Intermediate College Magazine




FEBRUARY
[illegible]





# انٹرمیڈیٹ کالج میگزین

## علی گڑھ

جلد ۱ — مارچ [illegible] — شمارہ ۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# انٹرمیڈیٹ کالج میگزین

جلد (۱) | بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۲۹ء | نمبر (۳)

## فہرست مضامین

---

## مغالطہ

فرہاد کے لئے صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا' اسی طرح ہمارے لئے بھی جناب رشید احمد صاحب صدیقی ایم اے سے مضمون حاصل کرنا جوئے شیر کے لانے سے کم نہیں۔ بعض گزشتہ واقعات کی وجہ سے رشید صاحب نے سالہاسال سے میگزین نوازی کا سلسلہ بالکل بند کردیا تھا لیکن ہمارے شدید اصرار سے مجبور ہوکر ہمیں خوشی ہے کہ رشید صاحب نے ہماری درخواست قبول فرمائی اور اپنے مخصوص انداز میں "مغالطہ" پر اپنے خیالات قلمبند فرماکر ہمارے میگزین کو سرفراز کیا' ہم ادب کے ساتھ اُن کی خدمت میں شکریہ عرض کرتے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ "کرسی" اور "مضمون" کے عہد و پیمان پر وہ ہمیشہ قائم رہیں گے۔

---

# دورِ حاضرہ کا اتھیلو

(مظہر عزیز متعلم درجۂ دوازدہم)

یہ وہ رات تھی جب وینس میں کارنیوال ہونے والا تھا کشتیاں[1] زرق برق ملبوسات کی کثرت کے سبب سے جگمگا رہی تھیں اور ہر دو اصناف کے حسن کے بہترین نمونوں کی جلوہ گری کے لئے وقف تھیں۔ قہقہوں سے تمام فضا گونج رہی تھی۔ چند خوش طبع صنفِ نازک پر پھول برسا رہے تھے جس کا جواب سر کے ہلکے سے خم یا ہونٹوں پر تبسم کی ایک لہر سے دیا جاتا تھا۔ جوں ہی کوئی ہوائی چھوٹتی اور اس کی روشنی آسمان کو منور کر دیتی تو لاکھوں نگاہیں اوپر اٹھ جاتیں۔ وینس کے رقص خانے سے موسیقی کی سُریلی صدائیں باہر آ رہی تھیں۔ آج یہاں ساڑھے نو بجے شب کو ایک عظیم الشان محفلِ رقص منعقد ہونے والی تھی۔ رنج و غم فراموش کر دیے گئے تھے اور ہر سو عیش و طرب کا دور دورہ تھا۔ سانتورو سائمن ڈی ٹلگیرو چند رفیع الشان قصرِ اطاق میں ٹہل رہا ہے' کارنیوال شروع ہونے کو ہے جس میں وہ اپنی بیوی کو لے جانے کا وعدہ کر چکا تھا ایک ہفتہ سے اس میں شرکت کے لئے تیاریاں کی جا رہی تھیں مگر خوبیٔ قسمت سے وہ آج اس میں شامل نہیں ہو سکتا۔ ٹلگیرو کے پرانے دوست اور اتالیق سانتورو فرڈیننڈا سینوزے نے اُسے اپنی جائے قیام پر بلایا ہے حیران ہے کہ کیوں کر اپنی بیوی کو یہ اطلاع پہونچائے تاکہ اُسے رنج اور مایوسی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

اُس نے طلبی نامہ کو پھاڑ کر پھینک دیا اور اپنی بیوی کے کمرہ کی طرف چلا۔ "سیمونٹا" اُس نے آواز دی۔

دروازہ کھلا اور وہ لیمپ کی روشنی میں بنی سنوری' بہترین ریشمی پیراہن زیبِ تن کئے اور اپنی رعنائیوں کو اس تزئین سے دوبالا کئے دکھائی دی۔ ٹلگیرو کی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے اس مجسمۂ حسن کو دیکھ کر چکا چوند ہو گئیں۔

"پیارے۔ کیا تم تیار ہو" اُس نے اپنے شوہر کا بازو تھام کر سوال کیا۔ مگر اُسے مایوسی ہوئی۔ اُس نے اُس کے خوبصورت چہرہ پر تردد کے آثار دیکھے۔ سیمونٹا متحیر رہ گئی اور کوئی وجہ دریافت نہ کر سکی۔

"میں سیکنڈریگارڈا جا رہا ہوں۔ مجھے فرڈیننڈ نے بلایا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں رقص میں شرکت نہیں کر سکتا" ٹلگیرو نے اس کی نظروں کی تاب نہ لا کر دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

---

[1] وینس میں سیر و تفریح یا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے کشتیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی نہریں گویا وہاں کی سڑکیں ہیں۔

"ہیں! پیارے سائمن۔ کیا تمھیں جانا ہی پڑے گا۔ کیا تم مجھے رقص میں نہ لے جاؤ گے؟"

لگلیرو کی پریشانی بڑھ گئی۔ اُس نے دل ہی دل میں فرڈیننڈ کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ اُس کی دلی پریشانی اور انتشار اس کی حرکات اور گفتار ظاہر کرتی تھیں۔

اُس نے رُک رُک کر کہا "ہاں! آج تو جانا ہی پڑے گا"۔ سیمونا کی آواز رنج کے سبب گلے میں پھنس گئی۔ اُس کے تعجب اور مایوسی کی انتہا نہ تھی۔ وہ مُڑی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ لگلیرو تھوڑی دیر تک اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر وہ بھی مڑا اور ہال میں چلا گیا۔

سیمونا کمرے میں پہنچکر صوفے پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رقص میں شرکت نہ کرسکنے کے باعث ہی نہیں بلکہ اپنے شوہر کے طرزِ عمل کی وجہ سے۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے اپنا سر اُٹھایا اور اپنے سامنے ایک خوش رو نوجوان کو کھڑا ہوا پایا۔ جس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک اور جاذبیت تھی۔

"مونشیر کارل!" اُس نے انتہائے حیرت میں اس کو پہچان کر کہا "تم اور یہاں!"

"سائنورا۔ میں معافی چاہتا ہوں"۔ اس نے عجیب انداز سے سر کو خم کرکے کہا۔ "دستک کا جواب نہ پاکر میں نے کمرے میں داخل ہونے کی جرأت کی۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے معاف کردیں گی"۔

سیمونا نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے اُسے بیٹھنے کو کہا۔

"شکریہ۔ مگر کیا آپ محفلِ رقص میں شریک نہ ہونگی۔ آپ کو اسے چھوڑنا نہ چاہیئے۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ وہاں جانے کے لئے بالکل تیار ہیں۔ سائنور لگلیرو کہاں ہیں؟"

"اوہ۔ وہ تو سیکنڈ ریگارڈا گئے ہیں"۔ اُس نے کہا اور ساتھ ہی ایک سوچ میں پڑ گئی کہ اُسے اُس کی درخواست منظور کرنی چاہیئے یا نہیں۔

مگر کھ در پہلے ہی ہار گیا تھا۔ اُس نے نہایت لجاجت آمیز لہجہ میں کہا "اچھا! اگر وہ نہیں ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں میں آپ کے ہمراہ چلنے کی عزت حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوں۔ میری کشتی باہر منتظر کھڑی ہے۔ میری عین عزت افزائی ہوگی"۔ اور اس کے ہونٹوں پر تبسم کی وہ جھلک نمودار ہوئی جس نے صنفِ نازک کے متاعِ ہوش و خرد پر بارہا تاخت و تاراج کی تھی۔ سیمونا آخر عورت تھی ہار گئی۔

سینٹ ویلنٹائن کے گھنٹہ نے دس بجائے۔ لنگیرو نے جلدی سے سیمونا کے کمرہ کا دروازہ کھولا۔ سیمونا کی آخری مایوسانہ نگاہیں رہ رہ کر اُس کے دل میں اضطراب و کرب کا ایک طوفان پیدا کرتی رہی تھیں۔ وہ ابھی آدھا راستہ ہی طے کرنے پایا تھا کہ محبت اطاعت پر غالب آگئی۔ اس نے فرڈینینڈ سے ملنے کے ارادہ کو فسخ کر دیا اور لوٹا تاکہ سیمونا کے ساتھ رقص میں شریک ہو مگر ........ سیمونا وہاں نہ تھی۔ اُس نے پکارا "سیمونا، تم کہاں ہو؟" مگر بستر کو دیکھنے پر معلوم ہوا کہ آج کوئی اُس پر سویا ہی نہیں۔

"آخر وہ کہاں گئی ہوگی؟" اُس کے دل نے سوال کیا اور خود بخود جواب سن لیا "بال روم"

معاً اُس کی پیشانی پر غم و غصہ کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ جلدی جلدی سیڑھیوں سے نیچے اُترا اور کشتی میں بیٹھ کر فوراً "بال روم" کا راستہ لیا۔ ملازم سے اُس نے شرکائے رقص کی فہرست طلب کی اور ناموں پر انگلی پھیرتے ہوئے اُس نے لکھا دیکھا۔

"ایم۔ کارل ........ سائنورا سیمونا ڈی لنگیرو"

یہ پڑھتے ہی وہ آگ بگولا ہو گیا۔ انتہائے طیش میں اپنا ہونٹ چبایا اور سوچا "تمام اہل وینس کیا خیال کرینگے میری بیوی اور ایسے بدنام شخص کے ساتھ شریک رقص ہو! سب انگشت نمائی کرینگے۔"

وہ گھر واپس ہو گیا۔ پشیمانی، خفت، غصہ، حسد اور رقابت اُس کے دل میں مختلف خیالات پیدا کر رہے تھے وہ اپنے بستر پر گر پڑا اور کروٹیں بدلنے لگا۔ نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

گھنٹے نے ٹن ٹن چار بجائے۔ ایک کشتی دروازہ پر رکی۔ سیمونا اور کارل اُترے۔ وہ کارل کے کاندھے پر سہارا لئے ہوئے تھی۔ رقص میں حصہ لینے کی وجہ سے وہ بہت تھک گئی تھی۔ لنگیرو نے جھروکے سے دونوں کو جھانک کے دیکھا۔ مگر افسوس! معمولی واقعات کتنی جلد انسانی قسمتوں کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔ وہ اس نظارہ کی تاب نہ لا سکا ایک ہاتھ سے اپنے دل کو تھام کر اور دوسرا اپنی آنکھوں پر رکھ کر وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنے کمرے میں واپس آیا۔ اُس کے دل میں جلن تھی اور آنکھوں میں آنسو (اور آنسو تو واقعی ایک مضبوط آدمی کی کمزوری کی علامت نہیں ہیں)

اُس رات کو بھلا اُسے نیند کہاں نصیب تھی۔ کبھی وہ اپنے آپ کو کارل کا گلا گھونٹتا ہوا معلوم ہوتا تھا کبھی خون آشام خنجر اُس کے ہاتھ میں چمکتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اُس کا دماغ چکر کھا رہا تھا اور [illegible]

اور رہتی دنیا تک اس کا وعدہ و آمد واجب [illegible] ہے۔ اس کے نیچے عالمگیر سے کسی کو مفر نہیں۔ اگر کسی غریب پر کیوں بھولی
تو شاہ ہفت اقلیم پر بھی کامراں رہی۔ اگر ظالم کو ظلم [illegible] مٹایا تو مظلوم پر بھی رحم نہ کھایا۔ اگر گنہگار کو عذاب دیا تو پرہیزگار پر بھی عتاب
کیا۔ اگر اولیائے کرام کی عظمت سے ہراساں نہ ہوئی تو انبیائے عظام کی حشمت سے بھی لرزاں نہ رہی۔ اس سے رستم تا کاوہ
دم نہ مار سکا۔ اس کا ناوک کبھی خطا نہ ہوا بلکہ نخچیر نے خود ہی گردن ڈال دی۔

مجھے اس کی سلطنتِ جہانگیر کے لئے دلیل کی حاجت نہیں۔ ہم آپ سبھی نے دیکھا کہ لاکھوں ہستیاں علمی، اخلاقی، سیاسی
دنیا میں تیز رفتاری سے منزل ارتقا پر پہنچیں۔ عزت شہرت کا تاج فرقِ اقبال پر رکھا۔ ہر خاص و عام کے دلوں میں وقار پیدا
کیا۔ امیر قوم ہوئیں مشعل ہدایت بنیں لیکن اُن کی نظیر اُس خورشید تاباں کی طرح ہے جو طلوع ہو کر اپنے شعاع عمیم سے ہر ذرہ
فطرت کو منور کرتا چمکتا دمکتا سرِ شام غروب ہو گیا اور اس غنچۂ سربستہ کی سی ہے جو فیضِ بہار سے گل شگفتہ ہو کر اپنی خوشبوئے
دل آویز سے گلزار کو معطر بنا کر مرجھا گیا۔ مگر چشم غافل اب بھی ہوشیار نہ ہوئی۔ خود پرستی کا برا ہو ٹھوکریں کھا کر بھی آگاہ نہیں ہوتی۔
ایسے روشن اشاروں پر بھی اپنی فرعونیت سے توبہ نہیں کرتی۔ مرگِ ناگہاں کے قہر دستِ اجل کے جبر سے ذرا نہیں ڈرتی۔ طرفہ
ستم یہ ہے کہ دور جدید کے گمراہ فلسفہ پرستوں نے اسرار موت و بعد الموت اور اس تعلیم اسلامی ع

خاک شو پیش از آنکہ خاک شوی

کو خود فراموشی کا مآل کر بیٹھے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ اوروں کو بھی گمراہ کرنے میں ہمہ تن لگے ہوئے ہیں۔ یاد موت سے اس لئے
بیزار ہیں کہ ہونے والی بات کا ورد و ذکر عبث ہے۔ سرور زندگی سے مسرور ہونا چاہیئے۔ مسرت حیات کو توہمات مستقبل سے منغص و مکدر
کرنا خلاف عقل ہے اگرچہ قیام بشری دو روزہ سہی، اشغال و مشاغل دنیا میں توجہ ضروری ہے۔ نہ خوف قضا میں جس کی وجہ سے
ہمت استقلال جوش و خروش پر مردنی بے ہنگام چھا جائے اور اس پژمردگی کے باعث کارہائے عالم ادھورے رہ جائیں۔
چمنِ زیست بھری بہار میں خزاں آشنا ہو۔ لیکن حکمتِ صحیحہ :

موتوا قبل ان تموتوا

ہے یعنی اپنے مرنے سے پیشتر ایک میت کی طرح تماشائے جہاں سے آنکھیں بند کرلو۔ ہاں بقدر معاش و معاد اس طرف متوجہ
رہو۔ کیونکہ ایک امین کو کسی کی امانت اپنی ملکیت سمجھنی زیبا نہیں۔ اگر صاحب ملک اختیار دے تو صرف بجا تصرف
ہے۔ بعینہٖ یہی حال روح کا ہے۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"

یہ جان کر کہ کل مرنا ہے کچھ نہ کرنا بھی غلط فہمی ہے اور یہ سمجھ کر کہ زندگی میں زیست کے مزے اٹھائیں خوف روز جزا دل سے بھلانا بھی نادانی ہے۔ چنانچہ آئے دن دیکھا جاتا ہے کہ انسان جب قصد سفر کرتا ہے تو روانگی سے قبل ضروریات کی انجام دہی سامان مسافرت کی بہم رسانی میں سعی و سرگرمی شروع کر دیتا ہے۔ اگر اس میں بے پروائی کرتا ہے تو کام ناقص رہ جاتا ہے۔ اسی طرح سفر آخرت یعنی ساعت موت اچانک آنے والی ہے اس لئے اس کے واسطے ہر وقت تیار رہنا چاہیئے۔ ؎

ایک ہاتھ باگ پر ہے تو ایک پا رکاب میں

یوں منتظر کھڑا ہوں میں کوس رحیل کا

سچ پوچھئے تو موت قابل فراموش نہیں۔ اس کی یاد ہمت و ارادہ، ولولہ و جولانی کبھی کم نہیں کرتی۔ بلکہ اس کی وجہ سے آدمی کے فتنہ و شر، قتل و غارت، کبر و غرور، بغض و حسد کے خیالات فنا ہو جاتے ہیں۔ گداز قلب، حلم مزاج حاصل ہوتا ہے یہ سبق آموز اور دانش افزا ہے۔ اس کا خیال ہر فساد سے بچاتا ہے۔ جنہوں نے اسے نظر انداز نہیں کیا در اصل انہیں اندوہ نہیں۔

ابھی تک یہ راز مخفی حل نہ ہوا کہ وقت واپسیں بشر کس رنج و درد میں مبتلا ہوتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ روح حیاتی کی کمی ہے کرب و اضطراب کی شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی کی رائے ہے کہ عضو کو شکنجہ میں دبانے سے جو تکلیف محسوس ہوتی ہے دم نزع بھی وہی اذیت معلوم ہوتی ہے اور حق تو یہ ہے کہ اس غم و الم کو مرنے والا ہی خوب جانتا ہے۔ بہرکیف موت کے وقت انسان اور اس کے جسم و روح مصائب و شدائد میں گرفتار ہوتے ہیں۔ پھر مرد شجاع کی طرح جان دے بیٹھتا ہے۔ کیونکہ پیشتر اپنی موت کو دیکھ کر خوف زدہ ہوا اس کے بعد رفتہ رفتہ مانوس بنا اور یہ احساس کرنے لگا کہ حیات مستعار کی تمنا فضول و بیکار ہے۔ عیش پرستی، راحت پسندی طبیعت سے زائل ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اسے بھی فراموش کر جاتا ہے کہ اس وقت مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ جیسے بے حس بچہ معمولی چیز سے ڈرانے کے بعد خائف ہو جاتا ہے۔ لیکن جب اسے دلیر بنایا جائے تو خوف و ہراس دل سے چلا جاتا ہے۔

واقعات بتاتے ہیں کہ جب انسان بستر علالت پر جاتا ہے تو خیال موت ضرور کرتا ہے۔ امید و بیم کے مابین دیکھتا ہے شفا کی امید کم [illegible] زندہ [illegible] دوست کی حسرت بھری جدائی دنیا کی مفارقت یاس [illegible] آمیز

جذبات مرض ایک گونہ اضافہ کر دیتے ہیں۔ پیچ و تاب کی حد نہیں رہتی۔ گھر کی ہر شے کو الفت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہتا ہے کہ میں نے کس مشقت سے یہ اسباب تعیش جمع کیا ہے لیکن ہیہات اس سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔ اب میرے بعد ان اموال پر دوسرے متصرف ہونگے۔ جو میرے نام پر ایک پیسہ بھی صرف نہ کرینگے۔ افسوس دنیا بھی خراب عاقبت بھی برباد۔ کبھی اولاد کو حسرت آلود نگاہوں سے دیکھ کر کف افسوس ملتا ہے کہ یہ نخل تمنا، یہ نہال آرزو خون دل خون جگر سے سینچے لیکن گل و ثمر سے بہرہ یاب نہ ہوا۔ اپنی ناکامی و نامرادی پر لاکھ لاکھ اشک ریزی کرتا ہے۔

مشہور ہے کہ کسی خسرو اقلیم نے محمود غزنوی کو خواب میں دیکھا کہ اُس کا سارا بدن تو خاک ہو گیا مگر چشمہائے حسرت اسی طرح مصروف تماشا ہیں۔ وہ اس خواب حیرت افزا سے پریشان ہی تھا کہ عارف خدا نے تعبیر دی کہ اسے پس مرگ بھی چین نہ ملا۔ وہ یوں مغموم ہو رہا ہے کہ میری دولت سے اغیار مالا مال ہو رہے ہیں۔ ارباب عقل کا قول ہے کہ مال عمر کی آسائش کے لئے ہے نہ عمر مال کی فراوانی کے واسطے۔ اس نے کہا "نیک بخت آنکہ خورد و کشت و بدبخت آنکہ مرد و ہشت۔"

ابھی مریض حرص و ہوس کے تخیل سے فارغ ہوا تھا کہ اپنے کمزور اعمال پر تامل کرنے لگا کہ آہ تمام عمر عیش طلبی کے غفلت خواہی میں گزری خدا جانے مرنے کے بعد کیا حشر ہو۔ نیز یہ کہ اعزا و اقربا زندگی کے شریک تھے مرجانے پر دو آنسو بہا کر خاموش ہو جائیں گے۔ مجھے بداعمالیوں کی سزا بھگتنی پڑے گی تو اس کے خیالات منتشر اور بھی پراگندہ ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی جب اس کی قوت خیالیہ دوزخ کی خوفناک تصویر ہیج درہیج کے پیش کرتی ہے تو بے حد بیتاب ہو جاتا ہے۔ بیساختہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے بلکہ عزم صمم کر لیتا ہے کہ اگر اب کے جیتا بچ گیا تو عمر کا باقی حصہ نیک اعمال اور یاد الٰہی میں گزارونگا اگر وقت رحلت آپہنچا تو خیر ورنہ بستر مرض سے کھڑے ہوتے ہی وہ سارے وعدے طاق نسیاں کے سپرد کر دیئے کاش بشر خیال مرگ سے کسی وقت غافل نہ ہو۔ ہردم اپنے کو حباب بحر کی مانند سمجھے۔ دولت آخرت کی فراہمی میں گرم جوشی دکھائے رشک و کینہ، جنگ و جدل اور عیب جوئی سے پرہیز کرے۔ دنیائے سفلہ پرور سے متنفر ہو دین کرم کے ہر کلمہ کو راز حیات جانے اور کار خیر میں کوشاں رہے۔

بہ سلطان طامع باشند و بس

---

# پُراسرار قتل

از جناب انیس الدین احمد صاحب رضوی ایم اے
ایڈیٹر یونیورسٹی میگزین

ہم جناب انیس صاحب کی اس قدر نوازی کے بے حد ممنون ہیں۔ ایڈیٹر

الماری کھول کر میں نے اپنا ریوالور نکالا اور یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ ٹھیک کام دیتا ہے یا نہیں، کئی مرتبہ اس کا گھوڑا دبایا۔ یہ ریوالور جنگِ عظیم کے زمانہ کی ایک پرانی یادگار تھا، اور ۱۹۱۹ء کے بعد میں نے اسے ہاتھ تک نہ لگایا تھا۔ البتہ میرا ملازم ولکن گاہے گاہے تیل دے کر صاف کرتا رہا تھا۔ میں تو شاید یہ بھول بھی چکا تھا کہ میرے پاس کوئی ریوالور ہے لیکن گزشتہ ہفتہ کلاڈ ڈرکنسٹر کے خط نے متنبہ کر دیا۔

میں نے اس میں چھ چھوٹے چھوٹے کارتوس بھر لئے۔ میرے دماغ میں جنگ کے واقعات گھوم رہے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ ریوالور کی نلی میری انگلیوں کے لمس کو دعوتِ اتحاد دے رہی ہے۔ ہولناک لڑائی کا سماں میرے پیشِ نظر تھا۔ خندقوں پر حملوں کی کیفیات دیکھ رہا تھا، اس حصۂ زمین پر جو کسی شخص کا ملک نہ تھا، اپنی پہرہ داری کے مناظر آنکھوں کے سامنے گزر رہے تھے اور میں ان مہیب لمحات کو یاد کر رہا تھا، جب ہم فرطِ حیرت و خوف سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے تھے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔

اس زمانہ میں میرا خیال تھا کہ میں جنگ کی ماہیت سے بخوبی آگاہ ہو گیا ہوں لیکن میں نے کسی بدمعاش کے پھندے میں پھنسنے کا تجربہ نہ اٹھایا تھا۔ چند روز ہوئے کہ مجھے کلاڈ ڈرکنسٹر کا خط ملا جس کی تحریر باریک اور گنجان تھی اور ہلکے سفید کاغذ پر لکھا ہوا تھا۔ خط کا مضمون حسب ذیل تھا۔

مکرمی، تسلیم۔ مجھے آپ سے شرفِ نیاز حاصل نہیں ہے۔ تاہم امید ہے کہ آپ مس ایڈنزین سے اپنی نسبت ہونے کی خوش نصیبی پر میری طرف سے دلی مبارکباد کو شرفِ قبول فرمائیں گے۔ میں صمیم قلب سے آپ کی اور آپ کی مجوزہ بیوی کی مسرت و شادمانی کا خواہاں ہوں۔

اس کے بعد مجھے اجازت دیجئے کہ ایک ضروری معاملہ کی بابت کچھ عرض کرسکوں۔
پکاڈلی کے پُراسرار قتل کے واقعات آپ کی یاد میں اب ضرور تازہ ہوں گے۔ ایک مشہور قمار باز، لیون کیوگینی، پکاڈلی کے ایک مکان میں مقتول پایا گیا تھا۔ لیکن اسکاٹ لینڈ یارڈ کی انتہائی کوششوں کے باوجود بھی قاتل کا سُراغ آج تک نہ مل سکا۔ آپ کو یہ سُن کر واقعی تعجب ہوگا کہ اس جرم کا ارتکاب آپ کی محبوبہ کے بھائی، باسل فرین کے ہاتھوں ہوا تھا۔ دنیا میں اس واقعہ سے صرف دو شخص آگاہ ہیں، مس ایڈ فرین اور میں۔ میں اتفاقیہ قتل کے وقت وہاں موجود تھا، اور آج اس وقت میرے پاس باسل فرین کا دستخطی اقبال نامہ مکمل اور مفصل موجود ہے۔
شاید یہ عرض کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سراغ رساں اس اقبال نامہ کو حاصل کر کے بہت خوش ہوں گے۔ لیکن دوسری طرف کس قدر افسوسناک بات ہوگی کہ آپ کی شادی کی رسومات میں خون کا ایک ایسا سنگین مقدمہ خلل انداز ہو، جو آپ کی دلہن کے خاندان سے متعلق ہے۔ اس کے علاوہ مس فرین کی کس قدر بدنصیبی ہوگی کہ وہ گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر سوالاتِ جرح کی مصیبت برداشت کریں۔ کیا آپ یہ امید کرسکتے ہیں کہ وہ "ہنی مون" کا مہینہ اطمینان و مسرت کے ساتھ بسر کرسکیں گی، درآں حالیکہ ان کا بھائی اسی عرصہ میں پھانسی پاچکا ہو؟
ان حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ آپ باسل فرین کے اقبال نامہ کو خرید لیں۔ تاکہ پولس کے ہاتھوں میں نہ پڑنے پائے۔ اس کی قیمت پانچ ہزار پونڈ ہے جو کل دوپہر تک نوٹوں کی صورت میں مجھے مل جانی چاہئے۔ اس وقت کے بعد پانچ پونڈ فی گھنٹہ کے حساب سے قیمت میں اضافہ ہوتا رہے گا، یہاں تک کہ جمعہ کو رات کے بارہ بجے اس رعایت کی میعاد ختم ہوجائے گی، اور یہ اقبال نامہ اسکاٹ لینڈ یارڈ میں بھیج دیا جائے گا۔
شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ میں فی الحال نمبر ۲ ڈیلٹن روڈ میں قیام پزیر ہوں جو آپ کے مکان سے صرف پانچ منٹ کی مسافت پر واقع ہے۔ اور میں ہر وقت آپ سے معذرت کے، ملاقات کرنے کے لئے تیار رہوں گا۔
آپ کا مخلص،
کلاڈ ڈریک

بدمعاش نے اس کے بعد کوئی خط نہیں لکھا لیکن ایک دن میں خود کئی مرتبہ آگیا اور دھمکی کر جاتا کہ قیمت میں برابر
اضافہ ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی ایک تمسخرانہ انداز میں یہ بھی دریافت کر لیتا کہ ہم اپنی شادی پھانسی سے پہلے منانا چاہتے
ہیں، یا اس کے بعد۔

یہ تمام واقعہ بالکل صحیح تھا۔ ایڈنے پہلے ہی یہ افسوس ناک قصہ مجھے سنا دیا تھا اور وہ اس پر مصر تھی کہ نکاح
کی رضامندی دینے سے پہلے مجھے یہ قصہ سن لینا چاہیئے۔ بابل فرین ہمیشہ سے ایک آوارہ اور بدمعاش انسان
تھا، اسے اسکول سے نکال دیا گیا تھا، اور اس کے بعد سے ہمیشہ یوں ہی ٹھوکریں کھاتا پھرتا رہا۔ یہ قتل بھی قمار بازی
کے سلسلہ میں ایک اچانک جھگڑے کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا۔ مقتول لیون لیوگینی پورے درجہ کا بدمعاش تھا، اور
دنیا کا اس کے وجود سے پاک ہو جانا بہتر ہی ہوا۔

ایڈ کو معلوم تھا کہ کوئی تیسرا شخص بھی اس کے بھائی کے جرم سے واقف ہے۔ اس تیسرے شخص نے
بابل سے اپنی خاموشی کی قیمت کے طور پر دو ہزار پونڈ طلب کئے تھے اور ایڈ کو اس رقم کے علاوہ آرجنٹائن تک
کرایہ کے لئے ساہوکاروں کے پاس جانا پڑا تھا۔ اس کے بھائی کا ارادہ تھا کہ آرجنٹائن میں جا کر از سرِ نو کاروبار
شروع کرے۔

اور اب اس کلاڈ ڈرکسٹر نے مجھے پھانسنا چاہا۔ میں پولیس میں رپورٹ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، اس کے
یہ معنی ہوتے کہ میں خود ہی بابل فرین کے راز کو افشا کر رہا ہوں بابل کی تو پرواہ مجھے کچھ زیادہ فکر نہ تھی، لیکن ایڈ کو
اس سے بہت محبت تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا اس بدمعاش کی مطلوبہ رقم ادا کر دوں یا یہ تمام دھمکیاں محض ایک فریب
سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ہیں۔

---

تمام دن اور تمام رات میں سوچتا رہا، اور ان سوالات کو حل کرنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن ہمیشہ میرے
دماغ پر ایک خیال عجیب طریقہ سے مسلط رہتا کہ اس بدمعاش کو خاموش کرنے کا صرف ایک ذریعہ ہے جو مجھے الماری میں رکھا
ہوا پستول یاد آ رہا تھا۔ میں نے اس خیال کو دماغ سے نکال دینا چاہا، دل کو یہ فریب دینے کی کوشش کی کہ میں
کسی صورت میں بھی دوسرے انسان کی جان نہیں لے سکتا، خواہ وہ انسان پورے درجہ کا بدمعاش ہونے کے علاوہ

میری محبوبہ کی حقیقی مسرت کے لئے کتنا ہی سود مند کیوں نہ ثابت ہو رہا ہو لیکن ــــــ اب کام کا عمل کا وقت تھا۔ اب فریب دینا بے سود تھا۔

میں نے بھرا ہوا ریوالور جیب میں ڈال لیا اور چپکے سے مکان سے نکل گیا، تاکہ کلن کی آنکھ نہ کھل جائے۔ مکان کے باہر کوئی ذی روح نظر نہ آتا تھا۔ رات خوشگوار تھی، اور ہر طرف مکمل سکوت طاری تھا۔ تمام کائنات خواب میں محو معلوم ہوتی تھی۔

لیکن نمبر (۱)، ڈلٹن روڈ کی سامنے والی کھڑکی سے روشنی کی شعاعیں چھن چھن کر نکل رہی تھیں۔

مکان کی گھنٹی بجی، اور چند لمحہ بعد ایک شخص نے دروازہ کھول دیا جس کا چہرہ شگفتہ، ہونٹ پتلے پتلے، آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور تن و توش کے لحاظ سے کافی موٹا تازہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ کلاڈ ڈرکسٹر بدمعاش تھا۔

"آئیے، مہربان عزیز، تشریف لائیے" اس نے متواضعانہ انداز میں کہا "آپ سے مل کر بہت خوشی حاصل ہوئی بڑی مسرت ہوئی"

میرے داخل ہونے کے بعد اس نے دروازہ بند کر دیا، اور مجھے لے کر کمرہ میں پہنچا۔

"کس قدر افسوس ہے کہ آپ نے اتنی دیر لگائی" اس نے نیم مستہزیانہ انداز میں کہا "اس کی قیمت اب پانچ ہزار پانسو پچپن پونڈ ہو گئی ہے۔ آپ چاہیں تو پنسل اور کاغذ لے کر حساب لگا دیکھئے۔ لیکن اب کوئی مفر نہیں۔ خیال فرمائیے کہ ایک خون کے مقدمہ کی تکالیف اور بدنامیوں سے یہ بدرجہا بہتر ہے کہ ۵۰۰ پونڈ ادا کر دیئے جائیں۔ حقیقتاً بالکل قرین کو پھانسی سے بچانے کے لئے آپ کے اوپر یہ بہت بڑا بار ہوگا۔ تاہم یہ بھی تو خیال کرنا چاہیئے کہ وہ آپ کی منسوبہ کا بھائی ہے۔ وہ بے چاری تو اس امید میں ہو گی کہ میرا بھائی از سر نو زندگی شروع کر رہا ہے، ممکن ہے اس دنیا میں کچھ کارآمد ثابت ہو سکے۔ غریب بیچاری لڑکی! اس قدر حسین، اس قدر دل فریب اور اپنے بھائی سے بالکل متضاد۔ واقعی اس خیال سے جسم میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اسے ایک خونی قاتل کی بہن کہہ کر پکارا جائے گا لیکن افسوس ایسے آوارہ مزاج تقریباً ہر خاندان میں ہوتے ہیں کس قدر افسوسناک بات ہے کس قدر افسوسناک!"

میں کمر پر ہاتھ رکھے کھڑا رہا، اور انتظار کرتا رہا کہ وہ شخص اپنی بکواس ختم کرے [illegible]

"اچھا لیکن ہم کو اخلاقیات پر بحث کرنے میں وقت ضائع نہ کرنا چاہیئے [illegible]

کیا آپ روپیہ ساتھ لائے ہیں؟"

"قبل اس کے کہ قیمت ادا کی جائے، میں یہ دیکھ لینا چاہتا ہوں کہ میں کس چیز کو خرید رہا ہوں۔"

میرا خیال ہے کہ اس وقت سے زیادہ میرا دماغ کبھی صاف نہ ہوا ہوگا۔ عنقریب جو واقعات پیش آنے والے تھے، میری آنکھوں کے سامنے وہ اسی وقت گھوم رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ کلاڈ ڈرکسٹر اس وقت میرے رحم وکرم پر ہے۔

"عزیزمن! آپ کا یہ مطالبہ بالکل جائز ہے۔ میں بامل فرین کا اقبال نامہ ضرور آپ کو دکھادوں گا۔ وہ سامنے اس الماری میں بند ہے لیکن اس کو کھولنے سے قبل ایک احتیاط صرف ایک احتیاط ضروری ہے۔ کیا آپ براہ مہربانی اپنے ہاتھ سر کے اوپر کرلیں گے اور اس عرصہ میں وہیں رکھیں محض احتیاط کے طور پر تاکہ کوئی اتفاقی حادثہ پیش نہ آجائے۔ آپ خود جانتے ہیں یعنی کسی اتفاقی حادثہ کی پیش بندی کے طور پر"

اس نے اپنی جیب سے ایک ریوالور نکالا اور میرا نشانہ باندھ لیا۔ میں نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھالئے۔ پھر وہ کہنے لگا۔

"حقیقتاً صرف احتیاط کے طور پر یہ کیا گیا ہے، اور عزیزم، آپ جانتے ہیں آج کل کوئی شخص کسی خطرہ میں پڑنا نہیں چاہتا۔"

وہ کہتا رہا، اور الماری کی طرف بڑھتا رہا۔ جو کمرے کے ایک کونے میں رکھی ہوئی تھی لیکن اس کی نظریں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں اور ریوالور کی نال میرے سینہ کو نشانہ بنائے ہوئے تھی۔ اُس نے بائیں ہاتھ سے عجیب و غریب تالا کھولا، اور پھر کہنے لگا۔

"یہ تالے بھی خوب ہوتے ہیں، واللہ اگر ان کی صنعت کا بھید معلوم ہوجائے تو ان کا کھولنا بالکل آسان ہے ورنہ بصورت دیگر کوئی سر پٹک کر مرجائے، پھر بھی نہیں کھول سکتا۔ بعیار سے عیار چور بھی اگر گھنٹوں محنت کرے ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتا۔ تاہم آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ میں اس کو صرف ایک ہاتھ سے چند لمحوں میں کھول سکتا ہوں۔"

الماری کھل گئی، اس نے ایک لمبا لفافہ نکالا جس پر بہت صاف لفظوں میں تحریر تھا۔

"بادشاہ کامل بامل فرین کا اقبال نامہ"

اس کے داہنے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کا رخ میری طرف تھا اور بائیں ہاتھ سے وہ دوسرے کام کرتا جاتا تھا۔ اس نے لفافہ میز پر رکھ دیا اور اسے کھول کر کچھ کاغذات نکالے۔

اقبال نامہ باسل کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اور نیچے اس کے دستخط موجود تھے۔ اس کے علاوہ روشنائی سے اس کے انگوٹھے کا نشان بھی تھا۔ کاغذات میں اس کی تصویر، اس کا آرضنائن کا پتہ، اس کے اعزا اور اقربا کے نام اور پتے، غرض وہ تمام معلومات مکمل موجود تھیں جن سے اسکاٹ لینڈ یارڈ کو کافی مدد مل سکتی تھی۔

"ملاحظہ فرمائیے" ڈرکسٹر نے اقبال نامہ کو ہاتھ میں لے کر کہا "یہ ہیں وہ کاغذات جو آپ کی دلہن کے بھائی باسل فرین کو پھانسی تک پہونچا سکتے ہیں"

"ذرا روشنی کے اور قریب آ سکتے ہیں آپ؟ میری نگاہ کچھ کم زور ہے اور عینک اس وقت موجود نہیں"

"ضرور ضرور، عزیز من، لیکن اپنے ہاتھ پوری طرح اپنے سر سے بلند رکھئے، دیکھئے بھولئے نہیں"

وہ کمرہ کے بیچ میں آکھڑا ہوا۔ میں کاغذات کو غور سے دیکھتا رہا، اور وہ کہنے لگا۔

"لیکن اگر یہ کاغذات پولیس کے ہاتھ پڑ جائیں تو آپ پر بھی تو حرف آئے گا۔ ممکن ہے پولیس والے آپ سے بھی سوالات کریں"

وہ ہنسنے لگا۔

"عزیز من۔ آپ کو میری بابت پریشان ہونے کی زیادہ ضرورت نہیں۔ میں نے ان تمام باتوں کا حل سوچ لیا ہے پولس والے مجھ سے کوئی سوال نہیں کر سکتے کیوں کہ میرا اس معاملہ میں دخل ہی نہ ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر آپ ان کاغذات کو نہ خرید سکے تو میں خود اسکاٹ لینڈ یارڈ جا کر کبھی نہ دوں گا۔ میں تو انھیں کسی مشہور اخبار کے دفتر میں بھیجوں گا اور مجھے یقین ہے کہ اخبار والے ان کاغذات کی بہت اچھی قیمت ادا کریں گے جس سے بہرحال انھیں کب ہاتھ لگتا ہے؟ فرمائیے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ سے انہیں خریدنے پر میں اصرار بھی نہیں کرتا ہوں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ اطمینان سے رہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ صرف مس فرین کی خاطر میں انہیں آپ کے ہاتھ فروخت کر رہا ہوں۔ واقعی یہ افسوس ناک بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ بیچاری اپنے بھائی کے جرم کی وجہ سے اس قدر تکلیف و مصائب اب تک برداشت کر چکی ہو اور اب پھر ——

"اور ان کی قیمت پانچ ہزار پانسو پینسٹھ پونڈ ہے؟" میں نے بات کاٹ کر کہا۔

"جی ہاں! ۵۵۶۵ پونڈ، لیکن صرف چند منٹ تک۔ اس کے بعد پانچ ہزار پانسو ستر پونڈ ہو جائے گی"

"اور اس کے عوض میں آپ یہ کاغذات میرے حوالے کر دیں گے؟"

"بڑی خوشی سے عزیز من"

"کیا مجھے اس بات کی ضمانت مل سکتی ہے کہ معاملہ یہیں ختم ہو جائے گا؟ ممکن ہے آئندہ چل کر آپ کچھ اور مطالبہ پیش کریں؟"

"دیکھئے عزیز من، ایسے معاملات میں یہ خطرہ تو اکثر رہتا ہی ہے لیکن اس معاملہ میں آپ کو ایک شریف انگریز کے قول و قرار پر اعتبار کرنا چاہیئے کہ پانچ ہزار پانسو پینسٹھ پونڈ صرف جزو مطالبہ کے طور پر نہ ہوں گے بلکہ آپ اپنی ذمہ داریوں سے بالکل بیباق ہو جائیں گے"

"بہتر! تو میرا خیال ہے کہ سوائے آپ کے قول و قرار کو مان لینے کے میرے لئے کوئی چارہ کار نہیں۔ اب میں کل دوپہر کو حاضر ہوں گا اور روپیہ ساتھ لیتا آؤں گا"

"عزیز من میں سمجھتا ہوں کہ بحیثیت مجموعی آپ اچھا کام کر رہے ہیں۔ آپ اس خطرہ کو ہمیشہ کے لئے دور کر دیں گے کہ آپ کی منسوبہ کا بھائی ایک خون کے مقدمہ میں ماخوذ ہو کر کٹہرے میں کھڑا ہو۔ اور مجھے یقین ہے کہ مس فریڈ آپ کے اس قابل قدر کام کی بہت تعریف کریں گی۔ لیکن عزیز من، کل دوپہر تک فی گھنٹہ پانچ پونڈ کے حساب سے قیمت میں اضافہ کرنا بھول جائیے۔ ضرور خیال رکھئے"

"نہیں میں نہیں بھولوں گا"

میں جس ساعت کا انتظار کر رہا تھا، اب وہ قریب آ رہی تھی۔ ڈاکٹر کاغذات کو الماری میں رکھنے والا تھا۔ میں نے دھوکہ دے کر اسے کمرہ کے بیچ میں بلا لیا تھا اور میز پر سے لفافہ اٹھانے کے لئے اسے پیچھے مڑ کر دیکھنا پڑے گا کم از کم ایک سکنڈ کے کچھ حصہ کے لئے اس کی آنکھیں میری طرف سے پھر جائیں گی۔

[illegible] کافی [illegible] تھا۔

میں [illegible] قدم آگے کی طرف بڑھا اور اس کے [illegible] ڈاکٹر [illegible] ساتھ

میں نے جیب سے اپنا ریوالور نکال لیا' اور اس کی نال ڈرکسٹر کے سینہ پر رکھ کر گھوڑا دبا دیا۔

ایک زوردار آواز ہوئی ــــ پھر ایک خفیف کراہنے کی آواز ــــ اور وہ ایک ڈھیر کی صورت میں میرے قدموں پر پڑا ہوا تھا۔

میں نے ان کاغذات کو جلا دیا' اور جلے ہوئے ٹکڑوں کو مسل کر راکھ کر دیا۔

مکان کے باہر کائنات ابھی تک خواب میں مصروف تھی' اور رات بدستور خوشگوار اور سنسان تھی۔

میرے سینہ میں دل بُری طرح اُچھل رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ پکار پکار کر مجھ سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے:

"تم نے اسے مار ڈالا۔ ہاں! تم نے اُسے قتل کر ڈالا۔"

"چائے حاضر ہے، حضور۔"

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں' اور تھوڑی دیر تک حواس باختہ ہو کر کبھی دلّن کے چہرہ کو' کبھی چائے کی کشتی کو' کبھی سگریٹ اور دیا سلائی کی ڈبیہ کو' کبھی اپنے بستر کو دیکھتا رہا۔ میرا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ میں بالکل نہ سمجھ سکا کس طرح؟ کیوں؟

"آج تو صبح نہایت ہی خوشگوار ہے' حضور۔"

دلّن نے یہ کہہ کر کھڑکی کھول دی اور کمرہ میں سورج کی گرم چمکدار شعاعوں کا طوفان اُمنڈ آیا۔

دلّن کے چلے جانے کے بہت دیر بعد تک میں بستر پر پڑا ہوا چاروں طرف دیکھتا رہا' اور حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

میں نے یقیناً قتل کے یہ تمام واقعات خواب میں دیکھے ہوں گے۔ مجھے یاد تھا کہ نصف شب سے کچھ پہلے میں بستر پر آ لیٹا تھا' مجھے یاد تھا کہ میرا دماغ اس بدمعاش ڈرکسٹر اور اس کے خط کے متعلق تفکرات میں پریشان ہو رہا تھا اور سونے سے قبل میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اس کے مطالبہ کو پورا کر دوں۔ میں یہ تہیہ کر چکا تھا کہ اس اپنے فرض کو ہر صورت اس خوفناک خفی مقدمہ کی روحانی تکالیف سے بچاؤں گا' اور ارادہ کر رہا تھا کہ صبح سب سے پہلے بینک جا کر روپیہ لے آؤں گا۔

درحقیقت اُس روز میں جو منظر میں ابھی دیکھ چکا تھا، وہ ایک خواب سے زیادہ اصل اور یقینی خواب سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ قتل کا مرتکب ہونے کے بجائے میں برابر اپنے پلنگ پر پڑا ہوا سو رہا تھا۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ابھی کلاڈ ڈرکسٹر سے معاملے کرنا تھا۔ میں لرز سا گیا۔

اس سے پہلے شاید میں نے ایسا کوئی خواب نہ دیکھا تھا۔ میرے کانوں میں اب تک کلاڈ ڈرکسٹر کی کراہ آ رہی تھی، اور میری آنکھوں کے سامنے اس وقت بھی وہ ایک ڈھیر کی صورت میں قدموں پر پڑا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ تاہم میرے دماغ میں بعض واقعات کا سلسلہ منقطع نظر آتا تھا۔ مجھے اس لمحہ سے قبل کی کوئی بات یاد نہ تھی جب میں نے الماری میں سے اپنا ریوالور نکالا تھا۔ مجھے بالکل یاد نہ تھا کہ میں کس وقت مکان پر آیا تھا۔

واقعی یہ سب کچھ صرف ایک خواب تھا۔

میں اُٹھ بیٹھا، اور چائے کی پیالی بنانے لگا۔ میرے دل و دماغ سے ایک بوجھ اُترتا معلوم ہو رہا تھا۔ میں خیال کر رہا تھا کہ میرا دامن ابھی تک قتل جیسے خوفناک جرم سے ملوث نہیں ہوا۔ میں ابھی تک ایک قانون کا پابند غریب شہری ہوں۔ سچ مجھے اس کا تصور بھی مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ اس بدمعاش ڈرکسٹر کی بابت میں نے سینکڑوں تدبیریں سوچی تھیں لیکن اس کو مار ڈالنے کا تو وہم بھی نہ تھا۔ شاید یہ خیال مجھے کبھی نہ آیا ہوگا، کہ جنگ عظیم کے اس یادگار ریوالور میں کارتوس بھروں، جو دس سال سے الماری میں یوں ہی پڑا ہوا تھا۔

میں نے ڈرکسٹر کی آفت سے بچنے کے لئے اس کے قتل کی صورت پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ میرے دماغ میں تو صرف دو تجویزیں تھیں: اس کا مطالبہ ادا کر دیا جائے یا اسکاٹ لینڈ یارڈ جا کر اس کی رپورٹ کر دی جائے۔ اور پھر قتل کے معاملات میں تو میں نہایت کم تعدد دل واقع ہوا ہوں۔ تمام دنیا میں شاید سب سے زیادہ حلیم اور بُردبار شخص میں ہوں گا کیونکہ مجھے آج تک یاد نہیں کہ کبھی غصہ آیا ہو۔ اگرچہ سچ ہے دن میں چوہا بھی پھنسا ہوا دیکھ لوں تو مجھے اختلاج ہونے لگے۔ اس کے علاوہ مجھے یقین ہے کہ میں اس قدر چالاک اور پھرتیلا نہیں ہو سکتا جیسا میں نے خود کو خواب میں دیکھا ہے۔ خیال فرمائیے کہ میں ایک بجھتے ہوئے جسم کا ست اور بالآخر کس طرح ڈرکسٹر کی طرف جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے پستول کے ساتھ بچ سکتا ہوں اور پھر اپنا ریوالور جیب سے نکال کر ایک دم اس کے سینے پر مار سکتا ہوں۔ یہ بہت بڑا کام تو صرف سینما کی سکرین پر ہیرو کے ہاتھوں ہی انجام پا سکتے ہیں یا کسی ایسے شخص کے۔

میں تو اس خواب کو سرتاپا ایک تمسخر خیال کرتا، لیکن اس میں ایک حقیقت بھی مضمر تھی، یعنی کلاڈ ڈکسٹر واقعی پامل
فرن سے اقبال نامے کے عوض پانچ اور چھ ہزار پونڈ کے درمیان مانگ رہا تھا۔ اس امر میں خواب کو دخل تھا۔

میں چائے پیتا رہا اور سوچتا رہا کہ انسانی دماغ بھی واقعی ایک حیرت انگیز چیز ہے۔ بالخصوص میرے دماغ نے
تو مجھے بالکل اس فریب میں مبتلا کر ہی دیا تھا کہ میں خون کر چکا ہوں۔ ایک سگرٹ سلگا کر میں بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا، لیکن میرا تمام
جسم تھر تھر کانپ رہا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ میں نے واقعی قتل کیا ہے۔

بالآخر میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ڈکسٹر کا مطالبہ حتی الامکان جلد سے جلد ادا کر دوں۔ بدمعاش میری منسوبہ اینڈی کی آ
میں مجھ پر ضرب لگا رہا تھا، اور ایسی صورت میں میرے لئے کوئی مفر نہ تھا۔ آج سے قبل بھی وہ اس طرح ڈرا دھمکا کر پامل
فرن سے روپیہ وصول کر چکا تھا، اور اب یہی جال میرے لئے پھیلا رہا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اس طرح آئندہ چل کر بھی وہ
کوئی نہ کوئی مطالبہ ضرور پیش کرے گا۔ لیکن ہماری شادی ایک ماہ کے اندر ہی ہونے والی تھی، اور میں خیال کر
تھا کہ اس کے آئندہ مطالبہ سے پہلے ممکن ہے کہ کوئی اور صورت پیدا ہو جائے۔

بے شک! اس بدمعاش کا روپیہ ادا کرنا پڑے گا۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ میں ایک مضبوط اور طاقت ور
پہلوان بن جاؤں اور اس کو مارتے مارتے کچلا کر ڈالوں، کیوں کہ وہ اسی کا مستحق تھا۔ پھر وہ میرے سامنے گڑگ
گڑگڑا کر رو رو کر رحم کی التجا کرے۔ اور میں بدذات حرام زادہ کو اس حالت میں دیکھ کر مسرور ہو رہا ہوں۔ میرے
دماغ میں ایسے ہی خیالات گشت لگا رہے تھے۔ اور میں نے پہننے کے لئے کپڑے اُٹھائے۔

میں اپنے لبادہ کی پیٹی ہی باندھ رہا تھا کہ ڈلکن جو آج تک مہذب اور شائستہ نوکر ثابت ہوا تھا بغیر کھٹکھٹائے
کمرہ میں گھس آیا۔

"حضور! ابھی ابھی ایک خبر سنی ہے" اس نے گھبرا کر کہا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور اندرونی اضطراب ا
بے چینی کو قابو میں رکھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

"خبر؟" میری زبان سے نکلا اور ایسا معلوم ہوا کہ میرا دل ایک دم بیٹھ گیا۔ پھڑک کے رہ گیا۔

"جی ہاں، حضور! اس کوٹھے پر نمبر ۱۱، ڈلٹن روڈ میں ایک آدمی مقتول پایا گیا ہے۔"

وہ کہتا رہا اور تمام واقعات کی تفصیل بیان کرتا رہا، حتی کہ نوکروں کی زبانی جو افواہیں اس نے

ہوئی تھیں، وہ بھی کہہ ڈالیں لیکن میں سخت حیران تھا کہ میرا دل ساکت و صامت رہا ہے مجھے یہ شبہ ہو رہا تھا کہ شاید میرا دماغ کوئی اور عجیب کھیل رہا ہے

"بہت بیہودہ بات ہے،" ولکن نے میں نے ان واقعات پر لئے زنی کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں، ٹھیک ہے حضور، اور پھر ہم سے اس قدر نزدیک!"

ولکن کے چلے جانے کے بعد تھوڑی دیر تک میں کھڑا ہوا الماری کو تکتا رہا، پھر میں نے اسے کھولا۔

میرے ریوالور میں پانچ بھرے ہوئے کارتوس تھے۔

چھٹا کارتوس چلا ہوا تھا۔

ترجمہ

---

# ایک ضروری تصحیح

فروری نمبر میں صفحہ ۱۵ پر ایک ایسی فاش غلطی ہو گئی ہے جس کا ہمیں نہایت افسوس ہے۔ اور جس کی ہم جلد سے جلد تصحیح کر دینا چاہتے ہیں "نقد و نظر" کا مرتب اڈیٹر ہے نہ کہ عبدالشکور صاحب ایم اے جیسا کہ گزشتہ رسالہ میں درج ہو گیا تھا، ہمیں اس فروگزاشت کا افسوس ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ ناظرین اس کی تصحیح کر لیں گے۔

اڈیٹر

# رنگ

از جناب حمید کاظمی بی اے (علیگ)

رنگ کیا چیز ہے؟ ایک عنصر ہے جس پر کائنات کی ترکیب مشتمل ہے جس نے نقش و نگارِ فطرت میں جان ڈالی ہے۔ یہ ظاہری حیثیت سے گزر کر تخیل اور روحانیت کی دنیا میں بھی جلوہ گر ہے۔ رنگ حیاتِ مطلق کی شان کا مظہرِ خاص ہے۔ رنگ ہی شہوت ہے۔ یہی روحانیت کا مصدر ہے۔ یہی قیس کی آنکھوں میں بس کر عشق ہو جاتا ہے اور حسنِ لیلیٰ بن کر تماشا ہو جاتا ہے۔ "عکسِ رخسارِ من" یہی ہے۔

رنگ سے جنسِ گراں ارزد کانِ ہستی — ہستی اک نقش ہے اور رنگ ہی جانِ ہستی

چاندنی ہو کہ خزاں ہو شفق ہو کہ شراب — رنگ جس چیز میں ہو اُس سے نمایاں ہے شباب

آہ اے رنگ تماشائے جوانی تو ہے — دل نشیں سب کو ہے وہ رام کہانی تو ہے

صبح دم غنچہ کو ازبر ہے فسانہ تیرا — جھلملاتے ہوئے تاروں میں ترانہ تیرا

تیرے ہی دم سے ہے مانی کا مرقع گلزار — جوششِ لالہ و گل سے وہ تزئین کی بہار

ذرّے میں تارے میں اے رنگ عیاں ہے تو ہی — ہر گل و خار کی یاں نوکِ زباں ہے تو ہی

خونِ رقصندہ جو ہر رگ میں رواں ہوتا ہے — ذوقِ مدحت سے ترے رطبِ لساں ہوتا ہے

خالِ مشکیں سے گلوں لبِ لعلیں تو ہے — زلفِ شبگوں میں سرِ انگشتِ نگاریں تو ہے

لبِ پان خوردہ کی لالی میں حکایت تیری — ہے کفِ دستِ حنابستہ کو بیعت تیری

سحر آرا دلبری ہے کرشمہ تیرا — سرمگیں چشم میں ہے نور کا چشمہ تیرا

[illegible] — [illegible]

رنگینی رنگ ہے افلاک کے [illegible] میں

[illegible] ہیں

# خوابِ بیداری

(عبدالعلیم نامی متعلم سکنڈ ایر انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ)

"بیٹا سعید یہ کس قدر بُری بات ہے تمھاری خالہ تم کو بار بار طلب کرتی رہتی ہیں اور تم ہو کہ ان کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے۔ پھر بھلا ان کو تم سے شکایت کیوں نہ ہو۔ ابھی ابھی یہاں سے خفا ہو کر گئی ہیں۔ تمھاری خالہ کی طرف سے کیا کچھ شکایت نہیں کی۔ بیٹا اپنوں سے اس قدر اجتناب۔ تمھارے نزدیک میں اور عائشہ بیگم دونوں برابر ہیں۔ پھر لوگ کیوں کہتے ہیں کہ ماں مرے خالہ جیئے اور کچھ نہیں دنیا سازی ہی سہی۔ کبھی کبھی تو نادان محل ہو آیا کرو۔ اچھا اٹھو آج ہو آؤ۔ شام کا وقت ہے تمھاری تفریح بھی ہو جائے گی۔"

ماں نے بیٹے کو اپنے [illegible] اصرار سے بخت نہ بیٹھنے دیا مسعود ماں کے پاس سے کچھ سوچتا ہوا کمرہ میں گیا۔ کپڑے بدلے اور چھڑی اٹھا کر ایک طرف نکل گیا۔ قدرت نے جہاں مسعود کو رنگ صاف۔ خندہ [illegible] گھونگھر والے سیاہ بال عطا کئے تھے وہاں اس کا شباب آگیں چہرہ مرد و عورت دونوں کے لئے یکساں دل فریب تھا۔ [illegible] بلا کا ذہین تھا۔ [illegible] تعلیم پاتا تھا تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کو فنون لطیفہ سے بھی از حد شوق تھا۔ [illegible] ہارمونیم پر انگلیاں چلاتا تو مضطرب دل پر ایک وجدانی کیفیت پیدا ہو جاتی اور [illegible] خاموش ہو جاتے [illegible] سننے والوں کو محو کر دیتیں۔ اس کی دل [illegible] جاتے [illegible]

[illegible]

ہونے والی تھی۔ گو کسی وقت میں دونوں نے ساتھ ہی پرورش پائی تھی۔ ساتھ ہی کھیلے اور ساتھ ہی اٹھتے تھے لیکن اب مسعود اس کے سامنے جاتے ہوئے شرماتا تھا وہ ماں کے صد اصرار سے گھر سے نکلا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا احاطہ نادان محل میں داخل ہوا۔ اندر اطلاع کرائی۔ تھوڑی دیر بعد نہایت متانت سے ماما کے ساتھ اندر داخل ہوا اور خالہ کے ہو کے کے سامنے کھڑے ہو کر تعظیمی سلام کیا۔ خالہ نے دعائیں دیتے ہوئے مسعود کو اپنے پاس ہی مسند پر بٹھا لیا۔ کچھ دیر بعد ایک خادمہ چا لائی اور ٹرے مسعود کے سامنے رکھ دی۔ مسعود نے ایک پیالی چا سے بھر کر خالہ کے سامنے پیش کی اور دوسری میں خود چا دے کر پینے لگا۔ سلسلۂ کلام تا دیر جاری رہا جھٹ پٹے کے وقت مسعود نے جانے کی اجازت چاہی۔ خالہ ساتھ ہی اٹھ بیٹھیں اور صحن تک مسعود کو پہونچا آئیں اور فی امان اللہ کہتے ہوئے امام ضامن کی اشرفی باندھ کر رخصت کیا۔

مسعود ابھی نادان محل سے نکل کر پائیں باغ تک جانے ہی پایا تھا کہ اس کو لائبریری کا خیال آیا جو اس کے خالو مرحوم اپنی حین حیات میں کوئی شے بنانا چاہتے تھے مگر موت نے فرصت نہ دی اور وہ خیال صرف خواب بن کر رہ گیا لائبریری کو آتے ہوئے وہ مغربی کمرے کی طرف مڑا اور اندر داخل ہو کر ایک تازہ اخبار اٹھا کر برآمدہ کی آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ ابھی اخبار پڑھنے بھی نہ پایا تھا کہ قریب ہی کی آواز سے چونک پڑا۔ آواز گوش آشنا تھی پھر بھی اس نے اٹھ کر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دیکھا کہ قریب ہی دوسرے کمرے میں دو لڑکیاں ہاتھوں میں کتابیں لئے ایک مسہری پر بیٹھی باتیں کر رہی ہیں اس نے ان کی باتوں میں مخل ہونا پسند نہ کیا اور خاموش آرام کرسی پر بیٹھا ان کی گفتگو سنا کیا۔

پیشتر اس کے کہ ناظرین کو ان کی گفتگو سے آشنا کیا جاوے ان کا ظاہری تفرق بتلا دینا ضروری ہے۔ اخلاق و آداب چال ڈھال، رفتار و گفتار اور طرز کلام میں ایک دوسرے سے زمین و آسمان کا فرق ہے اگر ایک پردہ سے بیزار اور سر راہ موٹروں پر منہ اٹھائے والی تو دوسری پردہ کی پابند اور چہار دیواری میں ٹہلنے والی۔ اگر ایک بکی تو دوسری خاموش طبیعت۔ اگر ایک مردوں سے دوبدو مقابلہ کرنے والی تو دوسری ڈر کر خاموش رہنے والی پوشاک قریب قریب دونوں کی ایک ہے کیوں کہ ایک ہی دیس کی رہنے والی ہیں۔ لکھنؤ جنت نشان ان کا مولد ہے شریف گھرانے کی لڑکیاں ہیں۔ البتہ فرق اتنا ہے کہ اول الذکر کو کافی آزادی ملی ہوئی ہے مگر اس کی یہ آزادی آوارگی کے معنوں سے بہت دور ہے۔ آخر الذکر کے والدین سچے مسلمان اور شریعت کے پابند ہیں تاہم ہر

لڑکی کو اعلیٰ تعلیم بھی دلوائی اور گھر سے باہر قدم بھی نہ رکھنے دیا۔ یہ دونوں لڑکیاں جو عادات و خیال میں بالکل متضاد ہیں یوں سرگرم گفتگو ہیں۔

ایک بہن زینب ۔ تو آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ وہ عورتیں جو پردہ کی پابند نہیں ہمیشہ دنیا کی دوڑ میں ناکامیاب رہیں۔ آج افغانستان، ترکی، ایران، مصر، البانیہ اور غیر اسلامی یورپین سلطنتیں اور امریکہ جو ترقی کر رہا ہے وہ محض عورتوں کے طفیل میں ہے اور اس ترقی کا سہرا اس صنف نازک کے سر ہے اگر خدانخواستہ وہ ہم ہندی عورتوں کی طرح صرف بچوں کی پرورش اور امور خانہ داری ہی اپنے ذمہ لے لیتیں تو یہ ترقی یافتہ طبقہ ایک صدی کے لئے پیچھے ہٹ جاتا۔

زینب ۔ ہاں! ہاں! بالکل درست مگر بی بی غور تو کرو کہ اسلام ترکی کے ترجم کردہ قانون یا افغانستان و ایران کے جاری شدہ ریفارم کا نام نہیں۔ ترکی ہو یا مصر، کابل ہو یا ایران سب کے سب مسلمان اسی دینوی قانون کے پابند ہیں جو اللہ نے بنائے اور اس کے رسول نے بتلائے۔ اگر کوئی شخص ان اٹل قوانین میں ترمیم و تنسیخ کو جگہ دے تو یہ اس کی غلطی ہے نہ کہ اسلام کی جو ملک ایسا کر رہے ہیں وہ تباہی کے عمیق غار میں اوندھے منہ جا رہے ہیں۔ آمنہ تم نے دیکھا نہیں کہ افغانستان نے پردہ اٹھایا۔ نئے ریفارم جاری کئے کیا پھل پایا۔ یہی نہ کہ تخت و تاج چھوڑا۔ جاہ و حشمت سے منہ موڑا۔ اللہ سے ناتا جوڑا۔ ننگی بھی بیوی کا دامن پکڑا اور قندھار کی راہ لی۔ دوسری مثال مصر کی ہے اس نے عورتوں کو آزادی دے کر کیا ترقی حاصل کر لی۔ پیاری بہن اگر روز روز کی خانہ جنگی اور جدال و قتال ہی کا نام ترقی ہے تو ایسی ترقی اور آزادی کو اپنا دور ہی سے سلام ہے۔

آمنہ ۔ (چیں بجبیں ہو کر) خوب یہ تو اچھا نتیجہ نکالا کہ دور ہی سے سلام ہے۔ بہن مصلحت کو دخل نہ دو۔ یہ صریحی غلطی ہے۔ کسی نتیجہ پر فوراً پہنچنا پڑھی لکھی کا کام نہیں۔ اگر کم ہمت مشرق اس کی قدر نہ کر سکا اور اس سے فائدہ حاصل نہ کر سکا تو اصول کی اس میں کیا خطا ہے۔ آزادی اور مخصوص آزادی پردہ سے جو کچھ مغرب میں کارہائے نمایاں کئے وہ روز روشن کی طرح سب پر عیاں ہیں۔ اب

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

یہ دراصل ہماری کوتاہ فہمی ہے کہ ہم اصل مفہوم سے الگ اپنے قیاس پر اس کا مطلب نکال دیتے ہیں۔

زینب۔ (مسکراتے ہوئے) بے شک یورپ و امریکہ مشرق سے کہیں آگے ہیں۔ لیکن تمدن، تحصیل علم اور شعبۂ علمی و قومی اور فنون لطیفہ میں جس قدر صنف نازک نے حصہ لیا مرد اس سے بخوبی واقف ہیں۔ بقول کسی مفکر کے یورپ نے اپنی عجلت پسندی سے عورتوں کے لئے جو رائے قائم کی اور جو حقوق ان کو دیئے اور جو خدمت ان کی کی اس کا مزہ اب اٹھا رہے ہیں اور ان کی نسل کو مجرد اور علمی مشاغل میں سرگرداں رہنے سے منع کر رہے ہیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے سینکڑوں سوسائٹیاں قائم کی ہیں جن کا اصل مقصد عورتوں کو عریاں کرنا اور ان کے حسن سے آنکھیں سینکنا ہے تاکہ کسی وقت ان کی نشیلی انکھڑیوں سے مدہوش اور ان کے دام گیسو میں اسیر نہ ہو جائیں جو بعد میں قوم اور ملک دونوں کے لئے نقصان رساں ثابت ہوں۔ صد افسوس مشرق پر کہ مغرب کی اس حالت کو دیکھتے ہوئے بھی کوئی سبق حاصل نہیں کرتا بلکہ اپنی بہو بیٹیوں کو آزادی سے سڑکوں پر پھرنے، کلبوں میں حصہ لینے، جلسوں میں شرکت کرنے اور اپنے نیم عریاں حسن کو (جو کریم اور پاؤڈر کا مجموعہ ہوتا ہے) دکھلانے کی اجازت دیتے ہیں اور اسی کو ذریعہ ترقی سمجھتے ہیں۔

آمنہ۔ زبردستی اور شے ہے اور منوانا دوسری شے۔ میں قرآن و حدیث سے ثابت کر سکتی ہوں کہ میری یا موجودہ تعلیم یافتہ طبقہ خواتین ہند کی آزادی کسی طرح خلاف شرع اسلام نہیں۔

زینب۔ پڑھا ہونا اور شے ہے اور تحریر کا مفہوم سمجھنا دوسری شے۔ ہاں اگر یہ جانتی کہ تم سمجھ دار ہو تو میں اس دعوے کو مان لیتی۔ حدیث و قرآن تو کجا اگر کوئی معتبر روایت ہی یاد ہو تو اپنے ثبوت میں پیش کیجئے۔

آمنہ۔ ایک کیا سینکڑوں بلکہ ہزاروں ورد زبان ہیں (بڑی دیر تک سوچ کر) جنگ مت ہی کو لیجئے جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہوئی جس میں کل عورتیں ہی شریک تھیں اور ان ہی کی وجہ سے فتح حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عورتیں برابر نکلتی تھیں اور ان کو کوئی روک ٹوک نہ تھی .....

زینب۔ بالکل بہتان۔ گھر کی گڑھی ہوئی روایت۔ بھلا یہ کس کتاب میں لکھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عورتوں سے بہت تھوڑی سی معذوری تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہاں تک ارشاد ہے کہ اگر اس طرح کرنا چاہیے کہ عورتوں سے کانوں تک ان کی آواز نہ جائے کہ کہیں وہ آواز ان کے باعث ہیجان نہ ہو۔ یہ سچ ہے کہ عورتیں مسجد میں جاتی تھیں تاہم یا نماز عید میں نکلتی تھیں لیکن با ضرورت، بے ضرورت نہیں اور وہ اس کے خلاف کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ [illegible]

زمانۂ محمدی اور خلفائے راشدین میں جب عورتیں باہر نکلتی تھیں یا صحابہ میں لپٹی ہوتی تھیں کہ کوئی ان کو دیکھ نہ سکتا تھا پہلے وہ محرمہ باندھتی تھیں اس پر مقدرہ کستی تھیں اور سر پہ لپیٹتی تھیں اور اس پر نقاب ڈال کر لبادہ اوڑھ لیتی تھیں۔

آمنہ۔ ممکن ہے کہ ایسا ہوتا ہو اور بہت ممکن ہے کہ میں غلطی پر ہوں لیکن یہ تو میں کھلے بندوں کہوں گی کہ اسلام اب تیرہ صدی پیشتر کا اسلام نہیں ہے ملاؤں نے اس کو کچھ سے کچھ بنا رکھا ہے۔ اس لئے میں ملاؤں کا اسلام ہی ماننے کے لئے تیار نہیں

زینب۔ آمنہ بی بی بے شک کسی نے سچ کہا ہے:

کچھ بھی خیال نام نہ پروائے ننگ ہے — بس اک خیال بادہ و مینا و چنگ ہے

ہاں اے بت فرنگ کے شیدائیو سنو — دل ہو سیاہ اگرچہ سفید اس کا رنگ ہے

لامذہبی کا دوسرا خالق سے جنگ ہے

آمنہ۔ (بگڑ کر) پھر وہی آپ میرا مذاق اڑا رہی ہیں یہ ذاتیات پر حملہ کیا۔ آپ بھی وہی پرانی باتیں گائے جاتی ہیں۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے کہ ایک مرد کسی عورت کو دیکھ لے۔

زینب (ہنس کر) حرج تو کچھ بھی نہیں۔ صرف اسی قدر کہ بھس میں چنگاری دکھلا دے

آمنہ۔ کیا مطلب

زینب۔ مطلب صاف ہے کہ عورتوں میں ایک قسم کی کشش ہوتی ہے اور مرد اس کشش کی قوت جاذبہ رکھتے ہیں بلکہ صنفوں کی کشش اور جاذبیت کی مثال پوری طرح الکٹری سٹی سے ہو سکتی ہے۔ اس کی قوت مثبتہ (Positive) اور منفیہ (Negative) ہوتی ہے ایک ذرا سا اتصال کچھ سے کچھ کر دیتا ہے اسی واسطے شریعت کے حدود جو کچھ پردے کے متعلق ہیں وہ محض اس لئے ہیں کہ دونوں زبردست ہستی طاقتوں کو دائرۂ اعتدال میں رکھیں۔"

آمنہ۔ واقعی یہ نازک مسئلہ ہے میں پھر اس پر غور کروں گی۔ اچھا اب رخصت

زینب۔ فی امان اللہ

زینب آمنہ کو رخصت کر کے لائبریری سے کمرہ میں داخل ہونا چاہتی تھی کہ برآمدہ میں کسی کو آرام کرسی پر سوتا سمجھ کر جھجکتے بڑھی اور کرسی کی پشت سے "تھمنے" کہتے پائی تھی کہ مسعود اخبار ہاتھ میں سنبھالے

اللہ شکر ادا ہوا ............................................

........................ نہ کہیں مسود تھا اور نہ کہیں لائبریری وہ مسعود ہی خاکسار تھا جو عالم بیداری میں لحاف سے لپٹا ہوا خواب دیکھ رہا تھا اور موجودہ زمانہ کی حالت پر تنقیدی نظر ڈال رہا تھا کہ اسی اثنا میں میرے چھوٹے بھائی نسیم نامی نے شانہ ہلا کر مجھے ہوشیار کر دیا اور میں یہ کہتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

---

# غزل

---

جب یہ صرف رنگ و بو ہو جائے گی — گل کی ہستی آرزو ہو جائے گی

غور سے تم میری صورت دیکھ لو — شرح لفظ آرزو ہو جائے گی

لذتیں دنیا کی وہ پا جائے گا — جس کو تیری جستجو ہو جائے گی

اب نگاہ شوق کو رسوا نہ کر — بے نیاز آرزو ہو جائے گی

عرض حسرت پر نہ تو مجبور کر — بے نیازی تیری خو ہو جائے گی

کیا خبر تھی تیری چشم لطف ہی — وجہ خون آرزو ہو جائے گی

انتہائے یاس سے امید ہے — اب مکمل آرزو ہو جائے گی

کیا خبر تھی انتہائے آرزو — یوں حریف جستجو ہو جائے گی

میری خاموشی ہی جو ہر ایک دن
داستان آرزو ہو جائے گی

---

# حالِ دل

(از محترمہ بلقیس جمال صاحبہ بریلوی)

(۱)

در صبح چمن شبنم گریاں ہستم — در ظلمت شب خواب پریشاں ہستم
صد دشت جنوں ریگ بیابانم اے دل — در بزم طرب کرمکِ سوزاں ہستم

(۲)

در بوئے سرم خار بیابان دارم — یک دیدۂ خوں آبلہ ساماں دارم
از خون فغاں "قاش" لبانم "سازند" — از ہستی غم شام غریباں دارم

(۳)

صد حسرت ظلمات دریں پیکرِ من — اے شعلۂ صد طور کہ اندر برِ من
در سینۂ خونیں ہمہ حرماں دارم — صد ظلمتِ ہجراں کہ نشاں در سرِ من

(۴)

از خاک گل سرشت تخمیرِ من — از گریۂ خوں آفریں تعمیرِ من
[illegible] ماتم سینہ — یک شعلۂ آسیب کہ تصویرِ من

# سیلابِ ہذیان

از

(تماشائی)

مجھے دنیا کے اس میدان کارزار کے کسی اور محاذ سے فی الحال سروکار نہیں، میں صرف علی گڑھ کے اُس خطہ کو لیتا ہوں جو فلورگیٹ سے جمال پور تک پھیلا ہوا ہے، اس میں اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی ساری عمارتیں، سارے فیلڈس اور سارے پڑھائی کے کمرے آ گئے۔ طلبا اور اساتذہ کی ساری آبادی آپ کو اسی خطہ میں ملے گی، اور یہی سرزمین گزشتہ نصف صدی سے مسلم ہندوستان کے بہترین دماغوں کا آماجگاہ بنی رہی اور امید ہے کہ بنی رہے گی۔ یہی ارضِ مقدس سرسید، محمود، حالی، شبلی، ماریسن اور آرنالڈ کی جولان گاہ تھی اور اسی سرزمین میں ہندوستان کے مسلمان بہت پلے، بڑھے اور پروان چڑھے۔ میں بھی اسی خطہ کا ایک ذرۂ بے مقدار ہوں، اور اکثر عالمِ تنہائی میں اس چار دیواری پر حیرت، استعجاب اور عقیدت کی نظریں ڈالتا ہوا خدا جانے کس عالم میں کہاں سے کہاں پہونچ جاتا ہوں، اسے آپ ایک چھوٹی موٹی سی دنیا کہئے، شکسپیر دنیا کو ایک عظیم الشان اسٹیج کے لقب سے یاد کرتا ہے جس پر مردوزن آتے چلے جاتے ہیں، یہ خصوصیت بدرجۂ اتم اس زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے میں موجود ہے، غالب نے بجوشِ جنوں میں دنیا کو "بازیچۂ اطفال" کہا ہے، میں کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ مکمل اور حقیقی "گھروندا" آپ کو کہاں ملے گا، دنیا کو آپ چاہے "دنیائے دوں" کہئے، یا فلکِ کج رفتار کی بازی گاہ تصور کیجئے، یہ تشبیہ کسی حالت میں ناقص نہ ہوگی۔

---

مگر میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ دنیا نہ یہ ہے نہ وہ، بلکہ ایک طوفانی سیلاب کی آمد کا منظر ہے اور دنیا کی ساری تحریکات اس سیلابِ عظیم کی تند و تیز لہریں ہیں جو کبھی ساکت نہیں ہوتیں بلکہ ہر آن ہر لحظہ ہر جگہ شور و غل اضطراب پیکر بستہ نظر آتی ہیں، بحر امکان [illegible] ہر لہر [illegible] کے [illegible] سے [illegible] ہے

ہم آہنگ نہیں ہو جاتی ہے۔ لیکن دنیا کا سمندر یا یک سمندر ناپید اکنار ہے جس کا ساحل بظاہر صرف ایک ہے یعنی موت آپ کہہ سکتے ہیں کہ دوسرا کنارہ دیوانگی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ حواس اور شعور کا درہم برہم ہونا بھی دراصل موت ہے۔ اس لئے میں اس سمندر کے ایک اور صرف ایک ہی ساحل کا قائل ہوں۔

یلدرم نے اس سیلاب زمانہ کے متعلق کیا خوب کہا ہے:

"بہے جا، بہائے لئے جا، نہ تجھ میں سلامتی، نہ تیرے کنارے سلامتی، مٹے ہوؤں کے
نشان مٹائے جا، تیراکوں کو ڈبا، غواصوں کو نہ اُبھار، یہی تیرا کام ہے"

اور غالب اس سیلاب کے "لطمۂ موج" کو "سیلیٔ اُستاد" سے کم نہیں سمجھتے۔

اس نظریہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے ذرا اپنی علی گڑھ کی زندگی پر غور فرمائیے، دسمبر کا شروع ہے۔ موسم کی چیرہ دستیوں نے ایک عالم کو کرۂ زمہریر بنا رکھا ہے، آپ صبح سات بجے اُٹھتے ہیں اور کانپتے ہوئے حوائج ضروری سے فارغ ہو کر جلدی جلدی چاء کی پیالی اور مکھن توس سے دست و گریباں ہو جاتے ہیں۔ ابھی آپ اس کام سے پوری طرح فارغ نہیں ہونے پائے تھے کہ جمن (علیہ الرحمۃ) نے ٹناٹن ٹناٹن گھنٹی بجا دی، افتاں و خیزاں آپ کالج پہونچے اور ایک بجے تک آپ اپنے درجوں میں تقریریں سنا کئے یا اونگھا کئے، یا علی الترتیب دونوں حرکات آپ سے سرزد ہوتی رہیں، کالج سے واپس آکر ابھی آپ کمرہ میں داخل بھی نہیں ہوئے کہ ڈائننگ ہال کا بلاوا آیا، گرتے پڑتے آپ وہاں پہونچے اور چپاتیوں یا تندوریوں پر حسب معمول مویذ طن، سے الجھ کر داد شجاعت دینے لگے، پھر تین بجے سے کھیل کی طیاری، شب میں ڈیبیٹ، بیت بازی، گپ، شطرنج، برج اور خواندگی کے مشاغل آپ کی توجہ کو جذب کر لینے کے لئے تیار۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ایسی معروف زندگی خواہ طالب علم کی ہو یا ممبر اسٹاف کی سکون، عافیت خود نگہ سے سراسر عاری ہے۔ خود ہم اپنی مرضی، اپنے رجحان کو اس زندگی میں بروئے کار نہیں لا سکتے، ایک سیلاب عظیم ہے کہ بہے جا رہا ہے اور اپنی طوفانی موجوں کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی بہائے لئے جاتا ہے۔ ہم میں یارائے ضبط نہیں، ہم میں مقابلہ کا حوصلہ نہیں، ایک آسمانی حادثہ ہے جو ہمیں خدا جانے کہاں سے کہاں

لئے جا رہا ہے

ذرا غور کر اور سوچیے، اور کل ہندوستان کی سیاسی حالت کو اپنے ذہن میں یکجا کیجئے آج سے تیس برس
قبل یہ بےکسی کی حالت سارے ہندوستانیوں کی تھی، اغیار جو چاہتے تھے وہ ہم سے کراتے تھے اور
جہاں چاہتے تھے ہمیں بہا لے جاتے تھے، تلک، گوکھلے، مہاتما گاندھی جی - سی آر - داس، موتی لال
نہرو، سریندر ناتھ بنرجی، فیروز شاہ مہتہ، لاجپت رائے اور مالوی جی نے اور کچھ اگر نہیں تو کم از کم ہماری بےبسی اور
کم مائگی کی حالت تو ہم پر روشن کر دی، لیکن غریب مسلمانوں کی حالت نہ سنبھلنا تھی نہ سنبھلی، اس زمانہ میں دیکھ لیجئے جناح کو
فی الحال نظر انداز کر دیجئے، باقی جس قدر قومی راہ نما ہیں اسی قدر فرقے اور جماعتیں، کوئی ایمان کو جا رہا ہے تو کوئی قرآن
کو اور اکثر و بیشتر بجائے پیش قدمی کرنے کے آپس میں دست و گریباں ہو جاتے ہیں، خود بھی ذلیل ہوتے ہیں اور دوسرے
کی عزت بھی پامال کر کے دم لیتے ہیں، جہالت، تاریکی اور تعصب کا غبار دماغوں پر کثرت سے چھایا ہوا ہے

سمندر کے اس حصہ میں طوفان ایسا شدید اور مہیب ہے کہ قوت فیصلہ، خود مختاری، آزادی، بے لوثی، ہمواری
کھوٹے کھرے کی تمیز حتیٰ کہ خود نصب العین ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہو گیا اور سمندر کی آتشیں موجیں ہمیں خس و خاشاک
کی طرح بہائے لئے جا رہی ہیں، بہے جا، بہائے لئے جا، نہ تجھ میں سلامتی، نہ تیرے کنارے سلامتی،
ناقص تیراک اور کم زور غواص ناممکن ہے کہ نہ ڈوب جائیں۔

---

سیاسی تصویر کا یہ دھندلا سا خاکہ خود بخود معرض تحریر میں آگیا، ورنہ میرا مدعا یہ نہیں ہے کہ میں اپنی قوم کی شوکت
و عظمت کے جنازے پر آنسو بہاؤں، ع وہ دل استعفوں سے ہے کہ عادت ہو گئی، اب قوم کی تباہ حالی پر رونا نہیں
آتا کیونکہ مستقبل حال سے زیادہ اندوہناک نظر آرہا ہے۔

میرا مدعا صرف اس قدر ہے کہ دنیا کے ہر شعبۂ زندگی پر ان طوفانی موجوں کا تصرف ہے، جس طرف [illegible] نظر
اٹھا کر دیکھئے آپ کو یہی کرشمہ نظر آئے گا، دنیا لرزہ میں [illegible] ہے اور ایک عالم پر [illegible]
[illegible]

چاہتی ہیں اُبھر رہی ہیں، مٹ جاتی ہیں، فریاد لاکھ پر لاؤ، زور دیجئے۔ ایک دوسرے پہلو سے آپ ڈارون کے
نظریہ پر آن پہونچے، یعنی دنیا میں فتح و ظفر اسی کے لئے مقدر ہے جو مکمل طور سے مسلح ہوگا۔
ہندی شوکت، یونانی عظمت، مصری جبروت، رومی سطوت اور ایرانی اقتدار سب نے فرداً فرداً دنیا
کو ہلا دیا، لیکن اس سیلابِ عظیم کی زد سے کوئی محفوظ نہ رہ سکا، ناممکن ہے کہ قوم کم زور رہ جائے اور سیلاب کی
لہریں اُسے خاموش بیٹھنے دیں۔ یہ لہریں کسی کے ساتھ رو رعایت نہیں کرتیں۔

---

علی گڑھ ہی کی فضا کو اپنی نظر میں رکھئے، یکم اکتوبر سے داخلہ شروع ہوتا ہے اور تین ماہ کی تعطیل کے بعد کالج کھلتا
ہے۔ ہزارہا طلباء داخلہ کے لئے آموجود ہوتے ہیں اور دو تین دن تک بھاگے بھاگے پھرتے ہیں، ایک طوفانی
ہنگامہ آرائی شروع ہو جاتی ہے۔ دس بارہ دن تک وہی ہماہمی اور دوا دوش، خدا خدا کر کے درس و تدریس
کا سلسلہ شروع ہوا کہ ناگہاں نومبر کے وسط میں لاٹ صاحب کے آنے کی خبر گرم ہوئی۔ پھر طوفانی لہریں امنڈنے
لگیں۔ پھر پانی میں برقی اثرات دوڑنے لگے، انتظامات شروع ہوئے، خیمہ و خرگاہ کا بندوبست ہوا۔ موٹر بگولوں
کی طرح مارے مارے پھرے۔ لاٹ صاحب کا ورود مسعود ہوا، خطبہ اور جواب خطبہ دونوں پڑھے گئے گردونوں
بے معنی مہمل جذبات سے دو چار، تصنع اور رسمیات سے ہم کنار۔ ایک آدھ دن بعد خدا خدا کر کے فضا میں سکون پیدا
ہوا، لڑکوں کے دم میں دم آیا ع "پھر وہی کنج قفس اور وہی صیاد کا گھر" اس تمام ہنگامہ آرائی کو آپ طوفان کے
تموج سے مشابہ پائیں گے، وہی شور و شغب، وہی ہماہمی، وہی کوہ نما موجوں کا بل کھانا اور ساحل
سے آ آ کر ٹکرانا۔

فروری کے مہینہ کو لیجئے، موسم بہار کے آخری ایام ہیں، نمائش کا آغاز ہے، شام کے وقت غروب سے کچھ دیر قبل یا
کچھ دیر بعد آپ نمائش کے کسی چبوترے پر کھڑے ہو جایئے یا ٹہلئے، ہر طرف طوفانی لہریں ہر سمت سے آتی ہوئی آپ کو
نظر آئیں گی [illegible]
[illegible]
[illegible]

اس طوفان سے نجات مل گئی یا ایک امتحان کے مہیب اور خوفناک تخیل سے ہوش و حواس پیاپنا سکر جانا چاہا، پھر بے بس ہو کر طوفان کی لہروں میں خس و خاشاک کی طرح بہنے لگے"
بہے جا، بہانے سے لئے جا۔ نہ تجھ میں سلامتی، نہ تیرے کنارے پر سلامتی۔

---

میں علی گڑھ کی فضا میں بارہ سال گزر چکے ہیں مگر اب تک بھاڑ جھونکنا بھی نہ آیا، مگر ہر سال اسی طوفان سے دوچار ہونا پڑتا ہے مگر میرا ذاتی خیال ہے کہ ڈرینج سسٹم Drainage system اور کالج کے سیشن کی تقسیم اگر ٹرمس (Terms) میں ہو سکی تو فضائے علی گڑھ کے یہ طوفانی اثرات ایک حد تک زائل ہو جائیں گے۔

باقی دارد

---

# غزل

---

یہی اپنے مدفن کی تجویز ہوگی ... کہ ہم ہوں گے اور اُن کی دہلیز ہوگی
بڑھاپے پہ توبہ ہے دنیا پہ جوبن ... جوانی میں کیا جانے کیا چیز ہوگی
بکتا ہے واعظ کوئی منہ تو سونگھے ... نہ ہو پیئے سے بوئے کشمیز ہوگی
ہمیں کیا غرض خود وہ پہچان لے گا ... جسے دوست دشمن کی تمیز ہوگی

دوا ہے نظیر اپنے اب اُن سے ہم ہم
وہی ایک تجویز۔ تجویز ہوگی

(منیر بیگ نظیر شاہ صاحب)

# ہیرا بائی

(از) جناب عزیز صاحب بریلوی (ماخوذ از آرسن لوپن)

ستمبر کا مہینہ ہے - سورج کی شعاعیں بمبئی کے رئیس اعظم سیٹھ جمشید جی کے عالیشان قصر کے وسیع ہال میں چھن چھن کر آ رہی ہیں - اور صدیوں سے جمع کردہ بیش بہا نوادر کو نمایاں کر رہی ہیں - نایاب تصاویر - پرانے اور قیمتی اسلحہ - رومی اور ایرانی قالین - یہ ہیں وہ چیزیں جو ہال کی زینت کو دوبالا اور صاحب مکان کے حسنِ مذاق پر دلالت کر رہی تھیں - مگر سب میں درخشندہ اُس دوشیزہ کا چہرہ تھا - جو کھڑکی کے قریب والی میز پر بیٹھی ہوئی کچھ لکھنے میں مصروف تھی - یہ حسین اور نازک اندام تھی - اس کے رخساروں پر ابروؤں کے ساتھ نہایت ہی خفیف سرخی کی جھلک نمایاں تھی - اور ایک حسن کے متلاشی کے لئے یہ امر دشوار تھا کہ اس کی نشیلی آنکھوں پر قربان ہو جائے یا اُن لبہائے لعلیں کے جو ہر دم دعوت بوسہ دے رہے ہیں - دل وجان فدا کرے - مگر کوئی صاحب دل ایسا نہیں جو اُس حسین اور بھولے چہرہ پر رنج والم کی ایک مستقل کیفیت نمایاں دیکھ کر متاثر ہو جائے - وہ لفافوں پر پتے تحریر کر رہی تھی اور اس کے بائیں ہاتھ کے قریب ناموں کی ایک طویل فہرست رکھی ہوئی تھی - ہر لفافہ پر پتہ لکھ کر وہ ایک دعوتی کارڈ دل میں رکھتی جاتی تھی - کارڈ پر حسب ذیل تحریر چھپی ہوئی تھی :

"شاپورجی نہایت مسرت سے جناب کو اس امر کی اطلاع دیتے ہیں کہ اُن کی صاحبزادی کی نسبت بمبئی کے رئیس اعظم سیٹھ جمشید جی سے قرار پائی ہے "

وہ اس طرح لفافوں پر لفافہ لکھنے میں مصروف تھی - البتہ گاہے گاہے جب کبھی اُن لڑکیوں کی آواز جو سامنے شینیں لان پر کھیلنے میں منہمک تھیں بلند ہوتی - تو وہ اپنا سر اُٹھا کر ایک نگاہ اُن پر ڈالتی - اور پھر ایک آہ سرد - اور خفیف سے ساتھ ورانی خوف کے ساتھ کہ اس کو خود بھی کم محسوس ہوتی - اپنے کام میں مشغول ہو جاتی -

[illegible] وہ مس ہیرا بائی شاپورجی کی صاحبزادی کی آمد [illegible] جن کی شادی کے

خطوط فہمیدہ تحریر کر رہی تھی)۔

"فہمیدہ" فہمیدہ"۔ فہمیدہ۔ "حضور"۔ آواز "چار بجے چا تیار کراؤ بہت جلد"۔ فہمیدہ "بہت مناسب"۔ فہمیدہ (یہ اس دوشیزہ کا نام ہے جو لفافہ پر پتے تحریر کر رہی تھی) اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور دوسرے کمرے میں جا کر گھنٹی بجانے لگی۔ ایک خدمتگار فوراً حاضر ہوا جس سے فہمیدہ نے کہا "فیروز، چا بنالاؤ"۔ فیروز "کتنے آدمیوں کے واسطے؟" فہمیدہ "چار کے واسطے، اگر تمہارے آقا واپس نہ آتے ہوں"۔ فیروز "سرکار آج لاٹ صاحب سے ملنے تشریف لے گئے ہیں۔ وہ ابھی دو گھنٹہ واپس نہ آئیں گے"۔

فہمیدہ "اور سیٹھ جمشید، کیا وہ ابھی ابھی ہواخوری سے واپس نہیں آئے ہیں" فیروز "جی نہیں"۔ یہ کہکر فیروز جانے لگا تو فہمیدہ نے کہا "ایک منٹ۔ تم سب نے بمبئی کے سفر کے لئے سامان طیار بھی کر لیا یا نہیں۔ ؟ تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ روانگی بہت جلد ہونے والی ہے۔ ملازمائیں بھی طیار ہیں۔ یا نہیں"۔ فیروز "ان کے بارہ میں تو مجھ کو علم ہے کہ طیار ہیں۔ عورتوں کا کچھ پتا نہیں۔ فہمیدہ "تو اچھا، اُن سے بھی کہدو کہ فوراً طیار ہو جائیں۔ اور دیکھو چا میں جلدی کرو"۔

فیروز کو حکم دے کر فہمیدہ پھر میز کے پاس واپس آگئی۔ اور اُس نے قلم تو نہیں۔ مگر شادی کا ایک کارڈ اٹھایا۔ اور اس وقت اس کے ہونٹوں کو ایک ایسی خفیف سی جنبش ہوئی۔ گویا وہ کسی خاص مایوس کن خیال میں منہمک ہے۔

مس ہیرا بائی ہال میں داخل ہوئی۔ اور اُس کی تیز آواز نے فہمیدہ کو اُس کے خیالات سے چونکا دیا۔

"فہمیدہ، تم کیا کر رہی ہو۔ کیا ابھی تک شادی کے خطوط ہی لکھے جا رہی ہو؟" یہ شا پورجی کرورجی کی تنہا دختر کے ہاتھ میں ٹینس کا ایک رَیکٹ تھا۔ یہ حسین تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ اور ہونٹ اور رخساروں پر سرخی۔ مگر اِن میں وہ خصوصیت نہ تھی جو فہمیدہ کے چہرے سے ٹپکتی تھی۔

# باب ۲

## موٹر کے خریدار

مس ہیرا بائی کے دوست چا پی کر رخصت ہوئے۔ اور فہمیدہ اپنے مقام پر جا کر خط لکھنے میں مصروف ہو گئی۔ مس ہیرا بائی کو اب چونکہ کوئی خاص شغل نہ تھا۔ وہ کبھی ایک کرسی پر بیٹھتی کبھی دوسری پر۔ ایک میگزین [illegible]

صفحات پر نظر ڈالی۔ اور جہاں سے اٹھایا تھا۔ وہیں رکھدیا۔ کبھی کمرے میں ٹہلنے لگتی۔ اور بیکار سوالات سے فہمیدہ
کو باتوں میں لگا لیا۔ دفعتہً کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور فیروز اندر داخل ہوا۔

"کیوں! کیا ہے؟" مس ہیرا بائی نے پوچھا۔

فیروز "حضور! دو صاحب آئے ہیں۔ اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" مس ہیرا بائی۔ "کون ہیں؟" فیروز
"انھوں نے نام تو بتایا نہیں۔ ایک تو ادھیڑ عمر کے ہیں۔ اور ایک اُن سے عمر میں کچھ کم۔"

مس ہیرا بائی "اچھا بلاؤ" یہ کہکر مس ہیرا بائی کھڑکی کے قریب ایک کرسی پر نہایت شان سے جا بیٹھی۔
اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ یکایک اس کی نگاہ کھڑکی کے شیشہ پر گئی اور دفعتہً اُس کی زبان سے نکلا "ہیں!
یہ کیا"؟ "کیا ہے؟" فہمیدہ نے سوال کیا۔ مس ہیرا بائی "اس کھڑکی کے شیشہ کو دیکھو۔ ایک شیشہ کس نے
نکال لیا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کاٹ کر نکالا ہے۔" فہمیدہ "ہاں! معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے" مس
ہیرا بائی "کیا تم اس سے پہلے دیکھ چکی ہو؟"

"نہیں! غالباً ٹوٹا ہوا شیشہ کھڑکی کے باہر گر گیا ہے۔" لڑکی نے جواب دیا۔

دروازہ کے کھلنے کی آواز نے ان دونوں کی توجہ کھڑکی کی جانب سے ہٹادی۔ دو شخص ان کی جانب
آ رہے تھے۔ ایک پستہ قد موٹا تقریباً پچپن برس کی عمر کا تھا۔ جس کی بھوری مگر روشن آنکھیں ہمیشہ اس کوشش میں
رہتی تھیں کہ دوسروں سے نگاہ چار نہ کریں۔ اس کے پیچھے ایک نوجوان تھا۔ رنگ سیاہی مائل مگر سنجیدہ۔
رنگ کے فرق کے باوجود یہ امر بالکل واضح تھا کہ یہ دونوں باپ بیٹے ہیں۔

مس ہیرا بائی ان کو دیکھ کر نہایت تعجب سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ غالباً وہ ان کی بجائے کسی دوسرے کی آمد کی
متوقع تھی۔ ان میں سے جو زیادہ عمر کا تھا مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور کہنے لگا۔

"مس صاحبہ، میرا نام خانصاحب محمد رشید ہے۔ پنشن یافتہ فوجی کرنل اور یہ میرا لڑکا ہے محمود۔ یہ انجینیر ہے۔"

فہمیدہ نے آہستہ سے مس ہیرا بائی سے دریافت کیا کہ ان لوگوں کے واسطے چا طیار کرائی جائے۔ جس کا
ہیرا بائی نے اسی تندی سے جواب دیا کہ "مطلق ضرورت نہیں" اور ان دونوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگی "آپ کی
تشریف آوری کا سبب؟" رشید نے مسکرا کے پیشتر ایک نگاہ اس کے چہرہ پر ڈالی اور کہا "ہم لوگ دراصل

آپ کے والد صاحب سے ملنے آئے تھے۔ مگر ملازم سے معلوم ہوا کہ مسٹر شاہ باہر تشریف لے گئے ہیں۔ مگر ان کی صاحبزادی تشریف رکھتی ہیں۔ دل نے نہ مانا کہ ان کی زیارت سے محروم چلے جائیں۔" اتنا کہہ کر رشید کرسی پہ بیٹھ گیا۔ اور محمود نے اس کی تقلید کی۔ مس ہیرا بائی اور فہمیدہ اس طرزِ عمل سے حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں اور کمرہ میں خاموشی چھا گئی۔ آخر محمود نے مُہرِ سکوت توڑی۔ اور یوں گویا ہوا۔ محمود "ابا جان! یہ مکان نہایت عمدہ ہے" رشید "ہاں! بے شک" اور پھر ہیرا بائی کی طرف مخاطب ہو کر "مس صاحبہ! آپ کا کمرہ بہت عالیشان ہے"

مس ہیرا بائی "مگر معاف فرمائیں آپ کے یہاں قدم رنجہ فرمانے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی" رشید کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھا اور اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگا۔ "بات یہ ہے کہ میں نے ٹائمز آف انڈیا میں آپ کے والد صاحب کی جانب سے ایک اشتہار دیکھا۔ کہ وہ اپنی ایک موٹر علیحدہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں اور میرا لڑکا مجھ سے برابر ایک تیز رفتار کی موٹر کی خریداری کے لئے اصرار کرتا رہتا ہے۔ ہمیں سات گھوڑوں کی طاقت کی موٹر کی ضرورت ہے" ہیرا بائی "ہمارے یہاں سات گھوڑوں کی طاقت کا موٹر تو ضرور ہے۔ مگر ہم اُس کو علیحدہ کرنا نہیں چاہتے۔ اور میرے والد تو آج ہی اُس پر سوار ہو کر گئے" رشید "تو شاید یہ وہی موٹر ہے۔ جو ہم نے اس موٹر خانے میں دیکھی ہے" ہیرا بائی "جی نہیں! یہ تیس سے چالیس تک گھوڑوں کی طاقت کی ہے اور یہ میری سواری میں رہتی ہے۔ اگر صاحبزادے کو تیز موٹر درکار ہے۔ تو ہمارے یہاں ایک موٹر سو گھوڑوں کی طاقت کی ہے۔ اور میں آپ کو اس کی تصویر دکھاؤں۔ ابھی تو یہیں رکھی تھی۔" فہمیدہ ذرا موٹر کی تصویر لانا" یہ دونوں لڑکیاں تصویر کی تلاش میں میز کے قریب گئیں اور کاغذات میں تلاش کرنے لگیں۔ ان کی پیٹھ پھیرتے ہی محمود نے نہایت پھرتی سے اُٹھ کر پاس کی الماری سے ایک کتاب جس کی جلد چاندی کی سی پتر کی تھی۔ اُٹھائی اور نہایت ہوشیاری سے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لی۔

قاضی صاحب عبدالرشید نہایت تیز نگاہوں سے ان دونوں لڑکیوں کو دیکھ رہے تھے۔ گو اپنے صاحبزادے کی اس حرکت پر اُن کو غصہ آ گیا۔ اور چہرہ پر بغیر کسی قسم کا اثر ظاہر کئے آہستہ سے اپنے لڑکے سے کہا "وہ ماش! کتاب فوراً الماری میں رکھ۔ دونوں لڑکیوں کے واپس آنے سے پہلے کتاب اپنی جگہ موجود تھی۔ مس ہیرا بائی نے

عبدالرشید کے ہاتھ میں تصویر الا کر دی۔

عبدالرشید تصویر دیکھ کر " یہ بے شک ہمارے کام کی چیز ہے۔ آپ کم سے کم اس کی قیمت کیا قبول کریں گے "

ہیرا بائی۔" اس سے مجھ کو کوئی واسطہ نہیں۔ اس کے بارے میں آپ میرے والد سے گفتگو کر سکتے ہیں " رشید۔

" مناسب۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے آپ کا قیمتی وقت ضائع کیا۔ اچھا! آداب عرض ہے "" آداب عرض "

رشید اور محمود شیک ہینڈ کر کے رخصت ہوئے۔

## گمشدہ تصویر

اب چونکہ چار کا وقت قریب آ چلا تھا۔ اور سیٹھ جمشید جی وعدہ کر گئے تھے۔ کہ ٹھیک پانچ بجے آ کر چائے پئیں گے

مس ہیرا بائی اور فہمیدہ کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئیں۔ اور نہایت بے صبری سے ان کا انتظار کرنے لگیں۔ دفعتہً

فہمیدہ چونک پڑی اور آگے بڑھ کر نہایت غور سے دیکھنے لگی۔ اور پھر یکایک چلانے لگی۔ فہمیدہ " مس صاحبہ!

وہ دیکھئے وہ!" ہیرا بائی " کیا ہے؟" فہمیدہ " وہ دیکھئے ایک سوار آ رہا ہے! وہ۔ اس جانب! "

ہیرا بائی " ہاں! اور بہت سرپٹ دوڑائے آ رہا ہے " فہمیدہ " اہا! یہ تو سیٹھ جمشید جی ہیں " ہیرا بائی " کیا

واقعی؟" فہمیدہ " یقیناً " ہیرا بائی " خیر! تو ٹھیک چائے کے وقت آ پہنچے۔ ان کو معلوم ہے کہ مجھ کو انتظار سے

کس قدر تکلیف ہوتی ہے۔ اور اس لئے وہ کہہ گئے تھے کہ ٹھیک پانچ بجے آؤں گا۔ چنانچہ دیکھئے وہ موجود ہیں "

فہمیدہ " مگر پانچ بجے تک تو آنا غیر ممکن ہے۔ ان کو پورا باغ طے کر کے آنا ہو گا۔ اس لئے کہ سامنے تو نہر ہے۔ اور کوئی

سیدھا راستہ دوسرا ہے نہیں " ہیرا بائی " مگر اس کے باوجود وہ تو سیدھے ہی آ رہے ہیں " یہ بات صحیح تھی

اس لئے کہ جمشید جی سیٹھ سیدھے نہر کے سامنے گھوڑا دوڑائے آ رہے تھے۔ انھوں نے سڑک چھوڑ دی تھی۔ اور

اب نہر بالکل سامنے تھی۔ بیس سیکنڈ میں وہ نہر کے کنارے تک آ پہنچے۔ اور جوں ہی انھوں نے گھوڑے کو [illegible]

لگائی فہمیدہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ مس ہیرا بائی " لو! وہ نہر کود ہی گئے۔ گھوڑا بھی تو نہایت اچھا [illegible]

[illegible] فہمیدہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور خوشی کے آنسو چھپانے کے [illegible]

[illegible]

اس کی آنکھوں پر اب تک ایسا غبار چھایا ہوا تھا کہ اس نے جمشید جی کو کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے بھی نہ دیکھا۔ جمشید جی نے اپنی جیب سے گھڑی نکالی۔ اور مس ہیرا بائی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے ٹھیک پانچ بجے ہیں۔ اور میں حسب وعدہ چاء کے وقت حاضر ہوں۔" یہ کہکر اُنھوں نے نہایت جوش سے مس ہیرا بائی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ان کو ایک بوسہ دیا۔ مس ہیرا بائی اور جمشید جی چاء پر بیٹھ گئے۔ اور فہمیدہ پھر کارڈ لکھنے میں مصروف ہوگئی۔ مگر اس وقت اس کا دل کچھ اُچاٹ تھا۔ مس ہیرا بائی اس کی جانب پیٹھ کئے بیٹھی تھی۔ مگر سیٹھ جمشید جی اور وہ آمنے سامنے تھے۔ سیٹھ جمشید جی کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ مگر اس وقت اس پر ایک رنگ آتا تھا۔ ایک جاتا تھا۔ بعض اوقات سیٹھ جی کی نگاہیں فہمیدہ سے چار ہو جاتی تھیں۔ مگر جوں ہی سیٹھ جی کی نظر پھرتی۔ فہمیدہ نہایت حریص نگاہوں سے ان کی جانب دیکھنے لگتی۔ سیٹھ جمشید چاء پی کر فارغ ہوئے تو اُنھوں نے جیب سے ایک مراکو کی ساخت کا نہایت خوبصورت کیس نکالا۔ اور کہا "تقریباً تین یوم سے میں نے آپ کو کوئی تحفہ نہیں دیا ہے۔ یہ کہکر اُنھوں نے کیس کھولا۔ اور ایک بیش بہا موتیوں کا ہار نکال کر مس صاحبہ کی نذر کیا۔

مس ہیرا بائی ہار کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اور تعریف کی تائید کے لئے فہمیدہ کو دکھایا۔ اور پھر گلے میں پہن کر قد آدم آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔ نفس الامر یہ ہے کہ یہ ہار مس ہیرا بائی پر بالکل نہ پھبا نہ اُن کے رنگ سے موتیوں کی چمک دوبالا ہوئی۔ نہ درخشاں موتیوں نے ان کے حسن کو چمکایا۔ البتہ اگر یہ ہار فہمیدہ کی نازک گردن میں ہوتا۔ تو فہمیدہ تو کیا کچھ موتیوں کی ہی ضو فگنی میں اضافہ ہو جاتا۔

ہیرا بائی خود آرائی سے فارغ ہو کر واپس آئیں۔ ان کو خیال بھی نہ ہو سکتا تھا۔ کہ اس قدر قیمتی ہار سے بھی ان کے حسن میں کچھ اضافہ نہ ہو۔

جمشید جی: "اُفوہ! اس قدر خطوط! کیا یہ سب شادی کے خطوط ہیں؟"

ہیرا بائی: "ابھی تو صرف L تک لکھے جا چکے ہیں۔"

سیٹھ جی: "اور alphabet میں چھبیس حروف ہیں۔ تو آپ گویا دنیا بھر کو مدعو کر رہی ہیں۔"

ہیرا بائی: "کیوں کیا شاندار جشن ہوگا۔ ہزاروں آدمی ہوں گے۔ مجھے خوف ہے کہیں کوئی حادثہ [illegible]

جمشید جی: "اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو نہایت کافی انتظام کرتا۔ تاکہ کسی [illegible]

ہیرا بائی ۔ "لوگ یہی فکر خود کر لیں گے ۔ اگر کسی کے چوٹ آ بھی گئی ۔ تو یاد بھی خوب کرتے ہو؟"

جمشید جی کے چہرے سے ایک حقارت نما تعجب ظاہر ہوا ۔ مگر وہ کچھ سوچکر فریدہ کی جانب متوجہ ہوا اور کہنے لگا

"آؤ ۔ پیانو تو سناؤ ۔ میں نے کل تم کو پیانو پر گاتے سنا تھا ۔ تم سے اچھا پیانو کوئی نہیں بجاتا"

مس ہیرا بائی "نہیں اس وقت نہیں ۔ فریدہ کو اور کام کرنے ہیں"

جمشید نے ہنس کر کہا "صرف پانچ منٹ کے لئے" ہیرا بائی "خیر! اگر ہم کو تم سے ایک نہایت ضروری معاملہ میں گفتگو کرنی ہے" سیٹھ "اور مجھ کو بھی تم سے ایک خاص بات کہنی ہے ۔ میرے پاس تمہاری اور فریدہ کی فوٹو جو پہلی مرتبہ کھینچی تھی موجود ہے"

ہیرا بائی "اوہو! یہ بھی کوئی خاص بات ہے" جمشید جی "تمام معمولی باتوں کی طرح یہ بھی نہایت اہم ہے ۔ دیکھو کتنی عمدہ تصویر ہے" یہ کہکر جمشید جی جیب سے تصویر نکال کر دکھانے لگے ۔

ہیرا بائی "آپ اسے عمدہ کہتے ہیں ۔ ہائے چپ ہے تو دیکھئے ۔ کیسے ڈراؤنے معلوم ہوتے ہیں"

سیٹھ "منہ تو آپ دونوں بیشک بنائے ہوئے ہیں ۔ مگر چہرے ڈراؤنے قطعاً نہیں ۔ مس فریدہ! آپ فیصلہ کیجئے ۔ اچھا! چہروں کو چھوڑ دیجئے ۔ اور چیزیں دیکھئے ۔ مثلاً اسکارف"

مس ہیرا بائی کو اب تاب نہ رہی اور کہہ اٹھی "پیارے جمشید! آپ بعض وقت کیسی فضول باتیں شروع کر دیتے ہیں"

سیٹھ "معاف کرنا پیاری بالکل بھول گیا ۔ کہ آپ کو مجھ سے کسی نہایت ضروری معاملہ پر گفتگو کرنی ہے"

یہ کہکر جمشید جی نے فریدہ سے تصویر لے کر احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لی ۔ اور ہیرا بائی کی جانب متوجہ ہوگئے

ہیرا بائی "بمبئی سے ہماری پرانی خادمہ زہرا بائی نے ٹیلیفون پر اطلاع دی ہے کہ آپ کے احباب ایک کاغذ خوشنما شیشے کا پیالہ اور ایک قلمدان تحفہ بھیجا ہے ۔ "بہت خوب!" جمشید جی نے یہ الفاظ اس قدر چلا کر کہے کہ وہ دونوں اچھل پڑیں ۔ ہیرا بائی "اور ایک مرتبان کا گلدان بھی"

وہاں سے جمشید جی نے پھر بلند آواز سے کہا ۔ ہیرا بائی ۔ جمشید جی! آپ بھی بعض اوقات کیسی [illegible]

کی باتیں [illegible] آپ سے کتنی مرتبہ کہا کہ ایک پیالہ تحفہ میں آیا ہے ۔ آپ تعریف کرنے لگے ہیں [illegible]

چاہیے کہ ایک موتیوں کا گلوبند بھی ہے۔ آپ خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے تھے کیا آپ کو قیمتوں کا کچھ اندازہ بھی نہیں؟"

سیٹھ "پیاری معاف کرنا! اگر موتیوں کا گلوبند تو آپ کے والد صاحب کے ایک دوست نے بھیجا ہے" ہیرا بائی "ہاں! ہاں! تو پھر" سیٹھ جمشید "مگر چاقو اور قلمدان میرے دوستوں نے بھیجا ہوگا" ہیرا بائی "ہاں! ہاں! تو پھر"

سیٹھ "پھر کچھ نہیں! برابر برابر ہوگیا۔ اب تم کو شکایت کی کوئی وجہ نہیں"

اس جواب سے مس ہیرا بائی خشمگیں ہوگئیں۔ اور کہنے لگیں "آپ کو میری ذرہ برابر پرواہ نہیں"

سیٹھ "مگر میں آپ کی پرستش کرتا ہوں" مس ہیرا بائی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور کھڑکی کے پاس جاکر باہر کی جانب دیکھنے لگیں۔ سیٹھ جمشید جی ہال میں ٹہلنے لگے۔ اور اپنے بزرگوں کی تصاویر کو جو ہال کی دیواروں پر آویزاں تھیں۔ دیکھتے رہے۔ فہمیدہ اپنے کام میں مصروف تھی۔ اور کبھی کبھی نگاہ اُٹھا کر جمشید جی کو دیکھنے لگتی۔ جب کبھی ان کی نظر اُس سے دوچار ہوتی۔ وہ مسکرا دیتے۔ مس ہیرا بائی اس جانب سے پشت کئے بیٹھی تھی۔ اور گویا طرح اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہی تھی۔ جمشید جی کی نگاہ تصاویر دیکھتے دیکھتے ایک ایسی جگہ پر پڑی جہاں تصویر کے بجائے صرف ایک کپڑا پڑا ہوا تھا۔ خالی جگہ دیکھ کر سیٹھ جی بہت متحیر ہوئے۔ اور بولے "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے میرے بزرگوں کی تصاویر تو یہاں گھورنے کے لئے رہنے دیں۔ اور میرا نہایت نفیس فوٹو علیحدہ کر دیا ہے"

مس ہیرا بائی کھڑکی کے پاس سے لوٹ پڑیں۔ اور فہمیدہ لفافہ لکھتے لکھتے رک گئی۔ اور دونوں نہایت تعجب سے جمشید جی کو دیکھنے لگیں۔ سیٹھ "یہاں جس جگہ کپڑا لٹک رہا ہے۔ یقینی طور پر میری تصویر تھی آپ نے اس کا کیا حشر کیا" ہیرا بائی "آپ نے ہم سے پھر مذاق شروع کیا"

فہمیدہ "یقیناً سیٹھ جی آپ کو معلوم ہوگا کہ تصویر کا کیا واقعہ ہوا"

ہیرا بائی "ہم نے تو آپ کو اس واقعہ کی جس کو اب تین سال کا عرصہ ہوا تفصیلی اطلاعات لکھ کر روانہ کر دی تھیں اور اخبارات بھی بھیج دیئے تھے۔ کیا وہ آپ تک نہیں پہنچے"

سیٹھ "مجھ کو قطعاً خبر نہیں۔ اور تین سال اُدھر تو میں جنوبی افریقہ میں تھا۔ اور لوگوں کو میری کچھ خبر ہی نہ تھی"

ہیرا بائی " کل رات جشید ! یہ بھی ایک نہایت ہی عجیب واقعہ تھا - تمام بمبئی میں اس کا چرچہ تھا - آپ کی تصویر چوری گئی تھی " سیٹھ " چوری ! کس نے چرائی تھی !"

ہیرا بائی دیوار کے پاس خالی جگہ کے قریب جا کھڑی ہوئیں اور بولیں " میں آپ کو دکھاتی ہوں " اور یہ کہکر کپڑا اٹھایا - جس جگہ تصویر لٹکتی تھی - وہاں کھریا سے نہایت جلی الفاظ میں لکھا تھا -

# "یعقوب"

ہیرا بائی " دیکھا ! آپ نے کس کا نام ہے ؟ " " یعقوب " سیٹھ جمشید جی نے نہایت حیرت سے نام دہرایا

فہمیدہ " معلوم ہوتا ہے چور آپ کے دستخط کر گیا ہے ؟ "

سیٹھ " مگر یہ ہے کون شخص ؟ " ہیرا بائی نے نہایت بے صبری سے کہا " یعقوب ! کیا آپ واقعی یعقوب کو نہیں جانتے ؟ " سیٹھ " مجھے اس نام کا خیال تک نہیں "

ہیرا بائی " کیا آپ فی الحقیقت یعقوب سے ناواقف ہیں - یہ ہندوستان کا نہایت ہی نامور اور دلیر ڈاکو ہے جس نے گزشتہ دس سال میں ہندوستان کے مشہور سُراغ رسانوں کو ............ جن کی قابلیت شہرۂ آفاق اور مسلّم ہے - نیچا دکھایا ہے "

سیٹھ " ہاں ! میں نے اس کو کبھی یہاں مدعو تو کیا نہیں - مگر یہ تو بتائیے کہ وہ ہے کس شکل و شباہت کا آدمی ؟ " ہیرا بائی " یہ بات کوئی بھی نہیں بتا سکتا - وہ ہزار کا بھیس بدل سکتا ہے - بس یوں سمجھ لیجئے کہ دو مرتبہ گورنر کے ساتھ ڈنر بھی کھا چکا ہے "

سیٹھ نے حیران ہو کر دریافت کیا " مگر اگر کوئی شخص اس کو پہچان نہیں سکتا - تو لوگوں کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ سب یعقوب ہی کے کارنامے ہیں ؟ "

ہیرا بائی " معلوم یوں ہوا کہ دوسری دعوت کے بعد مہمان غائب تھا - اور اس کے ساتھ ہر کسی کے جواہرات بھی " سیٹھ " تمام جواہرات ؟ "

ہیرا بائی " تمام - اور [illegible] ایک کاغذ بھی [illegible] جس پر یعقوب کے دستخط تھے - اور لکھا تھا " چوری نہیں ہے

بلکہ واجبی ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان کا مال ہندوستانی ہی میں رہنا چاہیئے۔"

سیٹھ "مگر اس کے یہ الفاظ تو بناوٹی معلوم ہوتے ہیں۔"

فہمیدہ نے جوش میں آکر کہا "نہیں! جمشید جی! یہ بات نہیں ہے۔ آپ نے نیشنل بنک کی چوری کا حال سنا ہوگا۔ یعقوب نے وہ روپیہ غربا میں تقسیم کر دیا۔"

سیٹھ "یہ اس بنک کا تو ذکر نہیں۔ جس کے ڈائرکٹر نے غربا سے دو نا دون کا سود لے کر روپیہ کمایا تھا اور پھر نیشنل بنک کے نام سے ایک بنک کھلوایا تھا۔"

فہمیدہ۔ "جی ہاں! اسی کا۔ اور یعقوب نے یہ کیا کہ سیف توڑ کر ایک ایک پائی نکال لی۔ اور یہ انھیں غربا میں تقسیم کیا۔ جن سے سود لے کر یہ ڈائرکٹر امیر کبیر بن گیا تھا۔"

سیٹھ "تو یہ چور کا کام نہیں۔ اس کو تو ملک کا بہی خواہ کہنا چاہیئے۔"

ہیرا بائی۔ "جی ہاں! بڑے بہی خواہِ قوم! ابا جان کو لوٹنے میں تو اس نے قوم کی بہی خواہی کی تھی۔ کیوں صاحب؟" سیٹھ "اگر اس واقعہ پر غور کیا جائے۔ تو بنک کی چوری اس قومی قزاق کے شایان شان تھی۔ میری تصویر کی اس قدر وقعت نہیں ہو سکتی کہ یعقوب اس کو چرانے آیا۔"

ہیرا بائی۔ "اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ وہ آپ کی تصویر چرانے آیا تھا۔ تو آپ غلطی پر ہیں۔ وہ میرے والد کی تصاویر کا تمام ذخیرہ لے گیا۔" سیٹھ۔ "آپ کے والد کی تصاویر کا ذخیرہ! ان کی تو اتنی حفاظت ہوتی تھی۔ جتنی کہ امپیریل بنک کی بھی نہیں ہوتی۔ آپ کے والد تو اس کی اس قدر فکر کرتے تھے۔ جس قدر کوئی اپنی آنکھ کی بھی نہیں کرتا۔" ہیرا بائی "اس حفاظت ہی کا تو یہ نتیجہ ہوا کہ یعقوب ان کو لے اڑا۔" سیٹھ۔ "یہ نہایت دلچسپ واقعہ ہے۔" یہ کہکر سیٹھ اٹھ کر کوچ پر جا بیٹھے اور بولے "معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر اس کا کوئی رازدار بھی ضرور ہوگا۔"

ہیرا بائی۔ "ہاں! ایک رازدار تو ضرور تھا۔" سیٹھ۔ "وہ کون؟" "ابا جان" ہیرا بائی نے جواب دیا۔

سیٹھ۔ "کیوں! مذاق کرتی ہو؟ سچ بتاؤ تمہارا کیا مطلب ہے؟" ہیرا بائی "میں آپ کو سب سنائے دیتی ہوں۔ ایک صبح ابا جان کو خط ملا۔ ٹھہریئے میں آپ کو خط ہی دکھائے دیتی ہوں۔ فہمیدہ [illegible] سے یعقوب کے متعلق جو انکشافات ہیں۔ مجھے نکال دیجئے۔" فہمیدہ [illegible]

ان میں سے کچھ کاغذات نکال لائی۔ اور سیٹھ کے ہاتھ میں دے دیئے۔ فہمیدہ نے ایک خط کی طرف اشارہ کیا اور کہا: "یہ لفافہ ہے جو شاہ پور جی جمشید منزل پونا کے پتے پر بھیجا گیا تھا۔"

سیٹھ نے لفافے سے خط نکالا۔ اور تحریر پر نظر ڈال کر بولے۔ "عجیب قسم کی تحریر ہے!"

ہیرا بائی: "اس کو غور سے پڑھئے۔" یہ ایک غیر معمولی طرز کی تحریر تھی الفاظ تھے مگر خوشنما اور اُن سے معلوم ہوتا تھا کہ صاحبِ تحریر کو اپنے خیالات کے مختصر مگر نہایت واضح الفاظ میں اظہار کرنے کی پوری قدرت حاصل ہے۔ خط حسب ذیل تھا:

مہربان محترم

مجھے امید ہے کہ جناب میری اس جسارت کو کہ میں آپ سے بغیر تعارف حاصل کئے آپ کی خدمت میں یہ تحریر روانہ کر رہا ہوں۔ معاف فرمائیں گے۔ مگر مجھے اس امر سے مسرت ہے کہ کوئی ذاتی............... مگر میرے نام سے جناب ضرور واقف ہیں۔ جناب کے ہال کے پاس والے ڈرائنگ روم میں جو تصاویر کا ذخیرہ آویزاں ہے۔ اُس کے نظارہ سے مجھے بے حد مسرت ہوتی ہے۔ اس کے پاس والے کمرہ میں آپ کی نایاب گھڑی جس میں ایک آدمی گھنٹہ بجتے وقت گھڑی سے برآمد ہوتا ہے اور بلند آواز سے وقت بتاتا ہے۔ نیز وہ طلائی پرند جس کے پروں کی جنبش سے کمرہ معطر ہو جاتا ہے کچھ کم دلآویز نہیں۔ مگر میرے لئے ان سب سے زیادہ کشش اس تاج میں ہے۔ جو آپ نے سیٹھ فریدون جی کی وفات پر ان کے ورثائے سے خرید کیا تھا۔ مجھے اس تاج سے دلچسپی اول تو اس وجہ سے ہے کہ اس کے دیکھنے سے ایک شاعرانہ خیال والے تاریخ کے شائق کے دل میں اس کے سابق مالک کے ایام عدل کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس کی دوسری کشش گو اس کا اظہار کچھ نامناسب سا معلوم ہوتا ہے۔ اس تاج کی قیمت ہے۔ میری رائے میں اس تاج کے جواہرات کم از کم دس لاکھ کی قیمت کے ہیں۔ لہٰذا التماس ہے کہ جناب ان مختلف اشیاء کو جن کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں نہایت حفاظت سے پیک فرما کر اور ریل کا محصول پیشگی ادا کر کے جام نگر اسٹیشن کو فوراً روانہ فرما دیجئے۔ ورنہ بروز پنجشنبہ ۱۰ اگست مجھ کو خود حاضر ہونا پڑے گا۔

مجھے یقین ہے کہ جناب اس تکلیف دہی کو معاف فرمائیں گے۔ آپ کا مخلص یعقوب

نوٹ۔ مجھے ابھی خیال آیا کہ بعض تصاویر میں شیشے نہیں ہیں۔ براہ کرم آپ ان فوٹوگرافوں پر نظر ڈال کر ضروری درستی کرا دیجئے۔ مجھے امید ہے کہ جناب میری خاطر یہ تکلیف گوارا فرمائیں گے۔ گو بعض ماہرین تصاویر کی رائے ہے کہ تصویر کی دلاویزی بہت کچھ اس پر شیشہ لگنے سے جاتی رہتی ہے۔ مگر اس سے حفاظت ہو جاتی ہے۔ اور تصویر اس سے خراب نہیں ہونے پاتی۔ اور ہندوستان ہم سے اس امر کا طالب ہے کہ ہم اپنی خواہشات کا ایثار کر کے آیندہ نسلوں کے واسطے تاریخی اشیاء کو محفوظ و برقرار رکھیں۔ یعقوب

سیٹھ جی خط کا مطالعہ کر کے ہنس پڑے۔ اور بولے "عجب مذاق ہے۔ آپ کے ابا جان کو بھی اس پر ہنسی آ گئی ہو گی۔"

میرا بائی "ہنسی! آپ نے ان کا چہرہ اس وقت دیکھا ہوتا۔ تو آپ یہ نہ کہتے۔ وہ بہت فکرمند ہو گئی تھی۔"

سیٹھ "اس حد تک تو نہیں کہ ان اشیاء کو پارسل میں روانہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہو۔"

# شمع

از محترمه پنہاں صاحبه بریلوی

اے نگارِ شام اے سرمایۂ حسن و جمال
اے عروسِ نازِ شب اے شاہدِ زرّیں خیال

شۂ برقِ طپاں افسانۂ طور و کلیم
عکسِ تنویرِ تجلی تابشِ حسنِ حریم

اے شعاعِ ضوئے نیّر نازشِ حسنِ قمر
آئینہ دارِ ضیا تابانیٔ ذوقِ نظر

خندۂ گل ہائے رنگیں جلوۂ رنگِ چمن
اے ضیائے بزمِ زرّیں صدرِ نازِ انجمن

اے فروغِ برقِ ایمن در حریمِ مہوشاں
اے سکون افروز و تسکین بخشِ قلبِ عاشقاں

ہمدمِ شب ہائے محزوں محرمِ شامِ الم
اے شریکِ حسرتِ خوں نابہ بارِ چشمِ نم

اے پیامِ سوز اے افسانۂ برق و شرر
سوختہ جاں شعلہ ساماں آتش افزا سربسر

در جگر ہر لحظہ داری نوکِ نیشِ بے قرار
ہر نفس در سینۂ سوزاں سنانِ جاں فگار

برق وش ہر لحظہ بیتاب ست قلبِ شعلہ زا
می طپد سیماب آسا سینۂ سوزش فزا

چشمِ حیراں سوز آرا از شرارِ جاں گداز
نوکِ مژگاں می چکد پیہم سرشکِ شعلہ ساز

در دلت پنہاں شرارِ آتشِ عشقِ طپاں
شعلۂ سوزِ محبت در جگر داری نہاں

ہر نفس از شعلۂ الفت طپد قلبِ حزیں
چشمِ سوزاں می چکد خونِ دلِ سوز آفریں

جلوۂ حسنِ حقیقی در دلِ خود داشتی
واقفِ سرِّ وفا اے شمعِ سوز افزا توئی

از خموشی زآتشِ الفت تو می سوزی چناں
زینہار آید نہ از لب ہائے تو آہ و فغاں

می شوی از جلوۂ محبوب خود خاکستری
بر نمی آید صدائے از لبت جز خامشی

پیشِ محبوب داری دفترِ شوق و قلبِ نیاز
می نہی سر ہا ولی داری سرِ دلگیر [illegible]

درنگاہت ہست پنہاں جلوۂ حیرانِ ما ز — درجبینت ہست خنداں تابشِ عجز و نیاز

از تبسم سازِ حسن و ناز عریاں کردۂ — از طپش چشمِ نیاز عشق حیراں کردۂ

چشمِ تو سوزد ز سوزِ حسن از شب تا سحر — می نماید لیک لب با خندۂ تابش اثر

سیرِ خاموشیِ وفا آموختی پروانہ را — محرمِ سازِ محبت کردۂ دیوانہ را

ہاں پتنگِ بے زباں را ہمدمِ خود ساختی — ذوقِ عشقِ کرمکِ بے مایہ را افراختی

کن مرا تعلیم اسرارِ وفا اے پاکباز — مضطرب چوں شعلہ مضطر شود چشمِ نیاز

چوں تو پنہاں ہم بسوزد ز آتشِ جان سوزِ عشق
چشمِ او مخمور از کیفِ سرورِ سوزِ عشق

# پنہاں

# مغالطہ

بخشش نہ تنگ داردے نہ سعدی را سخن پایاں

نان کوآپریشن کے مانند مغالطہ بھی ایک کیفیت دماغی ہے اور ممکن ہے یہی سبب ہو کہ نان کوآپریشن اور مغالطہ دونوں اب تک کسی منطقی یا نفسیاتی تعریف کے متحمل نہ ہو سکے۔ نظر بریں نان کوآپریشن کو ایک حد تک وسیع پیمانہ پر مغالطہ اور مغالطہ کو محدود پیمانہ پر نان کوآپریشن قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن جس طور پر نان کوآپریشن کے مختلف پہلو اور مختلف اقسام تھے اسی طور پر مغالطہ بھی مختلف النوع اور مختلف الجہات ہے۔

میں نے مغالطہ کے ریسرچ (تفتیش و تحقیق) پر اپنے فرصت کے اتنے ہی لمحات صرف کئے ہیں جتنے تاریخ کے دشمن لیکن تاریخی واقعات کے شیدائی سے توقع کیجا سکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خالی دماغ شیطان کا کارخانہ بن جاتا ہے یہ ایک طور پر "معنوی" جغرافیہ کی ایک سنگین غلطی ہے جسے مرور ایام نے دلچسپ بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ نہیں ہے کہ جب دماغ خالی ہوتا ہے تو اس میں وساوس شیطانی داخل ہو جاتے ہیں۔ وساوس شیطانی کا تعلق صرف شکم سے ہے۔ معدہ خالی ہو یا پر شیطانی بخارات ہمہ وقت دماغ کی طرف صعود کرتے رہتے ہیں۔ اسی بنا پر ہر بھلے مانس کو شکم سیر اشرار اور گرسنہ اشراف سے گریز کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جن کی شیطانی ذریات کبھی "اتحرہ" کبھی "ریاح" کبھی مزدور اور کبھی سرمایہ دار کی صورت میں جلوہ گر ہو کر ایسی حکومتوں کو جن کا قیام قانون اور امن کی ماتحت عمل میں آیا ہو ستاتی رہتی ہیں۔ اور گو حکومت کا سرمایہ اور ختمی دماغ اور دوایات "مارشل لا" اور دفعہ "۱۴۴" وغیرہ الف سے ان کا مداوا کرتی رہتی ہے یہ قوم ایسی بد پرہیز "معنام گرش" اور بدعمل واقع ہوئی ہے کہ ایک پیش نہیں جاتی۔ چنانچہ نوبت یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ اب تک قدیم الایام سے جو ضرب المثل سنی چلی آتی تھی جسے سنا کرتے اسی قسم کی حکمراں جماعت تھی جس کی وہ مستحق ہوتی ہے اب بالکل بدل گئی ہے یعنی ہر حکومت کو اسی قسم کی رعایا ملتی ہے جس کی وہ سزاوار ہوتی ہے۔

---

[illegible]

تھا، فرق صرف یہ ہو کہ ان کے گھوڑے پر شیطان سوار ہو کر جنت سے نکلا تھا اور میری تحقیقات سے یہ نتیجہ برآمد ہوا ہو کہ مغالطہ خود شیطان پر سوار ہو کر دنیا میں آیا۔ یاد ایا میکہ! یہ وہی زمانہ تھا جب فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں، حضرت ابلیس کو خاکی او ر آتشی کا مغالطہ لگا اور فرشتوں کی جماعت سے نکل کر خدا جانے کہاں کہاں بھٹکتے رہے بالآخر "جنت نشان" ہندوستان آ گئے، سنا گیا ہو کہ اس زمانہ میں ناخواندہ مہمان کی آمد پر سخت احتجاج کیا گیا یعنی "شیطان چلے جاؤ" "شیطان چلے جاؤ" لیکن ان کے استقلال میں فرق نہ آیا اور از آدم تا ایندم موجود ہیں۔

یہ تو شیطان کا تاریخی پہلو تھا لیکن اس کا نفسیاتی پہلو بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہو۔ مشیت الٰہی نے جب تکوین خلایق و اشیا کی تو یہ ضروری ہوا کہ اس نیرنگ خانہ کو ایسی حیثیت دیجائے جس میں ایک طرف مبدء اعلیٰ کا شوکت آفرین، عبیر العلم، لاہوتی تخیل نہ زائل ہونے پائے اور دوسرے طرف ناسوت کی گریز پا اور رنگین آویزشیں اور لغزشیں بھی کار فرما رہیں۔ انسان کو اگر صرف انسان ہی بنانا یا رکھنا مقصود ہوتا تو پھر ملائک کی خشک اور غیر دلچسپ جماعت غیر ضروری ہو جاتی اس لئے انسانوں کی جماعت میں "غیر سرکاری" عنصر (اہرمن) کا اضافہ کیا گیا۔ ابلیس "وہاں" کے "نکالے ہوؤں" میں تھا اس کو بڑی دور کی نسبت تھی پھر اس کے لیے کیا مشکل تھا، وہ لاہوتی حقیقتوں کو ناسوتی کرشموں میں بے نقاب کرنے لگا۔ اُس نے انسان کے کمزور پہلو یعنی عقل و دماغ پر اپنا تسلط بٹھایا اور اس کے سب سے مضبوط پہلو روح اور قلب کو اپنے حریفوں کے لیے چھوڑ دیا۔ وہ جانتا تھا کہ انسان اپنے کمزور پہلو کو اپنے کمزور بچے کے مانند زیادہ عزیز رکھتا ہو لیکن اس کا قائل نہیں ہوتا اور محض اس لئے کہ وہ قائل ہونا گوارا نہیں کرتا۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ زنجیر کی تمامتر استواری کا مدار زنجیر کے کمزور ترین حلقہ پر ہوتا ہے، اس لیے ذہن و دماغ سے زیادہ بہتر اور موزوں میدان اس کے جولانگاہ کے لیے نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر اس کے کارفرمائی کے مظاہر اور مظاہرے آپ خود ہی دیکھتے رہتے ہیں، حریم [illegible] حسن و عشق کی جلوہ فروشیاں دیکھئے اور انگورا میں رولئے خلافت کی دھجیاں، مہاتما گاندھی کی لنگوٹی دیکھئے اور گورنمنٹ کا پھاگ کھیلنا دیکھئے اور ........ اور ... "جھانسی کی رانی دیکھو ..... اور دیکھو دیکھو کلو پہلوان دیکھو" ...
....... الخ

---

نفسیات اور الٰہیات کے اس قسم کے مسائل بیان کرنے کے لئے تو آپ ہی کی ذات ہے [illegible]

اگر ان سے بہتر اور عجیب تر مسائل بیان کرنے کا ہم کو بھی مغالطہ ہوا ہو۔ چنانچہ ناظرین یہ نہ سمجھ لیں کہ ان کے مشتبہ یا "عتاب منکر یا مجہر" کا ہم کو علم نہیں ہوا، حالانکہ یہ سمجھ لینا بھی ایک قسم کا مغالطہ ہے اور یہ تو یقینی طور پر مغالطہ ہے کہ آپ اپنی حماقت کا اقرار کر کے عقلا کے زمرہ میں داخل ہو جائیں گے۔ حماقت ایک مستقل فن ہے، جس طور پر ایک بار "فرعون" میں ہمیشہ کے لئے فرعی میں "ضرب الامثال میں داخل ہو گیا ہے اسی طور پر ایکیا راحمق ہمیشہ کے لئے احمق" بھی زبان زد ہے۔

---

یہاں تک مغالطہ یا شیطنت یا بقول بعض آقایانِ ملتِ نوجوان کے بہترین مفسر یا علمدار سمجھے جاتے ہیں، طاغوتیت کا ایک "طائرانہ" یا "اشترانہ" جائزہ تھا، اب دیکھنا یہ ہے کہ دنیائے عمل میں اس کی کیا کیا کرشمہ کاریاں ہیں، مغالطہ ایک قسم کی گمراہی ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان کچھ ایسا محسوس کرنے لگتا ہے اور محسوس کرنے سے زیادہ محسوس کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس خاص صفت میں اللہ میاں تو اس کے چپکے چپکے احسانمند ہو ہی رہے ہیں، ساری دنیا فرطِ رشک و رقابت سے رفتہ رفتہ جل کر تباہ ہو جائے گی یا اسے تباہ ہو جانا چاہئے۔ اگر اس کے پاس دولت ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس نعمت کا موجد اور مورد دنیا میں اب تک صرف وہی رہا ہے اور یہی نہیں بلکہ جو لوگ اس سے محروم ہیں وہ یا تو عنقریب "ہذا ربی" کہکر اس کے قدموں پر گر پڑیں گے یا پھر وہ خود کلکٹر صاحب کے قدموں پر گر کر اس کو جیلخانے بھجوا دے گا، لطف یہ ہے کہ دونوں قدموں پر گرتے ہیں اور دونوں کامیابی سے دور رہتے ہیں، ایک اس فعل کو اس لیئے اختیار کرتا ہے کہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی طاقت نہیں رہتی، دوسرا اس لیئے گرتا ہے کہ اس کے بازوؤں میں سکت نہیں ہوتی!!

دولت کا مغالطہ اپنی بوقلموں حیثیات کے اعتبار سے عجیب و غریب ہے۔ ہر دولت مند اپنے آپ کو سب سے زیادہ طاقتور، سب سے زیادہ باعزت سب سے ——— زیادہ مہذب سب سے زیادہ متقی۔ سب سے بڑا عقلمند، سب سے زیادہ قوم پرست سب سے زیادہ محقق، سب سے زیادہ وفادار ——— "برٹش سبجکٹ" اور آ ہا ہا ——— سب سے زیادہ تعلیمیافتہ سمجھتا ہے۔

ہم سمجھتے [illegible] قسم [illegible] ہر ہر [illegible] کر دیئے، اس

کی آمدنی اور سود سے اس کی ساہوکاری میں دن رات اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ افلاطون، [illegible]
ایوریجان بیرونی، نوتمر، پنولین، مسانے، گوئٹے، آئن اسٹائن، مہاتما گاندھی اور ابراہم لنکن [illegible] ان سب کے
مورث اعلیٰ نیکسم میں اتنی دولت جمع کر گئے تھے کہ ان بزرگوں کو ساری سعادت اور بلندی بطور ورثہ اسی کے سود
سے حاصل ہوئی تھی۔ حالانکہ خود اسے جو نام نہاد سعادت یا رفعت حاصل ہے اس کی تحقیق خود اپنے نظریہ سے کرنے
سے ہمیشہ گریز کرتا ہے اور اگر کوئی دوسرا اس نیک کام کے لئے اپنی خدمات پیش کرے تو بگڑتا ہے اور عدالتی چارہ جوئی
کی دھمکی دیتا ہے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ دوسرا عدالتی چارہ جوئی پر آمادہ ہو جائے تو اسے اپنی دولت کا تھوڑا بہت شریک
کر کے خاموش کر دیتا ہے!

وہ دولت کا غلام بنکر غیر دولت مندوں پر حکومت کرنا چاہتا ہے اور یہی اس کے مغالطہ کا سب سے دردناک
پہلو ہے۔ وہ جتنا جاہل ہوگا اتنا ہی عالموں سے علم و فضل کی باتیں کرے گا اور وہ بھی اس طور پر گویا اس کے مخاطبان
جواہر پاروں سے اتنا ہی ناآشنا تھے جتنا مس میو ہندوستان سے، وہ ہر فن کے ماہرین سے اس طور پر گفتگو کرے گا گویا وہ
ان فنوں کا خود امام رہ چکا ہے لیکن اب بربنائے ایثار اس فن کو دوسروں کے کمانے کھانے کے لئے ترک کر چکا ہے۔
اس فرقہ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ماہرین علم و فن سے اس فروتنی اور سادگی کے ساتھ پیش آئیں گے گویا اپنے مخاطب
کو "نعوذ باللہ" کلکٹر صاحب سمجھتے ہیں، "میں تو آپ کے خاک پا کے برابر ہوں" "آپ کا فرمانا سر آنکھوں پر بے شک
لاریب" "آپ ملک و قوم کے لئے باعث نازش ہیں۔ ہائے ہماری شامت، خدا اس قوم پر رحم کرے" "مسلمانی در کتاب
و مسلمانان در گور" وغیرہ وغیرہ لیکن یہ سب اس انداز سے گویا وہ آپ کو دنیا کا سب سے بڑا احمق ہی نہیں سمجھتا بلکہ تمام
دنیا آپ کو ایسا ہی سمجھتی ہے۔ کبھی کبھی یہ حرکات محض اس بنا پر بھی ہونگی کہ دنیا یہ سمجھنے کہ وہ صاحبان علم و فن کا
مربی اور سرپرست ہے اور اکبر و بکرماجیت کے عہد کو از سر نو بیدار کرنے کے لئے اتنا ہی مضطرب ہے جتنا ہندو مہاسبھا اور
جمعیت العلمائے ہندوستان کو حکومت خود اختیاری دلانے کے لئے دست بدعا یا دست و گریباں ہیں۔ [illegible]
تھا ہو تو وہ آپ پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے گا کہ اب ایک وقت اس کے بجائے [illegible]
تو غیر نہیں کلکٹر صاحب کے چپراسی یا [illegible] ہیں اور [illegible]
[illegible] ہندوستان [illegible]

[illegible] ہندوستانی [illegible] آفتاب مغرب کی [illegible] ایکس [illegible] چاپلوسی اور [illegible]
[illegible] کی تالیاں [illegible] اور ہمہ وقت غمگساریاں ہیں

جس طرح پر حکومت ہند کو آئی سی ایس نے معاملہ میں قبضہ کر رکھا ہے اسی طرح پر طبقہ رؤسا کو مصاحبین اور توسلین نے گھیر رکھا ہے۔ حکومت ہند نے طبقہ آئی سی ایس کو اپنا ہاتھ پاؤں ہی نہیں بلکہ عقل و دماغ قرار دے دیا ہے دوسری طرف رؤسا کے مصاحبین ہیں جو ان کے ہاتھ پاؤں ہی نہیں بلکہ اور اعضائے رئیسہ کا بھی کام دیتے ہیں۔ یہ مصاحبین عام طور پر حاجت مند اور جاہل ہوتے ہیں اور چونکہ یہ اپنی بعض نہایت قیمتی متاع ان کے ہاتھوں فروخت کر چکے ہوتے ہیں اس لئے اس کا معاوضہ بھی اسی دلیری اور بے حجابی سے لیتے ہیں۔ ان مصاحبین کی عقل و ذہانت کا [illegible] ان کی "سرکار" پر ایسا طاری ہوتا ہے کہ وہ کبھی یہ محسوس نہیں کرتا کہ اس نظام شمسی اور کائنات عالم میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو اُس کے اور اُس کے مصاحبین سے زیادہ باوقعت اور قابل توجہ ہیں۔ یہ مشیر اور مصاحب اکثر تیسرے درجہ کے لوگ ہوتے ہیں اور ان کی مثال بعض جزئی ترمیم کے ساتھ اُن مردہ کیڑوں کی ہے جو انجکشن کے ذریعہ سے جسم انسانی میں پہونچا دیئے جاتے ہیں اور زندہ کیڑوں کو ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ مصاحب اور مشیر کار ناگزیر خرافات میں سے ہیں ورنہ رؤسا کی غیر ضروری آمدنی کا غیر ضروری ترمصرف ہی کیا ہو لیکن شاید یہ زیادہ بہتر ہو کہ رؤسا غیر معمولی قابلیت اور اہلیت کے لوگوں کو جو موجودہ عہد میں گریجوٹوں ہی سے نہیں بلکہ یونیورسٹیوں سے زیادہ سستے ہیں اپنا حاشیہ نشین اور وابستۂ دامن بنائیں۔ اس میں شک نہیں مصاحبت کا پروگرام بھی تاں کو اپریشن کے مانند تخریبی ہے لیکن قابل اور نااہل مصاحبین کے تخریبی پروگرام میں بھی امتیازی مدارج ہیں۔ کون نہیں جانتا واجد علی شاہ اور اکبر دونوں مصاحبین کے گرویدہ ہوئے تھے لیکن ایک "رنگیلے" اور "رسیا" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں اور دوسرا اکبر اعظم بن گیا۔

---

[illegible] کی ایک [illegible] قسم [illegible] ہے، بعضوں کو یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کا وجود دنیا کے لیے ناگزیر ہے۔
[illegible] ان [illegible] صدی میں کے لگ [illegible] کے قائل ہیں، غیر [illegible]
[illegible] ہندوستان کے امن و ترقی

کے لیے حکومت برطانیہ ہی کو ناگزیر سمجھتے ہیں، حالانکہ حکومت برطانیہ کے پاس دفعہ ۱۴۴ سے لیکر [illegible] تک موجود ہیں۔

میں اپنے دو دوستوں سے واقف ہوں جن کو اپنے متعلق یہ غلط فہمی ہے کہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹائے یا دنیا سے اٹھائے گئے تو اسی دن نظام شمسی درہم برہم ہو جائے گا۔ ایک تو میری مخدومہ ہیں جو گھر کا کھانا پکاتی ہیں اور ہر اس چیز کو میرے گھر کے لیے غیر ضروری اور اپنے لیے ناگزیر سمجھتی ہیں جو گھر والوں کے نظر سے اوجھل اور نقل و حمل کی متحمل ہو۔ ان کو کسی نے یقین دلا دیا ہے کہ دانہ دانہ پر ہر شخص کا نام لکھا ہوتا ہے اور وہ اس کے حصہ میں آکر رہتا ہے، اس بنا پر ان کا مسلک جزئی ترمیم کے ساتھ وہی ہے جو اکثر صوفیا کا ہے۔ یہ "ہمہ از اوست" کے بجائے "ہمہ از ان ماست" کی قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جس روز انہوں نے ہم کو اپنی خدمات سے سبکدوش کر دیا اسی دن ہم پر کمیشن بیٹھ جائے گا اور ہمارا نام حضرت میکائیل کے رجسٹر سے حذف کر کے حضرت اسرافیل کے صور پر اسی طور سے لکھا ہوا نظر آئے گا جس طور پر گراموفون کے ریکارڈ پر ایک صاحب کی تصویر نظر آتی ہے اور نیچے لکھا ہوتا ہے، "ہز ماسٹرس وائس" (His Master's Voice) لیکن اگر یہ اردو میں لکھا ہوا تو ممکن ہے بعض حضرات ایسے یوں بھی پڑھیں "ہز ماسٹرس وائس" (His Master's Vice) ہماری مخدومہ ہر شخص کے بارہ میں ایک رائے رکھتی ہیں، ان کا خیال ہے کہ مسلم یونیورسٹی اور دنیا کی محرومی کا راز یہ ہے کہ لوگ بیویاں رکھنے کے عادی ہیں اور یہی نہیں بلکہ جس قدر بیوی پر اعتماد کرتے ہیں اتنا ان پر نہیں کرتے۔ میری مخدومہ انتہائی انتقامانہ جوش و محویت کے ساتھ لکڑیاں پھونکتی ہیں، اور میں اکثر کسی محفوظ مقام سے گھر میں نوٹس دیدیا کرتا ہوں کہ بیوی بچے ہوشیار رہیں، یہ کہیں لکڑی کے ساتھ انہیں بھی چولہے سے آشنا نہ کرا دیں۔ کبھی کبھی یہ قطع تعلق کا اعلان کر دیتی ہیں، اس وقت ہم کو اپنی حالت پر خود ترس آجاتا ہے اور اس اندیشہ سے کہ ممکن ہے کوئی دوسرا نہ ملے یا ان سے بھی زیادہ مہربان ملے ہم فوراً ایک جلسۂ خاص منعقد کرتے ہیں جس میں ان کی خدمات اور احسانات کا اعتراف و اعادہ کرتے ہیں، بیوی "شیم شیم" اور بچے "ہیر ہیر" (جس کا اخباری ترجمہ "شرم شرم" اور "سنو سنو" ہے) کرتے ہیں اور یکبارگی پھر ہم ان کو اپنے آپ پر مسلط کر لیتے ہیں۔

سرسید مرحوم کی انتہائی بدنصیبی تھی اور ہماری اب بھی ہے کہ [illegible]

شدید مغالطہ ہوگا کہ یہ ہر اصلاح یا اعتراض پر سرسید یا ان کے چند معاصر افضہ کرتی ہیں اور چونکہ ہم پیدائش کے اعتبار سے مسلمان اور پیشہ کی حیثیت سے قبر پرست واقع ہوئے ہیں اس لیے سرسید کا نام مخدومہ کی زبان سے سنگر رہ جاتے ہیں۔ چیزیں چولہے اور لکڑی پھونکنے کے علاوہ ان کا فرصت کا لمحہ سرسید کی خطبہ خوانی میں صرف ہوتا ہے۔ ایکدن میں نے کہا بڑی بیوی اندرون کیشن آیا ہوا ہے۔ ہم لوگ فوجداری سپرد ہیں، کچھ دعا کرو کہنے لگیں "میاں، سرسید کے مزار پر چراغ جلاؤ اور پھول چڑھاؤ اور بیوی سے کہو، کھوج کھچر میں نہ رہا کریں، غریبوں کو کھانا کھلائیں،" اور میاں آفت کیوں نہ آئے ماشاء اللہ سرسید کے ڈاڑھی تھی، آج کل کے مردوئے ڈاڑھی منڈواتے ہیں، سرسید کی برسی میں ایک سال چراغ چڑھانے اور طاق بھرنے نہیں گئی تھی، میری بچی کے چیچک نکل آئی، ننھے کے ابا کو معلوم ہوا تو سارے گھر میں کہرام مچا دیا، کہنے لگے "ابکے نہ گئی تو سارے گھر کو کچا کھا جاؤں گا" چنانچہ میاں، جب سے کان پکڑا، ہر سال برسی کے موقعہ پر مزار پر جاتے ہوں اور ایک پاؤں پہ کھڑی ہو کر دعا مانگتے ہوں کہ میاں تمہارے کالج کے لڑکے بڑے اچھے ہیں، بیویاں البتہ بہت ستاتی ہیں، ان کو کوئی خواب دکھاؤ، میں تو ان کو ایکدن میں ٹھیک کر لوں لیکن یہ تمہارا ڈائننگ ہال ٹھیک نہیں ہونے دیتا، میں ان کو سوکھے ٹکڑے کے لئے ترسا ڈالوں لیکن سب ڈائننگ ہال سے بریانی کھانے لگتے ہیں — اور کیوں میاں اس ڈائننگ ہال کو فوجداری سپرد نہیں کراتے،" میں نے کہا اس پر بھی آفت آئی تھی لیکن ہائیکورٹ سے یہ سب بری ہوگئے کہنے لگیں، "ان سبھوں نے حاکموں کو بریانی کھلائی ہوگی اور سرسید کی ماننا مانی ہوگی آپ لوگ بھی مزار پر حاضری دیجئے، رات کو سرسید خواب میں بشارت دینگے صبح کے وقت محتاجوں میں بریانی تقسیم کرلیجئے، میں نے کہا اچھا یہ تو سب رہا ذرا لکڑی چولہے سے کھینچ لو فضول جل رہی ہے، کہنے لگیں میاں سرسید کے زمانہ میں ایسا ہی ہوتا تھا، بیوی نے کہا، آج کھانا پکنے میں دیر ہوئی، ذرا جلدی کرو، فرمایا کہ [illegible] کہ لو سرسید کا زمانہ ہوتا تو بتاتی، غرض سرسید کا خیال، ان کا عہد، ان کے کارنامے اور ان کا وجود ان [illegible] پر مسلط ہے اور بات بات پر مرحوم کو اس کثرت کے ساتھ معرض بحث میں لاتی ہیں کہ اکثر اپنے جی میں بھی چاہتا ہے [illegible] سرسید اجازت دیں اور بیوی مانع نہ ہوں تو بڑی بی کے ساتھ مزار میں سما جاؤں۔

---

[illegible] ہیں، تاہم ان کو ہر شے کی تعبیر کرنے میں ان سے داد ان کے

سے کے اکثر صاحب سے اختلاف آتا ہو، اس [illegible]

ان کو ابرنشن سے سخت اختلافات پیدا ہو گیا ہے [illegible]

سے زیادہ اہل اور مستحق دنیا میں نام پیدا کرنے کا کوئی امر نہیں ہے ان کے سامنے جب کسی اس قسم کا تذکرہ آئے گا کہ فلاں شخص نہایت قابل ہے یا نہایت حسین ہے یا نہایت پرہیزگار ہے یا نہایت منتظم ہے تو وہ ہمیشہ یہ فرمائیں گے کہ اُن کو یا ان کی کسی عزیز یا رشتہ دار کو اس قسم کے مواقع حاصل نہیں ہوئے ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ یہ یا ان کے عزیز اس پایہ کے نہ ہوتے۔

ایک مرتبہ کارنیگی اور راک فلر کا تذکرہ آیا، فرمانے لگے بھئی کیا کہتے ہو میرے پاس اتنا روپیہ ہوا اور ایسے موقعے حاصل ہوں تو کیا میں کارنیگی اور راک فلر نہیں ہو سکتا۔ مصطفےٰ کمال، مصطفےٰ کمال، ان میں کیا رکھا ہے اسلام سے برگشتہ اور بیزار ہو کر اتنی شہرت ہی حاصل کر لی تو کیا ہوا، مجھے دیکھو

منکرے بودن و ہم رنگ مستاں زیستن

ایک مرتبہ یہ ذکر چھڑا کہ انگریزی عورتیں نہایت محنتی اور منتظم ہوتی ہیں۔ فرمانے لگے یوں تو کہتے ہوئے کچھ [illegible] ہوں لیکن آپ یقین مانئے جفاکشی اور انتظامی امور میں میری بیوی کو کمال حاصل ہے، یہ اس کی بدنصیبی تھی کہ میرے حصہ میں آئی ورنہ اگر کہیں وہ یورپ میں پیدا ہوئی ہوتی اور کمبخت پردہ وغیرہ کی پابندی نہ ہوتی تو لطیفہ خانم اور ملکہ ثریا کا کوئی نام نہ لیتا، میری خود یہ حالت ہے کہ ان کے سامنے بالکل سہما ہوا رہتا ہوں۔ یہ انہیں کی تعلیم و تربیت کا اثر ہے کہ میرے بچے صحت اور ذہانت میں اپنا نظیر نہیں رکھتے، چھوٹے بچے کو تو آپ نے دیکھا ہوگا اس کی ذہانت کا میں کبھی خیال کرتا ہوں تو دنگ رہ جاتا ہوں ایک دن تو اس نے مجھکو بالکل متحیر کر دیا، میں [illegible] پڑھ رہا تھا، راجا اندر کی تصویر دیکھ کر کہنے لگا کیوں ابا یہ ایک تصویر ہے نا، اتفاق سے [illegible] میں اگر [illegible] کیوں ہے، بیٹیرے ابا ہیں تو کیا ہماری [illegible]

قابلیت کا ذکر آیا تو فرمانے لگے میرا بھتیجہ آنریبل [illegible]

[illegible]

[illegible]

بزرگ دریافت فرمانے لگے کیوں صاحب ان کی شادی ہوئی ہی یا نہیں۔

میرے دوست کوئی ایسی چیز پسند نہیں کرتے جو ان کے پاس نہ ہو بلکہ دوسروں کی ملک ہو، آپ نہایت اچھا کپڑا پہنکر جائیں وہ کہیں گے بھئی سلا اچھا نہیں، رنگ بھی کچھ مزیدار نہیں۔ تم نے میری شیروانی تو دیکھی ہوگی، ایکدن پہنکر نکلا تو تمام لوگ سناٹے میں آگئے، آپ کا مکان بہت اچھا ہے، لیکن کچھ تاریک سا ہی، میرے مکان کو دیکھئے بھئی میں بارہ بارہ بجے رات کو نکل کر صحن میں آیا ہوں، تمام گھر روشن اور شگفتہ نظر آتا تھا۔ آپ کے گھر پر تو بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا،

غرضکہ آپ کوئی تذکرہ کریں یہ اپنا اپنے بیوی بچوں یا عزیزوں کا پروپگنڈا کئے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ میں نے سنا جیلخانہ میں اس عادت کو انہوں نے بالکل ترک کر دیا تھا کیونکہ قیدیوں کے کارنامے سنکر کہیں آپ نے قبیلہ والوں کے کارنامہ کا خطبہ پڑھ دیا تھا، پولیس نے تحقیقات شروع کر دی، بالآخر ایک دن ان کے اعزا و اقربا ان سے ملنے آئے اور تاکید کر دی کہ وہ اُن کے بارہ میں لوگوں کو مرعوب کرنے کی کوشش نہ فرمایا کریں ورنہ ایک دن ایسا آئے گا کہ ان کے سارے خاندان والے پولس اور عدالت کے زد میں آکر جیلخانہ پہونچ جائیں گے!

---

دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ پریشاں را

مغالطہ کے بارہ میں اب تک جو کچھ کہا گیا ہو وہ اُس دفتر بے پایاں کا ایک صفحہ بھی نہیں ہے جس سے یہ نیرنگ کدۂ حیات لبریز ہے۔ لیکن جہاں تک رسالۂ ہذا کے صفحات اور ہماری محدود بصیرت ہماری رفاقت کر سکتی ہے ہم امید کرتے ہیں ہمارے ناظرین بھی — جو پسند کریں تو یقیناً اس کی زد سے محفوظ ہیں — ہمارا ساتھ دیں گے۔ اور متماشے کے بعد کی "نقل" سے بھی لطف اٹھائیں گے۔

بعض لوگوں کا راسخ عقیدہ یہ ہے کہ ان کا عجیب الہیئت ہو جانا، غیر معمولی کپڑے پہن لینا یا غیر معمولی طور پر [illegible] خاص طور پر پہن لینا، پھیرتے رہنا یا ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دینا [illegible]

[illegible]

مثلاً ایک صاحب موسیقی میں کمال رکھتے تھے۔ ان کی عادت برہنہ سر رہنے کی تھی، ایک اور دوسرے بزرگ نے محض اس خیال سے کہ لوگ بھی ان کو ویسا ہی باکمال سمجھنے لگیں یا ان کو دیکھ کر لوگوں کا دل لاتکر کا دھوکا ہو، ٹوپی ترک فرمادی، اب ان کے سر سے ٹوپی ایسی ہی غائب ہے جیسا ان کریم نوع کے سر سے ایک طبعی آلہ مدافعت، حالانکہ ان کا کمال اگر ظاہر ہو سکتا تھا تو شاید صرف اس طور پر کہ سوا ٹوپی کے یہ سارے کپڑے ترک فرمادیتے ۔

ایک چیز اور عجیب وغریب آج کل نظر آئے گی، بعض لوگ جو ہمیشہ انگریزی لباس میں نظر آتے ہیں اور بحیثیت اس کے کہ ان کی انگریزی تعلیم، انگریزی معاشرت اور انگریزی لباس متعین اور مسلم ہے، جب کوئی غیر معمولی تقریب ہوگی تو وہ قدیم سے قدیم اور متروک شدہ ہندوستانی لباس میں نظر آئیں گے، اور محض اس لئے کہ لوگ حیرت زدہ ہو جائیں کہ ایسا قابل اور ایسا مشہور آدمی، دیکھئے تو کس لباس میں نظر آرہا ہے، ہائے ہائے کیسر نفسی، یہ سادگی، یہ ایثار، اس نے تو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا نمونہ پیش کردیا۔ لیکن بعض دوسرے بزرگ اس نیت سے اس قسم کا لباس زیب تن فرمائیں گے کہ دنیا ان کو نہایت معمولی درجہ کا آدمی سمجھے لیکن جب لوگوں کو حقیقت حال معلوم ہو تو وہ اپنی بیوقوفی پر حیرت زدہ رہ جائیں، اور دل میں سوچنے لگیں کہ "بارخدایا" اس گرد میں ایسا سوار!" کبھی کبھی اس قسم کا لباس اس لیئے بھی اختیار کیا جاتا ہے کہ پہننے والا بالکل کمسن اور تھوڑا بہت (بقدر توفیق) حسین اور مجموعی طور پر بھولا بھالا بیوقوف سا معلوم ہونے لگے تاکہ لوگ اس پر متحیر ہوں کہ دیکھئے تو ابھی اس کا سن ہی کیا ہے اور بظاہر کیسا کم رو ہے لیکن کتنا بڑا آدمی ہوگیا ہے، اور پھر ان کو اس پر عبرت ہونے لگے کہ ہم کو دیکھئے بڈھے ہوگئے اور دنیا میں کچھ نہ کرسکے، اچھا گھر چلکر بیوی کی اجازت لیکر خودکشی پر آمادہ ہونگے! ایک دوسرے بزرگ اس تیور اور رکھ رکھاؤ سے "علی الرغم" نماز پڑھیں گے اور اس کے لئے آمادہ ہونگے گویا تمام دوسرے لوگ دوزخی ہیں اور یہی نہیں بلکہ ان بدقسمتوں کے نام خدائی وارنٹ بھی آگیا ہے۔ ایک حضرت ہیں جن کا مقصد زندگی صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ مشہور لوگوں کے ساتھ رہیں اور ہمیشہ ان کے ساتھ دیکھے جائیں وہ کھیلنے سے قطعاً ناآشنا ہونگے لیکن کپتان کے ساتھ رہیں گے یا کہیں کھیل ہو رہا ہو تو وہ گھوم پھر وہیں رہیں گے جہاں کھلاڑی جمع ہوں اور اپنے سوا کسی دوسرے کو وہاں آنے بھی نہ دیں گے۔ اس سلسلہ میں ان کو دو چار پست قسم کے کام کرنے پڑیں یا کپتان یا ٹیم والوں کو تھوڑا گالی دیدیں یا ایک آدھ ہاتھ تھوڑا رسید بھی کردیں تو وہ غالب سے ناواقف ہونے کے باوجود غالب کے مسلک

دیں وہ جس قدر وقت ہم ہنسی میں ٹالیں گے

کے پیر و نظر آئیں گے، اب سوال یہ ہو کہ ان کو اس کا معاوضہ کیا حاصل ہوتا ہے، صرف یہ کہ وہ کپتان یا کھلاڑی یا دیگر نمایاں افراد سے بے تکلف ہیں یا وہ ان کے بحث مباحثہ میں شریک ہونگے، کبھی کبھی اپنا کھانا منگا کر ان کے دسترخوان کے بھی شریک ہوجائیں گے۔ ان کی عدم موجودگی میں دوسروں سے کھیل کا حال یا کھیل کا طریقہ یا کھیل کا فلسفہ اس طور پر بیان کریں گے گویا یہ خود اس میں شریک رہے ہیں اور انھیں کے نام ٹرافی حوالہ کی گئی ہے، پہلی بار تو خیر مجبوری ہے ٹرافی کپتان ہی کے ہاتھ میں دی جائے گی لیکن اس کے بعد پھر غریب ٹرافی ہے اور یہ ہیں، تانگے پر، ریل میں، پلیٹ فارم پر، چورا ہے پر ہر جگہ ٹرافی انھیں کے آغوش میں ہوگی۔ اس قسم کے لوگ یا اس قسم کی حرکتیں صرف کھیل کود تک محدود نہیں ہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں پائی جاتی ہیں، مثلاً لکھنا پڑھنا، تقریر کرنا، فیل ہونا، کھیلنا، مائیٹری کرنا، اسٹرائک کرنا، مارنا، مار کھانا، شادی کرنا، والدین بننا یا نان کو اپریشن کرنا وغیرہ وغیرہ۔

---

ایک صاحب اور ہیں جن کا خیال ہے کہ ان کے علاوہ تمام دوسرے لوگ مغالطے میں مبتلا ہیں، اگر ناظرین ان کا ٹھیک ٹھیک پتہ بتائیں تو ہم وعدہ کرتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ اس صلہ میں یہ مضمون پتہ لگانے والے صاحب کے نام معنون کر دیا جائے گا!

رشید احمد صدیقی (علیگ)

# نقد و نظر

(از تماشائی)

**العزم**

کرنال کا ہفتہ وار جریدہ، جسے ہمارے مہربان منشی اسرار احمد صاحب آزاد کامیابی کے ساتھ نکال رہے ہیں، آزاد صاحب نے قوم کے ایک سچے خادم کی حیثیت سے سالہا سال کرنال میں مفید کام کیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ اُن کے ہاتھوں میں یہ اخبار سرسبز ہو کر کرنال کے قومی اور ادبی زندگی کا مرکز بن جائیگا۔ اخبار کی لکھائی چھپائی اور ترتیب قابل ستائش ہیں، مگر ہم یہ عرض کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ زبان زیادہ عام فہم اور سلیس ہونی چاہئے، تاکہ ہر کس و ناکس مضامین کے مفہوم کو سمجھ سکے، چندہ سالانہ ۱۲؎ ششماہی ۶؎ اور سہ ماہی ۳؎ ملنے کا پتہ، دفتر العزم محلہ پیرزادگان، کرنال،

**انگلستان کی کہانی** (معاصرین کی زبانی) مرتبہ جناب مولوی سبطین احمد صاحب بی۔اے بی ٹی، ملنے کا پتہ نظامی پریس بک ڈپو، بدایوں، قیمت درج نہیں،

ہم نے اس تالیف کو اول سے آخر تک غور سے پڑھا ہے اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ یہ مختصر سی کتاب اپنی نوعیت کی ایک جداگانہ چیز ہے جس کی ترتیب میں فاضل مرتب نے غیر معمولی تلاش و فکر اور محنت و جانفشانی سے کام لیا ہے، عبارت کی سلاست اور انداز بیان کی بےساختہ سادگی خاص طور سے قابل تعریف ہیں، اور ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب طلبا کے حلقہ میں جلد ہر دلعزیز ہو جائے گی، مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ تاریخ کے اساتذہ مجوزہ کتب تاریخ کے پڑھانے کے دوران میں تاریخی افراد کے حالات ایسے دلکش انداز میں بیان کریں کہ طلبا خود اُن کے مزید حالات کے متلاشی ہو جائیں ہمیں امید ہے کہ سررشتہ تعلیم یوپی کی جانب سے اس کتاب کو داخل نصاب کر کے فاضل مرتب کی بجا طور سے حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

**Inter Hostel League:—**

Trophy won by Marris hostel.

**Competitors.**

| | | |
|---|---|---|
| Mr. Mazher Aziz | ... | I. |
| Mr. Hyder Abbas | ... | II. |

Best speaker's (of all the above competitors) medal was secured by Mr. Mazher Aziz of class XII.

**English Extempore Speaking:**

*(Seniors)*

| | | |
|---|---|---|
| Mr. Rafat Pasha | ... | I. |
| Mr. Hyder Abbas | ... | II. |

*(Juniors)*

| | | |
|---|---|---|
| Mr. Raja Hamid Hasan | ... | I. |
| Mr. Ahmad Abbas | ... | II. |

**Urdu Extempore Speaking:—**

**Competitors** *(Seniors)*

| | | |
|---|---|---|
| Mr. Hyder Abbas | ... | I. |
| Mr. Raja Ali Mohamed Khan | | II. |

## A Farewell to the retiring editors.

It would be too ungrateful on our part to forget to thank Messrs. Akram Riaz Faruqi and Habibullah Khan Galzai, the retiring editors of the respective English and Urdu sections. It was on account of their joint efforts as well as with the co-operation of most of our distinguished professors and specially our Principal, Mr. A M. Kureishy, M.A., and our Secretary Mr. Abdur Rashid, M.A., LL. B., that we today have managed to publish a magazine of our own:

Like as the waves make towards
the pebbled shore,
So do our minutes hasten to
their end;
Each changing place with that
which goes before,
The sequent toil all forwards to
contend.

We extend our hearty thanks to the retiring editors, Mr. Akram Riaz Faruqi and Mr. Habibullah Khan.

Lastly, we should not fail to confess that Mr. Akram Riaz Faruqi, specially, has, both by his saturnine and bucolic humour as well as by the most useful quality of his pen which can speedily change from grave to gay, and from description and dialogue to narrative and character, roused our unbounded admiration. He has done much for our magazine and we are grateful to him for it.

"We own the splendour of thy
well-earned fame,
And bow before the magic of
thy name."

Ahmad, S. Moinul Ahsan Hyder Abas, Habibullah Baloach, K. S. Kazim Husain, S. M. Ali Kadeer, and S. Karimuddin.

*(Juniors)*

Messrs. Ahmad Abbas, Aftab Ali Khan, Rafiullah, Abdul Haleem, S. Islam Siddiqi, Ashraf Khan, A. K. Burdwani, Zaheer Kureishy and N. Mehdi.

**Urdu** *(Seniors)*

Messrs. Mazher Aziz, J. B. Qadri, Arif Fatmi, A. Ahmad Ansari, Sibte Ahmad Zaidi.

*(Juniors)*

Messrs. Akhtar Imam, Abdul Haleem Khan, Aftab Ali Khan, Ahmad Abbas, N. Medhi, S. Islam Siddiqi, M. Hussain, A. K Burdwani.

## 3rd U. T. C. (Aligarh Detachment)

The annual firing course was fired by the soldiers of the above detachment recently. Also a shooting competition was held between trained soldiers and the recruits who only joined this year. The latter owing to the handicaps which they received managed to win the cup. With the recommendation of the commanding officers, Lt. Haider Khan, and Lt. Hamiduddin Khan eleven All-India licences were awarded to the first class shots by the Government. From the Intermediate College only Mr. Sardar Khan, Md. Gaffar and the editor were fortunate enough to get these all-India free licences.

The detachment also held a grand tea party to which they invited some of the most distinguished guests the University had this session. These were H. H. the ruler of Bhopal, Nawabzada Saeeduz Zafar Khan and Nawabzada Rashiduz Zafar Khan. H. H. could find no time to give us the pleasure of his company but he sent his two distinguished cousins.

The next day a display was given by the detachment before the distinguished guests and Nawabzada Saeeduz Zafar Khan contributed Rs. 500 to the firing range which is to be constructed shortly.

It will be evident from the following results of the competitions that very few boys took part in them and that those who took part at all managed to get some prize or other.

**English Set Speaking:—**

**Competitors** *(Seniors)*

| | | |
|---|---|---|
| Mr. Mazher Aziz | ... | I. |
| Mr. Rafat Pasha | ... | II. |
| Mr. Hyder Abbas | ... | II. |

*(Juniors)*

| | | |
|---|---|---|
| Mr. Rafiullah ... | ... | I. |
| Mr. Shamsul Islam Siddiqi | | I. |
| Mr. Aftab Ali Khan | ... | II. |

### *Volley Ball.*

We shall be failing in our duty if we forget to thank our former captain, Mr. Wahajuddin Ahmad for his having fulfilled his duty honestly and conscientiously.

Our sports captain has also been appointed Volley Ball captain. We wish him a glorious career and hope he will fulfil his duties in both capacities to our entire satisfaction.

### *Kabaddi.*

Kabaddi being one of the only two Oriental games in our college, our newly appointed captain, Mr. S. A. Aziz has determined to have a number of matches as soon as the University Examinations are over. We hope to have pleasant moonlight nights next month and Kabaddi will, we hope, be no longer neglected.

We congratulate our former captain for the success he has attained.

## OUR SOCIETIES.

### *English Society.*

On account of Ramazan our societies have been somewhat inactive.

### *Union.*

The month of March saw the end of the Old Union Ministry, and the installation of the new one. A detailed account of the installation ceremony report and addresses will appear in our next issue.

This year's elections were marked by the spirit of provincialism which had crept amongst the students during the recent annual elections and which has not left them as yet. It is the duty of the Union authorities to try their best to chase out this spirit and to continue to train the boys in the art of speaking, for the youth of today is the citizen of tomorrow.

### Results of the Competitions continued:

**Competitors** *(Juniors)*

Mr Ahmad Abbas ... I.
Mr. Musharraf Husain ... II.

**Urdu Set-Speaking.—**

**Competitors** *(Seniors)*

Mr. Mazhar Aziz ... I.
Mr. Raja Mohammad Ali Khan. II.

*(Juniors)*

Mr. Raja Hamid Hasan ... I.
Mr. Ahmad Abbas ... II.

The following students competed for the English and Urdu essay writing competitions held recently by the Union club:

**English** *(Seniors)*

Messrs. Mazher Aziz, Sli. Abdur Rehman Abbas, Shankar Rao, S. Shabbir

Our Inter. College was represented by five players but unfortunately our team failed to win any laurels there. The Cricket club has not been very active this month. Undoubtely this unavoidable slackening was due to Ramazan.

Our newly appointed captain is no doubt a rising cricketeer who has already proved his mettle in many a match. He takes a keen interest in the game and we earnestly hope that he, far from belying our hopes, will on the other hand have a glorious career.

We should not fail to congratulate our former captain Mr. Said Mohammad Khan for the brilliant success and the great importance he has gained in the Cricket sphere, and to thank him for the pains he has taken in promoting the cause of Cricket.

***Football.***

The football club has also been rather inactive; but the newly appointed captain who is undoubtedly a good athlete and sportsman has determined to make all efforts in fulfilling his duty conscientiously.

We congratulate our former captain, Mr. Habib Osman for the glorious success he has attained in his career and we earnestly thank him for the pains he has taken in so doing.

***Tennis.***

We thank our illustrious secretary Mr. Ahsan Mujtaba Alvi for the earnest endeavours he has been making in encouraging Tennis as much as possible. It is to be said to his credit that apart from the four special courts, a large number of "non-special" courts have sprung up outside both the circles.

***Basket ball.***

Owing to Ramazan, students have not been taking much interest in the game. Nevertheless our former Captain Mr. Rana Bakhtiar Mohammad has made the game so popular that we do earnestly hope that students will continue to take the same interest in the game as they used to do before, no sooner Ramazan is over. We congratulate Mr. Rana for the success he has attained. He has presented a challenge cup to the club out of the savings of his pocket money.

We hope his successor will take care to follow in his footsteps. We wish him every success.

## The Aligarh Causerie; by Abas Sayeed.

### *A Great Need.*

The gymnasium, in spite of our repeated requests for its improvement is still ill-equipped. Nevertheless, the newly appointed sports captain is trying to fulfil his duty conscientiously by holding regular gymnastics and other physical classes every evening.

### *Dining Hall.*

The new dining-hall system established in compliance with the recommendations of the Aligarh Muslim University Enquiry Committee was a partial success in the beginning. At first they gave us relishing dishes, probably to win our unmixed admiration and, co-operation; but the success was short-lived, for now they seem to have altered considerably in their zeal and the students. especially those of the Minto Circle have begun to think that the good old times with their time-honoured Mess-arrangements of Aligarh were by far better. A hint to the wise will suffice!

### *Hockey*

A Hockey team from Agra visited our College during Exhibition time but were defeated. Another team from the Government High School, Meerut also came over here about the same time and we won this match also. A military touring team visited the University, but in the match that was played, our Inter. College was represented by seven students. That same illustrious young man, Mr. Sardar Abdul Aziz has been appointed Hockey Captain for this year.

Also, we shall not fail to congratulate our former captain, Ch. Sulman Hussain for the success his team has been achieving and thank him for the pains he has taken in promoting the cause of Hockey in Aligarh.

### *Cricket.*

The University Cricket team had been to Alwar some time back.

Counsel—"So then, you say, you stood up?"

Cantankerous Witness—"No, I said I stood. When one stands one naturally stands up."

"Indeed! That will do, thank you. Stand down!"

---

Wife—"Don't you think we ought to get mother a little present to take back with her when she goes? Can you suggest something?"

The Brute—"What about a nice, big jar of *VANISHING* cream?"

---

"Well, my man," said the Irish doctor to his patient, "What's the matter with you?"

"Pains in the back, sir," replied the patient.

"I'll put you right" said the doctor, handing him a few pills. "Take one of these a quarter of an hour before you feel the pain coming on!"

---

The inspector, who had just returned from the Isle of Man, was examining the girls' class in geography.

"Can you tell me what island there is off the English coast which from its name you would judge to be inhabited by people of the male sex only?"

"Please, sir, the Scilly Isles," replied a girl, promptly.

---

Mrs. Green bought a sundial and had it errected in her garden. She subsequently called in the builder and instructed him to move it to a more suitable place.

"Where would you like me to put it?" asked the builder.

"Under the gas iamp," she replied. "Then we shall be able to see the time when it is dark."

---

Notts Defendent—"I admit I swore, but it was under great excavation."



Dad—"You musn't tear the book like that."

Son—"How must I do it, then, daddy?"

Speaker (at club dinner)—"Gentlemen, did you ever stop to think? I ask you again, did you ever stop to think?"

Weary listener—"Did you ever think to stop?"

"Have you a cigarette lighter?"

"No, they're all the same weight."

Ted—"That woman has money to burn."

Ned—"Well, it won't take her long to find a match."

Mrs Bed—"My husband has something put aside for a rainy day."

Mrs Sted—"I know—my husband's umbrella."

Husband (attending theatre with wife)—"This play makes me think."

His wife—"It is an odd play."

Proud parent—"No, I will never recognise an actress as my daughter-in-law."

Lovesick son—"But she isn't an actress; she only thinks she is one."

Kind Old Lady—"My poor man! What were you before you became blind?"

The Beggar (Unconsciously)—"I was a legless man, ma'am."

Little Brother—"What's etiquette?"

Slightly Bigger Brother—It's saying 'No, thank you,' when you want to say 'Yes, please."

"Is this Wembley?" asked a man, who got out at that station, of a deaf man sitting opposite.

"Beg pardon," was the reply. "I am rather hard of hearing."

"Is this Wembley?"

"No—Tuesday."

Wife (During quarrel)—"You're becoming absolutely unbearable. It will soon be impossible to live with you."

Husband (hopefully)—"How soon?"

## Wits & Humour.

BY

**Sulaiman Mohammad,**

*8, Jubilee Hostel.*

Mrs. Higgins had just paid the last instalment on a perambulator.

Shop Assistant— "Thank you, madam. How is the baby getting on now?"

Mrs. Higgins—"Oh, he's all right. He's getting married next week."

---

Vivienne—"Last night Jack asked me to marry him and make him the happiest man in the world."

Beatrice —"Which are you going to do ?"

---

"My father was a Pole."

"How interesting! North or South?"

---

"Since Dorrothy married she has stopped wearing high heels. Her husband disapproves of them."

"I always said she'd lower herself by marrying that man."

---

Wife (at a sale) "I promised to meet husband in this department over an hour ago. I was wondering if you had noticed him."

Shaowalker—"How would you describe him, madam? Fresh coloured?"

"Oh, No. He'd be white with rage by this time."

---

"Here you are, miss. Tell your fortune and all about your future husband for a shilling."

"No, but you can tell me about the past of my present husband for future use."

---

The Girl—"While you are asking daddy, I'll play something jolly on the piano."

Her Bean—"I should'nt. Some people can't keep their feet still when they hear lively music."

---

chain that will bind you to this place. You expect me to ask my men to drive you back to the city. Well you either think yourself to be a very great knave or me a great fool. Would I send you back to bring an army upon my head. No my friend, you shall have to be my guest and how I treat you will depend on how you behave." "Don't you realise, Khan Sahib," stammered my friend, "that I am a man of sufficient importance in the city ; I shall be missed in the morning and enquiries will certainly be made which will lead to unpleasant consequences?"

(To be continued)

a rat would feel in the presence of a cat. The very face of the man was like a death-warrant. The doctor approached the bed and took the arm of the woman on the cot in his hand. It was long thin arm pale like a pealed potato, and felt the pulse. The woman faintly opened her eyes, shuddered and quickly drew away her hand and in a weak voice which sank into my heart on account of the infinite pathos in it, she exclaimed. "You again here, why don't you kill me and have done with this. I don't want to live; why torture me.......... Take away those red hot irons. The very sight of them drives me mad ...........There, have you brought a hireling with you—is that a new means of torture? Go away, don't touch me." With these words she sank back exhausted. It was evident that she had been kidnapped and was being tortured by these human vampires. A strange freak of fate had brought me here and a hundred thoughts came into my mind of how they would torture me and my friend if the woman died. Our life was linked with her and it was a frail thread by which two lives hang cn to the other.

My friend in the meantime had administered a pick-me-up to the patient. She had a very high fever and was delirious. We sat by her bed for an hour, the doctor holding her arm all the time. She had sunk into a stupor and we began to whisper to each other of the fate that had brought her here and the fate that awaited us.

The Khan then came in and in his peculiarly offensive manner said, "Doctor, any hope for the patient?" "Yes," replied my friend, "she has had a very great nervous shock which has brought about a nervous breakdown, and she shall have to be left alone. She had been raving of red-hot irons and other means of torture. As long as she is here she will be constantly reminded of the ordeal that she appears to have passed through. She shall have to be removed from this place and must be given proper medical attention and careful nursing. If you want her to live ask your men to drive me back to the city. The man didn't appear to have heard me." He was thinking hard and after a few minutes he bellowed out, "So she has been bragaing." "How much has she revealed to you. How much do you know, for remember every word that she has spoken shall be a link in the

We must have gone on thus for half an hour, when we were blindfolded and led by the hand over the same path. We went on thus and it must have been an extremely winding path. The bandage was taken of our eyes and we found ourselves standing blear-eyed in midst of a huge court-yard. On one side in a narrow verandah could be heard the champing of the horses that neighed as their masters came in. In front of us was a large opening in the court-yard. Dim light was burning inside and a hushed murmur of sounds came floating upon the still night. The Khan came to where my friend was standing, and from the folds of his blanket in which he was wrapped, he took his service revolver; patted it lovingly, opened the magazine and then replaced it in his pocket.

This was meant as a warning to us. "Doctor," he said in a deep guttaral voice, "I have brought you here to treat a lady of my house. No stranger has ever stepped in here. You have been brought here on account of your reputation as a medical man. Use your skill and remember that her life is very valuable to me. If she lives you will be allowed to depart in peace, if she dies, you will pay the penalty of her death with your life. You are permitted to ask no questions, talk to no one. This is all that I have to say to you. Now begin your work."

When this ominous speech came to an end, my heart sank within me. A hundred questions, surged through my breast. Why had I come here? Who was this woman? What was the mystry? What was going to be the end of all this? I cursed myself for having put my neck in the noose. But what help was there for this? I must keep my wits about me and wait for the end.

We were led into a room bare of all furniture. There was a big bed lying in one corner. Two wooden chairs were lying near the bed. In one corner was an earthen pitcher and a small lamp flickered dimly in a recess in the wall. The air was full of soot and smoke, and I felt the stinck of it in my nostrils.

On the bed over a dark grey blanket lay a woman, pale as death, quite senseless.

The Khan had left me. That at least was a satisfaction, for in his presence I felt very much like what

I do not know why, but I decided quickly to accompany him in his midnight mission of charity. When I told him of my intention, he refused to take me along but on my insistence he consented. I quickly changed, took my camera, my Winchester torch and binoculars, and went out in the dark night with him to where a car was throbbing silently.

Three burly men, dressed in long flowing cloaks with a piece of cloth wrapped round their heads were waiting for us. I could not see their faces clearly in the dark. One thing that I could clearly see were pairs of black burning eyes which gleamed upon me in the night. I can never forget that look. It has seared itself into my memory.

We got into the car, and even as I sat there, a strange fear stole over me. Something gripped my heart and as we started away, I became aware of a dark muffled figure couched in a corner like a cat. The touch of his body sent a shiver through me. Something cold and clammy touched my hand and I found, rather I felt the steel blue barrel of a rifle looking down upon me. I shrank back from him and wished I had brought my Webley and Scott with me. I enquired of my friend if he had brought his. He started up nervously and searched for it in his pockets. It was not there and we sat back heavily in our seats cursing ourselves for our lack of foresight. We sat in silence for some time; then a brain-wave seemed to have come on my friend. "Khan Sahib, will you stop and drive me back to my place, I have missed some medicine there." The only reply was to motor on at a greater speed My friend shouted again, but no one minded him. He tried again, but the man whom he had addressed seemed to have caught the ruse. The car went at a fearful pace, tearing through the still air. Trees, bridges, dark shaggy crags, flew past us. There was a distant bark of a dog and the faint glimmer of a lantern. Some habitation was near and we were evidently making for it. After some time the car pulled up near where a bridle path branched off the main road. We were asked to get down. One of the men carried the medicine chest and in ominous silence we went up the path. Two of the men walked in front of us, the third with the rifle in the rear.

letter to a well-known citizen there. The journey was uneventful. I reached Peshawar on—and when I got down at the platform, and passed through the crowd of strange-looking people there I realised I was a stranger among them. It was a world different from mine. That soft cringing culture was prominent by its absence. The people around me appeared to me filled with a fierce zest for life. I engaged a coolie and went out of the station and was greeted by cries of the tonga-wallas who rushed upon me as if each one of them had been expecting me, and in their strange babble of a mixture of Urdu and Punjabi, they invited me to their respective conveyance. I brushed them off and quickly got into the nearest tonga and directed the tonga-walla to drive me to the house of my friend.

Smack went the whip and round went the wheel, and we swiftly whirled past the busy streets of Peshawar. There I could see the wild fierce-looking Afridis, the urbane and polished people of the plains, the soldiers of the various English regiments stationed there; young students with bright silk turbans and the staid looking bearded Mullas. It was a strange mixture of humanity where the cultured and the uncouth, the fierce and the meek jostled with each other. I was thus absorbed when the tonga-walla stopped in front of a large brick-house and informed me that that was the house of Dr. X.

My friend came out of his house at the approach of the tonga as he had been expecting me. I went in, and he asked about my journey and other usual questions. I gave him that letter and he welcomed me again to his house. The servant brought me some light refreshments and then showed me to my room. I unpacked my things and changed there. The dinner was served soon after and being tired out, I excused myself and went to bed. I fell asleep immediately. I must have slept very heavily. At about twelve in the night I heard someone rapping at my door. I got up, threw a blanket over me hastily and opened the door. It was my host who was dressed as if for a journey with his medical chest in one hand and a heavy stick in the other. He told me that he had had an urgent call from a patient in one of the neighbouring villages, and that he might not be able to return till the following evening.

# THE BRIGAND.

BY

(Jyoti Prasada—ex-Student, Intermediate College)

WE had finished a rubber and my partner was about to deal for the next, when abruptly a stout-looking man with a cigar placed in one corner of his mouth entered the room and greeted my friends. His face was quite new to me. My partner dropped the cards on the table and cried out in surprise, "Hallo, Old chap! Where have you been all the time?" He had seated himself on a sofa and all those in the room got round him enquiring as to where he had been. I began to feel very awkward; standing like a fool near the bridge table fiddling with cards. One of them noticed my uneasiness and said, "Come near, I will introduce you to a great adventurer." I hesitated a little, but my friend dragged me on to him. "This is my friend Mr. T. and this is Mr. Shamser Singh, who has just returned from a tour through the N. W. Frontier Provinces." With a smile he got up, shook hands with me and looked into my face and exclaimed. "I think I have met you somewhere. Arn't you the son of——.?" With all humbleness I said 'yes' and he took me by the hands and offered me a seat next to him on the left. "Tell us some of your latest adventures, Shamser," asked one who was sitting on his right. "Some lemonade, if you don't mind," said he. "I am feeling dog-tired after that sickening journey from Peshawar to this place. It was only this morning that I arrived and I request you all to excuse me today." "No, no, this will not do, we must hear a story today," put in another sitting in front of him. In the mean-time the bearer came in with a glass of lemonade. "Come on, drink it and begin at once or we'll worry the life out of you" said one of them.

"Alright, if you much insist on it, I will tell you one of my adventures." He took a sip from the glass and lighted a cigar. "Well, since you must have it, I shall relate one of my adventures. I leave to you to believe it or disbelieve it, but you are not to interrupt me by any of your silly unbelieving questions."

"You are all aware that I left this place on the 10th of August to see the "No man's land" of Khyber. I reached Peshâwar on the 12th evening. A friend of mine had given me an introductory

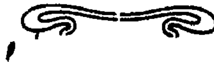
and eternal bliss, otherwise he entangles himself and ensnares himself in the passionate love, which ruins the life and energies of the man.

Some persons compare this passionate flame with the eternal bliss, *i. e.* "True Love ?" They are misguided and they do not know the reality of Love. Difference between these two? "True love is full of peace," and the other is "filled with constant craving for reciprocation." "The true love is perfect freedom ;" while the other is "bondage and slavery." One is "fulness of content, and the other is but a vain effort to find rest in another unit."

*Means to achieve True, Divine and Glorious love ?*

Humility, patience, purity, sincerity, simplicity and truth can bring True Love and lead us to the Divine Soul. An English poet says:

A smooth and steadfast mind,
Gentle thoughts and calm desires.
Hearts with equal love combined,
Kindle never dying fires.



# PHILOSOPHY OF LOVE.

BY

Sh. Mohammad Umar.

XI. B.

*What is love?*

"A fire which never warms, and leaves nothing behind but smoke and ashes."

"Love is the very essence of God's being."

"True love is a state of Beatitude which possesses the soul.'

"Apart from love there is no real life.'

"Love which illumines the soul, that reigns with a quiet joy and happiness, that surrounds all things with a halo of light, that makes the universe sing, that casts out fear and makes the heart content surely and indeed, that and that only is true Love."

"Love is the melody of heaven."

Shakespeare defining true love, says, *in one of his sonnets,*

Love is not love

Which alters when it alteration finds,

Or bends with the remover to remove.—

but,

O, No; it is an ever fixed mark

That looks no tempests and is never shaken

It is the star to every wandering bark;

Whose worth is but known, although his height be taken.

Love is a cross-word puzzle that cannot be solved

Without love no one can achieve his object.

Love is the missing link between man and God.

Love is happiness.

Love is mutual, love is magnet,

Love is sublime and inspiring.

*Kinds of love?*

1. Mother's love, a child has got love and affection for his parents. Mother's love is the first step to "The Universal Love" and Love for Nature. A child after growing loves his surroundings and Nature, and loves his relations, loves his pet animals and birds and so on. A spirit of new-life is infused in him; he becomes a love-bird and loves every thing that pleases him. At this time; comes a critical moment. If the child is fortunate enough and is instructed to glorious path of the true love; he acquires perpetuity

The emperor at the head of 40,000 Chaghatia soldiers was present in the field while Sher Khan was with 15,000 Afghan soldiers.

The emperor's army surged like waves of the sea over the surface of the ground. On the emperor side it was very difficult to hold the ground because every Ami· and Vizier whether rich or poor had his camp followers (gulams) who were of no use to their masters in the time of bettle. Such was the condition of the emperor's army. While Sher Khan's army came out of its entrechments, in two divisions, which seemed to be equal to four divisions, drew up in that place and three divisions advanced against their opponents When Sher Khan advanced in battle array, the army of the emperor took flight like chaft from the wind and it was quite impossible to check them. The result was that without a cannon shot, without a fight the imperial army was flying panic-strucken when Chaghatia took flight, the distance between them and the Ganges was one *farsakh*. The result was that Humayun who had a ratinue of 17,000 in attendance at midday was mounted on a horse supplied by Tardi Beg and had nothing on his head or feet.

Humayun was pursued every where and was dogged at every step by Sher Khan till he crossed the border of India till the lifetime of Sher Khan.

"Sher Shah was not all blood and iron" as his stormy career may suggest us. He was veritable father to his people ; stern to the unruly, but all kindness and love to the weak, the disabled and the destitute. Qanungo says "The names of few men in history are so expressive of their character as that of Sher Shah—the tiger Lord. The Royal Bengal Tiger is no unworthy prototype of his in the animal creation. To use the phrase of Mommsen, there was a mixture of the lion and the fox in him. With enemies of equal strength he was prone to play rather fox than Lion, and to this he owed his triumph ever Humayun and Kalder. But in his dealing with his subjects and nobles, he was the terrible lion of justice which was indeed the most characterstic feature of his character."

a strong party of his own as a counterpoise in the kingdom to save the situation. He was highly popular among the peasants and was highly influencial among the Lohani nobles. During the deputiship of Bihar he was in ardent pursuit of personal ambition. Two most notable incidents were the acquisition of Chunar and his alliance with the Makhdumi-alam the Governor of Hajipur on behalf of Nasrat Shah, king of Bengal. In the meantime the death of Babur was the signal for the out break of a formidable Afghan rebellion in the eastern provinces.

Sultan Mohammad Lodi rebelled against Humayun, the then emperor of India. His majesty started to crush the rebels. Sultan Mahmud compelled Sher Khan to help him and consequently Sher Khan helped him but opened treacherous negotiations with Humayun through Hindu Beg and at the critical moment of the battle drew off his forces, which caused the defeat of Sultan Mahmud Lodi. Sher Khan was already master of Chunar by bribing the Turkomen brothers or party of Loki Malika.

When the battle was over, Humayun sent Hindu Beg to Sher Khan demanding the surrender of the fort. But Sher Khan refused to give it up. Thereupon Humayun marched against Chunar. Sher Khan leaving his second son Jalal Khan in the fort went with all his family to the hills of Bahar Kunda. Humayun beseiged Chunar and in daily fight, Jalal Khan showed the greatest ability he could and gained a great renown.

When Sher Khan saw that the fort would fall within a couple of days he submitted to Humayun and sent his eldest son Qutub Khan to the presence of the emperor and secured peace.

Though Sher Khan was compelled to surrender to the emperor, yet the brilliant defence and ultimate retention of the fort gave his achievement an air of victory over the Moghals. Sher Khan fought many a battle with Humayun and defeated him many a time but never faced him openly except in the last battle of Qanuj.

On the 10th of Moharrum 947 A. H. (17th May, 1540 A. D.) the two armies intended to fight in which Humayun was very badly defeated and had to fly for his life. This was the last battle which was fought between Sher Khan and Humayun.

Mohammad but Sher Khan was not a man to seek the indirect support of a Lohani king who was really backing his opponents. His brother advised him to go to Sultan Junaid Burlas the Governor of Jaunpur and to enter in the Mughal service which would afford him an opportunity not only of vengeance on Mohemmad Khan Sur but even of driving him out of Chunar.

Sher Khan agreed to his brother's advice and consequently went to Benares. Reaching Benares, he sent his agent to get the permission of safety from Sultan Junaid Burlas at Jaunpur. The Mughal Governor gave him assurance and Sher Khan went to Jaunpur and made large presents to him and enlisted himself in Moghal service. After a few months when Sultan Junaid Barlas went to Agra he presented Sher Khan to his brother Mir Khalifa, who was acting as Babur's minister. Sher Khan remained in the Moghal army waiting in the eager expectation of another Moghal campaign in the eastern provinces. Sher Khan had been in Babur's camp for about fifteen months and after this short time, he got his lost jagir by the help of the Mughal army or as a result of Babur's eastern campaigns.

The death of Babar Khan Lohani followed almost immediatedly, and caused a great confusion in the affairs of the kingdom of Bihar. Jalal Khan son of Babar Khan was a mere boy when he ascended the throne. His mother Dadu who looked after his interest was undoubtedly a sensible woman but the disorganized state of the kingdom required a strong man and at the same time a man of uncommon discretion to set it in order. Sher Khan who was already his tutor and had already shown remarkable administrative ability during the lifetime of Sultan Mohammad, was called back by Dadu to service and was made a deputy of the Government. Dadu kept matters of importance for her own inspection and supervision and with co-operation with Sher Khan discharged important duties. A few days after, mother of Jalal Khan also died and the kingdom of Bihar fell upon Sher Khan. In this way Sher Khan was practically the master of the whole of Bihar. Like great Richeliue, the regenerator of France Sher Khan also became the object of aristocratic envy in his new office. But Sher Khan was aware of all the dangerous activities and hence he had made

brated throughout Bihar. One day he went out hunting with Babar Khan and a tiger happened to appear; Farid slew it. Babar Khan on account of his gallant encounter, gave him the title of Sher Khan or Tiger Lord.

Afer some time Sultan Mohammad Babar Khan, for it would be the more correct designation as these events took place before the first battle of Panipat, and after which Babar Khan assumed the title, finding Farid a man of skill and experience and quick understanding, nominated him the deputy of his minor son Jalal Khan. Here also Farid became popular and respectable. It was all due to his capacity for management and excellent arrangements. After working a long time under Sultan Mohammad, he returned to his own jagir with the permission of Sultan Mohammad. Farid remained for six months absent from Sultan Mohammad and the Lohani king expressed his displeasure at Sher Khan's delay. Mohammad Khan Sur the arch-enemy of Sher Khan, took his opportunity of alienating his mind further by artful representation of Sher Khan's evil nature and faithlessness. He persuaded Sultan Mohammad to confiscate the jagir of Sher Khan. The Lohani king refused to do so but out of deference to the position of his powerful noble, comissioned him to arbitrate between Sulaiman and Sher Khan upon their respective claims to their father's parganas.

Mohammad Khan Sur having got this long sought for opportunity, arrived in his parganas and sent his trusty servant Shadi Ghulam to Sher Khan with the self same demand previously rejected by Sher Khan. Sher Khan replied that he was not in a position to share his jagir which was given to him by Sultan Ibrahim. Whatever goods and money his father had left, Suleiman appropriated them and sought his protection; Sultan Ibrahim had granted these two parganas to him in which no brother could claim any share. This speech of Sher Khan was carried to Mohamed Khan and he hearing this fell into a fit of rage and commanded his troops to march towards his parganas, where a sharp tussle ended in the Khan's victory and Sher Khan finding it impossible to rally his forces, called his full brother Nizam and other well wishers to ask their opinion on the present situation. Some persons counselled him to go to Sultan

discontinued complaining to Hasan, but from that day seldom held any intercourse with them. The situation became intolerable to Hasan who asked his dearest wife the cause of her grief. Sulaiman's mother, in a choked voice, with copious tears and frequent sighs reminded him of his early pledge and threatened him with her determination to commit suicide, if he did not remove Farid from the charge of the parganas and invest her son Sulaiman with authority therein." Mian Hasan who was entangled in the noose of her love, swore a solemn oath to her and appeased her. When Farid discovered that his father had promised to Sulaiman's mother to remove him, he at once threw up the managements of the parganas and both the brothers *i.e.* Farid and Nizam, left their father's home for a second time and again went into a sort of exile to far away Agrâ in search of daily bread.

Agra had become the capital of the empire since Sultan Sikandar Lodi's time. Sultan Ibrahim who ascended the throne of his father in 1517 A. D., also resided there. At Agra he chose Daulat Khan a powerful noble of Sultan Ibrahim as his patron. By his services he won his favour and through him he tried to secure a grant of his father's parganas to his own name while his father was yet alive. However, his father soon breathed his last and Daulat Khan procured the imperial Farman in Farid's name. Farid returned to Sasram amidst the rejoicings of all his relatives and soldiery. Sulaiman, unable to offer any opposition fled to Mohammad Khan Sur of the Daud Shah Khail, the chieftain of the tribe of Sur. Farid sent his brother Nizam to fetch Sulaiman as he intended to give him a jagir which would have satisfied him. But Sulaiman did not consent as he desired to share in the government of Farid's parganas which he could not obtain. Mohammad Khan pursuaded Sulaiman to recover his share by force of Arms. Farid did not mind him and entered the service of Babar Khan.

According to his old habits and stratagems he employed himself day and night in his business, nor did he rest for one moment even and consequently gained his favour also, so much so that he had access to him in public and private and become one of his most intimate friends. In consequence of his excellent arrangements he became cele-

consented to take back Farid into his favour and promised them to make over the charge of his parganas to his son. After that Farid was taken to his father's presence by his kinsmen and his father was very glad to see his promising son. A happy reconciliation took place ; and Hasan kept his son for some months with him.

After keeping Farid for some months, Mian Hasan sent his glorious son to his parganas with powers to sanction and to cancel the soldiers' jagirs. Thus armed with necessary powers the young deputy, at the age of twenty-five (25) about 1511 A. D., when Sultan Sikandar Lodi was on the throne of Delhi, started for the head quarters of his parganas. When Farid arrived, he did not find the parganas of his father in prosperous condition. He set about working to change completely the existing condition and introduce far-reaching changes and wise regulations. Farid ruled his father's parganas for seven or eight years from 1511 to 1518 or 1519. During these years, says Qanungo, "Farid's youthful martial vigour found a fruitful outlet in extending the boundaries of his father's jagir, which being a frontier march had ample scope for expansion especially towards south. In civil affairs he went on experimenting on the efficacy of his new revenue regulations, in removing the misery of the peasantry and the corruptions of the Muqaddams, till he was satisfied with the soundness of his system, which was destined to be extended afterwards all over Hindustan. He was indefatigable in dispensing sure and relentless justice to all equally." Abbas Sarwani says, "If any soldier or peasant had a complaint, Farid would examine it in person and carefully investigate the cause, nor did he ever give way to carelessness or sloth."

After sometime, Mian Hasan came to his parganas and was very much pleased by the arrangements of his son and consequently he showed both brothers, Farid and Nizam, all kinds of favours. One day Hasan called Farid and directed him to manage the affairs of his jagir, as being old he was not in a position to control the corruptions of officers. When his step mother heard this, she pressed her husband to remove Farid and to give the charge of the parganas to her son Suleiman. But Mian Hasan did not mind her. The result was that Suleiman's mother

to his youngest wife, a slave girl, who bore two sons, Sulaiman and Ahmad.

Hasan though weak in private life, was a capable man of business His ability won him his mater's favour and he was soon raised to a dignified position. Sasram and Khawaspur in the neighbourhood of Rohtas were given to him for the maintenance of five hundred troops. So his family was removed from Narnot to Sasram. But this rise of the father did not change the lot of Farid and being very much aggrieved at his father's unkindness, he at the age of fifteen, went to Jamal Khan at Jaunpur. When his father came to know his son's presence at Jaunpur he wrote to the Khan that Farid had gone to him and that he should kindly send him back as it was his wish to instruct him in religious doctrines and in the court-etiquette. Jamal Khan pressed Farid to return home but he refused and said, "If my father wants me back to instruct me in learning, Jaunpur is certainly a better place than Sasram ; I will study here." The Khan being convinced by the boy's logic put no more pressure upon him. Farid began to learn Arabic and studied Kafia (a book on Arabic Grammar) and Sikandar-nama. He committed to memory the Gulistan and Bostan.

After a few years Farid began to pick up the knowledge of revenue affairs, the distress of the cultivators, the oppressions of the Muslim soldiery and the corruption of the Hindu revenue collectors. Farid lived at Jaunpur from 1501 to 1511 A.D. upto his twenty-fifth year. At Jaunpur, Farid by dint of his own unaided effort, had grown into an able and promising man. He was loved by all with whom he came into contact and his kinsmen living in Jaunpur became well-inclined towards him.

When his father came to Jaunpur on a visit to Jamal Khan, his friends and relatives scolded him, for putting away so able a son to please a slave girl. They remarked that Farid Khan, young as he was, gave promise of future greatness, that he bore marks of excellence on his forehead and that in all the tribe of Sur there was none who possessed learning talent, wisdom and prudence like him and that he had qualified himself so well that if Hasan would entrust him with the charge of a Pargana, he was sure to discharge the duties excellently. Mian Hasan

# SHER SHAH : HIS EARLY LIFE

By
Syed Moinudin Ahmad,
*Class XI, B.*

THE original name of Sher Shah was Farid and his father's Hasan. They belonged to the Sur section of the Mat clan. Hasan's father, Ibrahim was an obscure Afghan from Roh with no idea of being a descendant of the Sultan of Ghor. Neither Ibrahim, nor any one else of the Sur tribe wanted such an inconvenient distinction of being non-Afghan, though from Royal blood. Mian Ibrahim traded in horses but was not prominent among tradesmen.

His ancestral home was on the rugged hill-side of Sargari, a detached ridge of the Takht-i-Sulaiman mountains of the southern bank of the upper course of Gumal river. Owing to its nearness to Gumal pass, which was one of the oldest and most frequent trade routes between southern Afghanistan and the Indus valley, Ibrahim had excellent advantages for his profession. But he could not prosper in trade and during the latter part of Sultan Bahlol Lodi's reign, Ibrahim, then on the eve of his life with his young son Hasan, started for Hindustan in quest of service as a soldier. He came to Bajwarah near Jalandhar where Mahabat Khan Sur held a jagir. After residing there for a few months, he entered the service of Jamal Khan Sarang Khani at Hissar Firoz.

Farid, the first child of Hasan Sur, was born in this auspicious city which was founded by the gentle king Feroz Shah. Ibrahim's family settled at Narnot where he got several villages in jagir. After Ibrahim s death, his son, Hasan was confirmed in his father's jagir. Farid grew up under the persecution of his father and step-mother. Hasan had eight sons by four wives. Farid and Nizam were born of his eldest wife, an Afghan lady ; the others were of slave girls raised to the status of wives.

Hasan had left Farid's mother owing to the loss of her physical charm and did not keep any amiable connection with her and showed her no kindness. This is why he used to show little affection and kindness to these two brothers in preference to his other sons. He was passionately attached

the Stars on an ordinary celestial globe.*

I now leave to readers, to judge, whether Islam has been hostile to progress or has paved the way for mankind to elevation of mind and spirit.

*Draper.

rendered into Arabic by learned Persians and Indian translators. Passion for learning grew more and more. Astrology upon which they set great store led to the study of astronomical and mathematical works and out of these efforts soon arose a high order of intellectual activity, and a very extended literature of mathematics, natural science and philosophy. If not its origin, Algebra owes its development, to the Arabs. At the instance of the Caliph Mamun, the mathematecian Mohammad-ibn-Musa, wrote a short Algebrical treatise which gave the best known and the most useful illustrations drawn from the everyday problems of life. This treatise first introduced into Europe a knowledge of Algebra. The Latin translation of Mohammad Musa served as a manual to European scholars of sixteenth century, supplying to them knowledge of Algebra. No less credit is due to them for their cultivation of Geometry, particularly the development of spherical Trigonometry. To optics they made considerable independent contributions. A Spanish mechanic even invented a machine in which he actually flew into the air.*

*Makkari, II, 873.

About this time lived Al-Farghani, the famous astronomer, whose writings in Latin translation were studied in the Middle Ages, and who under the name of Alfranaganus, enjoyed great authority.

In the middle ages, Alchemy, through the Arabs, made its way across Spain to Europe, and with Alchemy a large number of organic and inorganic substances with their Arabic names such as Alcohol, Alkali, Elixir, Alembic, etc., etc.

Less conspicuous, but in no way insignificant, are the achievements of the Arabs in medicine.

The great Avecinna—whose systems of Medical Science enjoyed for six centuries an undisputed supremacy in Europe and cast all his predecessors into the shade. Enough has been said to indicate in general outline the scientific activities of the Muslims in these spheres of learning.

The Arab has impressed his intellectual stamp upon Europe, and not in too remote a future will Christendom concede this truth. He has left unfading traces of his finger on the sky which every one can see who reads the names of

The first thing that the Muslim did was to collect oral traditions, which had grown tremendously in bulk and variety. The oldest historical work under Abbasides was the chronologically arranged collection of traditions relating to the time of the Prophet. Its author, Ibn Phaq composed it at the instance of Caliph Mansoor. The passion for history increased more and more and foreign non-Muslims were not ruled out of consideration. History brought in its train the study of archaeology, geography and ethnography. Belazr, who died 892 A D. wrote a history of the Muslim conquest. *Masudi* (d. 956, A. D.) was born at Baghdad, he resided a long time at Cambay, and later on he went to Egypt. His chief work Mirat-ul-Zaman has come down to us. *Beruni* (d. 1039 A.D.) was born in N. W. India. He translated from Sanskrit to Arabic, and accompanied Mahmud the great conquror on his expeditions to India. His statement regarding latitude has been found, by recent calculation to be correct, except for a minute or two.

No less were they active in the sphere of geography, a subject intimately connected with history. The need was soon felt for the geographical knowledge, for in ancient poems names of places and of tribes were constantly referred to, in the history of the Prophet's campaigns, and of later conquests, geographical names were of extreme value. With the growth of the empire of the Caliph, it became even a matter of practical importance to know the chief stations, the main high roads, the extent of provinces, their towns, rivers, and mountains. A geographical work of Yakubi,* dating from the year 278 A. H. has come down to us.

It shows us that even then geography was studied systematically. Somewhat later, Qudama followed, with a practical hand book for the use of the central Chancery in Bhagdad. He knew of the spherical form of the Earth, and of the shortness of the days in polar regions. In intimate connexion with the growth of geographical knowledge stand mathematical, astronomical and the natural sciences, which attained a high development in the School of Bhagdad. With the accession of the Abbasides, great ardour was felt for the study of Greek works in the Arabic translation of the Syrian Christians, as also works in Persian and Indian

* Beazley, Dawn of Modern Geography.

arms but of mind too. These theological controversies provoked a keen intellectual contest, which continued well nigh for a couple of centuries, and marked the highest point of Arabian civilisation. Under the Ommayads a lively intellectual life was developed, and manifold must have been the relations between Muslim and Christian theologians.

We find ourselves on surer ground from the second century of Hejira, when intellectual activities began on a far grander scale. Not because with the growth of of large cities and a settled Arab populations, but for the thirst which they had for knowledge.

The Abbasides who were the successors of the Omayyads carried these activities to the limit. "The reign of the 1st Abbaside," says a distinguished French scholar and historian, "was the era of the greatest splendour of the Easteam Saracens. The age of conquest had passed that of civilisation had commenced. *The first nine sorvereign of this house, with one exception, were men of extraordinary ability and politicians of a superior type, devoted to the advancement of the public weal. All of them combined warlike qualities with high intellectual attainments. Surely it was the Augustian age in the history of Islamic politics. In this subject I shall make no reference to politics; but shall consider matters purely educationl.

†"Education enlarges the mind and uplifts the soul. It gives a clearer and wider outlook on life; it instils sympathy and it inculcates tolerance; it moulds character and teaches the dignity of man." The true aims of higher education are to extend the boundary of knowledge and to elevate man's character. It must be then our duty to do all we can towards its advancement.

Something has been said regarding theologic and philosophical knowledge. Now let us see the progress made by the early Muslims,* in other branches of the Learning. As far as historical knowledge is concerned, very little has come down to us from the early days of Islam. De Soeje speaks of Ibn Abbas' Life of the Prophet and Abu Miknof's Monograph on important events from the time of Abu Bakr to that of Walid II, as the oldest historical works known to us.**

*S. Amir Ali

Bukhsh†
Under Abbaside*
†These two works belong to the last days of Omayyads.

in the history of the world, and to hold aloft the torch of monotheism to guide erring humanity to the path of true faith."

Not only the Arabs enjoyed these previleges, but by accepting Islam, people of other nationalities acquired, at a stroke, complete equality of rights with the Arabs, and were raised to the rank of governing classes. Nothing like it has ever been realized in the East, and Europe itself has hardly any example to cite of so perfect a democracy as was the one established by Islam. True, it was short-lived, but its existence, however brief, is a crowning glory of Islam.

The Islam of the earlier centuries evolved and progressed with the nations, and the stimulous it gave men in the reign of the ancient Caliphs is beyond all questions. By magic, as it were, Islam transformed the old decrepit world, and made its head-quarters the centre of commerce, the seat of learing, the focus of a world-wide civilisation.

Rapidly Islam established its world-empire Why? because the early Muslims shot their arrows on one target, the aim of the one was

Loti.

the aim of all; union had strength; they all were devoted to one cause, one God, one Prophet, one Book, and one Qibla, so they became the masters of the greater part of the known world than the Romans were ever masters of. This is the lesson which we have for-gotten, and this is the lesson which must needs be taught if we would make ourselves worthy of the great Islam we profess. We have seen the spell of the former, now let us see the effect of another magic wand.

"Seek knowledge, may it be in China." Literary and Scientific impulse given by the said tradition, is the second part of our subject. The literary activities that chiefly engaged the attention of the first generation of Muslims were: the conception of the Unity of God; the precise understanding of the term—belief, unbelief, and predestination. These were the new ideas that were in the air. They were in a state of flux. To take up these unsettled questions was the first intellectual exercise of the Muslims—by no means a light or easy task. In the 1st century of the Hejira, these discussions powerfully got hold of the Arab mind, for into their service were pressed not merely the forces of

Almighty for his deeds and misdeeds. What a tremendous step forward this meant for mankind. Man, henceforward, became a moral being. He was, so to speak, born again, and born with a conscience; that inward judge whose vigilance none can evade, and from whose judgment there is no escape."

These are the general services rendered to humanity by Islam. Now let us weigh the teaching of Islam in the scale of political and intellectual progress.

It is difficult for me to discuss several teachings of Islam regarding 'Politics and Learning.' In this small article I shall confine myself to two of them only. One regarding politics and the other throwing light on learning. The first is the verse from the Holy Book and the second is a tradition, All Mulims are brothers, is the subject with which we have to deal first. It is the verse of Quran that Holy Book over which Goethe fell into raptures, in which Gibbon saw a glorious testimony to the unity of God.

We cannot forget this sublime idea of brotherhood in faith, which Islam, for the first time introduced into the world. All Muslims were brothers. There was to be no wall of division, no difference founded on the score of nationality, and no distinction begotten of colour. Islam truly realised "the parliament of man, the federation of the world." The idea of brotherhood was a splendid achievement. It was a beautiful ideal to aim at, to strive for, to live up to.

It is reported, that when Tariq burnt the fleet of which he was in command, the notables of the Arab army asked him, how would they go back to their homes again. He said "For the Muslim the whole world is their home, entire humanity their kinsman" The result was the Muslims remained Masters of Spain for seven hundred years. This broad and liberal doctrine found its counterpart in the splendid democracy which Islam set up. The head of the State and Church was a popular nominee with very clear duties and very distinct obligations.

"A new view opened, a fresh direction assumed, a new starting-point made—the past was obliterated, a new Arabia arose, and a new Arabian nationality summoned into existence to take up its place

# ISLAM AND PROGRESS.

BY
Z. G. Bart.
*XII Class.*

Historians differ as to the causes of the downfall of the Muslims and their Empire. European writers intoxicated with pride of prejudice say that the presence of Islam is the cause of national deterioration, that Islam is stationary, stereotyped, hostile to progress. But the whole history of Islam given lie to the charge.

Islam from its very inception taught the lessons of brotherhood to the unruly sons of the desert, it showed them the way towards humanity, righteousness, virtue, justice and love. Islam indeed has never been as represented by European historians. For them religion is nothing but a mockery, so it is difficult for Europeans to understand an Oriental's attitude towards life and religion. 'The life of an oriental—from cradle to grave—is a series of religious performances! In Europe the Church and the State are two different heads, in Islam there is no sharp line between religion and politics. There is no such thing as "give unto Ceasar what is Ceasar's and unto God what is God's—Ceasar is but a representative of God and obedience to him is obedience to God, 'Mohammad was Ceasar and Pope in one.'

On the contrary, the downfall of the Muslims and their Empire was occasioned, first and foremost, by their indifference and neglect of the eternal principle of justice, love righteousness which Islam enjoined and inculcated and which its great founder amply illustrated and emphasised in his own-dealings at home and abroad.

For a European writer Islam is nothing but a sharp instrument which cuts the neck of those who stand against it. I say, dear readers, is it not a curse to humanity and mankind? When man the mortal man forgets the Immortal, the created forgets the Creator, and the branch forgets its root. When this is so, Islam is surely a weapon which cuts the root, branch the plant of heresy, unbelief, and Trinity. A Bengali gentleman is of opinion that Mohammad opened eyes of humanity to the fact that man, as a rational being, endowed with the gift of understanding, was a responsible being, fully accountable to the

assiduity. But we would be doing him gross injustice if we were to imagine that he was callous to the fair side of life. In fact he was materialist in the very best sense of the word. But side by side with it he did not in any way lack the capacity of enjoying the pleasures of the mind, living as he did a life of spiritual purity, of paying due attention to every phase of his moral nature and, above all, of having no touch of selfishness in his relations with his fellowmen but only an unbounded love and sympathy. Nevertheless, it is true that as regards his views on his own art, he was a materialist.

In short, Scott's poetry lacks that inspiration, that elevation, that spiritual forcefulness which characterises the best work of Shakespeare, Shelley, Wordsworth or Browning. This fact is indisputable but the causes are not.

The great merit of Scott's poetry lies in description. He often describes scenes of external nature or scenes of human action marvellously; but in his portrayal of character he often fails, because of this interest, which as a poet he lacked. Secondly, he deserves praise for his powerful narrative. He narrates incidents with rare power and vividness; but his plots, as a whole, are often weak. Further, he claims our praise for his facility of diction, for his marvellous flexibility and diversity of nature, for his clarity of composition, for a marvellous power over detail of every sort and degree. He surpassed anything that had appeared before his day in knowledge of times in which he places his action, in antiquarian lore and in a carefully acquired intimacy with the scenes of his poems. His historical knowledge of men and manners is naturally imperfect, but this can be justified by the fact that the state of such learning at the time was no better.

Scott generally uses octosyllabic verse. His verses often lacks the the dignity of longer line. This is chiefly applicable to his longer poems. His finest qualities as a poet are exhibited in his lyrics and in some of the snatches of verse that are found in his later works. His best pieces " The Violet " and " Weirdlaw Hill " are not characteristic of his poetry at large, for if only they had been so, we today would not have said that it is Scott the novelist and not Scott the poet who has won immortality and whom posterity will admire and revere.

ger", a poem showing a return to his love and imitation of German ballads. In the "Saxon War Song" he attempts to imitate the style of the earliest Old English Poetry.

Early in 1830 Scott had suffered from an illness which had left him alarmingly weak, though undaunted. In fact he was so little daunted that he hardly relaxed his literary work. But the symptoms of over-strain were evident and unmistakable. He was not only affected physically but his creative powers also were fast declining. He retired from his clerkship on a pension of £800/- a year; but now still more rest was necessary. Therefore he calmly settled down again in his beloved Abbotsford to die there peacefully within the sound of his "silver streams of Tweed" on September 21, 1832.

There is no denying the fact that Scott's poetry has been eclipsed by the series of descriptive novels which he wrote in the later portion of his life and that these constituted the structure of his fame. Undoubtedly Scott has been a more popular writer of literature than poetry during the past century.

Many people consider Scott a mere rhymer, a versifier of tales, a mere writer of doggerel with great facility and a perfect command of language. This is partly true. He often relapses into prosaic versifying and thus exhibits clearly that truth of the doctrine that not all metrical composition is poetry. If we only remember what a hasty writer and too lax corrector Scott was, we can account for such prosaic passages. But to explain a fault is not to condone it. It is nevertheless true that these faults, resulting from a lack of concentration in artistic detail, are present in Scott's poetical works.

Furthermore, Scott was too little of an artist who worked for his art's sake, setting before himself a supreme and lofty ideal of the true aim of poetry. Undoubtedly he had a true love of the beautiful but his main object in life was to attain by means of art a certain material position. He wanted to establish his line of the Scott family as a great branch with a worthy seat at Abbotsford.

Therefore, being certain that the pursuit of art would enable him to do this he followed art with

reasons other than literary. It does not display the usual splendour of his martial descriptions. There is no doubt that Scott was fired with enthusiasm by Wellington's marvellous campaign but still he is not as much at home in this great English battle as in the Scottish fights of Flodden and Bannockburn.

The last of Scott's poetical romances "Harold the Dauntless" was published in 1817. It has a real grandeur of barbarism and ferocity which is well maintained in the rough and rugged characters of Harold, the heathen and his half Christian, savage old father Witikind.

Count Witikind came of a regal strain
And roved with his Normans the land and the main.
Woe to the realms which he coasted! for there
Was shedding of blood, and rending of hair,
Rape of maiden, and slaughter of priest,
Gathering of ravens and wolves to the feast:
When he hoisted his standard black,
Before him was battle, behind him wreck,
And he burn'd the churches, that heathen Dane,
To light his band to their barks again.

Scott's direct efforts as a poet ceased with the publication of "Harold The Dauntless." For twenty years he had been publishing poetry more or less regularly; and had obtained a marvellous hold on the public. But henceforward he abandoned poetry except on certain rare occasions when he diverted his thoughts towards it for the purpose of adorning his prose works. These poems, consisting mainly of headings for the chapters and songs sung by various characters are nonetheless beautiful because they are thus scattered. The most noteworthy of these short poems are "Elspeth's Ballad" and other mottos, consisting of "Major Bellenden's Song," "Jock of Hazeldean," "Noras Vow," and "The Sun upon the Weirdlaw Hill."

In 1817 Scott fell seriously ill. In 1819 he had further relapses of ill-health. But still he continued his literary activities. The same year he composed "The Noble Morin-

At this time a contemporary poet, Byron, obtained a hold on the public ear and mind; and consequently Scott's popularity began to decline; but still without becoming in any way despondent he still toiled on and continued exercising his poetic talents.

We have alredy seen that Scott, in connection with the politics of "Marmion," was always a staunch Tory. In 1814, he wrote a poem in memory of William Pitt, which may be compared with the well-known "Introduction" to the first canto of "Marmion."

Nor forget his grey head, who, all dark in affliction,
Is deaf to the tale of our victories won,
And to sounds the most dear to paternal affection,
The shout of his people applauding his son;
By his firmness unmoved in success and disaster,
By his long reign of virtue, remember his claim;
Witout tribute to Pitt join the praise of his Master,
Though a tear stain the goblet that flows to his name.

"The Lord of the Isles" was published on January 15, 1815. It resembles the earlier poems in the main Characterisation plays a less important part than scenic effect. We can compare its final description of the 'Battle of Bannockburn' with the description of 'Flodden Field' in "Marmion."

Just as Clare is a mere spectator at Flodden Field, so here the heroine Edith is watching the progress of the battle from a neighbouring hill. When she sees the English rally again, she stirs up the host of camp-followers around her to get what weapons they can find and rush to the Bruce's aid. It is an historical fact that the English took this descending mob for a fresh contingent, and, breaking rank fled in all directions. Argentine and other brave leaders in vain tried to rally again. The former, remembering that for the sake of his honour he must go and sake his enemy Bruce, plunges again into the battle to meet his enemy or his death.

In 1816, his "The Field of Waterloo" was published. It achieved great success with the public, though doubtless from

beauty of the character depicted. Furthermore, it is the poem which exhibits happy facility far more than any other of Scott's poems. In it the gentle natural sentiments of a father's love for his only daughter and of a servant's undying fidelity to his fallen lord are thrown into relief by the fierce and dreadful passion of the ferocious Highland Chief. (Few stanzas quoted).

With virgin step, and bashful hand,
She held the kerchief's snowy band ;
The gallant bridegroom by her side,
Beheld his prize with victor's pride,
And the glad mother in her ear
Was closely whispering word of cheer.

---

No fond regret must Norman know ;
When bursts Clan-Alpine on the foe,
His heart must be like bended bow,
His foot like arrow free, Mar.

In 1811, Scott's next publication "The Vision of Don Rhoderick" also brought him much fame. It is written in Spenserian stanza, a form which Scott at times employed with great success. In 1813 his two famous poems "Rokeby" and "The Bridal of Triermain" were published. They were written simultaneouly and brought him much fame.

Hearts are not flint, and flints are not rent ;
Hearts are not steel, and steel is bent.
When Mortham bade me, as of yore,
Be near him in the battle's roar,
I scarcely saw the spears laid low,
I scarcely heard the trumpets blow ;
Lost was the war in inward strife,
Debating Mortham's death or life.

revealed with an awkwardness that leaves one in confusion and doubt throughout the greater part of the story. Certainly this is a great blemish, caused doubtless by the speed at which Scott worked. He easily could describe an isolated scene with great accuracy and with telling strokes, but for artistic composition he lacked the time or inclination for the painful labour that must necessarily be given to this most important part of any work of art. There is no denying the fact that his execution is good, but that his construction is weak. But, doubtless this needs modification, for even in execution he often betrays too little care, and in his best passages we too often find lines of poor composition, harsh rhythm, odious rhyme or painful plainness and prosaic verbiage. We should not think for a moment that Scott was lazy; for he was on the contrary, endowed with abilities for extraordinary and superhuman feats of labour; but his powers and capability of work led to quantity rather than quality. In order to justify his frequent weak rhymes we can at the outset affirm that Scott laboured under the difficulty, as a writer of pure English, in being Scotch by birth. It is true that at the beginning of his poetical career he could not trust his own ear in such matters, and was largely dependent on friendly critics. Further as a poet, Scott was brought upon ballads and in ballad literature rhyme is not at all a strong feature. Very frequently in the older ballads one needs rhymes which are weak beyond measure or even no rhymes at all, merely assonances.

In 1809 on his way back from London, Scott visited his friend Morrit at Rokeby Park; and was so delighted by the scenery of the rivers Tees and Greta that he wrote "Rokeby."

His masterpiece "The Lady of the Lake" was published in 1810 and like its predecessors won great favour. It is the most interesting, romantic, picturesque and graceful of Scott's poems. Interesting it certainly is, because of the quality of the plot; romantic because of the dignified and noble knight errantry of the king and the merry peacefulness of the environment; picturesque by reason of its wonderful and admirable setting of Highland scenery; graceful in its plain and simple story and the

" While round the fire such legends go,
For different was the scene of woe.
Where, in a secret aisle beneath,
Tarneil was held of life and death.

---

Where shall the lover rest,
Whom the fates sever
From his true maiden's breast,
Parted for ever?
Where, through groves deep and high,
Sounds the far billow,
Where early violets die,
Under the willow.

---

With fruitless labour, Clara bound,
And strove to stanch the gushing wound;
The Monk, with unavailing cares,
Exhausted all the Church's prayers.
Ever, he said, that, close and near,
A lady's voice was in his ear,
And that the priest he could not hear,
For that she ever sung,
" In the lost battle, borne down by the flying,
Where mingles war's rattle, with groans of the dying."

"Marmion" is generally considered as the most powerful and splendid of Scott's great poems. A great part of the strength of "Marmion" lies in its psychology. Scott the poet, as a rule is essentially the descriptive painter or the vivid narrator and not a psychologist. The painter and the narrator are evident to the full in "Marmion' but, besides this there is the student of human nature and the describer and dissector of passions and emotions to boot. Like all Scott's poetical romances, "Marmion" has a too complicated plot, or rather, the plot is unfolded or

"When the huge stone sunk o'er the tomb,
The night return'd in double gloom ;
For the moon had gone down, and the stars were few ;
And, as the Knight and Priest withdrew,
With wavering steps and dizzy brain,
They hardly might the postern gain.
'Tis said, as through the aisles they pass'd,
They heard strange noises on the blast ;
And through the cloister-galleries small,
Which at mid-height thread the chanced wall,
Loud sobs, and laughter louder ran,
And voices unlike the voice of man ;
As if the fiends kept holiday,
Because these spells were brought today.
I cannot tell how the truth may be ;
I say the tale as t'was said to me."

In the autumn of 1805, Scott with his wife went to the English Lake country, and also paid a visit to Wordsworth who was then touring in hill-encircled Grasmere. It was here that Scott wrote "Helvellyn" and the "Bard's Incantation."

In 1806 Scott became Deputy Clerk of Sessions—a post in the Edinburgh courts of law. In the same year he wrote several of those short ballads in which action and passion are composed into the smallest space, and against a back-ground vividly sketched with a few bold strokes, produce a really marvellous effect. Browning describes them as "dramatic lyrics" and the best of them are "The Palmer." The Maid of Neidpath," "Wandering Willie" and, "The Battle of Flodden Field."

Early in the year 1808 "Marmion," the best or second best of Scott's poems, which would yield place only to "The Lady of the Lake" was published by the Edinburgh publisher, Constable. This brought him great fame and he was introduced into some of the best drawing-rooms of the day.

'The Fire King", "Frederick and Alice", and "The Wild Huntsman" to "The Tales of Wonder". The most remarkable of this is "The Eve of St. John", in which the scene is laid at Smaylholme Tower, which Scott since earliest childhood had known so well.

The Baron of Smaylho'me rose with day,
He spurr'd his courser on,
Without stop or stay, down the rocky way,
That leads to Brotherstone.

---

That nun, who ne'er beholds the day,
That monk, who speaks to none—
That nun was Smaylho'mes lady gay,
That monk the bold Baron.

In December 1799, Scott was appointed Sherif of Selkirkshire. This was a small but permanent position which fetched him £ 300 a year. But all his professional duties did not hinder him from pursuing his literary pursuit, although it is a most outstanding and noteworthy fact that he never looked upon literature as his real profession. He was a man of infinite capability of application and hard work. He never wasted a single instant, and unlike most writers, scarcely ever needed to await the right mood for composition ; for, he had that sternness and determination which enabled him to utilise every vacant hour. He at the same time fulfilled his public duty and was noted for his being the most hospitable of men.

Next, he collected, annotated and supplemented with original poems, a mass of Border poetry, which was published in 1802 and 1803. He also finished "Cadyow Castle" and "The Lay of the Last Minstrel" by the year 1805. The success of the latter was immediate and immense. The public critics, brother poets, statesmen, young and old, joined in praise. Besides simplicity of narrative, this poem had a spirit and energy, which were to become the most striking characteristics of Scott's narrative poetry.

to his addresses, she married William Forbes. In 1797 Scott under the influence of this disappointment, wrote what is justly regarded as one of his purest lyrics, and from this poem it is obvious that, whether justly or unjustly he was certainly filled with bitterness and remorse.

**The Violet.**

The violet in green wood bower,
Where birchen boughs with hazels mingle,
May boast itself the fairest flower,
In glen, or copse, or forest dingle.

... ... ... ...

Though fair her gems of azure hue.
Beneath the dewdrop's weight reclining ;
I've seen an eye of lovelier blue,
More sweet through wat'ry lustre shining.
The Summer sun that dew shall dry,
Ere yet the day be past its morrow ;
Not longer in my false love's eye
Remain'd the tear of parting sorrow.

About Scott, it is often remarked that he was essentially a martial spirit. In poetry he undoubtedly loved the blaring notes of the trumpet, and pomp, pageantry and military display were his delight. So in actual life he took pleasure in the exercise of arms and joining the band of mounted volunteers for he was crippled on foot which owing to zeal for military training, had been raised for the defence of the country, remained all his life a horseman of the first order.

In 1797, when in the company of his brother, he was on a tour to the English lakes, he was introduced to Charlotten Margaret Carpenter, the daughter of Jean Carpenter of Higous, who had fled to England at the time of the Revolution, and before the end of the year married her. He and his wife settled in Edinburgh and it was at Lasswade, a neighbouring village, that Scott laid the foundations of his literary reputation. In a short time he contributed five ballads "Glenfinlas," The Eve of St. John,"

:udies ; and at fifteen, was articled ) his father. But, in 1789 he ecided to study for the Bar. He tudied law till 1792 when he was alled. Thus he became an dvocate at the age of twenty one, nd had it not been for his greatess as a writer, it is absolutely ertain that he would have attained ie highest rank in his profession.

About this time he made the rst of many visits to Hiddesdale, hich he had heard was a regular iine of border ballads and studied t first hand the poetry and eople. He was also pushing forard his studies of English and of oreign literature. He was inrested in Gray, who had introuced in English poetry a new oirit of liberty and romance, id was delighted to read Morte d'Arthur" whose tales of ı ideal chivalry and romance ılightened him. French, German d Italians were also becoming :cessible to him and he took degl1t in studying Cervantes, Tasso, riosto, and old French Chronicles. ut it was to the new romantic erman writers primarily that he ;ed so much of his own tendency.

In the 17th century poetry had :cayed through excess of liberty, through utter license of the individual to express himself with restriction. But now (18th century) poetry had become cramped and finally dead through excess of regularity and restraint. Hence, amongst the earliest men to hark back to an earlier age of liberty were Gray, Horace Walpole, Chatterton, James Macpherson, Bishop Percy, and Blake. Scott himself, who had hitherto been feeding his mind on the romantic and ballad literature, abandond himself unrestrainedly to the in admiration of the School of German dramatists, which had revived the spirit. of romance and had given full licence to individualism in poetic art.

Scott's first serious production was a translations of the "Lenore" of Burgler, entitled "William and Helen." His ballad was translated in 1795 and was published in 1796 along with his second translation, also from Burgler, called "The Chase." Merits these poems surely have, and as first productions they are most interesting.

Scott had been disappointed in love. For six years he had been in love with Margaret, daughter of Sir John Stuart of Invernay, until at last in 1796, paying no heed

to his mother, particularly from Pope's translation of Homer. In his Autobiography he states, that in 1778 he was sent to the High School of Edinburgh, but that, there he was distinguished rather amongst his fellow students for story-telling than amongst his teachers for more orthodox learning. Nevertheless he progressed steadily and these strides were marked by many a fitful flash of brilliance, so that by the time he had completed his studies, he had acquired a sound knowledge of Latin, though his Greek was almost negligible. But the study of Latin did not expel or oust English, and his reading was widening by leaps and bounds. He, in adherence to his parents' advice, left the High School and went to Kelso, where opportunities for reading were nowise lessened. As yet, however, he had been scouring over books with the aimlessness of a child, when at the age of thirteen he first fell in with Percy's "Reliques of Ancient Poetry." With regard to this incident he himself writes, "As I had been from infancy devoted to legendry lore of this nature and only reluctantly withdrew my attention from the scarcity of materials and the rudeness of those which I possessed it may be imangined but cannot, be described, with what delight I saw pieces of the same kind which had amused my childhood, and still continued in secret the Delilahs of imagination, considered as the subject of sober research, grave commentary, and apt illustration, by an editor who showed his poetical aptitude was capable of emulating the best qualities of what his pious labour preserved, ..... ..."

From his infancy Scott had heard ballads and tales of border adventure, but his appreciation had so far been unconscious. Now, instead of roaming aimlessly in the fields of literature he began to exercise choice; for, he knew well what would please his newly discovered taste for the chivalrous and the adventurous in literature.

Scott returned from Kelso soon after, in order to enter the University of Edinburgh and to prepare for his father's profession. But as at school, here also he showed a tendency to stray away from the path of serious orthodox learning into pleasant but unfrequented by-paths of romantic and antiquarian lore.

Nevertheless, he had not been totally neglecting more regular

of nature. At this very age, when all the faculties and talents spring into existence, and when the imagination can be stunted or quickened, the child was influenced by the tragic and pathetic tales of Jacobite struggles and border raids by a neighbouring farmer who visited them frequently and by his own grandmother. His aunt too amused and inspired him by reading by the hour from works of history and imagination. If we believe in theory of early impressions then none can fail to trace to these early stimuli, that ardent love of chivalry and adventure and that sympathy with external nature which are the two most outstanding characteristics of all Sir Walter's literary works.

Scott's own account of the influence and impression which his dawning fancy received from the surroundings of Sandi-Knowe and Smailholm is the strongest confirmation of the above fact.

Thus, while I ape the measure wild
Of tales that charm'd me yet a child,
Rude though they be, still with the chime
Return the thoughts of early time;
And feelings, roused in life's first day
Glow in the line, and prompt the lay.
Then rise those crags, that mountain tower,
which charm'd my fancy's wakening hour.
Though no broad river swept along,
To claim, perchance, herioc song;
Though sigh'd no groves in summer gale,
To prompt of love a softer tale;
Though scarce a puny streamlet's speed claim'd
homage from a shepherd's reed;

Yet was poetic impulse given,
By the green hill and clear blue heaven.

When Scott reached the age of four, he was taken to England, and after living for a year at Bath for the sake of the waters, he returned to Edinburgh, and afterwards for a season to Sande Knowe At Bath he had been taught to read, and now he began to appreciate books quite unaided. He spent many spare hours in reading aloud

# MY APPRECIATION OF A POET.

## SIR WALTER SCOTT AND HIS POETRY.

BY

**Abbas D. Saeed**

*XI Class.*

Lord of all moods and passions of the soul,
Whose fame abides unrivalled through the years;
Poet supreme, whose masterful control
Exhausts the record of our hopes and fears.
Beauty waylaid thy steps from day to day,
Grandeur dwelt with thee in the starry night;
While in the human mind no secret lay
Which could elude thy keen and searching sight.
Oh that a human brow a crown should wear,
Which angels view with awe, and mortals with despair.

SIR Walter Scott was born on August 15, 1771, at his father's house in an ancient quarter of Edinburgh. His father was a staid calvinist and by profession, a writer to the Signet. He was the first of his hardy race to adopt the sedentary life of a profession.

In the second year of his life Scott fell seriously ill and this illness resulted in a lameness that lasted as long as his life. No remedy was left untried. At last as part of the treatment, he was sent to live in the country at his grand-father's house, Sande-Knowe, situated near the ruined tower of Smailholm. Here Scott, who was but a child still, learnt the delights of country life, and at this early age, developed a great love of external nature. This influenced him and all his work to a great degree; for, in his auto-biography he writes, "It is here at Sande-Knowe, in the residence of my paternal grand father, already mentioned that I have the first consciousness of existence."

During summer, when the weather was quite warm and pleasant, he would be carried by the old shepherd to the sheep pastures on the knolls, and there would lie gazing at the browsing sheep or roll quite luxuriously on the green in the midst of the flock. Thus, just at the age when infancy was developing into childhood, he gained an intimate knowledge of, aspects

are sure to follow it with rapt attention. His technical knowledge of the art was deep and profound. He laboured hard before he gave anything to the public, and that is why he is one of the most faultless of English poets. There is a peculiar orderliness and system in his romantic-colouring. He may describe whatever he likes to do, but he never forsakes the 19th century England for a moment. Every other thing he employed as a back-ground on which he painted the beautiful pictures of 19th century English homes, and English parks. Creative power was not given to Tennyson, and so he fails as a dramatist. His business was to take up a picture, draw it nicely, to colour it beautifully, and in this respect he is second to none in the rank of English poets. His eye is scientific, and with this scientific eye he observes nature without turning it into something cold and matter-of-fact. Wordsworth's nature was spiritualised, while Browning's was lit up with fire, but Tennyson views Nature just as we do without giving her any supernatural power.

In 1888 he fell serously ill, and rheumatic gout was the cause of great pain for him. But by nature he was patient and courageous, and he bore all these hardships of his serious illness with great fortitude and undimnished cheerfulness. After a time he improved, but again he began to work hard at his poems. In 1889 there appeared two of his last poems "Demeter' and "Crossing the Bar." In 1891 he went out on the sea to Exmouth. In 1892 he again fell ill, and began to sink visibly. His end was apparent. On the day of his death he called his doctor, and said to him "Death?"

The doctor bowed. Again he said,

"That is well."

The room was all flooded with the brilliance of the full moon, and Tennyson passed away quietly, with one hand clasping his Shakespeare, and with the other holding his daughter-in-law's hand—and so he shifted on to the unknown. He was buried in Westminister Abbey on the 12th of October. The panel was carried by twelve of the most eminent men in England; many of whom were his own personal friends. His death was as noble, quiet, and simple as his own life was. The greatest soul of England left the shores of this world on his way to eternity both calmly and peacefully.

of word-painting is given in

"The splendour fall on castle walls
"And snowy summits old in story:
"The long light shakes across the lakes,
"And the wild cataracts leap in glory"

is decidedly an immortal piece of Tennyson's well-wrought workmanship.

For fifty years Tennyson was the acknowledged poet of England, who identified himself entirely with English ideals and aspirations. He was rightly considered to be "the poetic heir of England's aristocratic intellectual, and heroic traditions." He clung firmly to the time-honoured traditions set up by the older poets. In fact he took hold of the material left by them, and began to sing the same type of song in his own mellodious strains. He was not a poet who took up art for the sake of art as Keats did, but he gave utilitarian touch to his poems. He wanted to guide, and to inspire the nation.

He wanted to mould the public character, and to drive away the evils that existed in the social, intellectual, and political institutions of the age. He is just like the national barometer, pointing out the changes, and the moods passing over visited the mentality of the nation.

"I sing myself, and in these transcripts of my heart and mind you will find your own." This was the line adopted by Tennyson. His personal sorrows, griefs, and aspirations were the main themes of his poems. and fortunately these themselves were the sorrows, griefs, and aspirations of the whole nation taken individually. For this reason his appeal was popular, and his lines were imprinted deeply on the hearts of the whole nation. With this we should not forget that he was a perfect artist. His business was to point out to the public at large their most intimate thoughts and feelings with fascinating simplicity and remarkable accuracy. There was hardly anything new and original in what he said. He has no message to impart. His point of view was the national point of view. He was deeply well read, and he had thoroughly assimilated the ancient and the modern master-pieces of literature. He was thorougly acquainted with all that was great and noble in the civilized world. And so he seldom becomes tame and tasteless. Read any of his poems, and you

magic, that sends a holy spectral shiver through the blood." We can safely say that the last line of this passage is unsurpassed in beauty ; the phrase " long-glories " is a miracle by itself, unequalled in the whole realm of English literature for its poetic beauty.

It is absolutely impossible for us to discuss the merits and demerits of all his writings. It demands greater space, and much strenuous labour. So far we have mentioned only the important works of Tennyson, but in the end we cannot resist the temptation of saying something about his shorter poems, and particularly about"Break,Break, Break" read and loved by millions of people. The poem is very short, containing not more than four stanzas, but even there less than a score of lines contain the very height of pathos, lyricism, and skilled workmanship.

"Break, break, break,
"On thy cold grey stones, O Sea!
"And ! would that my tongue could utter
"The thoughts that arise in me."

and the thoughts that arise in the heart of Tennyson are no other than the thoughts of Hallam, with whom he had spent a most pleasant time of his life "on the cold grey stone of the sea."

The third and the fourth stanzas containing as they do

"But O for the touch of a vanish'd hand,
And the sound of a voice that is still"

and

"But the tender grace of a day that is dead
Will never come back to me"

describe in a most touching manner pathetic sense of the loss sustained by Tennyson through the unexpected death of his cherished idol and friend Hallam, and the powerful recollections he still retained in the inner most recesses of his heart, of the deep love and tenderness of his beloved friend. Few poems in English literature are so short and beantiful. Another shorter poem to which we shall like to make a passing reference is "The Brook" published in the volume of 1855. The stanza beginning with.

"I slip, I slide, I gloom, I glance
.....................

contain a magnificent picture painted with the help of beautiful words. Another glorious illustration

was haunting him long before he rose to become one of the greatest poets of England.

The allegorical basis is rather simple, the struggles of the soul of man that face his existence upon the earth are more or less clearly depicted in the story. Arthur represents the soul of the man ; Camelot, the capital, is the atmosphere in which the soul moves and acts; Guinevere is the type of beauty which every soul wishes to seize. Arthur comes and establishes his rule on the earth, and for some time there is no hitch in his way. But in due course of time he is called upon to encounter a large number of unforeseen troubles and difficulties, which do not allow him to reign with love and peace. Hostile agencies are at work, and they are silently undermining the structure of civilized society set up by Arthur. His knights that flock round him, and fight for him are the human faculties that help the soul in its development. The crash comes, and poor Arthur is mortally wounded in a battlefield, where all of his knights and followers are killed one by one, except Sir Bedivere. The soul is overpowered, and the baser elements of the self gain the upper hand. Arthur disappears from this world saying—

"The old order changeth, yielding place to new", but his faith in God is not shaken—

"And God fulfils Himself in many ways."

In the end he gives a piece of good news to the last surviving knight, assuring him that he would visit the world once more, and would eventually crush the hostile agencies that are working against him. In other words it is a bit of consolation given to the soul, impressing upon it the fact that in the long run the nobler element of the self is bound to preponderate.

Pieces like —

"The bare black chliff clang'd round him as he based,
"His feets on juts of slippery cracks, that rang
"Sharp-smitten with the dint of armed heels—
"And all a sudden lo ! the level lake,
"And the long glories of the winter moon."

in fact show the highest pitch of Tennyson's poetic excellence. "This is the kind of writing that is pure

as is usual with Tennyson, he is resplendent in his lyrics. He was in fact the master of lyric poetry. Take "Maud" to be merely a love-poem, and you are sure to value it. Tennyson has never written finer lyrics than he did in "Maud." In this poem, Tennyson has praised war from his own stand-point. He admires this institution, and calls it the purifier of social and political evils. The philosophy is defective ; Tennyson has touched only one side of the question, the other side he has completely ignored. War brings in its train plenty of blood-shed, pillage, destruction, ruin and misery. And frequently wars are unjustified and unnecessary. These questions are not touched by Tennyson at all. "Maud" is the least read book of Tennyson, but at the same time in this attempt the dramatic power of Tennyson is at its best. Though he fails to represent the actions and the inter-actions of several consistent characters, still he fairly succeeds in depicting the varying moods of a single individual who is often excited by powerful passions. Some of the lyrics that are found in this poem are the most musical expressions of ardent and sincere sentiments. With this poem were published "The Brook", "The Charge of the Light Brigade", "Ode on the Death of the Duke of Wellington", and these are the most widely read of the shorter poems of Tennyson.

The "Idylls of the King" which did not appear till 1885 was the most ambitious work of Tennyson. He took twenty-six years (1859 to 1885) to complete this long series of poems. They are twelve in number. They form an epic whole, although they are disconnected but all of them revolve round the central figure, King Arthur. The story has been further developed, and describes the story of human life, its activities and civilization in the form of an allegory. Arthur was first drawn into English literature by Malory, who carefully collected the material from the continental literature, and became the undisputed author of the story. The facts of the story have got a very faint historical back-ground. It is only as reliable as a legend, but it has attracted the attention of almost all the leading poets of England. Tennyson was deeply in love with the legend, and his "Sir Galabad", and "The Lady of Shallot" prove beyond any shadow of doubt that this cycle of stories

"A league of grass, washed by a slow broad steam,
"That stirred with languid pulses of the oar,
"Waves all its lazy lilies and creeps on,
"Barge-laden, to three arches of a bridge
"Crowned with the minister-tower"

As we have already said, "In Memorium begins with a most tragic touch. The poet has lost his kindred soul, who loved and cherished him so dearly. There is absolute darkness round about the soul. The soul is feeling its way, and often stretches out its hand for help ; but there is none to help her ; not the least glimmer of any light points out the way to be adopted by the despondent wayfarer. By and by as the poet proceeds, the curtain of darkness is lifted up, and there appear to him persons whose sympathy and love consoles his afflicted heart. In the long run he begins to place implicit confidence in the wisdom of God, and the Eternity of the soul. At first the poet did not plan out any scheme for the poem, but continued to write at random. After a considerable time he realised that all these separate independent pieces could be grouped together into an organic whole. He filled up the gaps, and hurriedly supplied the connecting links. For this reason, though the poem is a connected whole, but it is still loose, and ill-fitted at certain places. The poem has got many merits of its own, but the most outstanding attractions of the poem are its magnificent colouring, its beautiful music, and its pictorial charm. We should bear in mind that Tennyson could not achieve his artistic perfection instinctively, on the other hand he had to work hard for days and days together, carefully revising and correcting the poem, before he gave it the finishing touch.

"Maud" came after this. It is certainly much inferior to "In Memorium" in many respects. The outlandish and silly hero of the poem is such a poor creation that we are not in the least excited when he runs and becomes a most miserable specimen of humanity. That was the real place for Tennyson to display his poetic height (as is done by Shakespeare in King Lear) but God knows why he appears to be fully satisfied with his unworthy hero. Once more,

questions—why? whence? whither? how? and what for? But he does take refuge under the shadow of despondency and faithlessness; on the other hand his God-loving soul so noble in its firmness of faith turns towards the omnipotent God, who is all power and might, and the very fountain-head of what we see and feel in this world—

> "A warmth within the breast would melt
> "The freezing reason's colder part,
> "And like a man in wrath the heart
> "Stoop up and answered, 'I have felt'."

To Tennyson nature was not merely a screen of beautiful scenes and pictures; it was, on the other hand, something living, animate, and throbbing with life and vigour. Nature to him was a mysterious power keeping itself strictly aloof from the activities of the world. All the same it freely sympathises with man, and takes her adequate share in the grief and the happiness that visit man—

> "Calm is the moon without a sound,
> "Calm as to soothe a calmer grief,
> "And only through the faded leaf
> "The chestnut pattering to the ground."

Tennyson's conception of Nature is essentially different from that of Wordsworth. For Wordsworth, nature was the very incarnation of the Universal Spirit, the presence of which was felt by him both in the living world, and in the mind of man. This kinship of nature was the bed-rock of his theory of communion with nature, but this was not the view held by Tennyson. Wordsworth's theory of nature was entirely his own, shared by none, but respected by all. Tennyson was keenly alive to the beauties of nature that came within his view. Her changing moods, and complex phases are marvellously described by Tennyson in his works, but he never creeps into the land of unreality. His grasp is as limited as that of the scientist. He observes the actual fact, and the real event which can be observed by all the inquisitive men of the world. He always takes nature as the back-ground, on which the men and the women of the world move about, say what they desire to say, and do what they desire to do. So to say it is the curtain of the stage on which the drama of the world is played out.—

> "......Between it and the garden lies

It is not an easy job to find out a better piece so richly coloured and artistically picturesque. His masterly art lies in the skill with which he has woven romance and chivalry while dealing with a modern question, the education of women.

Hallam's untimely and sad death took place in Vienna in 1833. He was quietly sitting on a sofa in a hotel when suddenly a blood-vessel of his brain burst, and he died instantaneously. The elegy was published in 1850 by Tennyson, which means that the poet was working hard at the poem for 17 years continually. It is something more than a mere elegy. It is a vivid representation of his deeply-rooted religious philosophy. The social questions that were concerned with the relation of science and religion find a place in this long poem, which in fact mirrors the moods, the effects, and the changes that came upon the intellectual horizon of Tennyson. We can see how carefully the poet has mastered the recent scientific inventions, and how accurately he depicts them in his easy and graceful style. The pictorial splendour, and the personal touches which are so abundantly found in the poem make it a very charming addition to the store of English literature. It represents the keen spiritual struggle in which the soul of Tennyson was involved at the death of Hallam, and which in the long run assured the poet of the greatness of God, and the immortality of the soul. It represents the thoughts and feelings that were found uppermost in the head and heart of the average man of England in those days. Tennyson himself says :—

> "It is rather the cry of the whole human race than mine. In the poem altogether private grief swells out into thought of, and hope for the whole world. It begins with a funeral and ends with a marriage, begins with death and ends in promise of a new life—a sort of Divine Comedy cheerful at the close. It is a very impersonal poem, as well as personal. There is more about myself in Ulysses, which was written under the sense of loss, and all that had gone by, but that still life must be fought out to the end. It was more written with the feeling of his loss upon me than many poems In Memorium."

Tennyson found himself hopelessly helpless in the face of such

tion under discussion. In fact he wanted to give a romantic touch to the question of the education of women. His theory of female education is as simple as it is convincing. We infer from his writings that "maidenly delicacy" was of very great importance in the eyes of the poet, and this he wanted the women to preserve under all conditions and environments. The education according to the poet that annihilated this "maidenliness" was highly injurious and opposed to the vital interests of women. The Princess has a keen desire to acquire as much knowledge of the current sciences as possible; thereafter she wanted to set up an academy for the education of women, where she could continue to acquire and impart knowledge for the future and permanent advancement of the female masses. The Prince, on the other hand, is just like a silly lad, lecturing to her lady-love, Idia, without making any attempt to overlook the faults of her lofty ideal. The peom on the whole is lacking in dramatic interest, not a single character is powerful enough to sustain interest and arrest the attention of the reader. The story is hopelessly loose and desultory.

But in spite of the above criticism we cannot dispose off the poem so easily. It is in fact a mine of pure gold. It contains pieces of unsurpassed beauty and radiance. Its lyrical songs and descriptive sketches are sure to be admired by all those who love everything that is great and beautiful in poetry. The pictorial sketches are fascinating. In a few skilful touches the poet presents before us the happy picture of a magnificent palace with its long corridors, lofty towers, and fountain-sprinkled lawns. Also, Tennyson is highly accomplished in word-painting. He does not make an elaborate preparation to put forward the picture before us, but only with a few strokes of his artistic pen his work is completed :—

> "As one that climbs a peak to gaze
> "O'r land and main, and see a great black cloud
> "Drag inward from the deeps, a wall of night
> "Blot out the slope of a sea from verge to shore,
> "And such the building splendour from the sand,
> "And quenching lake by lake and tarn by tarn
> "Expunge the world."

faultless as far as their formal art is concerned, but there is a lack of spirit and dramatic situations. They are besides, political rather than anything else. In the first, he is at great pains to bring out the importance of the religious liberty of the individual ; in the second, he portrays the keen competitive struggle going on between the various European races; while in the last he represents the time-honoured conflict of the church and the crown. Tennyson has always been an ardent lover of Drama. He rightly believed that stage can improve the mentality of the masses if run on the right lines, and taking all these things into consideration he attempted to give to the public, plays of poetic excellence. But we should not lose sight of the fact that Tennyson had a brooding temper, lacking that liveliness and mastery of detail which are responsible for "the swift give, and take of Dramatic situation." The result was that the house is there with all the necessary furniture and other requisites, but the spirit of the house is absent; the tree is there with all its branches, leaves, and fruits, but the sap of life has been dried up, and hence the leaves are falling off, and the fruits are dropping down. This is in fact an accurate picture of Tennyson's plays. We are sorry that he should have spent so much of time and energy in these tasteless and insipid attempts. His was not a dramatic genius, and hence the plays are anything but plays. If we take away the lyrical songs and passages from these writings, their sole interest will lie in the excellence of their technique.

Tennyson's mind was always wide awake, and he freely received impressions from outside world. The chief social question of his age produced a deep impression upon him. The position of women, and the question of their higher education were matters of sharp controversy in those days in England. The social structure had rapidly undergone a great change, and with this change it was necessary to adjust the position of women, who were gradually learning to safeguard their rights and privileges. This was the topic that Tennyson discussed from his own point of view in "The Princess.' The fantastic story is "half-serious and half-sportive."

In this story Tennyson has tried to reduce to concrete forms all the elements and bearings of the ques-

# ALFRED TENNYSON.

BY

**Mr. A. Shakoor, M. A.**

*(Continued from our February Number)*

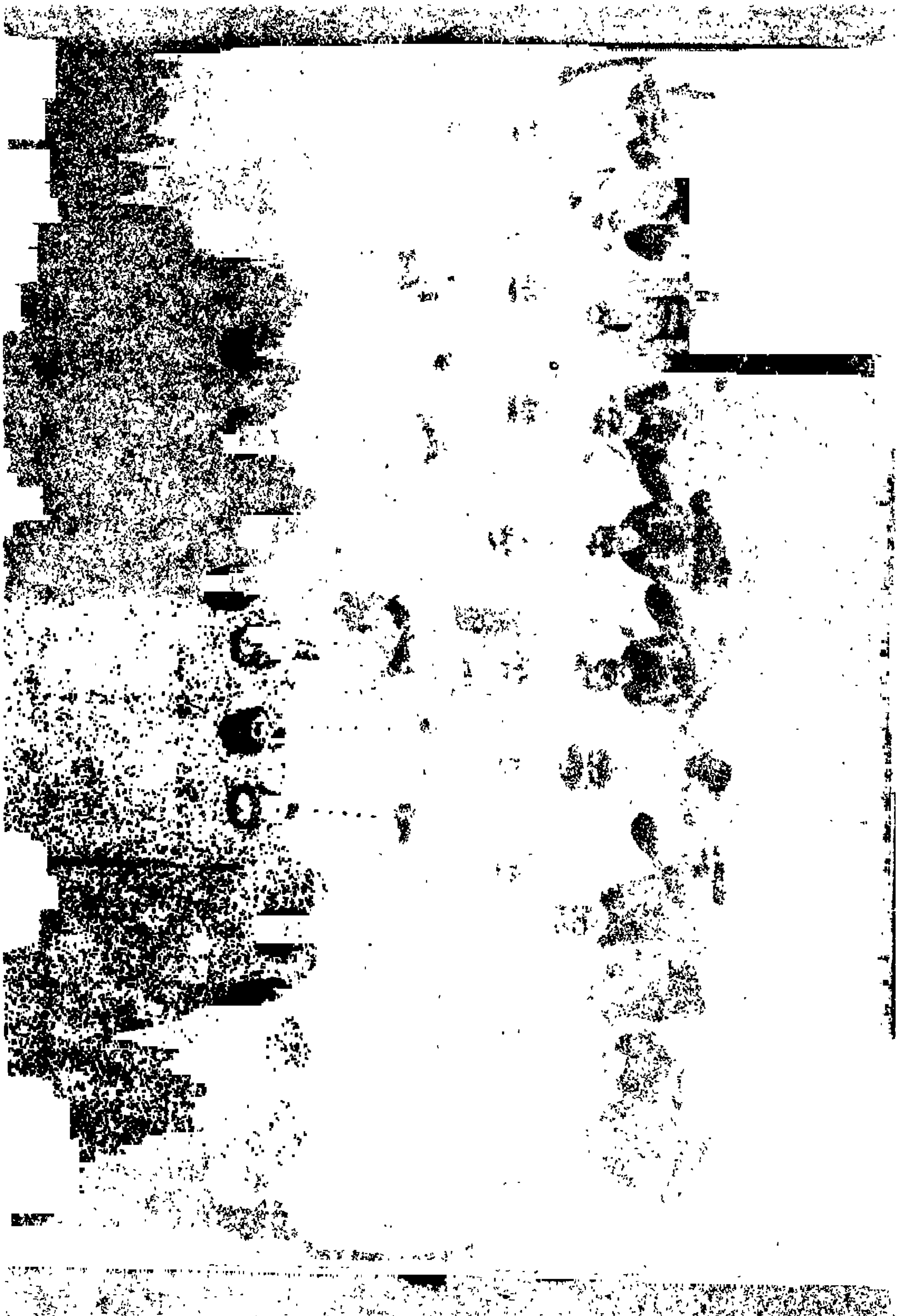
By nature Tennyson was always in need of love, tenderness, and quiet sympathy. And all these things were plentifully given to him by his sweet and cheerful wife, who nobly encouraged, and judiciously criticised his poetic output. The marriage was in every respect an ideal marriage. Tennyson was extremely fortunate in his domestic life. He himself says:—

> "The peace of God came into my life before the altar when I married her".

She was in fact the best companion for the poet. The domestic life of the family was extremely beautiful, and continued to be so till the last days of Tennyson. Soon after the marriage they travelled a great deal, but no other sight could fascinate the poet as much as the atmosphere of his own home and hearth. In 1853, he was offered the Rectorship of the Edinburgh University, and in 1855 he was made a D. C. L. by the Oxford University. Now he was living in Farringford in a quite cosy, and beautiful house with his wife and children, frequently visited by his friends, and seldom going out to see the world. In 1854 he was struggling hard at "Maud," and thereafter he began his "Idylls" that continued to engage him almost to the last days of his life.

In 1864 the Enoch Arden, and in 1865 Lucretuis were published. In 1869 he was made an "Honorary Fellow" of his Trinity College, Cambridge. In 1883 he was made a peer by Gladstone, who had become a personal friend of Tennyson. In 1886 a sharp affliction once more invaded the heart of the poet. His beloved son, Lionel, who was a young man of great ability and noble earnestness died while on his way back from India. Tennyson felt the loss very much, and says "the thought of Lionel tears me to pieces, he was so full of promise, and so young." But for this grief the pure current of his life was flowing smoothly and cheerfully.

In the closing years of his life Tennyson turned towards Drama, and published his historical triology incluring Queen Mary, Harold, and Becket in 1875. These plays are



# ALFRED TENNYSON.

BY

Mr. A. Shakoor, M. A.

*(Continued from our February Number)*

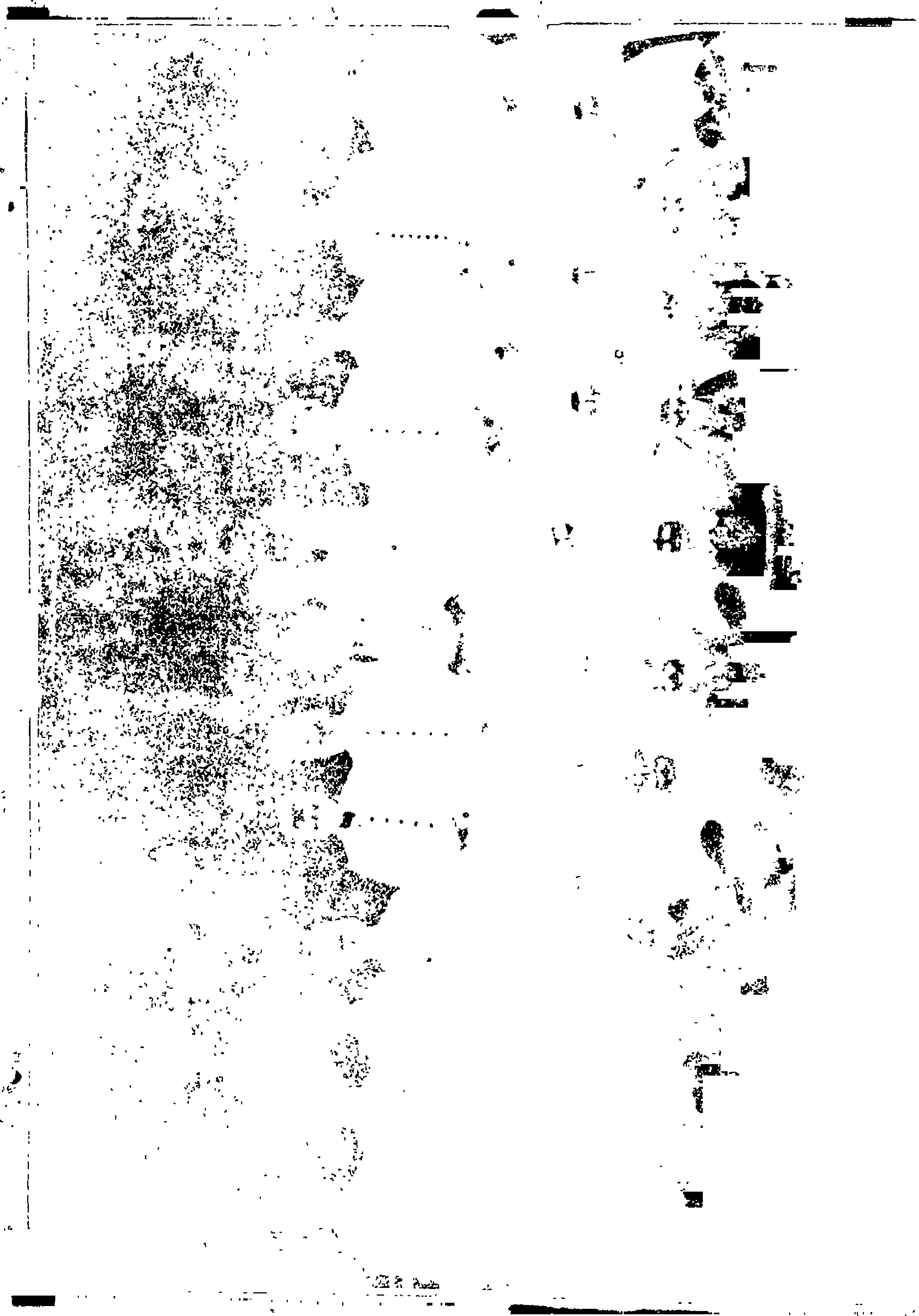
By nature Tennyson was always in need of love, tenderness, and quiet sympathy. And all these things were plentifully given to him by his sweet and cheerful wife, who nobly encouraged, and judiciously criticised his poetic output. The marriage was in every respect an ideal marriage. Tennyson was extremely fortunate in his domestic life. He himself says —

> "The peace of God came into my life before the altar when I married her".

She was in fact the best companion for the poet. The domestic life of the family was extremely beautiful, and continued to be so till the last days of Tennyson. Soon after the marriage they travelled a great deal, but no other sight could fascinate the poet as much as the atmosphere of his own home and hearth. In 1853, he was offered the Rectorship of the Edinburgh University, and in 1855 he was made a D. C. L. by the Oxford University. Now he was living in Farringford in a quite cosy, and beautiful house with his wife and children, frequently visited by his friends, and seldom going out to see the world. In 185[illegible] he was struggling hard at "Maud." and thereafter he began his "idylls" that continued to engage him almost to the last days of his life.

In 1864 the Enoch Arden, and in 1865 Lucretius were published. In 1869 he was made an "Honorary Fellow" of his Trinity College, Cambridge. In [illegible] he was made a peer by Gladstone [illegible] had become a personal friend of Tennyson. In 188[illegible] a sharp affliction once more invaded the heart of the poet. His beloved son, Lionel, who was a young man of great ability and noble earnestness died while on his way back from India. Tennyson felt the loss very much, and says "the thought of Lionel tears me to pieces. he was so full of promise, and so young.' But for this grief the pure current of his life was flowing smoothly and cheerfully.

In the closing years of his life Tennyson turned towards Drama, and published his historical triology including Queen Mary, Harold, and Becket in 1875. These plays are



## CONTENTS



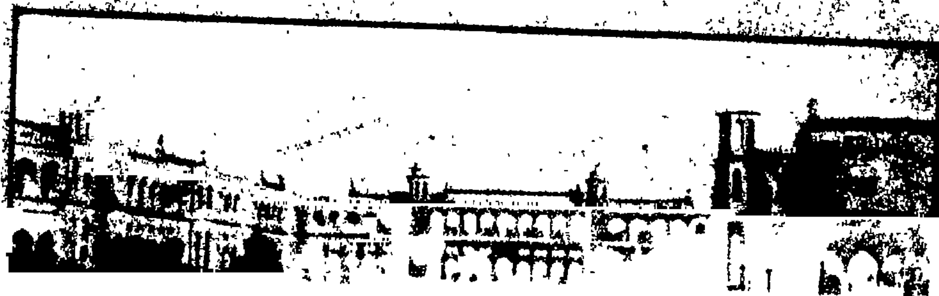


# The Intermediate College Magazine




**MARCH**
**1929**

# The Intermediate College Magazine.



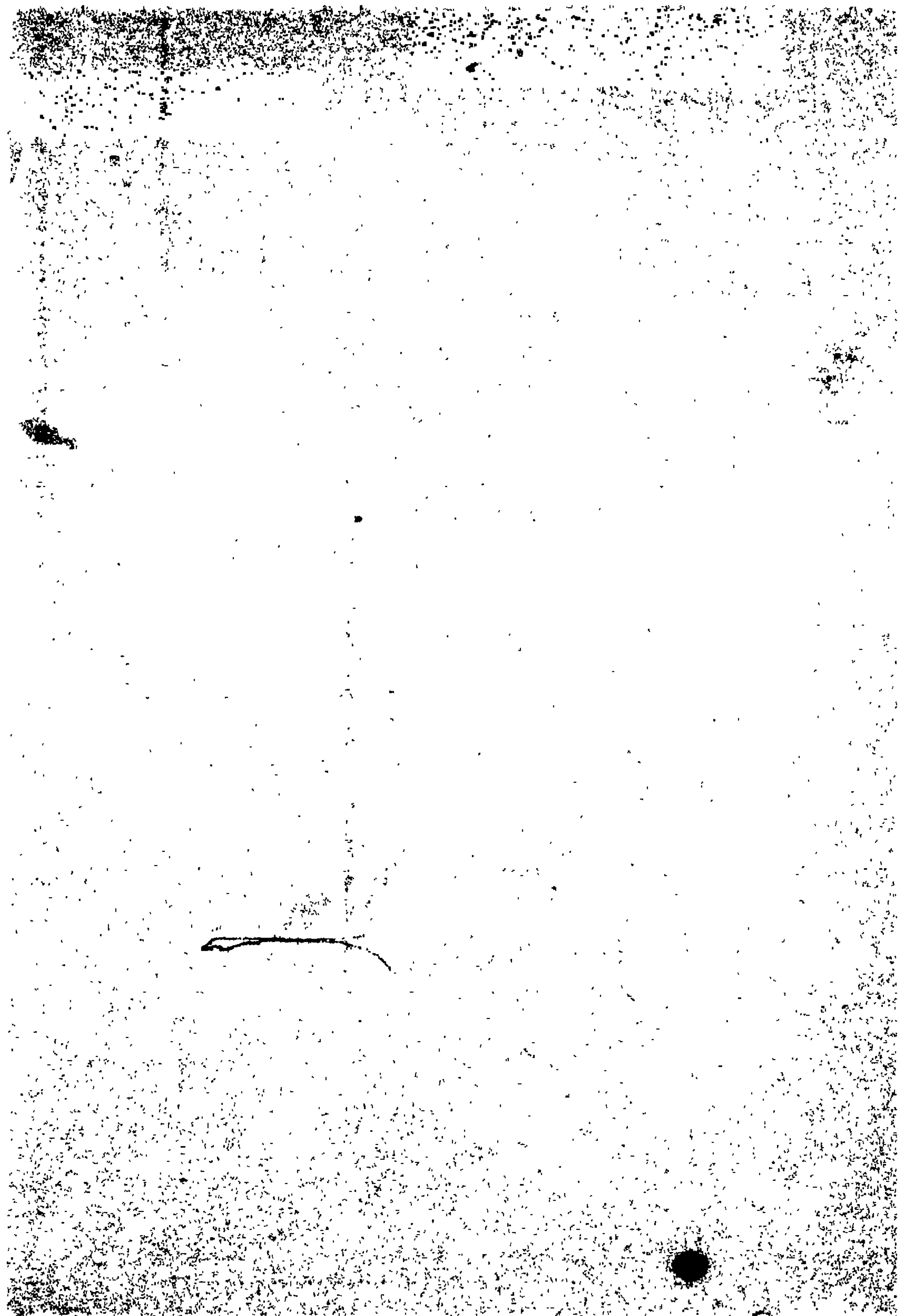
M. U. INTERMEDIATE COLLEGE, ALIGARH.

MARCH, 1929

جلد (۱) بابت [illegible]

# انٹرمیڈیٹ کالج میگزین

اڈیٹر معین الدین احمد



# فہرست مضامین

## انٹرمیڈیٹ کالج میگزین

### حصۂ اُردو

| نمبر شمار | مضمون | مضمون نگار | صفحہ |
| --- | --- | --- | --- |

# ترکی میں ذہنیت آئینی

# کا

# انقلاب

(از جناب سید نوشہ علی صاحب ایم اے)

قبل اسکے کہ وہ قانونی تبدیلیاں جو ترکی میں عمل میں آئیں معرض بحث میں لائی جائیں یہ بتا دینا زیادہ ضروری ہے کہ ترکی قانون کی بنیاد کس قانون پر ہے۔ اخباروں میں ہمنے پڑھا ہے کہ ترکوں نے سوئزرلینڈ کا قانون اختیار کیا۔ بادی النظر میں ہمارے اوپر اس کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ مگر غور کرنے کے بعد ہم نے یہ محسوس کیا کہ یہ وہ تبدیلی ہے جو اسلامی دنیا میں کبھی عمل میں نہیں آئی۔ قبل اسکے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ قانون جدید کیا ہے قانون قدیم کا علم لازمی ہے۔ ترکی میں عام قانون جو رائج تھا وہ حنفی شرح محمدی تھا بعض صوبوں میں شافعی حنبلی اور مالکی فقہ بھی رائج تھا۔ شرح محمدی کے اصول کیا ہیں اور قانون مغربی میں اور قانون مشرقی میں کسقدر فرق ہے یہ بتا دینا لازمی ہے۔

تاریخ قدیم کے محققوں نے جس میں سے (Sir Henry Maine) بہت زیادہ مشہور ہیں یہ بیان کیا ہے کہ تاریخ حضرت آدم حضرت حوا کے نزول کے وقت سے شروع ہوتی ہے اور قانون اسوقت شروع ہوا جب حضرت آدم نے حضرت حوا کو پہلا حکم دیا۔ لہذا تاریخ اور قانون میں تقدیم و تاخیر کا مسئلہ اب تک طے نہ ہوسکا۔ دنیائے قانون میں علم قانون کی دو قسمیں کی گئی ہیں۔

(۱) مغربی اصول قانون۔ مغربی اصول کے مطابق قانون ایک خاص جماعت کیطرف سے کسی خاص ملک کے باشندوں کے لئے کسی خاص وقت کے لئے جاری ہوتا ہے۔ دنیائے مغرب میں سب پرانے قانون جو انسان کی کوششوں کا نتیجہ ہیں وہ سولن (Solon) اور (Draco) کے قوانین ہیں جو یونان اور اسپارٹا کے لئے بنائے گئے تھے جب رومیوں کو عروج ہوا تو انکو اپنے قانون کی ضرورت ہوئی اور Twelve Tables of XII کا اجرا ہوا۔ چنانچہ مغربی قانون کی تین خاص خصوصیتیں یہ ہیں (۱) وہ آدمی کا بنایا ہوا ہے (۲) ایک خاص ملک کے لئے بنایا گیا ہے (۳) ایک خاص وقت کیلئے بنایا گیا ہے۔

(۲) مشرقی اصول قانون کے مطابق تمام قوانین حسن اور قبح پر مبنی ہیں۔ جو عمل حسین ہے وہ ضرور کرنا چاہئے اور جو قبیح ہے وہ ہرگز نہ کرنا چاہئے۔ دوسری بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ کونسا عمل حسین اور کونسا عمل قبیح ہے انسان کے طبائع مختلف ہوتے ہیں جو عمل ایک انسان کے لئے اچھا ہے وہ ہی دوسرے کے لئے برا ہو سکتا ہے اس لئے حسن و قبح کے صحیح معیار کا پتہ چلنا مشکل ہے اس دقت کو شارحین مشرق نے ایک خاص خوبی سے حل کیا ہے ان کا قول ہے کہ خدائے عزوجل کو برائی اور بھلائی کا صحیح علم ہے۔ جو چیز خدا کے نزدیک اچھی وہ اچھی ہے اور جو بری ہے وہ بری چنانچہ خدائے عزوجل پیغمبروں کو مبعوث کرتا ہے اور انکے ذریعہ سے برائی اور بھلائی کا علم بندوں تک پہونچاتا ہے۔ اسیوجہ سے وقتاً فوقتاً غیر معمولی اشخاص پیغمبران مرسل کی شکل میں نمودار ہوئے اور اپنی شریعت اور قانون کا اجرا کر گذرے منجملہ ان کے سات پیغمبروں کو خدا کے نزدیک خاص عظمت حاصل ہے اور ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں (۱) حضرت آدم (۲) حضرت ابراہیم (۳) حضرت داؤد۔ (۴) حضرت سلیمان (۵) حضرت موسیٰ (۶) حضرت عیسیٰ (۷) نبی آخر الزماں صلے اللہ علیہ آلہٖ وسلم۔ نبی آخر الزماں پر رسالت اور شریعت ختم ہوگئی اور دوبارہ نزول شریعت کا وعدہ نہیں فرمایا گیا ہے۔

مشرقی [illegible]ل قانون کی خاص خصوصیات حسب ذیل ہیں۔ (۱) قانون الہام و وحی کے طور پر پیمبران یا روتادوں کے ذریعہ سے انسان تک پہونچتا ہے (۲) یہ قانون تمام زمانوں کے لئے ہوتا ہے (۳) یہ قانون تمام اقوام اور ممالک کے لئے ہوتا ہے۔

یہ ہی اصول اسلامی قانون کا ہے جو رسول آخر الزماں کے ذریعہ سے قرآن شریف کی صورت میں خدا کی طرف سے نازل ہوا۔ مگر کلام مجید مخصوص طور پر قانون کی کتاب کی طرح منضبط نہیں ہے۔ لہذا آیات قرآنی کی وضاحت کے لئے حدیث کی ضرورت پیش آئی۔ کلام مجید کی حفاظت اور حدیث کی صحت کے لئے جو احتیاطیں مسلمانوں نے کی ہیں اس کا جواب تاریخ عالم میں نہیں ملتا۔ مگر پھر بھی سات ہزار سے زیادہ آیات میں سے مشکل سے پانچ سو آیات اور ہزاروں حدیثوں میں سے مشکل سے ایک ہزار حدیثیں ایسی ہونگی جن سے قانونی مطالب اخذ ہو سکتے ہیں۔ لہذا قرآن اور حدیث نے اسلامی قانون کی طرح بنیاد رکھدی مگر اسلامی فقہ کی تکمیل بہت زمانہ کے بعد عمل میں آئی۔

اسلامی فقہ میں سب سے زیادہ قابل تعریف شعبہ تقسیم اعمال ہے۔ احکام المحاسہ کے مطابق انسانی اعمال کی پانچ قسمیں ہیں یعنی فرض[۱] واجب[۲] مباح[۳] کریہ[۴] حرام[۵]۔ ان امور پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فقہ بہت آسان ہے۔ حقیقت میں اوائل زمانۂ اسلام میں شرع محمدی بہت آسان تھا اور تردید اور تکفین کا زیادہ دور نہیں تھا۔ رسول اللہ نے ایک صحابی کو ایک

صوبہ کا حاکم مقرر کیا اور ان سے دریافت کیا۔
رسول اللہ۔ کہ تم کس طرح حکومت کروگے۔؟
صحابی۔ جیسا کہ خدا نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے
رسول اللہ۔ اگر کتاب میں اسکے متعلق کچھ نہو؟
صحابی۔ جیسا کہ رسول نے حکم دیا۔
رسول اللہ۔ اگر اس کے متعلق کچھ حکم نہ دیا ہو؟
صحابی۔ میں اپنا قیاس استعمال کرونگا۔

اس مکالمہ سے یہ بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس اوائل زمانہ میں اسلام میں کسقدر آزادی تھی۔ اس کا ثبوت اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اہل قبلہ پر کفر کا فتویٰ نہیں ہوسکتا اور وہ مسلمان جو خلیفہ وقت کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے تھے وہ بھی کافر نہیں کہلائے جاتے تھے۔

سنہ ۶۳۲ء میں رسول اللہ کا انتقال ہوا۔ اسکے بعد خلفائے راشدین کا دور آیا۔ خلیفہ ثالث کے عہد میں دنیائے اسلام میں کچھ بدامنی نمودار ہوئی اور انکو انکے مکان میں شہید کیا گیا۔ خلیفہ چہارم اپنے تمام دور خلافت میں خانہ جنگی رفع کرنے میں مشغول رہے۔ مگر انکی لڑائیاں کچھ سود مند ثابت نہیں ہوئیں اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسلام میں تفرقہ پڑ گیا ہے۔ تعجب یہ تھا کہ طرفین میں بڑے بڑے صحابی اور رسول اللہ کے مقربین تھے حتیٰ کہ حضرت عائشہ بھی اس خانہ جنگی میں شریک تھیں خلفائے راشدین کے بعد بنی امیہ کا زمانہ شروع ہوا جس میں اسلام کو بہت فروغ ہوا۔ بنی امیہ کے زمانہ کے بعد بنی عباس کی خلافت شروع ہوئی۔

خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں اوائل کی اسلام آزادی میں ایک بڑی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اس زمانہ میں چار بہت بڑے فقیہ نمودار ہوئے جنہوں نے اسلامی فقہ کی بنیاد ڈالی۔ امام اعظم۔ امام شافعی۔ امام مالک اور امام حنبل نے اسلامی فقہ کی تکمیل کردی۔ ان چاروں فقیہوں نے کوئی بات نہیں پیدا کی بلکہ رسول اللہ اور صحابی کے درمیان جو مکالمہ ہوا تھا اس کی تکمیل کردی۔ یعنی یہ کہ جب کلام پاک اور حدیث کسی خاص مسئلہ میں خاموش ہوں تو کس اصول پر اپنا قیاس استعمال کیا جائے انہیں اصولوں کی تشریحوں کا نام فقہ اسلامی ہے۔

منطقی نقطۂ نظر سے فقہ اسلامی بالکل مکمل ہے۔ اور یہ بات علمائے مغرب کے لئے باعث تعجب بھی ہے انہیں اصول پر احکام خداوندی اور نبوی کے شارعین نے کئی قسمیں کیں یعنی اول وہ آیات اور حدیثیں جو بالکل صاف ہیں اور بتدریج ان آیات اور حدیثوں پر پہونچ گئے جو کسی خاص امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ پس قرآن کے خلاف کوئی کام کرنے کی اجازت نہیں اور وہاں اسکے لغوی اور لفظی معنوں کو بہت زیادہ اہمیت دی۔

مثلاً کلام مجید میں جب کفار مکہ نے رسول اللہ کو مدینہ منورہ میں جا دینے کے بعد بھی دق کیا۔ تو وہ آیات نازل ہوئیں کہ کفار کے خلاف جہاد کرنا چاہیئے۔ یہ آیات

مدنی ہیں اور تاریخی علم کے مطابق کفار مکہ کے خلاف
نازل ہوئیں۔ مگر فقہائے اربعہ نے اسکے تاریخی معنوں کی
اجازت نہ دی اور جہاد کا حکم تمام کفار کے خلاف دیدیا۔
اسی طرح سے جہاد فی القلم و جہاد فی النفس کا راستہ بھی
بند کر دیا کہ یہ سب اس کی اصطلاحی صورتیں ہیں ۔
یہ سب پابندیاں اس اصول کے ماتحت ہیں کہ خدا
عالم مطلق ہے اور انسان کا علم و عمل اس کے آگے ہیچ ہے
صرف ایک راستہ قانونی تبدیلی کا کھلا ہوا تھا وہ اجتہاد
علما تھا۔ تمام راستے اجتہاد کے بند تھے تو علما جو کہ نائب
رسول تھے ان کو اختیار تھا کہ کسی خاص مسئلہ کے متعلق
کسی وقت کے لئے اپنا فتوے دے سکیں۔

فقہائے اسلام کے سات مدارج ہیں صف اوّل
تو چار فقیہ آتے ہیں جن کا ذکر اوپر لکھ آیا ہوں۔ صف دوئم
میں وہ فقیہ جنکو فقہائے اولین کی تقلید لازمی ہے مگر کچھ
اجتہاد کا حق بھی حاصل ہے اسی طرح سے علمائے وقت کے
سات درجہ فقہا کے ہیں۔

اجتہاد کا دروازہ شریعت اسلام میں کب اور
کیوں بند ہوا؟ اس تحقیق کے لئے تاریخ اسلام کی ورق
گردانی کرنی پڑیگی۔ اس سے پہلے یہ بتا دینا زیادہ اچھا معلوم
ہوتا ہے کہ ہر مذہب میں بانی مذہب کے انتقال کے کچھ
زمانہ کے بعد علماء میں اس بات کا شوق پیدا ہو جاتا کہ
مذہب کی باقاعدہ پابندی کے لئے کچھ قواعد بنائے جائیں
مذہب کو انسان کی جدت پسند طبیعت کے حملہ سے محفوظ
رکھیں۔ چنانچہ عیسائی مذہب میں بائبل حضرت عیسٰی کے
انتقال کے ایک مدت کے بعد مرتب ہوئی ہندو مذہب
میں منوں کے قانون ویدوں کے نمودار ہونے کے
بہت مدت کے بعد مرتب کئے گئے اسی طرح اسلامی فقہ
کی ترتیب رسول اللہ کی وفات کے ڈیڑھ سو برس
بعد ہوئی۔ اسلامی فقہ ہر طرح سے مکمل ہیں اور اسوقت
تک حکمائے یورپ اس کی منطقی تکمیل کو دیکھ کر دنگ
رہ جاتے ہیں خدا کی کتاب اور رسول اللہ کے کلام کو
اصول فرض کر لیا گیا ہے اور اس میں سے سینکڑوں
فروعی مسائل نکالے گئے ہیں جو انسان کے لئے ہر شعبۂ
زندگی میں مفید ثابت ہوتے ہیں اور جن کو دیکھکر
بیسویں صدی کے فقہائے محو حیرت ہو جاتے ہیں۔
نویں صدی عیسوی میں فقہائے اسلام نے انسان
کے انفرادی حقوق کی حفاظت کی اور اس کی ذاتی
جائیداد اور اس کی جان کو خدا کی امانت تسلیم کر کے اسکو
حفاظت ہر بادشاہ وقت پر فرض کر دی جن سیاسی
مسائل کے طے کرنے میں ہابس (Hobbes) اور لاک
(Locke) کو سترویں اور اٹھارویں صدی میں
دقت پیش آئی اور جن کے حصول لے لئے فرانس اور
اس کے بعد یورپ میں ۱۷۸۹ء سے ۱۸۴۸ء تک لاکھوں
جانوں کا خون ہوا۔ مسئلہ خلافت کے ذریعہ سے طے
کر دیا۔ خلافت دراصل بادشاہ اور رعیت کے درمیان
ایک عہد ہے۔ خلیفہ کے لئے کچھ حدود و شرائط مقرر کر دیں

تھیں جنکی پابندی اسپر فرض ہے اور رعایا کو اسکی
فرمانبرداری لازم مگر خلیفہ وقت کے حدود کے باہر ہوتے
ہی ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کو جس طرح سے ہو سکے
راہ راست پر لائے اور اگر نہ ہو سکے تو معزول کر دے۔
ایسی حالت میں خلیفہ کے خلاف بغاوت جائز ہے۔ خلافت
کسی خاندان یا قوم کا اجارہ نہیں ہے جو شخص خلیفہ کی خصوصیات
رکھے اس کو خلیفہ مان لیا گیا۔ اسی طرح ان فقہائے اسلام
نے قانون جنگ کو ایسا منضبط کر دیا کہ جس کو دیکھ کر حامیان
جنگ عظیم کو شرم آنی چاہئے۔ اسلام نے دشمن کی عورتوں
کے ساتھ زیادتی کرنے سے منع کیا ہے اور جب دشمن
ہتھیار رکھ دے اسوقت اس پر زیادتی منع ہے۔ انہیں
فقہا نے مذہبی آزادی کی بھی ہدایت کی ہے۔ جو مظالم
مہذب یورپ میں اکیسویں صدی میں ہوئے۔ (یعنی
انگلستان میں ایک عرصہ تک وہ شخص جو رومن کتھولک
ہو پارلیمنٹ کا ممبر نہیں ہو سکتا تھا۔ فرانس میں پروٹسٹنٹ
پر ظلم۔ اسپین میں تاری عدالتوں Court of [illegible]
کا قیام مہذب اقوام کے لئے ہمیشہ باعث ننگ رہینگی۔
مسلمانوں نے جزیہ کے ادائیگی کے بعد ہر قسم کی آزادی
دی تھی کہ غیر مسلموں کو فوجی خدمات سے بھی آزاد کر دیا اور
اُن کی حفاظت کا ذمہ لیلیا۔ چونکہ اسلامی فقہ ہر حیثیت سے
مکمل تھا اس لئے مسلمانوں نے اُسے اختیار کیا اور اجتہاد
کی ضرورت نہ سمجھی اور اس کا دروازہ بند کر دیا گیا۔
اجتہاد کا دروازہ بند کرنیکی دوسری وجہ وہ انقلابات
عظیم ہیں جو اسلام پر تیرھویں صدی میں نازل ہوئے۔ یہ
خلافت عباسیہ کی ایرانیوں سے موالات اور عربوں
سے مخالفت شامل تھی یہ باتیں طاقتور اور روشن دماغ
خلفاء کے عہد میں دبی اور چھپی رہیں۔ مگر جب اساس خلافت
کمزور ہو گئی تو خلفاء کو ایک ایسے گروہ کی مدد مانگنی پڑی جو
نہ عرب ہوں نہ ایرانی اور جو خلیفہ وقت کے مطیع اور فرمانبردار
ہوں یہ جماعت ان ترکوں کی تھی جو حال ہی میں مسلمان
ہوئے تھے بہادر قوی ہیکل اور پیدائشی سپاہی تھے۔ لہذا
قایم بامر اللہ کے عہد میں بہت سے ترک خلافت عباسیہ میں
داخل ہو گئے۔

دوسری مصیبت جو مسلمانوں پر نازل ہوئی وہ
تاتاریوں کا حملہ تھا جس نے اسلامی سلطنتوں کی بنیاد کو
تہ و بالا کر دیا چنگیز خاں نے سلطان محمد اور اس کے بیٹے
جلال الدین خوارزمی کی سلطنت کو تباہ کر دیا۔ ہلاکو
خاں نے ۱۲۵۸ء میں بغداد کا تختہ لوٹ دیا۔ امیر تیمور نے
بایزید یلدرم کو ۱۴۰۲ء میں انگورا پر شکست فاش دی۔
ان مصائب کا اثر مسلمانوں کی ذہنیت پر ویسا ہی ہوا
جیسا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں۔ یعنی مسلمان
ایسے خائف ہو گئے کہ ان کو اپنے اوپر بھروسہ بالکل نہ رہا
اُن میں سے ایجاد و اجتہاد کی روح بالکل غائب ہو گئی
اسلامی سلطنتیں قائم تو ہوئیں مگر اس میں پہلی سی بات نام کو
نہ تھی پس مسلمانوں نے نہ صرف اجتہاد کا راستہ بند کر دیا
بلکہ اس کو ایک جرم قرار دیدیا۔ چونکہ ترکوں کا عروج

اسلامی سلطنتوں کے تباہ ہونیکے بعد ہوا لہذا انہوں نے فقہ اسلام کو تسلیم کرکے اس کی اندھی تقلید شروع کردی فقہ اسلام کا ایک جز علماء کی جماعت کا قایم کردہ ہے ہمیں تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جس قدر اس جماعت کا زور ترکوں کے دور میں ہوا اتنا کسی عہد میں نہیں ہوا۔ یہ زور صرف مصطفےٰ کمال پاشا بانی جمہوریہ انگورا نے توڑا۔

اس وقت اس بات کا بیان کرنا کہ ترکوں کو علماء کی جماعت سے نفع پہونچا یا نقصان اس مضمون کو بہت طول کردیگا۔ مگر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ علماء نے ہمیشہ اصلاحات کی مخالفت کی۔ یورپ میں جنگ سی سالہ [illegible] کے بعد بہت سی نئی باتیں فوجی قانون میں داخل ہوئیں ان کو داخل کرنا تمام سلاطین آل عثمان نے اپنا فرض سمجھا۔ مگر علماء نے ہمیشہ ان کی مخالفت کی۔ ترکوں کو جسقدر زحمتیں عیسائیوں کے خلاف اوٹھانا پڑیں انکی وجہ انکی فوجی کمزوری تھی۔ ترک سپاہی ہمیشہ بہادر رہا مگر یورپ کے نئے جنگی قواعد سے ناآشنا۔ [illegible] مارٹین لوتھر نے اپنے ایک خطبہ میں کہا ہے کہ جتنی شکستیں عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف ہوئی ہیں انکے ذمہ دار پادری ہیں۔ یہ ہی [illegible] کے بعد ترکوں کے متعلق کہا جا سکتا ہے البتہ لفظ "پادری" کو "علماء" سے بدلنا پڑیگا۔ سلطان سلیم ثالث کو ۱۷۹۸ء و ۱۸۰۱ء میں جو مصیبتیں پیش آئیں اُن کا بیان کرنا بے سود ہوگا۔ ایک طرف تو فرانسیسیوں نے ترکوں کو دبا رکھا تھا انگریزوں نے اسکندریہ پر قبضہ کر لیا تھا اور انگریزی بیڑا مخالفانہ طور پر دردانیال میں داخل ہونیکی کوشش کر رہا تھا روسی شمال سے ترکوں پر حملہ کر رہے تھے اور سلطان سلیم ثالث اصلاحوں کی ابتداء اور دشمنوں کی مخالفت پر کمربستہ تھا مگر علماء فتوۂ تکفیر کی ترتیب میں ہمہ تن مشغول تھے۔ سلیم کو ۱۸۰۷ء میں اپنا تخت چھوڑنا پڑا اور اپنے وزراء کے سر قربان کرنے پڑے۔ سلطان محمود دوم نے ۱۸۰۸ء میں کچھ اصلاحات کرنیکی کوشش کی۔ مگر علماء نے مخالفت کی وزیر اعظم کا محل جلا کر خاک سیاہ کردیا۔ وزیر اعظم مارا گیا قسطنطنیہ میں کشت و خون کا بازار گرم ہوگیا یہ وہ زمانہ تھا جب نپولین اعظم اور زار اسکندر کے درمیان ٹلسٹ کے مقام پر ترکوں کی سلطنت کا حصہ بانٹ کرنیکے متعلق عہد نامہ ہوا تھا۔ ترکوں کو سروِیہ میں شکست فاش ہوئی اور ریاستہائے ڈینیوب سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اسی زمانہ میں نجد میں وہابیوں کا عروج ہوا اور محمد علی پاشا والی مصر نے شام پر قبضہ کر لیا۔ غرضیکہ ترکوں کو ہر سمت سے شکست ہی کا سامنا کرنا پڑا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان محمود ثانی نے جنیسری فوج کو تباہ کرنے پر کمر باندھ لی اور جبتک کہ چالیس ہزار جنیسری اور انکے بچوں کو قتل نہ کر دیا آرام نہ لیا۔ سلطان عبدالمجید ۱۸۳۹ء نے اصلاح کرنیکی کوشش کی اس کو بھی ان ہی مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور اسکے جانشین سلطان عبدالعزیز کو روسیوں نے شکست فاش دی اور عہد نامہ برلن ۱۸۷۸ء میں ترکوں کو بہت نقصان

پہونچا۔ سلطان عبدالحمید خاں نے جبکہ (پان اسلامزم)
کا خواب دیکھا تو علماء کی خوشامد کو لازمی سمجھا۔ عبدالحمید
خاں موجودہ ترقیات کے خلاف تھے اور اُن کی ذات سے
نوجوان ترک پارٹی کو بہت نقصان پہونچا مگر انہیں علماء
کی مدد سے عبدالحمید خاں تخت سے معزول کئے گئے ۱۹۰۹ء [illegible]
میں جب غازی انور پاشا نے کچھ اصلاحات فوجی کرنا
چاہئیں تو ایک نہایت طوفانی ہنگامہ برپا ہوگیا جس میں
بہت سے جدید ترکی افسر کام آئے اور انور پاشا کو اپنی
اصلاحات واپس لینا پڑیں۔ ان علماء سے پورا پورا
انتقام مصطفٰے کمال پاشا نے لیا جس کا ذکر ہم آگے کرینگے۔

ترکوں نے اپنا مذہب اور اسکے اصول عربوں سے
حاصل کئے۔ یہ ایک بالکل تاریخی اتفاق ہے کہ ترک سلطنت
اسلامیہ میں اس وقت داخل ہوئے جب انحطاط شروع
ہوگیا تھا اور جملہ امور و اصول دینی میں اندھی تقلید
شروع ہوگئی تھی محققین کی ہمتیں پست تھیں اور کسی میں
اتنی جرأت نہ تھی کہ جادہ شریعت سے ایک قدم بھی باہر
نکال سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ترک حنفی المذہب ہیں۔ اس
احسان کے علاوہ ترک عربوں کے اور کسی طریقہ سے
(احسانمند نہیں ہیں۔ اور نہ ان میں کوئی باہمی مشابہت و
اشتراک ہے مورخین یورپ کی ایک عام گمراہی یہ ہے
کہ جب مذہب اسلام کا ذکر کرتے ہیں تو عرب۔ ترک۔
مور اور ایرانی کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں اور عربی۔
فارسی اور ترکی زبانوں میں کچھ فرق نہیں سمجھتے۔ عرب

اور ترک باہمی اتنے ہی مختلف ہیں جتنے کہ ساکنان سوئیڈن
اور اٹلی۔ اور انکی زبانوں میں بھی اُسیقدر اختلاف جسقدر [illegible]
اور انگریزی زبانوں میں فرق پایا جاتا ہے اُن میں صرف
حروف تہجی مشترک ہیں۔ جو تعلق کہ یورپ میں رومیوں
اور یونانیوں کا رہا ہے وہ ہی مشرق میں ترکوں اور عربوں کا
رہا۔ ترکوں میں عربوں کی سی زباندانی اور مشکل علوم سے
آگاہی بالکل نہیں مثلاً ترک علم الہیات سے اتنا ہی
بے بہرہ ہیں جتنا کہ منطق و فلسفہ سے۔ اسی لئے ترک اپنی
زبان کی شاعری کو زیادہ ترقی نہ دیسکے۔ ترکوں نے عباسی
خلیفہ کی ایسے ہی مدد کی جیسے مغرب میں سوئیزرلینڈ
کے باشندوں نے ملوک یورپ کی جان
کی حفاظت کی۔ اپنے سردار کا حکم ماننا ان کا فخر رہا اسلئے
یہ عربوں کی فرقہ وارانہ کارروائی سے ہمیشہ متنفر رہے۔
انکے طرزعمل نے ان کو اس بات پر مجبور کیا کہ علاوہ
کلام الٰہی اور کلام رسولؐ کے اپنا سردار کا حکم ماننا بھی اپنا
فرض سمجھیں۔ لہذا اس کا عقیدہ یہ بھی ہوگیا کہ علاوہ الہامی
احکام کے ایسے احکام بھی ہو سکتے ہیں جن کو سردار واقعات
تاریخی سے مجبور ہوکر ایک خاص گروہ کے لئے اور ایک خاص
وقت کیلئے جاری کرتا ہے۔ عربوں نے اپنے سردار کو امام
سمجھا اور اس میں دونوں دینی اور دنیوی پہلو شامل ہوگئے
ترک اپنے سردار کو لفظ "سلطان" سے تعبیر کرتے ہیں اور اسکا
ماہر علوم دینی ہونا ضروری نہیں سمجھتے عربوں نے صرف
خدا اور اسکے رسول کی اطاعت پر انسان کو مجبور کیا۔

پھر اس کو آزاد کر دیا۔ اس آزادی کا لازمی نتیجہ خانہ جنگی
اور خلیفہ وقت کے خلاف بغاوت تھا۔ مگر ترک اپنے
سردار کے نہایت مطیع اور فرمانبردار سپاہی رہے اس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی سلطنت بہت عرصہ تک قایم رہی اور
بفضلہ اب تک موجود ہے۔ ترکوں نے سات سو برس تک
باوجود عیسائیوں کی سخت مخالفت کے یورپ کے ایک
حصہ پر حکومت کی، اور اب بھی یورپ کا ایک حصہ انکے
قبضہ میں ہے۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ سمجھ لینا کہ ترکوں نے اسلامی
احکام کی مخالفت کی اور علما کو حقیر سمجھا۔ بالکل غلط ہے
اسلام چونکہ ان کے سردار کا مذہب تھا اس لئے ان کا
یہی مذہب ہو گیا مگر علما کے طبقہ کو انہوں نے ایک محکمہ
کی سی اہمیت دی اور ان کی اسی طرح اطاعت کی جس طرح
کہ وہ اپنے کسی "پاشا" یا "بے" کی کرتے۔ عربی زیادہ نہ تو
انہوں نے سیکھی اور نہ اسکے سمجھنے کی کوشش کی۔ ایسا
مذہب جو عالمگیر مساوات کا حامی ہو اور جو اپنے بزرگوں
اور افسروں کی اطاعت و فرمانبرداری کی تعلیم دے۔
ان کو بہت پسند آیا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ علما کو فروغ جتنا کہ
ترکوں نے دیا اتنا اور کسی مسلمان سلطنت میں انکو نصیب
نہ ہوا مگر یہ طبقہ بالکل الگ رہا اور کبھی دنیادار لوگوں میں
شریک نہیں ہوا۔ مگر ان میں بھی انہوں نے قومی مدارج
قایم رکھے۔ مثلاً (۱) سوختہ (۲) دانشمند۔ (۳) عالم اور
یہی علما قاضی مفتی اور شیخ الاسلام کے درجہ تک پہونچے
مگر شیخ الاسلام ہمیشہ سرکاری نوکر رہا۔

ترکوں نے علم فقہ میں ایک جدت دکھائی۔ عرب
ذہنیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قانون خدا کیطرف
سے ہے اور حکومت خلیفہ کی طرف سے اور علماء اسواسطے
ضروری ہیں کہ وہ قانون الٰہی کے مطالب واضح اور تفسیر
بیان کر سکیں لہذا تمام عربی عہد حکومت میں ایک بھی قانون
اور ضابطہ مرتب نہو سکا عرب لوگ لفظ قانون کے مفہوم
سے ہی بے بہرہ رہے۔ صرف ترکوں کے عہد میں ایک ایسا
قانون نظر آیا جو الہامی نہ تھا اور جس کو ایک بندۂ خدا نے
اپنی رعایا کے لئے مرتب کیا تھا۔ ایسے قواعد کو ہم اپنی
سہولت کے لئے لفظ "قانون" سے تعبیر کرتے ہیں تاکہ لفظ
شرع سے اس کو ممیز کر سکیں۔ ترکوں نے اجراء قانون میں
اسلام کی خلاف ورزی نہیں کی۔ چار بڑے ائمہ اسلام
اور امام ابو یوسف کی تقلید کی۔ ایسا اکثر دیکھا گیا ہے
کہ علماء وقت نے موقع اور محل کے مطابق اپنی رائے کا
اظہار کیا اور اس میں ملک اور خلیفہ وقت کی بہبودی
مد نظر رکھی ایک مثال دیکر میں اس کو صاف کرونگا
خلیفہ المامون کے وقت میں فرقۂ معتزلیہ کو بہت عروج ہوا
اور بہت سے جوشیلے علماء کو سخت تکالیف پہونچیں۔
یہی رویہ معتصم اور واثق کا رہا مگر متوکل نے جو عربوں کا
نیرو صاحب کہلاتا ہے معتزلہ پر بہت جور و ستم کئے
ان خلفا کا علماء وقت نے ہمیشہ ساتھ دیا۔ اس سے یہ
نتیجہ نکلتا ہے کہ علماء وقت اور موقعہ کے مطابق قوانین

اسلام کی تفسیر کرنے پر قادر رہے۔ اس کے علاوہ جب بھی علما کے دو گروہ میں اختلاف پیدا ہوا تو خلیفہ کو یہ اختیار رہا کہ جس گروہ کی وہ چاہے تقلید کرے اور دیگر علما اسکی رائے پر عمل کرنے پر مجبور رہے۔ ترکوں نے اس اختیار کو جو مذہباً خلیفہ کو دیا گیا تھا ہمیشہ نہایت دانشمندانہ اور معقول طریقہ سے استعمال کیا۔ مثلاً جب سلطان سلیمان "قانونی" نے عیسائیوں کو مراعات (Capitulations) عطا کیں تو ان مراعات کو اسلام کے مطابق تعبیر کیا گیا اور یہ مراعات لفظ "امان" کے دائرہ میں لائی گئیں جنکے شرع شریف کی رو سے غیر مسلم جائز طور سے ہر زمانہ میں مستحق مانے گئے ہیں۔

شرع محمدی خلیفہ کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ جب وہ غیر مسلم غنیم سے صلح کرے تو اپنے اختیار تمیزی کو استعمال کرسکتا ہے۔ اس کے لئے کوئی ہدایات نہیں ہیں البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول کے احکامات کے حد کے اندر رہے۔ اس کی مثالیں خلیفہ ثانی کے عہد سے بے شمار ملتی ہیں کہ انہوں نے یہودیوں اور عیسائیوں سے تجارتی عہدنامے کئے جن کا تعلق سیاست اور مذہب سے بالکل نہیں۔ لہذا سلاطین ترکیہ نے بھی خلیفہ ثانی کی مثال پیش نظر رکھ کر عیسائیوں سے تجارتی عہدنامے کئے۔ سلیمان اوّل نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اس نے قوانین شائع کئے یعنی ایسے قانون جو صرف ترکوں کے ملک میں ایک خاص وقت تک جاری رہے۔ سلیمان "قانونی" نے تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ قانون تعزیرات کی ترتیب دی اور بہت سی ایسی سزائیں جو وقت کے لحاظ سے زیادہ سخت تھیں خارج کردیں مثلاً چوری کی سزا شرع محمدی کے مطابق ہاتھ کاٹنا ہے سلیمان نے صرف بہت سنگین موقعوں پر اس سزا کو روا رکھا اور جج کو اپنا اختیار تمیزی استعمال کرنیکی اجازت دیدی۔

بیسویں صدی کے مقننین کو قانون تعزیرات کی صلاح ایک معمولی بات معلوم ہوگی۔ مگر جب وہ یہ غور کرینگے کہ ایک مسلمان بادشاہ قانون خدا کے خلاف ترمیم پیش کر رہا ہے تو ان کو بھی یہ ایک خطرناک تجربہ معلوم ہوگا۔ مگر سلیمان اوّل خود بہت با قتدار بادشاہ تھا۔ اسکے علاوہ اسکے علما چونکہ ترک تھے اس لئے انکی ذہنیت بھی ترکی تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ ان کا "خان" تمام قانونی تبدیلیاں "سیاست" کی بنا پر کر رہا ہے اور اس سے مطلب مذہبی ہتک یا عدم احترام نہیں ہے، پس اس زمانہ سے وہ متوازی قانون ترکی میں ہوگئے اوّل "شریعت" یعنی قانون خدا اور دوسرا "قانون" یعنی وہ ترمیمیں جو انسان نے اپنی ضرورت کے مطابق ترتیب دیدیں شرع اور قانون میں کوئی مخالفت نہ ہوئی کیونکہ سلطان ہمیشہ آل عثمان رہا اور علماء ہمیشہ ترک رہے۔

سترھویں صدی عیسوی سے سلطنت ترکی کا

زوال شروع ہوتا ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں ترکوں کو فاش شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسٹریا ۔ روس اور یونان کے پردے میں تمام یورپ انکا دشمن ہوگیا اور ترکوں کو بہت سے صوبے روس اور اسٹریا کو حوالہ کرنے پڑے۔ انیسویں صدی میں ترکوں کو اور زیادہ نقصان ہوا۔ بغاوت یونان ۔ سرکش محمد علی شاہ "والی" مصر۔ فتنہ ابن سعود غرضکہ تمام آفات بیرونی و اندرونی کا ایک طوفان کی طرح اُبل پڑیں۔ سلطان عبدالمجید کے پیش نظر دو امور تھے۔ اوّل تو روس کی حمایت جس نے وعدہ کیا تھا کہ اگر روسیوں کے ساتھ مراعات کی گئیں تو روس بقائے ٹرکی کا حامی ہوجائیگا۔ دوسرے انگلستان اور فرانس نے اس بات کا وعدہ کیا تھا کہ اگر سلطان نے چند قانونی اصلاحیں اپنے ملک میں کرلیں جس کی وجہ سے بیرونی ممالک کے باشندے ایک حد تک سلطنت ٹرکی میں محفوظ ہوجائیں تو ہر دو دوَل ٹرکی کی حمایت کرینگی۔ سلطان عبدالمجید کو دونوں فریقوں کا اچھی طرح تجربہ تھا انہوں نے یہ خیال کیا کہ انگریز اور فرانسیسی نسبتاً زیادہ قابل اعتبار ہیں لہذا انہوں نے نفاذ اصلاح کا وعدہ کرلیا۔ انہوں نے خط شریف ہمایوں ۱۸۳۹ء میں اعلان کیا اور خط ہمایوں کا اعلان ۱۸۵۶ء میں ہوا۔ ان اعلانات کے رو سے بیرونی ممالک کی کل رعایا کو ترکوں کے مساوی حقوق ملے۔

شرعاً سلطان عبدالمجید کے اوپر کوئی اعتراض نہو سکا کیونکہ یہ سب مراعات "امان" کے تحت میں آگئیں لیکن سلطان نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اپنے تجارتی قانون کا بھی نفاذ کردیا جس میں اس روپیہ پر جو تجارت میں لگایا جائے سود لینا جائز قرار دیدیا گیا تھا۔ اسی طرح سے قانون تعزیرات میں بھی بہت سی ترمیمیں کیں مثلاً چوروں۔ زانیوں۔ شرابیوں اور ڈاکوؤں کی سزاؤں میں بہت تخفیف کردی۔ سلطان نے مشترک عدالتیں قائم کیں جس میں یہودی عیسائی اور مسلمان جج ایک ہی جگہ بیٹھ کر مقدمہ فیصل کرتے تھے۔ سلطان محمد فاتح اور سلطان سلیمان اوّل کو بھی اپنے زمانہ اقتدار میں کبھی اتنی جرأت نہیں ہوئی جتنی کہ سلطان عبدالمجید کو زمانہ انحطاط میں۔ مگر علماء نے اس کو برداشت کرلیا یہ سب ٹرکی ذہنیت کا نتیجہ تھا علماء نے سمجھا کہ تعزیری قانون کا تعلق پولیس سے ہے اور اسلام میں سلطان پولس کا افسر اعلیٰ مانا جاتا ہے لہذا قوانین پولیس میں سلطان خود مختار ہے اور یہ مداخلت علماء سے بے نیاز اسی طرح قانون تجارت میں بھی چونکہ سوداگروں کا تجارت سے تعلق ہے نہ کہ مذہب سے اس لئے سلطان خود مختار ہے۔ مگر شیخ الاسلام ہمیشہ باب عالی میں اور ٹرکی "دیوانوں" (مجالس مشاورت) میں شریک رہا اور ہمیشہ اپنے دستخط تمام احکام سلطانی پر کرتا رہا علماء کی وقعت ترکوں میں ہمیشہ ہوتی رہی اور ان ترمیموں سے ان کے اثر میں کچھ فرق نہ آیا۔

۱۸۷۸ء میں عہد نامہ برلن سے ترکوں کو بہت نقصان پہنچا

بہت سے صوبے مثلاً بلغاریہ۔ سرویا۔ وغیرہ آزاد ہو گئے۔
سلطان عبدالحمید خاں نے محسوس کیا بغیر بیرونی مسلمانوں کی
مدد کے ٹرکی کی بقا محال ہے لہذا انہوں نے پان اسلامک
تحریک کی بنیاد ڈالی۔ اس کا خیال تھا کہ جملہ مسلمان عالم کو
ایک ہی خیال کا کر لیا جائے تو دشمنان اسلام کا بہت
اچھی طرح مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ
دشمنان اسلام کے لئے یہ ایک بہت سخت دھمکی تھی اور
اور تمام دول یورپ کو اس کی فکر ہو گئی۔ مثلاً ہندوستان
کا ایک مسلمان شاہنشاہ انگلستان کے مقابلہ میں سلطان
روم کی مدد کرنیکو فوقیت دیگا۔ یہی حالت تمام مسلمانوں
کی تھی۔ پھر اگر یہ تحریک کامیاب ہو جاتی تو اس میں شک
نہیں کہ دنیائے اسلام میں ایک بہت بڑا تغیر پیدا ہو جاتا
مگر اسکیلئے بہت بڑے دماغ اور اعلی التعلیم کی ضرورت تھی
بڑی دقت جو سلطان عبدالحمید کے راستہ میں تھی وہ یہ تھی
کہ تمام مسلمان تعلیمی حالت میں ایک درجہ پر نہیں تھے

اور سیاسی امور کو سمجھنے کی یکساں اہلیت نہیں رکھتے تھے
دوسری وجہ سلطان عبدالحمید کی ناکامی کی یہ تھی کہ
ٹرکی میں "نوجوان ترک" کی جماعت پیدا ہو گئی۔ نوجوان
ترکوں کا یہ خیال تھا کہ ترکوں کی مدد اس وقت تک
کوئی نہیں کریگا اور نہ انکو کوئی فائدہ ہوگا جبتک کہ وہ
خود اپنی اصلاح نکریں۔ لہذا اول ضرورت ترکو انکو خود اپنی
اصلاح کرنا ہے یعنی ٹرکی میں وہ اصلاحات کریں جو ممالک
مغربی میں جاری ہیں تاکہ تعلیمی اور تمدنی حالات میں ترک
یورپ کے ہم پلہ ہو جائیں" تو نوجوان ترکوں کو" دنیائے اسلام
کا اتحاد ایک امید موہوم معلوم ہوا اور انکا خیال تھا کہ
غیر تعلیم یافتہ مسلمانوں کا اتحاد ٹرکی کے لئے باعث پریشانی
اور دیگر مسلمانوں کیلئے باعث خوں ریزی ہوگا پس انہوں نے
ٹرکی میں اصلاحات کی تعلیم دینا شروع کی چونکہ پہلی اصلاح
بادشاہ کی خود مختاری پر حملہ تھا اسوجہ سے سلطان عبدالحمید خاں
اور نوجوان ترکوں میں سخت مخالفت ہو گئی (باقی آیندہ)

# کشکول

(از عالی جناب منشی حبیب احمد صاحب قبلہ عینی)

بہت عرصہ کا ذکر ہے ملفوظات حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی قدس سرہ پیش نظر تھی ایک موقع پر مولانا نظامی گنجوی کے شعر پر اظہار خیال فرمایا گیا تھا۔ اوس کو دیکھکر حیرت طاری تھی کہ اوائل عہد کے اس نامور حکیم نے جس کی عہد تک تغزل نے کوئی مستقل طرز اختیار نہیں کیا تھا کس بے تکلفی۔ سادگی جوش ادا کے ساتھ جذبات و اولدات کو ادا کیا ہے۔ غرضہ دراز تک اس شعر کی متعلق بقیہ اشعار کی تلاش رہی میخانہ۔ آتشکدہ سرو آزاد و چند دیگر تذکروں میں جو شعرا متقدمین کے ذکر میں ہیں۔ تلاش کیا پتہ نہیں چلا شعر العجم کے اشاعت نے ہمیشہ کے لئے مایوس کر دیا۔ کچھ عرصہ ہوا حسن واتفاق سے ایک سفینہ ادب میں جو کہ محض ردّیات کے حیثیت میں تھا یہ پوری غزل مل گئی۔ اوس کو دیکھ کر جو حالت وکیفیت طاری ہوئی اوس کو ادا کرنے سے زبان قاصر ہے ایک جدائی کیفیت تھی جس نے عرصہ دراز تک محو و خود رفتگی رکھا۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ ارض و سما ساکت ہیں حضرت اسرافیل صدائے صور سے مردہ پیکران خاکی کے عظام رمیم میں روح حیات پھونک رہے ہیں۔ مولانا روم نے انہیں کے شان میں کہا ہے "ایکہ اسرافیل وقت اندلو لیا۔ مردہ را زلیشاں حیات الست ونما" قبل اس کے کہ ان عرش پیما خیالات کو پیش کیا جائے حضرت سلطان المشائخ کے وہ پیارے الفاظ جس کے ہر لفظ نے دل وجگر میں آگ لگا دی پیش کئے جاتے ہیں اس اندازہ سے ذہن قاصر ہے کہ مولانا کے کلام میں کیا واردات وجذبات ہیں جنکے سبب سے ایسی مبارک ومقدس ہستیاں وجد ومستی میں بے خود رہیں حضرات علائے سنجری ملفوظات میں تحریر کرتے ہیں

چہار شنبہ جمادی الآخر سنہ ثلاث وعشر وسبعمائۃ
دولت پائے بوس بدست آمد سخن در نظم افتادہ در
تحلیلات غزل وغیران فرمود۔ کہ تا ہر کس بر چہ حل کند
بعد ازاں فرمود کہ وقتے شیخ الاسلام حضرت ضیاالدین
قدس سرہ العزیز بزبان مبارک راند نظامی ایں چہ
اسرار است کز خاطر بروں داوی بدکے دزدت نی الد
زباں در کش زباں در کش
بیشتر روز ایں بیت میگفت تا تمام شام در آمد در وقت

اظہارِ ہمیں بیت بر زباں مبارک می راند گویند در وقتِ دو
بحر ہمیں بیت می گفت و ہر زمانہ کہ میگفت تیزی درو ے
پیدا می آمد۔ بعد ازاں خواجہ ذکر اللہ بالخیر فرمود کہ تا چہ
بود در خاطر او و چہ چیز ش می گویند۔

اس صنف و جوش ادا میں جو طرز خاص خواجہ حافظ رکھتے ہیں۔ فارسی شعرا میں اور کسی کو میسر نہیں۔ واردات قلبی مقالات مختلفہ میں تنوع مضامین کے ساتھ مستی و بیخودی. ذوق و شوق اور اس کے ساتھ جوش ادا کا وہ اثر ہے کہ الفاظ میں۔ واقعات کی زندہ تصویریں نظر آتی ہیں لیکن مولانا کا جوش و وارفتگی اس سے بہت بالا تر ہے خواجہ صاحب اپنی جوش مستی از خود رفتگی میں آسمان و زمین کو درہم برہم کر رہے ہیں۔ نظام کائنات کو زیر و زبر کر دیا ہے دیوانہ وار جھوم جھوم کر ہاتوں سے تالیاں بجاتے ہیں پائے خوبی سے کیفیت رقص پیدا کر رہے ہیں لیکن مولانا جذبات و ادارات کا جادو عالم سفلی سے بالاتر عالم علوی کو جگا رہا ہے۔ اُن کی کلام کی شرر افشانی عرش و کرسی و ماسوا اللہ کو پھونک کر عالم علوی کے اُس ذروہ حقیقت پر قدم زن ہے جہاں ملکوت کی حدود ہزاروں فرسخ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت مسعود فرید الدین گنج شکر کا اس روحانی و ترجمان اسرار کے کلام پر اسقدر بیخود ہو جانا تعجب انگیز نہیں مولانا کی پوری غزل اور خواجہ صاحب کی ایک غزل جو کہ اتحاد مضمون کے لحاظ سے قریب قریب ہے ہے

## خواجہ صاحب

بیا تا گل بر افشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشکافیم و طرح نو در اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش بر اندازیم
چو در دست است رودے خوش بزن مطرب سرودے خوش
کہ دست افشاں غزل خوانیم و پا کوباں سر اندازیم
صبا خاک وجود ما بداں عالی جناب انداز
بود کان شاہ خوباں را نظر بر منظر اندازیم
بہشت عدن اگر خواہی بیا با ما بہ میخانہ
کہ از پائے خمت یکسر بہ حوض کوثر اندازیم

## مولانا نظامی

جہاں تیرہ است رہ مشکل جنیبت را عناں درکش
زمانے رخت ہستی را بہ خلوت گاہِ جاں درکش
کلاغانِ طبیعت را ز باغ انس بیروں کن
ہمایانِ سعادت را بہ دام امتحاں درکش
چو خاص الخاص جاں گشتی ز صورت پائے بیروں نہ
ہزاراں شربت معنی بیک دم رائیگاں درکش
گراں جانی مکن ہرگز کہ در بزم سبک روحاں
چو ساقی گرم رو گردد بیک رطل گراں درکش
چو مست حکمتش گشتی فلک را خیمہ برہم زن
ستون عرش را جنباں طناب کہکشاں درکش

۱۴

بیا جانا منور کن ز رویت مجلس ما را
که در پیشت غزل خوانیم و در پایت سر اندازیم

سخن دانی و خوش خوانی نمی‌ورزند در شیراز
بیا حافظ که تا خود را بملک دیگر اندازیم

طریقش بی قدم می‌رو جمالش بی نظر می‌بین
حدیثش بی زبان میگو شرابش بی دهان درکش

نظامی این چه اسرار است کز خاطر برون آوی
کسی در عشرت نمی‌داند زبان درکش زبان درکش

# بچہ

از

## روسی مضمون نگار چیخوف

ترجمہ

جناب جلیل احمد صاحب قدوائی، بی۔ اے،

گریشا، ایک پھولے گالوں والا چھوٹا بچہ جسے پیدا ہوئے دوسال آٹھ ماہ ہوئے اپنی آنا کے ساتھ سڑک پر ٹہل رہا ہے وہ ایک لمبا موٹا دگلا، ایک گلو بند، ایک بڑی ٹوپی جس میں لیس ٹکی ہے اور گرم لیدر بوٹ پہنے ہے اُسے گرمی معلوم ہوتی ہے اور گھبرا رہا ہے اور اُس کے چہرہ پر اپریل کی ماہ کی تیز دھوپ پڑ رہی ہے اور اس کے آنکھیں جلی جا رہی ہیں۔

اُس کی پوری بھدی، کمزور، غیر مستقل آواز آہستہ آہستہ اُٹھنے والے قدموں کی شخصیت سے انتہائی سراسیمگی ٹپک رہی ہیں۔

اب تک گریشا کو صرف ایک چوکھنٹی دنیا کا علم ہے جہاں ایک کونے میں اس کا بستر ہے دوسرے میں آنا کا بکس تیسرے میں ایک کرسی اور چوتھے کونے میں ایک چھوٹا چراغ جل رہا ہے۔ اگر کوئی بستر کے نیچے دیکھے تو وہاں اُسے ایک گڑیا، جس کا ایک ہاتھ ٹوٹ گیا ہے اور ایک ڈھول پڑی ملے گی اور آنا کے بکس کے پیچھے بہت سی بیکار چیزیں پڑی ہیں سوت کی گڑیاں، بغیر ڈھکن کے ڈبے اور ایک ٹوٹا پھوٹا جوتہ اس دنیا میں آنا اور گریشا کے علاوہ اکثر اُمّی اور بلّی بھی آجاتی ہے اُمّی بالکل گڑیا کی طرح ہیں اور بلی ابا کے سموز کے کوٹ سی ہے، صرف کوٹ کے آنکھیں اور نہ دُم نہیں ہیں۔ اس دنیا میں جسے نرسری[1] کہتے ہیں ایک دروازہ ہے جو ایک صحن میں کھلتا ہے، اُس سے ملا ہوا ایک کمرہ ہے جہاں کھانا کھاتے اور چائے پیتے ہیں وہاں گریشا کی کرسی رکھی ہے جس کی ٹانگیں اونچی ہیں اور دیوار پر ایک گھڑی لٹک رہی ہے جس کا کام اپنا پنڈولم ہلانا اور گھنٹی بجانا ہے کھانے کے کمرے میں سے آپ اُس کمرے میں جا سکتے ہیں جہاں سرخ آرام کرسیاں ہیں یہاں دری پر ایک سیاہ دھبہ ہے

---

[1] وہ کمرہ جہاں بچے پالے جاتے ہیں افسوس کہ اس کے لئے اردو لفظ جو پورے طور پر معنی پر حاوی ہو مجھے نہیں ملتا۔ مترجم

ممی کو دکھا کر اب تک گریشا پر انگلیاں اوٹھائی جاتی ہیں
اس کمرے کے بعد ایک اور کمرہ ہے جہاں جانیکی کسی کو
اجازت نہیں اور جہاں ابا جان —— کوئی نہایت
ہی پُر راز اور عجیب ہستی — کی جھلک نظر آتی ہے انّا اور
اُمّی بھی یہیں آتی ہیں وہ گریشا کو کپڑے پہناتی ہیں اُسے
کھانا کھلاتی ہیں اور سُلاتی ہیں لیکن ابا جان کی زندگی
کا مقصد کیا ہے یہ نہیں معلوم ایک اور ناقابل فہم وجود
پھوپی اماں کا ہے جنھوں گریشا کو ڈھول خرید کر دی تھی
وہ نمودار ہوتی ہیں اور پھر کہیں الوپ ہو جاتی ہیں وہ
کہاں غائب ہو جاتی ہیں؟ گریشا نے ایک سے زاید
دفعہ پلنگ کے نیچے صندوق کے پیچھے اور کرسی کی
پشت پر انھیں تلاش کیا مگر وہ وہاں نہیں ملیں.....

اس نئی دنیا میں جہاں سورج انسان کی آنکھوں کو
مجروح کرتا ہے اسقدر آبا، اُمّی اور پھوپھی امائیں نظر
آتی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کوئی کس کے پاس دوڑ کر جائے
لیکن جو چیز سب سے زیادہ عجیب اور سب سے زیادہ
مہمل ہے وہ گھوڑے ہیں گریشا اُن کی حرکت کرنیوالی
ٹانگیں دیکھتا ہے لیکن اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ وہ
اس راز کا حل اپنی اماں سے طلب کرتا ہے مگر وہ
بولتی نہیں ہے۔

یکایک اُسے ایک پُر خطر کھٹ پٹ سُنائی دیتی ہے
سپاہیوں کی ایک فوج جن کے چہرے لال ہیں اور
جن کی بغلوں میں بندوقیں ہیں سڑک پر زور زور سے
قدم ڈالتی ہوئی اُس کی طرف آرہی ہے گریشا خوف کی وجہ
سے سر سے پیر تک کانپ جاتا ہے اور انّا کی طرف سوالیہ
نظروں سے دیکھتا ہے تاکہ معلوم ہو خوف کی بات تو نہیں
ہے لیکن انّا نہ روتی ہے نہ بھاگتی ہے اس لئے اطمینان
ہے کہ خطرہ کی بات نہیں ہے۔ گریشا سپاہیوں کو گذرتے
دیکھتا ہے اور خود بخود اُن کے ساتھ اپنے قدم اُٹھا کر بڑھنا
چاہتا ہے۔

دو بڑی بلیاں جن کے چہرے لانبے ہیں اور جن کی
زبانیں باہر نکلی ہیں اور دُمیں ہوا میں بلند ہیں کہیں سے
آتی ہیں اور ایک دوسری کے پیچھے دوڑتی ہیں گریشا
خیال کرتا ہے کہ اُسے بھی دوڑنا چاہئے اور وہ بلیوں کے
پیچھے دوڑتا ہے۔

"کہاں چلے؟" انّا جلدی سے اُس کے کندھے پکڑ کے
کہتی ہے "ارے آخر کدھر کو؟ کہدیا بچے شرارت نہیں کرتے"

ایک طرف ایک انّا نارنگیوں کی ایک ٹوکری لئے
بیٹھی ہے گریشا اس کے پاس سے گزرتا ہے اور بغیر کچھ کہے
ایک نارنگی اُٹھا لیتا ہے۔

"یہ کیا؟ یہ کیا؟" اُس کی پہلی انّا اُس کے ہاتھ سے
نارنگی چھین کر کہتی ہے "عجب بدتمیز ہو۔"

اب گریشا چاہتا ہے کہ وہ شیشہ کا ایک ٹکڑا اوٹھائے
جو اُس کے پردے کے پاس ہی پڑا ایک چراغ کی طرح چمک رہا
ہے لیکن وہ ڈرتا ہے کہ کہیں پھر اُس کا ہاتھ نہ پکڑ لیا جائے۔

"بوا سلام" یکایک گریشا کو قریب اپنے کانوں

کے اوپر ہی ایک اونچی بھاری آواز سنائی دیتی ہے اور وہ ایک لانبے آدمی کو جس کے کوٹ میں سُرخ بٹن ہیں دیکھتا ہے۔

جب یہ آدمی ٹھہر جاتا ہے، اَنّا سے ہاتھ ملاتا ہے اور اُس سے باتیں کرنے لگتا ہے تو گریشا کو خوشی ہوتی ہے سورج کی چمک، گاڑیوں کا شور، گھوڑے، چمکیلے بٹن یہ سب ایسے نئے اور انوکھے ہیں اور خوف آمیز نہیں ہیں کہ گریشا کی روح میں ایک جذبۂ لطف پیدا ہوتا ہے اور ہنسنے لگتا ہے

"چلو! چلو!" وہ چمکیلے بٹن والے آدمی سے اُس کے کوٹ کے دامنوں کو کھینچ کر کہتا ہے۔

"کہاں چلیں؟" آدمی پوچھتا ہے۔

"چلو!" گریشا اصرار کرتا ہے۔

وہ کہنا چاہتا ہے کہ اپنے ساتھ ابّا، امّی اور بلّی کو بھی لے چلیں تو اچھا ہے مگر جو وہ کہنا چاہتا ہے اُسے زبان ادا نہیں کرتی۔

تھوڑی دیر بعد اَنّا سڑک چھوڑ کر گریشا کو ایک بڑے صحن میں لے آتی جہاں اب تک برف جمی ہوئی ہے اور چمکیلے بٹن والا آدمی بھی اُن کے ساتھ آتا ہے وہ ہوشیاری کے ساتھ برف کے تھوئے اور پانی سے بھرے ہوئے گڑھوں کو بچاتے ہوئے ایک تاریک اور میلے زینہ سے ایک کمرے میں جاتے ہیں یہاں بہت زیادہ دھنواں ہے، بھونے ہوئے گوشت کی خوشبو آرہی ہے اور چولھے کے پاس ایک عورت کھڑی کباب سینک رہی ہے باورچن اور اَنّا ایک دوسرے کا پیار لیتی ہیں اور اُس آدمی کے ساتھ بنچ پر بیٹھ جاتی ہے اور آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگتی ہیں گریشا کو اس تنگ و تاریک کوٹھری میں اور اپنے چست اور جکڑے ہوئے لباس میں سخت گرمی اور پیاس معلوم ہوتی ہے۔

"یہ سب کیا ہے؟" وہ اپنے چاروں طرف متحیر نظروں سے دیکھتا ہے۔

وہ سیاہ چھت، کفگیر اور چولھے کو ایک بڑے سیاہ سوراخ کی طرح سے دیکھتا ہے۔

"ام ــــ م ــــ می ــــ ی" وہ چلانے لگتا ہے۔

"اچھا اچھا" اَنّا کہتی ہے "ابھی چلی!"

باورچن میز پر ایک بوتل، دو شراب کے گلاس اور کچھ کباب رکھتی ہے دونوں عورتیں اور چمک دار بٹنوں والا آدمی اپنے اپنے گلاس ایک دوسرے کے گلاس سے ٹکرا کے جھنکار پیدا کرتے ہیں اور انھیں بار بار خالی کرتے ہیں سُرخ بٹن والا آدمی پہلے باورچن اور پھر اَنّا کے کمر میں ہاتھ ڈالتا ہے اور اس کے بعد تینوں مل کر دھیمہ لہجہ میں گانا شروع کرتے ہیں۔

گریشا کباب کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے اور وہ اُسے اُس کا ایک ٹکڑا دیتے ہیں وہ اُسے کھا لیتا ہے اور اَنّا کو پیتے دیکھتا ہے... وہ چاہتا ہے کہ اُسے پینے کو بھی دیں۔

"اَنّا، وہ...... وہ!" گریشا کہتا ہے۔

باورچن اُسے اپنے گلاس میں سے ایک گھونٹ دیتا ہے وہ اپنی آنکھیں چڑھاتا ہے، پلکیں مارتا ہے کھانستا ہے

اور اُس کے بعد دیر تک اپنا ہاتھ ہلاتا رہتا ہے۔ باورچن اُسے دیکھتی ہے اور ہنستی ہے۔

جب وہ گھر جاتا ہے تو گریشا اُمّی سے دیواروں اور بستر کی نسبت جہاں وہ تھا اور جو کچھ اُس نے دیکھا بیان کرتا ہے۔ وہ زبان سے اتنا نہیں کہتا جتنا اپنے چہرے اور اپنے ہاتھوں سے وہ بتاتا ہے کہ سورج کیسے چمکتا ہے، گھوڑے کیسے دوڑتے ہیں، خوفناک چولھا کیسا معلوم ہوتا ہے اور باورچن کیسے پیتی ہے....

شام کو اُسے نیند نہیں آتی۔ بندوق لئے ہوئے سپاہی، بڑے جھمگٹ، اَلو بلّیاں، گھوڑے، شیشہ کا ٹکڑا، نارنگیوں کے ٹوکری، چمکیلے بٹن سب جمع ہو کر اُس کے دماغ پر چھا جاتے ہیں وہ کروٹیں لیتا ہے، تلا تلا کے بولتا ہے اور آخر کشمکش پر قابو نہ پاکے رونے لگتا ہے۔

"شاید تمھیں حرارت ہے!" اُمّی اپنا ہاتھ اُس کے ماتھے پر رکھکر کہتی ہیں۔ "کوٹھی پر بد پرہیزی کی ہوگی"۔

"چولھا!" گریشا رو کے کہتا ہے۔ "بھاگ جاؤ چولھا!"

میں کہتے کہتے حیران ہوگئی۔ کھانے میں احتیاط نہیں ہوتی....؟ اتنی خفا ہوتی ہیں۔ اور گریشا اپنے ابتی زندگی کے تاثرات کو یاد کرنے کی سزا میں اُمّی سے ایک ایک چمچہ رینڈی کا تیل پاتا ہے۔

# پروازِ جنوں

(از جناب حامد سعید خاں صاحب حامدؔ بھوپالی)

اللہ اللہ یہ کیفیت اعجازِ جنوں
کہ مجھے خود نہیں معلوم مرا رازِ جنوں

دلِ خاموش، جیسے پیکرِ معصوم کہیں
یہی انجامِ تمنا، یہی آغازِ جنوں

موسمِ گُل کی ہواؤں سے لرز جاتا ہوں
کہ بڑھا دیتی ہیں یہ طاقتِ پروازِ جنوں

چھانیوالا ہے زمانہ پہ ابھی رنگِ سکوت
کہنے والا ہوں زمانہ سے ابھی رازِ جنوں

اب وہ دامن رنگیں ہے، نہ دستِ وحشت
رہ گئی یاد بس اک جرأتِ آغازِ جنوں

وحشتِ رنگ محبت ہے، بہ اندازِ بہار
چاک ہے سینۂ مجروح بہ اندازِ جنوں

آنیوالی ہے ابھی وجد میں روحِ نغمہ
چھڑنیوالا ہے لگا ہوں سے ابھی سازِ جنوں

یا وہ حالت کہ کوئی پوچھنے والا ہی نہ تھا
یا یہ عالم کہ ہر اک ذرہ ہے غمازِ جنوں

جن منازل سے محبت میں گذر جاتا ہوں
گونجتی رہتی ہے واں شورشِ آوازِ جنوں

پاس ہے جیب و گریباں کا وگرنہ حامدؔ
مجکو معلوم ہے سب قوتِ پروازِ جنوں

# ہُد ہُد

(از علامہ ابوالکمال مولوی سید محمد عبدالودود صاحب ندرو بریلوی)

فالسے کے پیڑ پر بیٹھا ہے کیوں آجا یہاں آج تو اُڑ کر نکل آیا اِدھر ہُد ہُد کہاں؟
تو پرندوں میں نظر آتا ہے مجھکو خوبرو آکہ کرنا چاہتا ہوں تجھ سے میں کچھ گفتگو
سب پرندوں سے تری شکل و شباہت ہی جُدا سب سے ذہنیت جدا ہے اور ذہانت ہے جُدا
تیرے بھولے پن کے باعث نام ہیں تیرے کئی کوئی کہتا ہے تجھے مُلّا کوئی کھٹ کھٹ بڑھئی

---

شکل تیری کس قدر پیاری ہے اور معصوم ہے پر ادب میں ذکر تیرا شاذ کالمعدوم ہے
قمری و بُلبُل پہ حاصل ہے تجھے فضل و شرف پھر بھی ہے اُردو ادب سے ذکر تیرا برطرف
طرفہ تر یہ ہے کہ بُلبُل ہند میں مفقود ہے اور باغ و راغ میں تو ہر جگہ موجود ہے

کیا نہیں پاتے سخنور تجھ میں کوئی بات بھی؟
کیوں نہ اک مرکز تخیل کا ہو تیری ذات بھی؟

کون کہہ سکتا ہے درد دل سے تو بیگانہ ہے عشق سے بیگانہ جو سمجھے تجھے دیوانہ ہے
تیرے بارے میں یہ سوءِ ظن ہے فی الواقع عجیب رہ چکا ہے تو تو دربار سلیماں کا نقیب

دے چکا ہے بیش قیمت خدمتیں انجام تو — کر چکا ہے قابلِ تعریف اکثر کام تو

جو پڑی بلقیس پر پہلے وہ تیری تھی نگاہ — تو ہے جنسِ حُسن کا کیسا مُبصر واہ واہ

پھر مبصر ہی نہیں تدبیر میں بھی طاق ہے — چارہ سازی تیری وقفِ خدمتِ عُشّاق ہے

وصل کی تدبیر کرنے میں بہت مشاق ہے — تیری خدمت اور اطاعت شہرۂ آفاق ہے

عشق کا پیغام سوئے حسن لیجاتا ہے تو — عاشقِ بیتاب کو تسکین دیجاتا ہے تو

تیرے پہلو میں بھی بیشک اک دلِ آگاہ ہے
تیرے سر کا تاج گویا لائی الا اللہ ہے

---

# دولت کا صحت پر اثر

(از ایم۔ اے۔ خالق صاحب متعلم فرسٹ ایر کلاس)

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ صحت و دولت ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور آدمی جس قدر دولتمند ہوگا اسقدر بلند ہمت بھی ہوگا۔ یہ خیال عوام تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ علما منافع الاعضا بھی اسی غلطی میں مبتلا ہیں۔ اور وہ دولت کو "اکسیر حیات" اور "اکسیر بدن" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر ہال نے ایک مرتبہ اپنے رسالہ صحت (جورنل آف ہیلتھ) میں لکھا تھا۔

انسان پر دولت کا حفظان صحتی اثر اس رپورٹ سے بخوبی واضح ہوتا ہے جو مسٹر ایم۔ دلیری۔ ہیوری کے کمشنران محتاج خانہ کے سکرٹیری نے لکھی ہے۔ انہیں اس نے واضح کیا ہے۔ کہ دولتمندوں کی اوسط عمر غریبوں کی بہ نسبت بارہ سال زیادہ ہوتی ہے چنانچہ ۱۰۵۸ دولتمند ۴۲ سال کی اوسط عمر میں مرے ۴۷۹۱ متوسط الحال اشخاص نے ۲۹ سال کی اوسط عمر پائی۔ اور ۱۹۵۴۹ غریب آدمیوں کی اوسط عمر صرف بیس سال تھی

ان اعداد و شمار سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ واقعی دولت صحت پر اچھا اثر ڈالتی ہے۔ لیکن وہ لوگ جو دولت کو درازی عمر اور ترقی صحت کا موجب قرار دیتے ہیں۔ وہ اس میں حق بجانب نہیں۔ وہ اس اصل اصول کو ہی بھول جاتے ہیں۔ جو ان کے نظریہ کی بنیاد ہے۔ یعنی صحت دولت کے حصول کا ذریعہ تو ضرور ہے۔ لیکن وہ دولت کی پیداوار نہیں چنانچہ بیشتر لوگ موروثی طور پر کمزور اور مریض پیدا ہوتے ہیں جنکی وجہ سے وہ دُنیا کی کشمکش میں حصّہ لینے اور دولت پیدا کرنے کے اہل ہی نہیں رہتے۔ اگر وہ وراثت سے دولت حاصل نہ کریں۔ تو مفلسی کی حالت میں بہت جلد ملک عدم کو سدھار جائیں اس کے برعکس تندرست اشخاص خواہ پیدائشی طور پر مفلس ہی کیوں نہ ہوں محنت اور کوشش سے دولتمند ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مغربی ممالک خصوصاً امریکہ کے بیشتر اشخاص جو ابتدائے زندگی میں نہایت عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ خود اپنے دست و بازو سے دولتمند بن گئے۔ ہندوستان میں بھی ایسی مثالوں کی کمی نہیں۔ چنانچہ مغرب میں لپٹن کمپنی کا مالک لپٹن۔ فورڈ موٹر کار کا مالک مسٹر ہنری فورڈ۔ مشرق میں میڈن تھیٹرز کا مالک مسٹر میڈن۔ غازی مصطفےٰ کمال پاشا ترکی اور اعلیٰ حضرت شاہ پہلوی ایرانی وغیرہم اس

حقیقت کی بہترین مثالیں ہیں۔

اس کے برعکس بیمار اور دائم المریض اشخاص کو دولت پیدا کرنے کے موقع کہاں میسر آسکتے ہیں ۔ بیماری ان کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیتی ہے انہیں کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ اور انکی تمام زندگی اور دولت بیماری سے رستگاری حاصل کرنے میں صرف ہو جاتی ہے ۔

سچ پوچھئے تو دولت اپنی تمام مکروہات کیساتھ انسانی صحت کو خراب اور زندگی کو کم کرتی ہے۔ کیونکہ دولت کی عام استعداد نیکی اور رحمدلی نہیں ہے۔ بلکہ فضول خرچی خود غرضی سستی اور بسیار خوری ہے۔ یعنی دولت فضول خرچی عیش وعشرت۔ سستی بسیار خوری اور مخالفِ صحت عادات واثرات پیدا کردیتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر جیننگ نے دولت کے جسمانی اثرات کے متعلق لکھا ہے۔ کہ جسمانی امراض میں امیروں اور غریبوں کے درمیان بہت تھوڑا فرق ہے۔ وہ لکھتا ہے:" اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملکی بھائی بھوک اور فاقہ کشی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مگر ان کی بہ نسبت اُن اشخاص کی تعداد بہت زیادہ ہے جو بسیار خوری کی بدولت موت کے گھاٹ اترتے ہیں۔ صحیح ہے کہ بہت سے نادار لوگ ایسے ہیں۔ جو لباس کی کمی کی وجہ سے سردی سے ٹھٹھرتے رہتے ہیں لیکن ان سے بھی زیادہ دولتمند امراض کا شکار ہوتے ہیں جو فیشن کی بدولت غیر مناسب اور تکلیف دہ لباس پہنتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی امیر عورتیں اپنی قیمتی پوشاکوں کی بدولت اپنی گداگر نیم برہنہ بہنوں کی بہ نسبت جلد تر قبر میں پہنچ جاتی ہیں اسی طرح غریبوں کو اکثر حد سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے لیکن وہ ان بیکار امیروں کی بہ نسبت کم بیمار ہوتے ہیں جنھیں فطرتی قوت عمل کی خواہش کو پورا کرنیکے لئے کوئی مناسب کام ہی نہیں ملتا۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کے مندرجہ بالا الفاظ واقعات پر مبنی ہیں۔ غلامی پسند ہندوستان کے بعض اشخاص کو مستثنیٰ کردینے کے بعد دنیا میں فاقہ کشی بہت کم اموات کا باعث ہوا کرتی ہے۔ اسکے برعکس ۹۰ فیصدی اشخاص بالخصوص دولتمند بسیار خوری کی وجہ سے بدہضمی، قبض، اسہال، ہیضہ اور دیگر مختلف جسمانی امراض کی آماجگاہ بنے رہتے ہیں۔ اسی طرح لباس کی کمی کی وجہ سے بھی بہت کم غریب لوگ مرتے ہیں۔ البتہ امیروں میں لباس کی بے احتیاطی ہی اکثر اوقات امراض کا سبب بن جاتی ہے جسکے مختلف اسباب ہیں۔ مثلاً جدید تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ تازہ ہوا کی لہریں اور دھوپ کے اثرات انسانی جسم کیلئے مفید ہیں۔ ان کے بغیر جسم نازک اور کمزور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دیہاتی اور وحشی اقوام کے لوگ جو بالعموم ننگے دھڑنگے رہتے ہیں۔ ہمارے عام دولتمند شہریوں کی بہ نسبت۔ زیادہ تنومند، مضبوط اور قوی الجثہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ دولتمندوں کی تہذیب

اور طرزِ معاشرت انہیں اپنے تمام جسم کے پوشیدہ رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ مغربی ممالک میں یہ حقیقت یہاں تک سبق آموز ثابت ہوئی ہے۔ کہ بعض لوگ اب معمولی ستر پوشی کو بھی جائز نہیں سمجھتے۔ اور فطرتی لباس عُریانی کو اختیار کر بیٹھتے ہیں۔ سب سے پہلے مغربی علماء کی توجہ اس مسئلہ کی طرف اپنی نیم برہنہ عورتوں کی روزافزوں صحت و تندرستی کو دیکھکر مبذول ہوئی تھی۔

دولت کی آخری مگر نہایت اہم پیداوار بیکاری ہے۔ جو دولتمندوں کی صحت پر بہت کچھ اثر انداز ہوئی ہے۔ کثرتِ کار سے لوگ اسقدر بیمار نہیں ہوتے جتناکہ بیکاری سے۔ چنانچہ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

مرد چوں شود بیکار یا شود دزد یا بیمار

اس کی صورت یوں ہے کہ انسان طبعی طور پر اچھا بُرا کوئی نہ کوئی کام کرنیکے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اسکے اعضاء اور جسم کی بناوٹ ہی فطرت کے ہاتھوں سے ایسی رکھی گئی ہے کہ یہ کچھ نہ کچھ کام کرتا رہے۔ مگر دولت بیشتر اسکے منافی ہے۔ دولتمند ورزش یا کام کرنا خلافِ شان سمجھتے ہیں۔ جد و جہدِ حیات میں حصّہ لینا غیر ضروری خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ معاش کی ضروریات سے مستغنی ہوتے ہیں۔ پس اکثر ان میں سے دائم المریض رہتے ہیں۔ جس کے اسباب مختلف ہوتے ہیں۔ دولتمندوں کے اشغالِ زندگی اکثر ایسے ہوتے ہیں جو بیماری کو دعوت دیتے ہیں۔ وہ بیماری کے تکلیف دہ اثر سے بچنے کے لئے ہر وقت مست و مدہوش رہتے ہیں۔ اسکے لئے منشیات بالخصوص شراب اور کوکین وغیرہ کا استعمال شروع کر دیتے ہیں۔ اور بتدریج کثرت سے مہلک امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پھر انکا محبوب مشغلہ سامان تعیش بہم پہونچانا ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی جلد یا بدیر انہیں ہمیشہ کے لئے آغوشِ لحد میں سلا دیتا ہے۔

علاوہ بریں دولت اور اُس کی مخصوص دلچسپیوں کا حصول شہری زندگی کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ شہر کے تیرہ و تار مکانوں اور غلیظ اور گندی گلیوں میں پاک وصاف اور تازہ ہوا۔ نیز عمدہ اور مصفّٰی پانی کا قحط ہوتا ہے اور یہ دو ضروریات ایسی ہیں جن کا ہونا اچھی صحت کے لئے مقدم ہے۔ پاک وصاف اور تازہ ہوا کی کمی پھیپھڑوں کو کمزور اور انہیں مختلف قسم کے امراض میں مبتلا کر دیتی ہے۔ خون پر اس کا بُرا اثر پڑتا ہے۔ وہ اچھی طرح پاک وصاف نہیں ہو سکتا۔ اور اجزائے نسیم (آکسیجن) کی کافی مقدار حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کا اثر بالواسطہ تمام بدن اور صحتِ عامّہ پر پڑتا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ شہروں کے تمام لوگ جو عام دیہاتیوں کے بہ نسبت دولتمند خیال کئے جاتے ہیں۔ بکثرت پھیپھڑوں کے امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور اس کی وجہ سے زرد رو۔ کمزور اور منحنی سے رہجاتے ہیں۔

دولت ایک اور ناگوار اثر ڈالتی ہے۔ اس کو ہوتے ہوئے انسان بالاکثر جذبات کا غلام ہو جاتا ہے۔

اس میں بے ایمانی۔ غصہ۔ خود غرضی۔ تکبّر اور بے رحمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا اثر اس کے اعصاب اور جسم پر پڑتا ہے۔ اور اس کی صحت عامہ خراب اور ناقص ہو جاتی ہے۔ نیکی اور اخلاقی خوبی نہ صرف روح بلکہ جسم کو بھی تندرست کرتی ہے۔ اور بیشتر دولتمندوں میں یہ مفقود ہوتی ہے۔

الغرض دولت صحت پر اچھا نہیں بلکہ بُرا اثر کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حد سے زیادہ مفلسی کا بھی صحت پر بُرا اثر ہوتا ہے۔ اور مفلسی کا بُرا اثر دولت کی بہ نسبت زیادہ اور جلد تر ہوتا ہے۔

البتہ دولت اور مفلسی کا مناسب اعتدال ایک ایسی چیز ہے جو جسمانی صحت کو ترقی دیتا اور روحانی مسرت کو بڑھاتا ہے۔ چنانچہ وہ شخص جو اپنی زندگی میں جائز ضروریات زندگی بآسانی بہم پہنچا لیتا ہے۔ اور نیک کاموں میں اپنی عمر بسر کرتا ہے وہ ان لاکھوں متمول انسانوں کی نسبت دولت صحت سے زیادہ بہرہ اندوز ہوتا ہے جو تمول کی وجہ سے مختلف امراض اور پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔



# آمدِ شب

# THE DAY IS DONE

(از حکیم ماجد حامدی متعلم درجہ دہم انٹرمیڈیٹ کالج)

1 The day is done, and the darkness
Falls from the wings of Night,
As a feather is wafted downward
From an eagle in his flight.

ہو چکا دن اور شب کی بے اماں تاریکیاں
پھیلتی جاتی ہیں کل دنیائے موجودات پر
ہو بہو جیسے کسی فرغ ہوا کا کوئی پر
رفتہ رفتہ جانب خاک آ رہا ہو ٹوٹ کر

---

2 I see the lights of the village
Gleam through the rain and the mist,
And a feeling of sadness comes o'er me
That my soul cannot resist:

ہاں دکھائی دے رہی ہے سامنے کی روشنی
آ رہی ہے کُہر اور مینہ سے جو چھن چھن کر یہاں
اور چھاتی جا رہی ہے مجھ پہ وہ غم کی گھٹا
جس سے زائل ہوتی جاتی ہے مری تاب و تواں

---

3 A feeling of sadness and longing
That is not akin to pain.
And resembles sorrow only
As the mist resembles the rain.

ایک احساسِ غم و حسرت ہے دل میں جاگزیں
جس کی صورت درد کی کاہش سے کوسوں دور ہے
کہر کو بارش سے ہے یک گونہ نسبت جس طرح
ہے یہ جذبہ بھی اداسی سے مشابہ ایک شے

---

4. Come, read to me some poem,
 Some simple and heartfelt lay,
 That shall soothe this restless feeling,
 And banish the thoughts of day.

اے مغنی چھیڑ دے اس دم کوئی سادہ سا راگ
دل سے جو نکلا ہوا ہو اور دل میں گھر کرے
جو کہ دے تسکین میرے مضطرب جذبات کو
یک قلم آزاد کر دے دِل کی فکروں سے مجھے

---

5. Not from the grand old masters,
 Not from the bards sublime,
 Whose distant footsteps echo
 Through the corridors of Time.

ہاں مگر تصنیف اُستادانِ کامل کی نہو
جنکے نغموں کی زمانے بھر میں شہرت ہوگئی
کان میں آتی ہے ابتک جن کے قدمونکی صدا
کاروان کو گرچہ گذرے ایک مدت ہوگئی

---

6. For, like strains of martial music,
 Their mighty thoughts suggest
 Life's endless toil and endeavour;
 And to-night I long for rest.

کیوں کہ فوجی گیت کی مانند اُنکے راگ بھی
ہیں مرے نزدیک سرتاپا دہانِ زندگی
میں تو خواہان آج کی شب ہوں سکون قلب کا
یاد آجاتی ہے پر جنگ وجدالِ زندگی

---

7. Read from some humbler poet,
 Whose songs gushed from his heart,
 As showers from the clouds of summer,
 Or tears from the eyelids start.

ہاں سُنا مجھکو کسی شاعر کی وہ پرجوش نظم
قلب کی گہرائیوں سے جو کہ ہو نکلی ہوئی
موسم گرما میں جیسے بادلوں سے بارشیں
یا کسی کے دیدۂ پرنم سے اشکونکی جھڑی

8. Who, through long days of labour,
And nights devoid of ease,
Still heard in his soul the music
Of wonderful melodies.

اج سننا چاہتا ہوں ایسے شاعر کا کلام
جس نے دُنیا کی کشا کش میں لیا ہمت سے کام
میٹھی موسیقی کی تانوں میں دم فکر سخن
روح نے جس کی سُنا ہو بار فطرت کا پیام

---

9 Such things have power to quiet
The restless pulse of care,
And come like the benediction
That follows after prayer.

ہیں یہی چیزیں کہ دے سکتی ہیں تسکیں روح کو
اور چھڑا سکتی ہیں دُنیا کے غم و اندوہ سے
جیسے ہوتا ہے دعا کے بعد اطمینان قلب
ان سے بھی ہوتی ہے راحت قلب کو انسان کے

---

10. Then read from the treasured volume
The poem of thy choice,
And lend to the rhyme the poet
The beauty of thy voice.

ہاں سُنا دے اپنے چیدہ بے بہا کشکول سے
کوئی دلکش سا ترانہ جو تجھے مرغوب ہو
میری خاطر شعرِ جان افزا کو ہم آہنگ کر
اس ترنم سے جو حاصل ہے تری آواز کو

---

11. And the night shall be filled with music,
And the cares that infest the day
Shall fold their tents, like Arabs,
And as silently steal away.

ہوگی تب شب کی فضا لبریز نغموں سے ترے
اور مٹ جائیں گی دن کی فکر ہائے جاں گزا
یک بیک جیسے عرب خیمے اُٹھا کر چل پڑیں
اور یوں میدان سے غائب ہوں گویا کچھ نہ تھا

# غزل

(جناب مولانا ضیاء احمد صاحب ایم۔ اے)

غمزہ بے پناہ نے مارا تیر بے نگہ نگاہ نے مارا
لے چلا پھر صنمکدے کی طرف دلِ گم کردہ راہ نے مارا
آب سمجھا کئے سراب کو ہم اس فریب نگاہ نے مارا
مدد اے نورِ آفتاب مدد غم روزِ سیاہ نے مارا
دل کی غداریاں ارے توبہ ملکے اس خیر خواہ نے مارا
اڑ کے پہونچی نہ خاک بھی میری حسرتِ جلوہ گاہ نے مارا
رکھ لے اے دامن کفن پردہ انفعالِ گناہ نے مارا
دیکھتا ہوں بہار میں بھی خزاں چشم عبرت نگاہ نے مارا
ہو ہی جاتے ستم کے خوگر ہم کرم گاہ گاہ نے مارا
انفعالِ ستم معاذ اللہ نگہ عذر خواہ نے مارا
خم زلف سیاہ کی سوگند خمِ زلفِ سیاہ نے مارا
شکر بیداد بھی گلہ ٹھیرا عشق کی رسم و راہ نے مارا
حیرتِ جلوہ کا تو کیا مذکور حیرتِ جلوہ گاہ نے مارا
کیا کروں برق حسن کا شکوہ مجھے ذوقِ نگاہ نے مارا

میرا دعویٰ ہے اے ضیاؔ دل پر
بس اسی روسیاہ نے مارا

## نظم

# ایک تصویر کو دیکھ کر

(از ایس۔ ایم، ارشد صاحب بریلوی؛ متعلم انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

تیرے اندازِ خموشی میں تکلم ہے نہاں — تیری صورت الفتِ ماضی کا دیتی ہے نشاں

یاد آیا ہے کہ اک شکل مجسم سامنے تھی — ہم تھے یہ صورت تھی اپنا دن تھا اپنی رات تھی

آسماں کی یہ ستم آرائیاں پہلے بھی تھیں — تیری الطاف اور کرم فرمائیاں پہلے بھی تھیں

ہاں! مگر اغیار اُن الطاف میں شامل نہ تھے — یہ حجاباتِ دوئی آپس میں یوں حائل نہ تھے

یہ ہوائیں، یہ فضائیں یہ سرور اور یہ کرم — صرف اغیار اور ہم ہیں تختۂ مشقِ ستم

یہ تری تصویر اور پھر پہلوئے اغیار میں — یہ ترا مخصوص جلوہ عام ہو بازار میں

بجلیو! اتر پڑو جلا دو خرمنِ مقسوم کو

بادلو! برسو ڈبو دو ہستیٔ موہوم کو

آہ! اے غم چھیڑتا ہے قصۂ دل کس لئے — ذکرِ ماضی ہو رہا ہے ہائے پیشِ محفل کس لئے؟

وہ پریزادوں کے جمگھٹ اور وہ جلسے کیا ہوئے — وہ شبِ روشن کی تنہائی، وہ قصے کیا ہوئے؟

رقصِ نظر و نگاہ وہ میری تیرے عارض کے قریب — بس تخیل رحم فرما مجھ میں اب طاقت نہیں،

پھر وہ تیرا منع کرنا اور برمرتا ہے کیوں — خوشہ چینی گلشنِ اغیار سے کرتا ہے کیوں؟

ابتدا اور انتہا کو دیکھ اور خاموش رہ — "شورشِ امروز میں محوِ بہرِ دیدِ دوش رہ"

طائرِ بے بال و پر کو دیکھ اے صحنِ چمن — آ دعائیں تجھکو دے گا ایک حزین و بیوطن

سرفرازی، سربلندی، سروری زیبا تجھے — بےکسی و بےپری و بےخودی زیبا مجھے

عیش ہو تجھکو مبارک، غم نصیب دشمناں — اک دلِ محزوں کی آہوں سے نہ پہونچے کچھ زیاں

فرق آجائے نہ تیرے عیش و راحت میں کہیں — اس لئے یہ بےنوا اس عیش میں عارج نہیں

بانٹ لے کوئی کسی کا درد یہ ممکن نہیں — بار غم ہے منتِ مزدور کا ممنوں کہیں

بندہ الفت ہے تو نام و نصب کو ترک کر — عزت سادات کیا فخر حسب کو ترک کر

عشق کی تاریکیوں میں روشنی کی کر تلاش
منزلِ مقصود غافل خود ہے تو ہشیار باش!

لو! وہ منظر ہے بدلتا صورتیں کچھ اور ہیں — فکر فردا کچھ نہیں، اب حالتیں کچھ اور ہیں

اب تخیل سامنے کچھ صورتیں لایا ہے اور — پردہ ماضی جو الٹا حال کا نقشہ ہے اور

جذب ہیں نظریں مری اک پیکر انساں میں کیا — جسم کا سب خون کھنچ کر آنکھ میں کیا آگیا

"آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں — اس قدر ہوں محو حیرت کچھ بتا سکتا نہیں

ایک صورت ان میں کچھ ایسی اثر انداز ہے — قلب سا کھنچتا ہے اور جان مائل پرواز ہے

روح کی گھرائیوں میں رعشہ ہے جس سے خفی — بجلیاں سی کوندتی ہیں قلب کے اندر کبھی

آہ! اے نظرو! خدارا رحم، یہ کیا کر دیا
کیا کیا، دلکو جو مصروف تماشا کر دیا

بس تھا نظر پر دلِ ناداں یہ کیسا اضطراب — نغمۂ محزوں سے ہے لبریز کیوں تار رباب؟

کیوں سبب رسوائی دل کا ہوا جاتا ہے تو — بجلیاں نالوں کی سوئے آسماں لاتا ہے تو؟

شیوہ عاشق نہیں رازِ درون افشا کرے — آرزو گو اک تلاطم قلب میں برپا کرے؟

اپنی قسمت کی خرابی سے ہوا جو کچھ ہوا
شکوہ بے التفاتی ہائے حسن یار کیا

# غزل

از سید ظہور الحق متعلم فرسٹ ایر سائنس

اُدھر برقِ تجلّی کا نہاں اِکبار ہو جانا
ادھر آنکھوں کا وقفِ حسرتِ دیدار ہو جانا

کسی کے تیرِ مژگاں کا جگر کے پار ہو جانا
ہمیں بیٹھے بٹھائے عشق کا آزار ہو جانا

مریضِ غم پہ ہو جائیگی آسان نزع کی مشکل
دمِ آخر ذرا بالیں پہ تم اِکبار ہو جانا

فلک پر برق نے شاید ترے جلوہ سے سیکھا ہے
کبھی روپوش ہو جانا کبھی دوچار ہو جانا

عبث ہے شکوۂ بیدادِ اے دل اِن حسینوں سے
کہا تھا تجھ سے کس نے طالبِ دیدار ہو جانا

تمہارے بسملانِ ناز کو دو کام آتے ہیں
تڑپنا اور تڑپ کر سردِ آخر کار ہو جانا

عدو کے ساتھ وہ جاتے ہیں گھر سے سیرِ گلشن کو
مرے زخمو ہرے ہو کر ذرا گلزار ہو جانا

کمر کستے ہو کیوں تم قتل کو کافی اشارہ ہے
تمہارے ابروؤں کو آتا ہے تلوار ہو جانا

عیادت کو مری اظہر سرِ بالیں وہ شوخ آیا
مرے کام آگیا آخر مرا بیمار ہو جانا

# موجودہ اُردو تغزل کی رفتار

(از جناب مولانا ضیاء احمد صاحب ایم ۔ اے)

ہر زندہ زبان کا خاصہ ہے کہ اُس کے الفاظ ۔ تراکیب ۔ معانی ۔ استعمالات ۔ اسالیب بیان ۔ اور طرزِ خیال غرض ہر چیز میں آئے دن تغیرات ہوتے رہتے ہیں ۔ اور سچ پوچھو تو یہ تغیرات ہی زندگی کی علامت ہیں ۔ یہ انقلابات و اصلاحات ملکی ماحول اور تمدنی ارتقاء کے ماتحت ہوتے ہیں ۔ جسقدر ملک یا قوم میں تہذیب و حضارت ترقی کرتی ہے اہل فن ادبیات کے طرز و اسلوب میں (خواہ نظم ہو یا نثر) کاٹ چھانٹ کرتے ہیں ۔ اسی بنا پر اہل علم کا فیصلہ ہے کہ اگر کسی قوم کی تاریخ صفحۂ دہر سے معدوم ہو جائے تو بھی اُس کے ادب سے اُس کی نشو و نمائے ذہنی و اخلاقی کا سراغ لگانا دشوار نہیں ۔ عربی شاعری کے اُس حصہ کو جو عجمی اثرات سے ملوث نہ ہوا تھا آج بھی پڑھ کر ہم عربوں کے قومی کیریکٹر کے متعلق رائے قائم کر سکتے ہیں ۔ فارسی ادب ہزار اصلیت و واقعیت سے دور سہی لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ اُس کے مطالعہ سے اہل فارس کے غیر حقیقی اور مبالغہ آمیز خصوصیات کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے ۔ انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں کا بھی یہی حال ہے ۔ ہماری اردو اگرچہ کم عمر ہے لیکن خدا کے فضل سے زندہ زبانوں میں شمار ہوتی ہے ۔ پھر کیونکر ممکن تھا کہ وہ اس کلیہ سے مستثنیٰ رہتی ۔

اُردو نظم و نثر میں ہر زمانہ میں گرد و پیش کے اثرات ۔ سوسائٹی کے رجحانات اور ارتقائے تہذیب کے مقتضیات کے ماتحت ہزاروں قسم کی تبدیلیاں ہوتی رہیں ۔ یہ تبدیلیاں کبھی طرز تخیل میں ہوتی تھیں کبھی انداز بیان میں ۔ اور رنگینی و سادگی ۔ مبالغہ و واقعیت تصنع و بے ساختگی ۔ آورد و آمد ۔ شیرینی و ملاحت ۔ زور اور لوچ وغیرہ وغیرہ کے اعتبار سے ہمیشہ متنوع اور متأثر رہیں ۔ حکومت یا سوسائٹی کے اثرات نے "طوطی صفت" ادیبوں کو جو پڑھایا وہی کہنے لگے ۔ یہ قانون فطرت کا تقاضا تھا جس کو ٹالنا کسی کے بس کی بات نہ تھی ۔ اس میں شک نہیں کہ بعض نثار یا ناظم ایسے بھی ہیں گے جنہوں نے سوسائٹی سے متاثر ہونے کے بجائے سوسائٹی سے الگ روش اختیار کی اور کبھی کبھی گرد و پیش کی فضا کو متاثر کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے (اگرچہ اکثر حالات میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا) مگر النادر کالمعدوم ۔ عام طور پر یہی

نظر آتا ہے کہ جس رنگ میں دربار یا سوسائٹی رنگی ہوئی
نظر آئی ادب بھی رنگ گیا۔ شعرائے دہلی کی سادگی
ہو یا شاعرانِ لکھنؤ کا تکلف ۔ ماحول کے رجحانات کا
نتیجہ تھے۔

اس مختصر مضمون میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ
ہم اُردو شاعری کی ایک خاص صنف (غزل) میں جو
انقلابات رونما ہوئے ہیں اُن پر بحث کریں اور
اُن کے اسباب و نتائج پر تبصرہ کریں۔ جس سے معلوم
ہوگا کہ ہمارا تغزل کس جانب جا رہا ہے اور اُس سے
کس قسم کے توقعات قائم کی جاسکتے ہیں۔

سب کو معلوم ہے کہ اُردو شاعری اور خصوصاً
غزل نگاری کا دورِ عروج حکومت اسلامیہ کے زوال
کا زمانہ ہے۔ جس عہد میں میر و مرزا نے اپنی رنگین
نوائیوں کی دھوم مچا رکھی تھی گلشن دہلی پر خزاں
آچکی تھی اور دو کے باغ میں کچھ دنوں بہار رہی
... وہ بھی تاراج ہوگیا۔ تاریخ کے جاننے والے واقف
ہیں کہ اجتماعی مطلق العنانی۔ ذہنی پستی۔ اخلاقی تنزل
عیش پرستی۔ آرام طلبی۔ عزم و حوصلہ کی کمی اسراف
و نمائش کی زیادتی۔ توہم پسندی۔ غلامانہ ذہنیت
تقدیر پر اعتماد۔ تدبیر سے انحراف۔ کے اوصاف اُس
وقت ہماری قوم کی طبیعت ثانیہ بن چکے تھے۔ اس لحاظ
سے ہمارے شعرا کے یہاں خیالات میں پستی۔ جذبات
میں سوقیت۔ مدح میں عزت نفس کا فقدان۔ ہجو میں
ابتذال و رکاکت۔ بیان واقعہ میں مبالغہ و تصنع کی
صفات کیونکر پیدا نہ ہوتیں۔ حاشا ہماری یہ تمنا ہرگز
نہیں کہ اُس زمانہ کے تمام افراد قوم ان اوصاف
رذیلہ کے مرتکب تھے یا تمام شعرا ان عیوب سے متصف
تھے۔ لیکن للاکثر حکم الکل۔ اِس سے کون انکار کرسکتا
ہے کہ اُس وقت بقول آزاد "درخت اقبال کی جڑ کو
دیمک لگ چکی تھی"۔ اور بد اقبالی کے دور کے خصوصیات
کسی سے مخفی نہیں۔

اس ماحول کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک صدی تک ہماری
شاعری کا معتد بہ حصہ (مستثنیات کو چھوڑ کر) اس قدر
مبتذل رہا کہ اُس پر حالی کی زبان میں "ناپاک دفتر"
کا لقب بیجا نہ تھا۔ اگر مدح تھی تو بادخوانی۔ ہجو تھی تو
دشنام دہی۔ عشق میں سوقیانہ پن تھا اور تخیل میں
بناوٹ۔ محبت لاریب ایک بلند اور فطری جذبہ ہے
مگر ہمارے غزل گو شعرا نے اُس کو جذبات عریاں کا
مظہر اور داعیات ہوس کا سرچشمہ قرار دے لیا نتیجہ
وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا کہ غزل سوقیانہ عاشقی کا
شاعرانہ نام ہوگیا جس کو مشاعرہ میں کوئی غیرتمند
بزرگ اپنے چھوٹوں کے سامنے شرم سے آنکھیں
جھکائے بغیر نہیں پڑھ سکتا۔ وصل و ہجر کا عامیانہ
مفہوم۔ واردات حسن و عشق کا گرا ہوا بیان (جس
کا اصطلاحی نام ایران میں وقوعہ گوئی اور ہندوستان
میں معاملہ بندی مقرر کیا گیا) معشوق سے نوک جھوک

رضیوں کی درازدستیوں کا تذکرہ۔ کنگھی چوٹی کے
داستان، خط یا دستار کا ذکر۔ غیر فطری اور مبالغہ آمیز
طرز ادا۔ تصنع اور رعایات کی بھرمار۔ یہ وہ چند
عیوب تھے جو ہماری غزل کا جزو لاینفک بن گئے تھے

اس بے اعتدالی کا اثر یہ ہوا کہ نہ صرف اخلاقی
نقطۂ نظر سے غزل عموماً مخرب اخلاق قرار پائی بلکہ
واقعیت اور تاثیر کے فقدان نے فنی اعتبار سے
بھی اُس کو ناقص بنا دیا۔ بیسویں صدی سے ہندوستان
میں ذہنی انقلاب پیدا ہونا شروع ہوا۔ کوئی خوش
اعتقاد یہ گمان نہ کرے کہ یہ انقلاب برطانوی
حکومت یا یوروپی علوم کے "برکات" کا رہین
منت ہے۔ بلکہ ایشیا اور خصوصاً ہند میں مغربی استعمار
کے خلاف طبائع میں جس قدر جدوجہد کا ولولہ پیدا
ہوا اُسی قدر ذہنی نشوونما کو فروغ ہوا اور تحریک
عمل میں قوت آئی۔ ہمارے چند ارباب ادب نے
اپنے ادبی سرمایہ کی کم مائگی سے شرما کر تخیل اور
اسلوب بیان کی نئی نئی راہیں نکالیں اور قدیم غیر
فطری شاعری کو قومی اور ملکی مقاصد کے لیے
ناکافی پاکر اس کے خلاف ردعمل شروع کر دیا۔ خاص
قومی و سیاسی شاعری سے قطع نظر خود تغزل جدید
میں بہت سے تغیرات ہوئے جن کے وجہ سے قدیم
خائص بڑے حد تک زائل ہوگئے۔ موجودہ غزل گو
طبقہ جس کے علمبرداروں میں حسرت۔ یاس عزیز
فانی۔ اصغر۔ جگر۔ رضی۔ رواں۔ سیماب خاص طور
پر قابل ذکر ہیں تقریباً ربع صدی سے ادب اُردو
کی خدمت میں مصروف اور اِن عیوب کے دور
کرنے میں سرگرم ہے اس میں شک نہیں کہ ان شعرا
کے یہاں بھی اُن عیوب میں سے بعض کہیں کہیں
پائے جاتے ہیں اور دوسرے عیوب بھی جستہ جستہ
ملتے ہیں تاہم یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ موجودہ
تغزل پہلے کی بہ نسبت واقعیت کے زیادہ قریب
آگیا ہے۔

ہم ذیل کی سطور میں اُن نمایاں خصوصیات کو
جو تغزل کے دورِ جدید کی مابہ الامتیاز ہیں دکھانا
چاہتے ہیں تاکہ قارئین کرام عصر حاضر کے غزل گو
شعرا کی عظمت کا اندازہ کر سکیں۔

(الف) تصوف و فلسفہ۔ یہاں فلسفہ یا حکمت
کی کوئی جامع و مانع تعریف بیان کرنا نہ مقصود ہے
نہ ضروری۔ یوں سمجھئے کہ فلسفہ حقائق موجودات
سے بحث کرتا ہے۔ اس کے ہمہ گیر دائرہ میں ایک
طرف تو تصوف آجاتا ہے جس کا بنیادی اصول وحدت
الوجود ہے دوسری طرف علم اخلاق شامل ہو جاتا
ہے جو خیر و شر کی حقیقت آشکار کرتا ہے۔ تصوف و
اخلاق ہی پر منحصر نہیں۔ نفسیات ہوں یا جمالیات
کوئی اُس کے وسیع احاطہ سے باہر نہیں۔ ان مباحث
کا شعر سے جس قدر گہرا تعلق ہے ظاہر ہے۔ یہ دور درحقیقت

حقائق پرستی کا دور ہے (جہاں تک فکر و نظر یا شعر و
ادب کا تعلق ہے) اور یہی وجہ ہے کہ طبائع دور از کار
خیال آفرینی یا غیر فطری مبالغہ۔ غرض کسی چیز سے
جس کی بنیاد حقائق کو نہ ہو متاثر نہیں ہو سکتیں
تغزل جدید میں آپ دیکھیں گے کہ تصوف و فلسفہ
کو شعر میں اس خوبی سے سمویا ہے کہ حیرت ہوتی
ہے۔ اس امتزاج کا یہ اثر ہے کہ شعر نہ خشک فلسفہ
ہونے پاتا ہے نہ خیالی ڈھکوسلا۔ سابق شعرائے
اردو میں جن لوگوں نے مادّی اور خصوصاً سوقیانہ
عشق سے کلام کو بامزہ بنانا چاہا وہ تو اس وقت خارج
از بحث ہیں۔ جنہوں نے تصوف کے میدان میں گام
زنی کی ہے اُن میں بھی (میر درد وغیرہ کو چھوڑ کر)
تقریباً سب کے سب "جامہ عاریت خواستن" کے
مصداق نظر آتے ہیں۔ وہ گرمی محفل کے لیے صوفی
بنتے ہیں اور کلام میں دلکشی پیدا کرنے کی غرض سے
صوفیانہ مضامین باندھتے ہیں۔ اسے سرمایۂ آرائش
گفتار" بنانے کا نتیجہ اگرچہ عارضی داد و تحسین کی
صورت میں ملجاتا ہے مگر وہ چیز حاصل نہیں ہوتی
جس کی نسبت کوئی نکتہ سنج کہہ گیا ہے۔ ع

ورائے شاعری چیزے دگر ہست

لیکن دورِ حال کے متغزلین کے خیالات دردمند دل
اور وفا پرست روح کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے
معلوم ہوتے ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ از دل می
خیزد و بر دل می ریزد۔ اس میں شبہ نہیں کہ اکثر
خیالات وہی ہیں جو بارہا دُہرائے جا چکے ہیں تاہم
انداز بیاں نے ان میں خاص ندرت اور صدق
جذبات نے مخصوص تاثیر پیدا کر دی ہے۔ ان
شاعروں میں فانی۔ اصغر۔ اور جگر اس رنگ خاص
میں زیادہ ممتاز ہیں۔ مثلاً حضرات صوفیہ ذات
بحث کو حقیقت اور اُس کے ماسوا کو مجاز کہتے ہیں۔
دوسرے لفظوں میں وہ ایک کو ہستی برحق اور
دوسرے کو ہستی باطل قرار دیتے ہیں۔ فانی کو یہ
بھی گوارا نہیں۔ وہ ہستی باطل کے مفہوم کو اجتماع
ضدین سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

ہستی ہی نہیں جو باطل ہو پھر فرق مجاز و حقیقت کیا
یہ عرض حقیقت ہے وہ حقیقت ہستی باطل کوئی نہیں

عرض حقیقت کا ٹکڑا کس قدر بلیغ و پرمعنی ہے۔
پڑھیئے اور وجد کیجئے۔ اسی عرض حقیقت و حقیقت کے
علاقہ کو دوسری جگہ بیان کرتے ہیں۔

جلوہ غیب شہود ہے پھر بھی غیب کے جلوے غیب میں ہیں
نظارہ نظر میں شامل ہے نظارے میں شامل کوئی نہیں

مرزا غالب نے بھی اپنے خاص انداز میں اس
مضمون کو ادا کیا ہے۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں سب شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

عام صوفی شاعر مجاز کی گوناگوں نیرنگیوں میں

حقیقت کو ڈھونڈھتے ہیں۔ فانی کی نادرہ کار طبیعت
کی داد دیجیے کہ وہ عالم مجاز کی جستجو کرتے ہیں اس
لئے کہ اُن کی "حقیقت نگر" آنکھوں کو مجاز کا سراغ
ہی نہیں ملتا۔ کہیں ہوتا تو نظر آتا۔

یہ جستجو ہو کہ ہے عالم مجاز کہاں
تلاش چشم حقیقت نگر نہیں ہے مجھے

صوفی اپنی ہستی کی نفی کرنا عین تصوف سمجھتے ہیں۔
یہ بہت فرسودہ خیال ہے اصغر اس کو کس خوبی سے
ادا کرتے ہیں۔

اصغر حریم عشق میں ہستی ہی جرم ہے
رکھنا کبھی نہ پاؤں یہاں سر لئے ہوئے

عشق کا راز اہل ظاہر کے ظرف کی سمائی سے کہیں
زیادہ ہے۔ اصغر

ایسا کہ بتکدہ کا جسے راز ہو سپرد
اہل حرم میں کوئی نہ آیا نظر مجھے

ذرہ بھی آئینہ دار جمال آفتاب ہے۔ اس پرانے
مضمون کو جگر نے کس ندرت سے بیان کیا ہے

ایک ذرے کا اگر نور نمایاں ہو جائے
آدمی کثرت انوار سے حیراں ہو جائے

عالم فلسفہ و حکمت بھی شعرائے حال کا طرۂ امتیاز ہے۔
جس کا اثر یہ ہے کہ غزل کا محدود دائرہ پہلے سے کہیں
وسیع ہو گیا ہے۔ مگر لطف یہ ہو کہ اس کے باوجود شعریت
ہاتھ سے نہیں جانے پاتی۔ اور غزل پر خشک فلسفہ کا
اطلاق نہیں ہونے پاتا۔ مثال کے طور پر اشعار
ذیل ملاحظہ ہوں۔ عزیز لکھتے ہیں۔

اب بھی زیادہ عالم اسباب سے ہے وہ
جو کچھ کسی کے اجڑے ہوئے دل میں رہ گیا

یعنی انسان اگرچہ ضعیف البنیان ہے تاہم اس کے
اندر عالم اکبر چھپا ہوا ہے۔

وتعلم انک شئے صغیر
وفیک انطوی العالم الاکبر

جبر و اختیار کا مسئلہ اہل مذہب کے علاوہ خود
شعرا نے اس قدر تکرار سے بیان کیا ہے کہ بظاہر اس پر
اضافہ کی گنجائش متصور نہیں۔ مگر دیکھئے دور جدید کے
چند دور رس دماغوں نے اس بحث قدیم میں کیا
کیا جدت آفرینیاں کی ہیں۔ اس مابہ النزاع مسئلہ
کی مذہبی حیثیت سے قطع نظر کر کے بتائیے کہ کیا اس
سے بہتر ندرت اسلوب اردو میں کہیں نظر آتی ہے۔
فانی کہتے ہیں۔

محشر میں جبر دوست سے طالب ہوں داد کا
آیا ہوں اختیار کی تہمت لئے ہوئے

شاعر صوفی ہونے کی بنا پر اپنے آپ کو مختار کیونکر
کہتا جب کہ اپنی ہستی ہی کا منکر ہے۔ مگر دیکھنا جبر کے
مضمون کے لیے انداز بیاں کس قدر بدیع اور عدیم النظیر
اختیار کیا ہے۔

آیا ہوں اختیار کی تہمت لیے ہوئے

اس مصرع کی ندرت کی تعریف نہیں ہو سکتی - ایک جگہ لکھتے ہیں -

کیا ہے خلق مجھے باوجود علم گناہ
یہ ابتدا ہے کرم کی تو انتہا کیا ہے

گناہگار کی حالت ہی رحم کے قابل
غریب کشمکش جبر و اختیار میں ہے

"رحم کے قابل حالت" ہونے کا بالکل نیا پہلو ہے۔ جبر و اختیار کے متعلق مرزا یاس کا ایک شعر سنئے اور شاعر کی رسائی فکر کی داد دیجئے۔ فرماتے ہیں۔

ہاں وسعت زنجیر تک آزادی ہو نہیں
ہستی مری مجموعہ اضداد رہے گی

انسان کوشش کرتا ہے اور اکثر ناکام رہتا ہے۔ اس لئے نتیجہ کے اعتبار سے وہ مجبور ہے۔ لیکن جہانتک سعی عمل کا تعلق ہے وہ مختار ہے (گویہ اختیار بھی ذاتی یا لامحدود نہیں) اس بنا پر یاس نے کسقدر بلیغ تشبیہ سے کام لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح ہم کسی جانور کو زنجیر سے باندھ دیتے ہیں اور وہ بھاگنے سے مجبور ہو جاتا ہے یہی حال انسان کی مجبوری کا ہے۔ اُسی کے ساتھ جس حدتک زنجیر کے درازی اجازت دیتی ہے وہ چلنے پھرنے میں آزاد ہوتا ہے۔ اسی پر انسان کی محدود آزادی کا قیاس کرنا چاہئے۔ ہمارے خیال میں اُردو تو کیا فارسی بھی ان نادر تشابیہ اور لطیف اسالیب سے خالی ہے۔ عربی میں ضرور ایک شاعر موت کا ذکر کرتے ہوئے ایسی ہی تشبیہ سے کام لیتا ہے

لعمرک ان الموت ما ابرح الفتیٰ
لکالطول المرخیٰ وثنیاہ بالید

حکمت کے موضوع پر چند شعر اور ملاحظہ ہوں۔ بخوف طوالت بغیر تشریح نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتی ہے

جناب عزیز

بزم مطرب میں کبھی سوز نہ ہو ساز نہ ہو
پردہ ساز میں گر آپ کی آواز نہ ہو

حضرت رضی

تھا امتیاز ذوق پہ احساس منحصر
پنہاں شمیم دوست ہر اک پیرہن میں تھی

جناب فانی

خود حسن کمال حسن ہی یعنی حسن جہاں کامل ہی
اور عشق مآل عشق ہی یعنی عشق ہر کامل کوئی نہیں

دریائے محبت بے ساحل اور ساحل بے دریا بھی
جو موج ڈبو دے ساحل ہی یوں نام کا ساحل کوئی نہیں

جگر

یہی ہی سب سے بڑھکر محرم اسرار ہو جانا
میسر ہو اگر اپنا ہمیں دیدار ہو جانا

اصغر

کارفرما ہے فقط حسن کا نیرنگ کمال
چاہے وہ شمع بنے چاہے وہ پروانہ بنے

رواں

سدّا نوارِ حقیقت ہی مرا پردۂ زیست
توڑ دینا ہی یہ آئینہ تصویر مجھے،
مل گیا مل گیا انجام گنہ اے داور
اب خیالات مرے دیتے ہیں تعزیر مجھے

ب۔ متغزلین حال کے یہاں تصوف کے علاوہ عشقِ مجازی بھی کافی ہے مگر حتی الامکان مبتذل اور پست نہیں ہونے پاتا۔ اُن کے کلام میں عشق ہی مآلِ عشق ہے۔ یعنی عاشق صرف اس لیے عشق کرتا ہے کہ عشق اپنا خود انعام ہے۔ وہ کسی مادی مقصود کے حصول کو مدنظر نہیں رکھتا۔ بلکہ اس دریائے بے ساحل کو اسے لئے پسند کرتا ہے کہ "ڈوبنے والے کا بیڑا پار ہے"۔ اگلے شعرا کے یہاں محبوب سے نوک جھونک۔ وصل کا سوقیانہ مفہوم اور پھر اُس کے تمنا۔ جذبات کی عریانی۔ رقیبوں کی شکوہ سنجیاں وغیرہ وغیرہ ہی عشق کے معراج اور تغزل کا معیار سمجھی جاتی تھیں۔ ہم اس موقع پر اِن امور کی مثالیں پیش کرکے قارئین کے ذوقِ سلیم کو مجروح کرنا پسند نہیں کرتے۔ کسی اُستاد کی غزلیات کا دیوان اٹھا لیجئے یہی رنگ پائیے گا الا ماشاء اللہ دورِ جدید کی ذہنیت ان مطالب کو پبلک میں پیش کرنے سے ابا کرتی ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس دور کے متغزلین کے یہاں یہ مضامین یا تو سرے سے موجود نہیں یا نہ ہونے کی برابر ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جو جذبات محبت ایک دردمند۔ غیور اور عالی حوصلہ انسان کے قلب میں پیدا ہو سکتے ہیں وہی تغزل جدید کا سرمایہ ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھئے ولولہ محبت یا غیرت عشق کا مفہوم۔ اصغر یوں بیان کرتے ہیں۔

نام اُن کا آ گیا کہیں ہنگام بازپرس
ہم تھے کہ اڑ گئے صفِ محشر لیے ہوئے

محبت کی ہمہ گیری (اصغر)

میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں
رگ رگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لیے ہوئے

حسن کا مطالبۂ عقیدت (اصغر)

مری نگاہوں نے جھک جھک کے کر دیے سجدے
جہاں جہاں سے تقاضائے حسنِ یار ہوا

عشق کا مفہوم ہجر اور وصل دونوں کے علاقوں سے بلند ہے۔ (اصغر)

کیا دردِ ہجر اور یہ کیا لذتِ وصال
اس سے بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے

عشق کی لذت نامرادی اور ویرانی میں مضمر ہے۔ (فانی)

اب تو دیوانے پہ اتمامِ کرم کر یا رب
در و دیوار دئے اب انہیں ویرانی دے

عشق خود دار مگر ساماں ہے۔ (فانی)

اپنی ہی بدولت ہے نشیمن کی خرابی

منت کش بیدردی صیاد نہیں ہے
اسی مضمون کو دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

آلودہ نہیں خون تمنا سے وہ دامن
رنگین ہے مرے خون سے دامانِ تمنا

بعض موقعوں پر دوست کی توجہ بیجد بیداد سے
زیادہ قاتل ثابت ہوتی ہے۔ جگر

ہم نہ مرتے ترے تغافل سے
پرسش بے حساب نے مارا
ستم یار کی دُہائی ہے
نگہ التفات نے مارا

حسن وعشق لازم وملزوم ہیں۔ جگر

ایک دن پردہ کشا کش سے پشیماں ہونگے
مجکو پائیں گے جہاں تک وہ نمایاں ہونگے

محبوب کی "بیگانہ ہی" کس سادگی اور لطف سے ثابت
کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ (جگر)

تیری آنکھوں کا کچھ قصور نہیں
ہاں مجھی کو خراب ہونا تھا

جذب عشق کی تاثیر۔ جگر

کیا قیس کی پرشوق نگاہوں نے کیا سحر
محمل کو بھی اب صاحب محمل نہیں ملتا

معشوق کا کرم ہی عشق کی ہستی کا کفیل ہے۔
جنوں بدایونی۔

رعب نشاط پھر ترے نغموں نے پھونکدی
مدت سے سازِ بزم تمنا خموش تھا

جلوہ حسن کی ہوشربائی۔

بجلی سی ایک کوند گئی پھر خبر نہیں
جنبش ہوئی حجاب جہاں تک تو ہوش تھا

عالم شباب کی بیخودانہ محویت۔ عزیز

سچ تو یہ ہے کہ جوانی میں کسے ہوش رہا
جیسے وہ اپنا زمانہ ہی کہاں دیکھا ہے

انقلابات عشق۔ ایضاً

دکھاؤں گا تمہیں بھی میں تغیر اپنی ہستی کا
کہ آج اک ابتدائے عشق کی تصویر نکلی ہے

حسن خود اپنی شراب جلوہ سے سرشار ہے۔ یاس

آئینہ رکھ کے سامنے سجدے میں جھک گئے
اب کیا کہیں گے کافر و دیندار دیکھ کر

دنیا کے انقلابات غم عشق میں تغیر پیدا نہیں کرسکے

ولہٗ

نظام دہر نے کیا کیا نہ کروٹیں بدلیں
مگر ہم ایک ہی پہلو سے بیقرار رہے

محبوب کی ندامت ہی عاشق کی تمام اذیتوں
معاوضہ ہے۔ حسرت

گلگوں نہ ہوتیں اشک ندامت سے وہ آنکھیں
بے صرفہ ہوا خون شہیدان تمنا

عشق اپنی تمام نیرنگیوں کے باوجود جہاں سے
یکساں رہے گا۔ سیماب

یہی روداد روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

سادہ سا شعر ہے۔ مگر کتنے گہرے اور سچے فلسفہ کا حامل ہے۔ غم میں بلائیں چاروں طرف سے اپنی مہیب صورت دکھا کر ڈرایا کرتی ہیں۔ ولہ

قفس کی تیلیوں میں جانے کیا ترکیب رکھی ہے
کہ ہر بجلی قریب آشیاں معلوم ہوتی ہے

محبت میں زحمت بھی راحت معلوم ہوتی ہے۔ رواں

اللہ اللہ یہ عرفان محبت کا اثر
خار کو خار نہ سمجھا ترے سودائی نے

ج۔ صدق جذبات واثر۔ دور جدید کی ایک امتیازی خصوصیت مطالعہ نفسیات ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جذبات تصنع سے خالی اور اثر سے لبریز ہوتے ہیں پچھلی صدی کے آخر تک تقریباً تمام شعرا خصوصاً اہل لکھنؤ کی شاعری کا دارومدار مصنوعی جذبات اور خالص لفاظی پر رہ گیا تھا۔ مثال کے طور پر دو استادوں کے دو شعر نقل کرنا کافی ہونگے۔

امیر

وہ دیکھتے ہیں خون تمنا جما کے آنکھ
مہندی لگائی جاتی ہے پائے نگاہ میں

منیر

پھر کیا عدم میں جا کے لگائیں جو ہم پتہ
حال دہن تم آپ بتاؤ تو بات ہے

ظاہر ہے کہ ایسے شعر کیونکر جذبات کو اپیل کر سکتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں سوسائٹی کا مذاق یہی تھا۔ لیکن اگر سوسائٹی کے مذاق کو حجت قرار دیا گیا تو پھر بہت سی باتیں جائز ماننی پڑینگی۔ ان کے برخلاف حال کے غزل گو شعرا کے یہاں عموماً جذبات میں صداقت اور اثر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر کہیں کہیں سے لکھے جاتے ہیں۔

حسرت

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

عزیز

اب کھل رہا ہے نزع میں یہ راز حسن عشق
وہ شوخ دل میں تھا میں سمجھتا تھا درد تھا
دیکھا نظر اٹھا کے جسے میں نے۔ رو دیا
وقت اخیر ایسا نگاہوں میں درد تھا

" دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا

کیا ہے کس نے یاد اللہ اکبر اب اسیروں کو
کہ توڑا جا رہا ہے قفل زنگ آلودہ زنداں کا

یہ مشورے بہم آتے ہیں چارہ جو کرتے
اب اس مریض کو اچھا تھا قبلہ رو کرتے

یاس

نظام دہر نے کیا کیا نہ کروٹیں بدلیں

گر ہم ایک ہی پہلو سے بیقرار رہے

## فانی

بنتی نہیں ہے صبر کو رخصت کئے بغیر
کام اُن کی بیقرار نگاہوں سے پڑ گیا

اے یاس تونے آکے اُسے بھی مٹا دیا
لذت سے کچھ جو شکوۂ رنج و محن میں تھے

اب لب پہ وہ ہنگامہ فریاد نہیں ہے
اللہ ری تری یاد کہ کچھ یاد نہیں ہے

تعمیر آشیاں کی ہوس کا ہے نام برق
جب ہم نے کوئی شاخ چنی شاخ جل گئی

ترک غم ساحل کا حاصل نظر آتا ہے
اے ڈوبنے والے وہ ساحل نظر آتا ہے

آغاز محبت میں جینے ہی کے لالے تھے
اب خیر سے مرنا بھی مشکل نظر آتا ہے

## رضی

شوخی غضب کی اُس نگہ سحر فن میں تھی
اک روح اضطراب تمام انجمن میں تھی

بجلی سی ایک کوند گئی پھر خبر نہیں
جنبش ہوئی حجاب کو جبتک تو ہوش تھا

## رواں

نزع کی اک نگہ یاس نے وہ کام کیا
عمر بھر جو نہ گیا طاقتِ گویائی سے
میں کیا ہی کرتا تھا اپنے حوالہ

کہ اُن کا مرا سامنا ہو گیا

کوئی معترض شاید یہ کہے کہ متغزلین حال کے یہاں فلسفہ رجائی کے عوض فلسفہ قنوطی کی تعلیم بکثرت ہے۔ اور درد یاس۔ ماتم کے مضامین حد اعتدال سے زائد ہیں۔ اس خصوص میں عزیز۔ فانی۔ یاس کا نام زیادہ لیا جاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سوز و گداز کے مضامین غزل کے لازمی عناصر ہیں۔ درد مند دل سے درد کی آہ نکل جائے تو کیا تعجب ہے۔ بقول عزیز "اہل دل کبھی کبھی گورغریباں کی بھی سیر کر لیتے ہیں۔ آپ بھی ان کے اشعار کو اسی نظر سے دیکھیں"۔ پھر بھی ان جذبات غم سے اگر طبیعت سیر ہو جائے تو آئیے اصغر و جگر کے یہاں فلسفہ نشاط و سرمستی کا ترانہ سنئے

## اصغر

سرشک شوق کا وہ ایک قطرہ ناچیز
اچھالتا تھا کہ اک بحر بے کنار ہوا

بہت لطیف اشارے تھے چشم ساقی کے
نہ میں ہوا کبھی بیخود نہ ہوشیار ہوا

## جگر

تری یاد کی اُف یہ سرمستیاں
کوئی جیسے پیکر شراب آ گیا

جلوؤں کو ترے دیکھ کے جی چاہ رہا ہے
آنکھوں میں اتر آئے مرا کیف نظر بھی

اس جوش بیان اور سرمستیٔ ادا کو دیکھ کر یقیناً ہر شخص جسکو شعر سے ذرا بھی مس ہوگا اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ سب کچھ

صدق جذبات کا اثر ہی۔ جبتک دل میں آگ نہ ہوگی شرار
کا نکلنا معلوم۔

د۔ تخاطب شعر میں ذوق سلیم کی رعایت۔ یہ امر
کہ شعر کا مخاطب صحیح کون ہو ہمیشہ مابہ الاختلاف رہا ہی۔
عرب کی شاعری میں شاعر جنس نازک (خصوصاً اپنی بنت
عم) کو اپنے تمام جذبات محبت کا مرکز قرار دیتا ہی اور
اُسی کو تشبیب میں مخاطب ٹھراتا ہی۔ مغربی شاعری کا
رخ بھی اسی طرف رہا ہی۔ ہندی میں آپ اسکے برعکس
پائیں گے۔ یعنی شاعر (جو عموماً مرد ہوتا ہی) عورت کی زبان
سے اظہار محبت کرتا ہی اور مرد کو مخاطب قرار دیتا ہی۔
انمیں پہلا طریقہ زیادہ فطری اور حقیقی معلوم ہوتا ہی دوسرا
بھی فطری ہے مگر کم۔ سب سے بڑھکر قیامت فارسی شاعری
پر آئی ہے جہاں ترک شیرازی اپنی زلف و خط سے تا عمر
کا دل لینے اور تیغ و خدنگ سے اُس کا خون بہانے کو
آمادہ رہتا ہی۔ اُردو کے سامنے جو نمونہ تھا وہ فارسی
شاعری کا تھا۔ اس لیے ناممکن تھا کہ اُس میں فارسی طرز
تخاطب کا رنگ نہ آتا۔ مگر اُس پر مستزاد یہ ہوا کہ کہیں
کہیں عربی شاعری کا بھی صدقہ نظر آتا ہی۔ گویا اُردو
شاعری کا مخاطب ایک معجون مرکب ہے جو دستار
بھی باندھتا ہی اور دوپٹہ بھی اوڑھتا ہے۔ چہرہ پر خط
بھی رکھتا ہی اور سر پر چوٹی بھی۔ غرض ایک اچھا خاصہ
بہروپیا ہی۔ ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ اس بحث خاص
پر زیادہ لکھا جائے۔ مگر دو مثالیں توضیح مضموں کے
لیے ضروری ہیں۔ (میر)

کھلا جو نشے میں پگڑی کا پیچ اُنکے میر
سمند ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا

منیر

جنس خوبی کی ترازو ہی دوپٹہ تیرا
دونوں پلّوں کو مناسب ہی برابر ہونا

اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا بھی لازم ہی کہ پچھلے دنوں
بعض اہل فن نے عربی انداز تخاطب کی تقلید شروع کردی
تھی اور معشوق کے لیے غزلوں میں ضمائر مؤنث استعمال
ہونے لگی تھیں۔ ایک مصرع اسوقت یاد رہ گیا ہی۔ ع
کیوں پریشاں ہوگئیں حال پریشاں دیکھکر۔ ہمارے
خیال میں اُردو شاعری کو شعر جاہلیت کی روش پر
لیجانا غیر محمود ہے اور جبتک ہندوستان میں پردہ کا
رواج قائم ہے یہ سعی ناشکور ہوگی۔ اس کے متعلق
بعض دوستوں نے حیدرآباد وغیرہ میں ہندی شاعری
کی تقلید کا بیڑا اُٹھایا مگر اس "ریختی نما" طرز کو بھی رنگ
قبول نہیں ملا۔ کیونکہ یہ طرز ایک حد تک فطرت سے
دور ہونے کیساتھ نامانوس بھی معلوم ہوتا ہی۔ ہمارے
نزدیک متغزلین حال نے اس قضیہ کا تصفیہ نہایت
خوبی سے کیا ہے۔ اُن کا فیصلہ ہی کہ غزل میں محبوب
کے لیے ہمیشہ ضمیر مذکر استعمال کرنی چاہیئے۔ کیونکہ علاوہ
کی صورت میں تغلیباً فرد کامل ہی کو خطاب کیا جاتا ہی
دیکھو اللہ تعالیٰ کی ذات تمام جنسی علائق سے پاک
ہی مگر اُس کا ذکر جب کرتے ہیں ضمیر مذکر استعمال کرتے
ہیں۔ اسکے ساتھ ہی ان حضرات کا معمول ہی کہ شعر میں

حتی الامکان ایسے اوصاف کے ذکر سے اجتناب کرتے ہیں
جو خاص طور پر جنس لطیف یا جنس قوی سے منسوب ہیں
مثلاً کنگھی چوٹی یا خط و دستار وغیرہ۔ جس کا لازمی نتیجہ
یہ ہے کہ شعر عریانی یا ابتذال سے محفوظ رہتا ہے۔ سراپا
کی تعریف یا خارجی متعلقات کا بیان ترک کر دینے سے
جذبات عشق میں وہ ابہام کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے
جو شعر کی جان ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں پہونچکر شاعر
پکار اٹھتا ہے۔

خوبی ہمیں کرشمۂ و ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

امور بالا کی مثالیں پیش کرنیکی ضرورت نہیں معلوم ہوتی
کیونکہ اساتذہ حال کے تمام دیوان ان مثالوں سے بھرے
پڑے ہیں ۷ انداز بیان کا زیادہ مطابق فطرت ہونا
قدیم شعرا کی تمام کائنات یہ تھی کہ مبالغوں سے کلام کو
مجموعۂ محالات بنالیں۔ محبوب کی مدح پر آئے تو دہن
و کمر کو غائب کر دیا۔ شب ہجر کا طول بیان کرنے لگے تو
اسکا دامن دامانِ قیامت سے جا باندھا اپنی لاغری کا ذکر
آگیا تو ع۔ گمان ہوا کہ شکن پڑ گئی ہے جادہ پر۔ پکارنے
لگے۔ مرنے کے بعد یونا قتل ہو کر قاتل کی گردن پر سوار
ہونا یہ ہمارے شاعروں کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ دور جدید کے
غزل لکھنے والوں نے یہ سب مضامین یک قلم
موقوف کر دیئے۔ بعض کے یہاں ابتدائی کلام
میں یہ رنگ موجود ہے۔ مگر اب رفتہ رفتہ ترک
کرتے جارہے ہیں۔ یہ صفات چونکہ نسبتہً مسلمہ حقیقت
رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کی وضاحت کے لیے
دو چار مثالیں دینا بے سود ہے۔ دواوین حال
کے مطالعہ سے تصدیق ہو سکتی ہے۔ اوپر جذبات
کے عنوان کے ماتحت چند مثالیں گذریں جن سے
ہمارے دعوے کا ثبوت ایک حد تک ملسکتا ہے۔

۸۔ اسی کے ساتھ دور حاضر کی ایک خصوصیت
یہ ہے کہ قدما کے برخلاف اس دور کے شاعری
میں مخرب اخلاق یا رکیک مضامین کم ملیں گے۔
مثلاً رقیب کا مفہوم جو عربی میں نہایت بلند تھا
فارسی و اردو میں آکر اس قدر پست ہو گیا کہ
الامان۔ خواہ مخواہ اپنے عشق کی داستان
میں (جو اکثر فرضی ہوتی ہے) ایک فرضی رقیب
قرار دیا اور لگے تمام زورِ دماغ ہجو و دشنام
میں صرف کرنے۔ یہ غیرت عشق کا خون کرنا
نہیں تو اور کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور سینکڑوں
فحش اور سوقیانہ مضامین۔ واعظ و ناصح کی ہجو۔
کفر و بتخانہ کی مدح۔ اسلام اور کعبہ کی توہین۔ اسی
قسم کے چند کفریات و ہفوات تھے جن کی بنیاد
پر غزل کی سر بفلک عمارت قائم کیجاتی تھی۔ اس
بُنْيَانٌ عَلىٰ شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ ہے۔ اکثر زاہدوں
اور واعظوں میں خود فروشی اور ریاکاری ہوتی
ہے۔

ہوتو ہے۔ اس لئے اگر شاعر اُن کے خود فروشی
وریاکاری کا استہزا کرے تو حق بجانب ہے۔ مگر ستم
تو یہ ہوا کہ زاہد یا واعظ کو محض اس وجہ سے کہ وہ زاہد
یا واعظ ہے برا کہنا شروع کر دیا اور یہ استخفاف مذہب
کہ انکار نصوص آخر یہ انکار النصوص آرد کا مصداق
ہوگیا۔ جس سے نہ دنیا ملی نہ دیں۔

یہ امر موجب اطمینان ہے کہ جدید تغزل تقریباً
بالکل اس رنگ سے پاک ہے۔ غزل اشعار کی نسبت
جناب رواں کا یہ مقولہ آب زر سے لکھنے کے قابل
ہے کہ ایسے شعر جن کو چھوٹے بڑوں کے سامنے یا
بڑے چھوٹوں کے سامنے پڑھتے ہوئے ہچکچائیں
قطعاً ترک کر دینے چاہئیں۔

اسی سلسلہ میں اتنا عرض کرنا اور ضروری ہے
کہ قدما اپنے ذات کے متعلق شعر میں یا تو انتہائے
تعلّی روا رکھتے تھے یا گدایانہ تملق۔ دور جدید کا شاعر
ان دونوں کے درمیان میں ایک راہ نکالتا ہے۔
وہ ایک خوددار غیور عاشق ہے اور حد اعتدال سے
تجاوز پسند نہیں کرتا۔

ز۔ قدیم شاعری کے بڑے حصّہ کا خصوصاً لکھنؤ
کی شاعری کا دارومدار زیادہ تر لفاظی پر رہا ہے
مراعاۃ النظیر۔ ایہام وغیرہ چند صنعتیں تھیں جو ہمارے
شعرا کی مایۂ ناز تھیں خصوصاً صنعت ایہام تو اس
کثرت سے برتی گئی کہ اب اس میں نام کو لطافت
باقی نہیں رہی۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

کب دل سخن تلخ سے کھٹا نہیں کرتے
تم اپنے ترش ہونے سے چوکا نہیں کرتے

دل چوڑیوں میں ڈھونڈوں کہ چھلوں میں کہتا
ہاتھوں سے بتانے کا اشارا نہیں کرتے

صحرا میں آنکھ دیکھ کے اُس مے پرست کی
ڈھالی صراحی آہوئے مشکیں نے جست کی

غرض کہانتک مثالیں لکھی جائیں۔ اب زمانہ
نے ان تکلفات باردہ کا ورق اُلٹ دیا۔ اہل سخن نے
دیکھا کہ یہ قیود اظہار مطلب میں معین ہونے کی بجائے
اور مخل ہوتے ہیں چند زمانہ شناس بزرگوں نے
پہلے ہی اس کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ اب شعرائے
حال نے ان رعایات کو یکقلم ترک کر دیا۔

ح۔ تراکیب جدیدہ۔ متغزلین حال کے اشعار میں
قدم قدم پر نئی فارسی ترکیبیں نظر آتی ہیں جن میں سے اکثر
نادر اور لطیف ہیں۔ ان تراکیب سے تحسین کلام کے
علاوہ ایک فائدہ یہ ہے کہ ایک بڑا خیال چند لفظوں میں
ادا ہو جاتا ہے۔ بخوف طوالت صرف چار پانچ مثالیں
دینا کافی ہوگی۔ (عزیز)

نظر کرشمہ پیما تجھے کیا اثر ملا ہے
ترے دور میں کبھی تو کوئی ہشیار رہتا

ایضاً

یاد آگئیں وہ حسن کی یوسف فروشیاں
ہنگامہ خیز عشق کا بازار دیکھ کر

(جگر) جو جہنم میں بھی فردوس بہ داماں ہونگے
دیکھ لینا وہ ہیں سوختہ ساماں ہونگے

(ایضاً) شعلہ سامانیٔ غم پر نہ کرو ناز جگر
تم سے کتنے ہی جگر شعلہ بہ داماں ہونگے

(فانی) نالے ہیں نہ آہیں نہ خلش ہے نہ تپش ہے
باقی نہ رہا کوئی زباں دانِ تمنا

(ایضاً) احساس غیر بادہ گوارا ہوا مجھے
لا جام ساقیا ئے مینا گداز کا

(رواں) اللہ اللہ یہ عرفان محبت کا اثر
خار کو خار نہ سمجھا ترے سودائی نے

یہ چند امور ہیں جن کی بنا پر ہمارا دعویٰ ہے کہ موجودہ تغزل پہلے کی بہ نسبت واقعیت کے زیادہ قریب آگئے ہیں اور قلوب پر زیادہ اثر کرتے ہیں۔ زمانہ کی رفتار بدل رہی ہے اور ارباب فن کو احسن الشعرا کذبہٗ کی بجائے اصدقہٗ کی ترمیم پر مجبور ہونا پڑا ہے۔ یہی حالت رہی تو وہ دن دور نہیں جب ہماری شاعری کا دفتر عربی نقاد کے معیار پر پورا اترے جس کا فیصلہ یہ ہے۔

وان اشعر بیت انت قائلہ ؛ بیت یقال اذا انشدتہ صدقا

یعنی سب سے بہتر شعر جو تم کہہ سکتے ہو وہ ہے
جس کو سنکے لوگ [illegible]

ناتمام رہجائے گی اگر اسقدر اور عرض نہ کر دیا جائے کہ موجودہ تغزل میں بھی چند نقائص ہیں۔ کچھ تو وہی ہیں جو پرانی ایشیائی شاعری کے آثار باقیہ میں سے رہ گئی ہیں اور اب روز بروز مفقود ہوتے جا رہے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں کہ رنگ جدید کے ساتھ شاعری میں داخل ہوگئے ہیں۔ مثلاً متغزلین حال میں سے بعض کے یہاں خیالات میں اسقدر اشکال و اغلاق ہے کہ شعر معما یا راضی کا سوال بن کر رہجاتا ہے۔ شعر کا تعلق براہ راست قلب سے ہے۔ اوس کو دماغی ورزش کی چیز بنا لینا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ اسکے علاوہ دور جدید کے شعرا مضمون کے سامنے اکثر صحت زباں کی پروا نہیں کرتے۔ یہ صحیح ہے کہ زبان کی صحت کا مسئلہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے مگر اوس کو سرے سے نظرانداز کر دینا زبان کے ساتھ صریح ظلم ہے۔ معنی لطیف و عبارت فصیح کی مثال آب زلال اور جام زریں کی ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا ایک باکمال شاعر کا فرض ہے۔ بعض اصحاب کی رائے ہے کہ تغزل کو شاعری کے دائرہ سے یکسر خارج کر دینا چاہئے۔ ہمارے خیال میں یہ مشورہ قطعاً نافہمی پر مبنی ہے جب تک انسان میں جذبات لطیف موجود ہیں وہ اُن کے اظہار کے لئے کوئی راہ ضرور تلاش کرے گا۔

قومی۔ سیاسی۔ نیچرل اور مذہبی شاعری یقیناً زیادہ
[illegible]

مسرت وغم سے بھی بالکل قطع کرلینا ناممکن ہے البتہ
یہ ضرورت ہے کہ غزل کو زیادہ موثر اور مطابق فطرت
بنانے کی برابر سعی کی جائے۔ معہذا ہر چیز سے صرف اسی
امر کی توقع کی جائے جو اس کے دائرہ عمل کے اندر ہو۔
غرض عصر جدید کے رنگِ تغزل کو دیکھکر ہر
غیر جانبدار نقاد اپنے کو اس فیصلہ پر مجبور پائے گا کہ موجودہ
تبدیلی بہتر ہے اور اب یہ داغ کہ اردو شاعر زبانی طوطا
مینا۔ بنایا کرتے ہیں ہمارے شاعر کے دامن سے بہت
کچھ دھل گیا ہے۔



# عیدِ مُبارک

(از منظور حسین صاحب شور)

اے کہ! تیرا حُسنِ فطرت نازشِ چشمِ یقیں — اے کہ تیری آستان بیشک سزاوارِ جبیں
اے کہ! تیرا نطق تسخیرِ قلوبِ دوستاں — اے کہ! تیری خامشی صد معنی لطفِ بیاں
اے کہ تیری طبع عالی مظہرِ صدق تمام — اے کہ! تیری مدح میں جوشِ عقیدت تشنہ کام
تیرا آئین کرم آئینہ دارِ دوستی — تیری ہر مہر و عنایت صد بہار دوستی
اے کہ! فطرت تیری ہے محمود۔ تو محمود ہے — حُسن کی تیری فضا بے شبہ لامحدود ہے
تیری دلسوزی ہے مجھکو مایۂ نازِ نیاز — قدرِ محمودی کے باعث بڑھ گئی قدرِ ایاز
میں محبت کا کروں دعویٰ مری مقدور کیا — ذرۂ بے مایہ میں جوں مہرِ تاباں نور کیا
میکنم ہر بار لیکن ناز بر حسن تمیز — مظہرِ لطف و محبت را بدل دارم عزیز
ہاں مبارک عید ہو یہ ہے پیامِ آرزو — تا ابد قائم رہے یونہی نظامِ آرزو

شام ہو شامِ محبت صبح صبحِ عید ہو
زیست کا ہر دور یارب مطلعِ اُمید ہو

# Laugh and Grow Fat

BY

A. A. DESAI, XI B (1)

**A Witty Excuse**

A thief was brought before the magistrate on the charge of stealing a coat.

"Why", exclaimed the magistrate, "You are the very man, who was brought before me last year for the same offence.'

"But may it please your lordship," replied the robber without hesitation. " a coat can not last for one year."

* *

**A Cutting reply**

In accordance with one of Shakespeare's plays an actor vehemently cried out. "A horse, a horse, my kingdom for a horse." A voice from the audience was suddenly heard saying. "Will an ass do, sir?" "Yes please, come up," was the only reply of the performer.

* *

**Trifling with Ignorance**

While moving in a train a father took his young son's cap and pretended to throw it out of the car window. To the bewilderment of the child he produced the cap after some pretensions of magic. A few minutes later the child threw the cap out of the train. "Now papa," pleaded the child, "do produce the hat by your magic."

* *

**My wife.**

"Yesterday," said Jabson, "I refused a poor woman a request for a small sum of money and in consequence of my act I passed a sleepless night. The tones of her voice kept ringing in my ears the whole night."

"Your softness of heart does you credit," said Mabson.

"Who was that woman?"

"My wife."

* *

**New Currency**

It was a miserable day, and the bus conductor was not in a very cheerful frame of mind.

It so happened that one passenger had insufficient money to pay his fare. But he managed to find a couple of farthings and a half penny stamp. These he tendered to the conductor.

These proceedings were watched with much interest by brother passengers, who were anxious to see what the conductor would do.

Turning to the next fares, the conductor smiled bitterly.

'An what 'ave you brought?' he inquired. "Jam-jars?", was the reply.

Printed and Published by Ashfaq Mohammed at Aligarh Printing Works, Aligarh.

dog, on which he had taken compassion. Everyday he went into a neighbouring village for food, but suddenly his visits ceased, while the dog daily ran down the village street, barking in a distraught manner. After a week another wood cutter, struck by the dog's insistance, went in search of its master and found him lying in the hut shivering, with the dog doing its best to comfort him A tree which the man was felling had fallen and seriously injured him. He only had the strength to crawl to h's hut, taking an hour to cover six yards, with the dog constantly licking his face to revive him. Once inside, he lay helpless just able to stretch out hand for food and the man said he would have died had it not been for the efforts of the dog to keep him warm The woodcutter has now been taken to hospital, where the dog is to be allowed to sleep by his master's bedside.

(London).

# Here and There

BY

A. A. DESAI, XI B (1)

**Tax on Bachelors.**

Mustapha Kamal the Turkish President is taking a leaf out of Signor Mussolini's book, as a Bill deposited in the Angora National Assembly provides for special taxation of all bachelors between the ages of 25 and 45.

The tax will be a heavy one and it is hoped that this measure will encourage the younger generation to marry.

Statistics show that the death rate in Constantinople considerably exceeds the birth rate, and this is causing the authorities anxiety.

* *

**World's Greatest Light.**

Whether or not the one square mile of the city of London is the best polished area of its size in the world, it is probably the most lighted. The total light of the City's street lamps aggregates 1,260,000 candle power, and this is almost equally divided between gas and electric light. Its main thorough-fares as Cheapside and Queen Victoria street are illuminated by electric lamps of 3,000 candle-power each fitted with dioptric lenses, and high pressure gas lamps of 2,000 candle-power. But even the City's lamp, if concentrated in one great light, would be feeble compared with the great light of the serial light-house recently created 2,000 ft. above sea level on Mont Afrique, France, which has a candle-power of 1,coo million. This is easily the most powerful artificial light ever produced.

* *

**A Dog's Devotion.**

A stray dog saved the life of a man who had befriended it. The man, a woodcutter, lived alone in a hut in the forest his only companion being the

power there was none except the stalwart Ruskin who preached the gospel of beauty : he may fittingly be called the prophet of the religion of beauty.

In 1859 he married Miss Jane Burden with whom he had fallen in love sometime before. Before his marriage he had written several small poems under the guidance of Rossetti. They were collected, and published under the name of " The Defence of Guenevere." These poems created very little interest in the literary world, and its sale was extremely limited. At that time Tennyson was reigning supreme in the realm of poetry. His poems as we all know were exceedingly pure exquisite and fascinating. In the face of such poems it was impossible for the " chaotic, mediaeval scraps of wind music" to prosper. There was nothing of art or philosophy in them. In fact the atmosphere obtaining in England in those days was uncongenial for the genius of Morris. It was after the death of Tennyson that people could appreciate the bright jewels and the sweet flowers of " The Defence of Guinevere.' As long as the influence, of Tennyson was supreme, no attention could be paid to these poems all, sprinkled over with Mediaeval colouring.

busts of the church must have been of very great interest and attraction to him. Not only these, but the Woodford Hall and the beautiful country round about the river Thames grow to their full stature in one form or the other in the lines of his poetry.

In 1843, he was sent to a school, while from 1848 to 1851 he resided atMarlboroughCollege where he established his reputtation as the best story-teller, and as an enthusiastic student of art and Architecture. In 1852 he was at Oxford where he met for the first time Buney-Jones, with whom he formed a life long friendship, and who was destined to play an important part in moulding William's future career. In both of these colleges, William's life was lonely; he did not play any game, but on the other hand he was swallowing up book after book on Art and Architecture. His life at Oxford was well-suited to his taste, "the Mediaeval city, that vision 'o grave roofed houses, and the long winding street, and the sound of many hills' was an ideal nursery for their (William's, and Burney-Jone's) dreams. But Morris speaks bitterly of Oxford. Is it not very heartless and cruel of him to hate his Alma Matar so profoundly? The atmosphere of the University, the sequestered recesses of Seminar, the amount of freedom he enjoyed, the strong tie of friendship with Burney-Jones, and later with Swinburne and other kindred spirits; the long walks that he enjoyed in the company of great artists, and the large number of debates and discussions in which he participated in made him in due course of time one of the most intellectual luminaries of England.

He took his degree in 1856, but because he enjoyed a personal income of £ 900 a year he settled down to an "artistic" life of peace and pleasure without taking to any prosaic profession. His friend Burney-Jones also abandoned the idea of the church as a profession; "art was to be the mistress: for Burney Jones, painting: for Morris the career of an anchitect. Both of them shifted on to London, and were happily spending their spare time with their common friend and guide, the poet-painter, Rossetti. Morris had already spent a great deal of his time in going about tc study the masterpieces of painting both in England and France. At that time there was a great upheaval in the social conceptions and poetic notions of England owing to the Crimean War, and the new Scientific discoveries and researches. The old hymns were upset, and their place was taken up by the new theories of Darwin and Spencer. Materialism was at its height; and amidst this din of wealth and

# William Morris A Study

BY

Mr. A. SHAKOOR, M. A.

William Morris was born at Elm House, Waltham Ston, on March 24, 1834. and was the third child of his parents in a family of nine children. His father was a billbroker, and his financial condition remained quite prosperous till the year of his death, 1847. William was a healthy and stout boy, but in those days there was nothing remarkable about his intellect and imagination. He did not show any trace in his boyhood of those intellectual qualities that made him a remarkable figure in the literary and artistic circles of England in the later half of the nineteenth century. ' It is a happy chance that his whole childhood may be seen at a glance as on a single splendid fragment of his own romance-empurpled tapestry."

In 1841, Morrisons left the Elm House, and shifted on to Woodford Hall in Essex. There he was seen on a Shetland pony with curly hair in the guise of a world champion riding through the forest like a breast plated knight hunting dreadful dragons and killing imaginary giants. This mediaeval knight in the fitness of things became the author of "Guenevere," and "The Earthly Paradise."

At the age of 4, William became interested in the pictures of Waverly Novels, and when he was 7 he had already devoured a large number of Marrayt's and Scott's popular fictions. The hall in which he lived was a building of the old type, in which mediaeval customs prevailed, and mediaeval festivities were scrupulously observed. In fact, the very atmosphere in which he passed the early days of his life was thoroughly antique, and these surroundings and conditions of life left a lasting impression upon his mind, and are occasionally mirrored in his poems.

At the age of 8, his father who was a keen lover of old architecture took him to see Canterbury, and in this trip William could get an opporttunity of seeing a large number of old antique buildings besides the Church. He was of a romantic bent of mind, and undoubtedly the faintlighted vaults, dark aisles, the cold mysterious tombs, and the long galleries full of paintings, statues, and

he is one of those poets the rarest of all, who serve as channels to convey the enjoyment of what is real poetry to those vast numbers of human race, the majority by something like 99 to 1, who are intolerant of political quintessence in unadulterated draughts. The benefits conferred by these can hardly be exaggerated. "No matter sometimes the aforesaid great poets composed in direct rivalry to him, he would not make his poetry a source of bitterness or displeasure. It was a boon of happiness to the mankind and not a means of pinching other's feelings. Scott thus in his poetry has left an everlasting source and spring of joy which shall never fail or dry, and which shall be equally profitable for the people of all ages to come.

close air of theatres, his poems dealing with luxury and softness. "The poetry of the former is sublime but real while of the latter is low and shallow. Scott always dealt with widespread truth without prejudice and without narrowness of heart. He had frank liberal views. About love he said,

"It is a silver link, a golden tie,
That heart to heart and mind to mind
In the eternal union can bind."

Poetry has two aspects according to its true value. One is its historical position, the other is its purely intrinsic merit as regards imaginative speculation. In the first channel none should vie with Scott. Saintsbury says, "from the historic point of view hardly the greatest poets exceed Scott in importance" It was merely on his account that a regeneration and conversion of thought of people was possible otherwise the greatest poets of the new school, Coleridge, Wordsworth, Shelley, and Keats had to wait a considerable time for their due acceptance, and "if the work would have been left to them alone, the progress would have been slower still. The education of Scott had been irregular and it perhaps had made him careless in the minute details of phrase, construction and sometimes rhyme.

But Scott would always look into life of things and had a "sound healthy love of wild scenery." Scott would notice everything with a "painter's eye," and it had been a part of his practical creed that literature should be a staff and not a crutch. He always adhered to this definition and acted according to it. In fertility of mind and resourcefulness of subjects, speed and variety and depth of interest, Scott was peerless. His greatest claim is as a war poet and in that respect he is compared with Homer. In describing the glow and fire of battle, the speed and activity of warriors, Scott had a great command. In the 19th century Scott was able to recreate a charm for the old tales and romances. This was a special gift of God to him.

"His legendary song could tell
Of ancient deed, so long forgot;
Of fueds whose memory was not,"

The charges and faults of Scott for centuries have been mis-represented. Some of them are hyperbolic in toto, and others are multiplied in their draw backs. The commonplace natural fluctuations are sometimes taken as grave mistakes. But indeed a true candid critic says about him that "above all

(1813), The Bridal of Trierman, The Lord of the Isles (1815) and Harold the Dauntless' These poems did not make augmentations to his repute as a poet. Some of them received merely a cold reception in the public and discouraged the poet too much. who consequently gave up the art soon after. He found no use in rivalling the popularity of Byron as a poet who had "beat him" Instead of vainly "striving against wind and tide," he took up prose writing, where he proved to be a matchless and unparalled writer.

**A Criticism on Scott's Poetry.**

In poetry Scott holds a disputed position. There are some critics who say that "Scott's poetry is not great, considered as poetry," while others say that he was a "pioneer poet." Nevertheless as a song writer Scott occupies an unchallenged position in English literature. "He was though no musician, one of the best song writers in English, and when he gave up poetry for novel writing his magnificent faculty for improvising verse still found vent in mottos, songs, and snatches included in movels themselves.' Scott like Wordsworth tried to create the taste by which he was to be appreciated and admired. The people had begun to look into the beauty of the ballads and were ready to embrace the simpli city of Metrical Romances. Carlyle says that "It was a time for such a new literature ; and this Walter Scott was the man for it." Marshall quotes a stanza from Marmion which about Scott says,

> "The mightiest chief of British song
> Scorn'd not such legends to prolong ;
> The gleam through Spenser's elfin dream,
> And mix in Milton's heavenly theme.

Scott had really discovered the true spirit of the country. He had a control over it and could mould it in any way It was under his subjugation and he could always dominate over it without friction or collision "As long as Sir Walter Scott wrote poetry" says James Hogg "there was neither man nor woman ever thought of reading or writing anything but poetry. But the instant that he gave over writing poetry. there was neither man nor woman ever read it more. All turned to tales and novels.

Walter Scott had ceased writing poetry because he was beaten by Byron, but there is a wide difference in the Metrical Romances of the two-Scott's poems are full of healthy, generous life and with him one "would tramp the heathes and ford the rushing streams." With Byron one would be in

ballads and legends. The Countess of Dalkeith, wife of the heir apparent of the dukedom of Buecleuch, took interest in Scott's Minstrelsy, and asked him to write a ballad. He consented to the proposal and connected the story to the house of Buecleuch. Sir John Stoddart who met Coleridge at Malta conveyed to Scott the idea of the four-beat couplet of the unfinished Christabel. Scott introduced the metre in his Lay of the Last Minstrel published in 1805. The lay made his reputation. Scott thought that 'the attempt to return to a more simple and natural style of poetry was likely to be welcome." The popularity of the Lay can be witnessed by the fact that fourteen editions of it followed in rapid successions and in 25 years about 40,000 copies were sold. In the Lay there was "the vivid description of Border life and the escape it afforded from the commonplace." The simple feelings, interesting story brilliant energy, and common incidents of the life added grace to the charm and beauty of the Lay. Scott also received kindly entertainment for the Lay at Newark Castle the seat of the Duchess of Buccleuch. Scott said,

"When kindness had its wants supplied,

And the old man was gratified
Began to rise his minstrel pride.

In the Lay, Scott had avoided the common fault of the old ballads of "rambling, discursive and disconnected structure." Marmion, Scott's best poem appeared in 1806. It was written to relieve "grave cares," and at once became the most favourite poem of the commonality. People would be constantly reading it in solitary places and muttering it in streets. Its four-beat metre took the people by madness. The popularity of Marmion, Scott himself says, "almost lifted him off his feet.' In it Scott was not only as "the painter or the vivid narrater" but really "a student of human nature, the disector and describer of passions and emotions'.

In 1810 another of Scotts famous poems namely Lady of the Lake appeared. It established the fame of Scott. He described the beauty of the rugged country so well that many English people flocked to see the poet and the country for themselves, and Scotland also became a fashionable country. About these poems Scott's son-in-law and biographer Lockhart says, "The Lay is I should say generally considered as the most natural and original, Marmion as the most powerful and splendid. The Lady of the Lake as most interesting, romantic, picturesque and graceful of his great poems." Later on Scott wrote other poems like Rockeby

begin his literary life as a poet. Carlyle in his review of the "Life of Scott" by Lockhart charges the poet for an "extempore speed in romantic composition" which he said was accomplished "without preparation." But Scott perhaps had foreseen the evil. He says that "the preparation began from his boyhood and almost with infancy.' The fire was there but it required fanning to kindle up. The germ of Romanticism in him required nourishment to breed and to bear fruits. For his own self Scott says "he was like an ignorant gamester who keeps good hand till he knows how to play it." Scott only required a spur to diffuse his poetical instinct. In 1788 he attended a lecture of Hewny Mackenzie on German literature. Scott began to make a secret study of Romance. Meantime Mrs. Barbauld visited Edinburgh. She recited some part of the English translation of Burgher's Lenore and repeated that.

"Tramp, tramp, across the land they speed

Splash, splash across the the ses."

Scott's ambition rose high on hearing these lines, and this impulse was much strengthened by the study of Lewis Monk. He obtained a copy of Burgher, translated several of the ballads and published them in 1796 in the form of Chase, William and Helen, which were the start of his feverish trade of poetry."

Scott perchance met Lewis personally, and talked to him. "If I fell behind him in poetical powers" says Scott, "I considerably exceeded him in general information. I suddenly took it into my head to attempt the style of poetry by which he had raised himself to power.' He read Goethe's drama, Goetz Von Berlichingen' and published a translation of it in 1797. The study of the book evolved new ideas and aspirations in his heart and he thought that why he should also not do the same which Goethe did for ancient feudalism of the Rhine. Early in 1801, Scott produced some original work in the form of Glenfinlas. The Eve of St. John; The Gray Brothers and Cadyow Castle. The practice of ballad writing had been out of date and to revive it Scott how to toil.

Scott now had finally decided to stake his spontaneous and versatile faculty for the composition of poetry. In 1802 and 1803 he published the three large volumes of Minstrelsy of the Scottish Border. He had really undertaken an interesting subject and had poured it through a suitable metrical vehicle. Scott even insisted on his friends to collect the Border

of baronial splendour and hospitality on a scale suited to his large literary revenue. Scott suddenly discovered that the foundations of his fortune were unsubstantial." The situation was still more serious, for soon he was astounded to find himself under a horrible debt of £ 1,30,000, But this did not unnerve him. Scott was a stout bold hearted man. He would not allow for his friends compliments of any reduction of the amount from the creditors. He said, "I involve no friend rich or poor, my own right hand must wipe out the debt.'

At an old age of fifty-five, Scott began his life once more He produced many novels to pay off the debt and so wonderful was the success that before his death, he had paid of £ 70,000 of his debt after an exertion of six years. His books brought so much money that in fifteen years after his death the whole debt was wond off. Scott's sense of honour and firmness of spirit in refusing others help had been perhaps unique. "How Scott's pride rebelled against the dishonour of bankruptcy, how he toiled for the rest of his life to clear off this enormous debt, declining to all offers of assistance and asking no consideration from his creditors except time, and how nearly he succeeded, is one of the most familiar chapters in literary history, and would be one of the saddest were it not for the hercism of the enterprise." His hard working had a bad effect on his health, and the protracted illness considerably pulled him down. He was advised to go abroad for reparing health. Scott's health was a national concern. The government gave him a warship to sail to the continent but he could make no improvement even there and asked to return, for he said he wished to die at Abbotsford.

Scott rerurned back, but condition grew worse. Still he could not forget his studies. One day he asked his daughter Sophia to put pen into his hand. He endeavoured to close his fingers, but they refused their office. Scott fell back among his pillows, tears rolling down his cheeks. The illness grew fatal, but still "the gentleman survived the genius." A few minutes before death he said to Lockhart, "My dear, be a good man. be virtuous be religious be a good man. Nothing will give you comfort when you come to lie here." at last Scott hreathed his last on September 21, 1832 before all his children. His remains were interred at Dryhurgh Abbey.

**Scotts Poetry and his Poetical Works.**

Nature had imparted to Scott the true genial spirit of a poet. He, therefore, had to

were extravagent. The high salary now had enabled Scott to pursue his literary under takings most fervently and ardently. He was enjoying a prosperous rather a luxurious life. At Abbotsford he bought a large estate and built an elaborately Gothic house near the Tweed. He to one of his friends wrote, "As for the house and the poem, there are twelve masons hammering at the one, and one poor noddle at the other so they are both in progress." His house at least was complete. He loved it, and would spend long hours in looking after the plants of his garden.

Scott possessed a magnanimous nature. Every one would feel happy and cheerful in his company and so his house was always thronged by visitors, invited and uninvited. He himself would make expeditions into the surrounding country. Mar shall says, "He would sit and talk with a poor man in his cottage, listening to his tales of long ago, with the same ease and friendliness as he would entertain the great in his beautiful house" Among the commonality he was called a "Gentleman." But his evil days were approaching. His prosperity was to vanish soon, and he was to be vanquished by misfortunes and degradation. He was unwittingly fetching him to the blasting sea, nay he had dug the pits of ruin for himself unprecedented. He committed the silly blunder of the establishment of the printing house of John Ballantynes & Co., Scott had fallen out with his old publishers and had secretly become partners with the Ballantynes. This displeased Jafferey who for hostility and resentment bitterly criticised Marmion Little after, the warehouse of the firm was filled with unsaleable stock. The firm thus began to suffer a financial loss but the situation was concealed from him. The loss was multiplied by non payment of debt. Scott on account of his literary engagements could not scrutinize into the management of the firm but he was solely responsible for its welfare. The affairs went adown and became worse. When he was informed of the state of matters and was demanded to submit the required amount he said 'for Heaven's sake treat me as a man and not as a milk cow.' He wrote Rockeley in 1813. Its proceeds were swallowed up and still the bankruptcy was inevitable. The imminent danger could not be avoided or escaped from. The curse had fallen on his head.

To this effect W. Morrison says that "towards the close of 1825, after 11 years of brilliant and prosperous labour encouraged by constant tributes of admiration, homage and affection such as no other literary potentate had ever enjoyed, realizing his dreams

sought by professional antiquarians of the age.

**II. The Ebb and Flow of his Fortune.**

When sixteen years old, Scott's father apprenticed him to his own profession, but Scott did not concur with the idea, as he preferred the profession of bar. In 1792 he was admitted to the faculty of advocates. There he was "a boon companion in the jinks of the Junior bar." He studied law for four years with considerable pains, but all along he aimed at some comfortable appointment which might render him ample leisure for the execution of his literary pursuite which was his chief object of love in life.

Often men's wishes bear fruit, and mortal prayers and desires are favoured and expediently granted by Heaven. Thus Fates themselves follow men's aspirations, and impart good luck to human beings. Scott's hazy dreams for a post were soon materialised and his joy was beyond expression when he received the office of Sheriff deputy of Selkirkshire in 1799. The office was really a message of future happiness and prosperity for 25 years to come.

Scott could raise his income to £ 300 through the aid of his wife whom he had married in 1797. His wife was his lady love. Scott had a visit to the English Lakes with his brother and a friend. There he saw a charming beautiful maiden riding on a horse. The maiden's beauty captivated and almost won the young Scott's heart. He fell in love with her at the very first glance; perhaps he was true to Shakespeare's dictum that "they never love who never at the first sight." The lady was Charlotte Margaret Carpenter, the daughter of a French refugee who had taken shelter in England from the fury of the Revolution. He made a sincere and active courting. In less than a year he gained the lady's heart and good favour. He soon married her and took him to Scotland. His marriage indeed had been a great bliss to him for it added much to the pleasures of his life. It really brought a sterling and faithful solace to his soul. Thus he could spend many years of perfect happiness with his wife, which were only perturbed most horribly in the last years of his life.

In 1801 Scott with his dear wife had taken abode at Achestiel but he had to leave the place soon after. In 1806 he was also invested with the duty of the office of clerk of Sessions. He discharged his duties with utmost capability and zeal. His income in 1812 had reached to £ 1,600 a year which was a more than necessary sum to meet his expenses, which in no way

The chief food of the Aryans consisted of milk, ghee, grain, vegetables and fruit. They had no scruples about sacrificing bulls and cows, and ate horse-flesh and beef. They drank fermented liquor made of the juice of Soma plant. This juice was considered highly acceptable to gods and was offered at sacrifices. It was the "Amrita" or nectar of the gods. Another kind of liquor used was known as Sura and was probably made from grain.

The chief occupation of the people was 'cattle rearing. Next in importance to it was agriculture. Wheat, barley, beans and sesame were sown. Hunting and fishing was also practised. Among other occuptions, those of the wood-cutter, carpenter, tanner, armourer, smith and the potter are mentioned. Trade was barter only and coins were unknown. There are no allusions to royal palaces, great temples or large accumulations of wealth.

Sufficient advance appears to have been made in mechanical arts. The soldiers wore armour and fought with bows and arrows, spears and battle axes. Kings and the wealthy fought in chariots drawn by horses. They appear to have known the use of ships.

> "He, Varuna knows thepath of birds through the air, and sovereign of the sea, he knows the ships that are thereon.

The Aryans were divided into many tribes, A common language and similar religious observances united these people. They were patriarchal people—that is in each family the father was the head and master. As the family grew large, the sons separated and formed different families. Those families formed the clan—made up of several families all related to one another. The clan in the same way grew into a tribe.

The land of the tribe was made up of settlements, of clans, and each settlement was made up of a number of villages.

The tribes were governed by a chieftain or Raja. The Raja was generally elected though sometime he succeeded to his office by reason of his birth. The Raja however was not absolute. His power was limited by a tribal council whose advice the king was bound to ask and take.

Caste in its modern form did not exist, but there were different classes of people. One man was not considered better than another by reason of his occupation, One Rishi says of himself.

> "Behold, I am a baker : my father is a physician, my mother grinds corn on a stone, we are all engaged in different occupations."

phenomena of nature attribute them with a childlike simplicity to a divine agency. With this springs up the idea of the personification of the forces of nature. There are no idols, no temples, no priests—in fact it is a religion of open air worship. After some time the religious speculation begins and we find the Rishis attempting to look beyond the vast number of gods to the God himself There is a desire to know, the Unknown—the One Almighty God that governs the whole Universe.

"The Vedic Aryans were martial energetic people, tall and of fair complexion, fond of hunting and chariot racing, music and dancing and often given to alcoholic drinking and gambling yet with a well ordered mode of life and high moral-ideals." They knew how to till the earth and rear cattle, to build houses, waggons and boats, to make utensils and arms in copper and iron, to weave hemp and wool and erect citadels.

Women were held in great respect and were not secluded. They were educated as some of the Rishis who made hymns were women. They took a part in the sacrifices and the performance of their religious rites. Women, sometimes at least, chose their own husbands at the ceremony of Swayambara,

*"The woman" gentle in nature and graceful in form selects* from among many her own loved one as her husband." (Rig Veda).

The second marriage of widows was sanctioned:

"Rise up woman : thou art lying by one whose life is gone, come to the world of the living, from thy husband and become the wife of him who holds thy hand and is willing to marry thee." (Rig Veda).

There is no evidence in the Rig Veda of the practice of Sati.

The dead were sometimes burnt and sometimes buried as is evidenced by the following funeral hymns :

"O thou departed one: go to the wide earth as to a mother, let the heaped up earth liee lightly on him."

2. "O fire do not give the deceased pain, send him to the home of our fathers as soon as his body is burnt in thy heat."

The Vedic Aryans were generally monogamous, though their chieftain sometime had several wives.

The Aryans were particularly fond of cleanliness and with it originated the idea of purity and later on of caste. They prided themselves upon being well dressed and "both men and women took great pains with their toilet." The barber's razor was known and used.

there no caste system in Europe when racially the people of that continent come from the same stock as the Indo-Aryans. The reason is not far to seek. The institution of caste was the result of peculiar environments in which the early Aryans found themselves when they came to India. They had come into a country inhabited by a dark-skinned people whose dress and habits and food and religion were not in the least like their own. At first they mixed with the people, but later on they realised that this unrestricted intercourse with the aborignes would tell upon their mental and physical health. It was thus the pride of race and the pride of colour and of civilisation that impelled these people to cut themselves off from the Draividian by religious legislation. The underlying idea was the preservation of the Vedic ideal of life and the laws became stricter and more rigorous "as alien influences supervened and threatened to subvert the religious foundations of Aryavarta."

Judging from the needs of the age, it was a farsighted measure calculated to preserve the identity of a superior race ; the philosophical justification of it was different. It was based on the belief of the Hindus that appointed place of a man in the Universe was determined by Karma or "the coumulative effect of conduct in past lives upon the present one." This doctrine of rebirth is the central idea of Hindu religion. The whole future of man, his spiritual advancement as well as his worldly happiness, depended how he conducted himself in the station to which he was born.

Another cause which certainly contributed to the formation of castes was the need of making rules for preservation of health. Cleanliness is next to godliness and the idea of purity grew up as a part of the Aryan tradition.

The institution of caste is about 3,000 years old. There are not less than 2378 main castes besides a great many sub-castes. Race has little concern with caste, nor is it necessary the members should follow the same sect. It is exclusively determined by birth and transition from one class to another is impossible. The essential duty of a member is to render unquestioning obedience to the laws of his particular caste particularly in relation to diet or marriage. Any violation of such rules may result in expulsion from the caste.

Caste has played a very important though a silent part in the economic, social and political development of the Indian people. "Caste was India's substitute for nationality. It gave to individual the permanence and

First in importance was the class of nobles called Rajayana or Kingsmen, their duty being to fight for the tribes. There was afterwards called Kshattrayas. The next in importance were the priestly families who performed the sacrifices for the family or the chieftain. The rest of the men of the settlement were called Vaishyas or farmers who tended the cattle and tilled the land To these were later on added the mass of conquered people who had either been captured in war or who had settled voluntarily in Aryan villages. Thus, caste in its rigid form did not exist in Vedic times. It was originally only a distinction based on profession and "arose in India from the permanent separation of the priestly and warrior classes from the people, in an age when the people had become enervated and feeble and those two classes usurped all power and dignity.

The duties of each class as fixed by God are set forth at length in the Code of Manu:

> "The Brahmin is the chief of all created beings, he is an incarnation of God. Everything in the world belongs to Brahmins. All other classes enjoy life but by the kindness of Brahmins.

There is no greater crime of *on earth than to kill a Brahmin.* Never shall a king slay a Brahmin, though he be convicted of all possible crimes. Let not a king make a Brahmin angry for he could destroy him and his army by a curse. All things were made by Brahmins. A Brahmin could frame other worlds even new gods, if he chose.

The Veda and other holy books are on no account to be taught to women or to Sudras. He who teaches them to a Sudra or shows him how to get rid of sin (except through a priest) sinks with him into hell.

The Sudra is a slave and must always be a slave. God made him to be a slave to Brahmin. "Even if his master set him free he remains a slave, for how can a man be set free from that state in which God made him."

Caste is an institution peculiar to India. In all countries and in all nations there are classes of people of high rank and of low rank, rich and poor, servant and master but nowhere has humanity been so divided into groups as to admit of no social intercourse. Those of one caste may not marry with those of another, nor even eat with them. The caste of a man is determined by the mere accident of birth and when once a man is born in a caste transition into another is impossible.

*The question arises why is*

# Sir Walter Scott as a Poet

BY

S. RASHIDUL HAQ-XIIth CLASS

**I. Early Life and Education :—**

Sometimes to live in the age of great is even moie than to battle against the storm and the winds. At the sight of the welfare and progress of the others, one feels sanguine of his own success of becoming great at the expense of little effort. But the lively fascinating hopes of advancement soon fade away and are dissolved into mere nothingness and utter desperation, when one thinks of the seemingly impregnable barriers of competition and other difficulties which must be overcome beforeplucking the feather. The abominable look of these barriers disheartens, the imperfect and the slack alone, while the hope for uplift and betterment causes heavings in the breast of the zealous, and stirs the sentiments and ambitious feelings of the promising. To rise, every man has to compete and to excel his equals and his superiors in worth and quality. But the difficulties of such a competitor are much more enhanced if the time is shifting towards such an aspect of human conception and thought which is radically antagonistic to the former impressions in princip'e and practice both. For a complete mastery of these discrepancies an undaunted spirit profound knowledge and all round experience are essential and fundamental factors. Without these equipments all efforts of a novice to encompass any revolutionary movement will be futile alone. The 18th century was a reconstructive period of the English language.

A literary revolution was in play. " Literature had already begun to shake off it fetters of art, " remarks H. E. Marshal, and " Romance had begun to stir in her long sleep.' In 1765 Bishop Percy's Reliques of Ancient English Poetry had appeared. In the first half of the century Mallet and Shenstone were making best for the Resurrection of the Ballad, but Percy's Book tried to clear " the prickly briar hedge that had grown up round the Sleeping Beauty, Romance. ' Although Burns, Wordsworth, Coleridge and Southey fought on Percy's side but " it was left for another knight to break through the hedge and make us free of the Enchanted Land. That knight s name was Walter Scott." This knight who was the very liberator of the English literary world was born on August 15, 1771, at Edinburgh in Scotland.

the communal interest which other races found in their national life.' The limits of a caste are not co-extensive with those of a political division. The consiousness of belonging to a particular caste in the absence of any other unifying bond created a community of interests and fostered a common spirit It lent stablity to the social system by making it independent of political changes. Besides securing the purity of race, it averted racial conflicts by assigning the non-Aryans a place though an inferior one in the social system of the Aryans. It further helped in the preservation of learning among the Brahmins and manual skill among the craftsmen. The caste organisation is to the Hindu his club, his trades union his benefit society, his philanthrophic society. The obligation to provide for kinsfolk and friends in distress is universally acknowledged, nor can it be questioned that it is due to that recognition of the strength of family ties and of the bonds created by association and co-pursuits which is fostered by the caste principle, which it is not quite easy to imagine."

On the other hand the caste system has split up society into separate units and has thus prevented natural and healthy intercousre among the classes. The division of society into castes has hindered co-operation for any purpose, religious, political or social by setting up a gulf between one class and another. It has fostered class pride and engendered jealousy. In the words of Sir Henry Maine, it is "the most disastrous and blighting or all human institutions." In the words of of Mr. Thompson, "it has fed the pride of the high born and taken hope and ambition from the lowly. Caste has much to do with making India that was stagnant and divided against itself.' But all nations are in a great measure responsible for their fate and "the people of modern India are slowly awakening to the conviction that it rests with themselves to cast asunder the broken links of an ancient chain and to rise to the dignity of free men and a united nation."

better at games than at lessons Scott would tramp the country side and his father feared his son might be a wandering pedlar alone. But his walks were not idle and worthless. A scoring of the country in search of ballads and other relics of antiquity was made under the disguise of solitary rambles. Very early in his life "he showed a tendency to stray from the path of orthodox learning into unfrequented but pleasant by-paths of romantic and antiquarian lore," says Lockhart. In his rambles Scott made a survey into the manners and social customs of the people that ultimately "were to become so eminently his."

Scott was really twice blessed. His father was conspicuous for methodical and rough industry, his mother was a woman of imagination. He probably inherited the best qualities of one and achieved the best qualities of the other. The young boy had a complex nature. He was not a cloistered cheerless student too much absorbed in books, but had a frivolous and jolly spirit. In contrast to this at the age of six he pronounced that he was a "virtuiso' and "one who wishes to and will know everything," When ten years old he had collected many ballads and chap books and was perhaps a connoissere in study of diverse interests. At school, Scott was not precise in his knowledge and study of Latin. In Greek too he was much belated. He did not relish it and its crabbed majesty did not suit his temper and taste. At last he resolved to part from it for good. Scott had a very keen and fine intelligence. He would brood deep into his lessons. Even Latin syntax which was an unpalatable dose to him he could follow in the class. His master said that "though many of his schoolfellows understood the Latin better, Walter Scott was behind few in following and enjoying the author's meaning." He was sincerely and deeply sensitive to the true analogies of his subjects, and the study was not a mere indulgence into the subject for exciting literature.

In the school life also "fame was the great spur' to him, but he would always tried to specialize in the subject. At fifteen, he read French so "that he might thoroughly understand and enjoy French romances." Scott had an immense passion for romantic literature. He also learnt Italian to study Aristotle in original. His versatility of mind was finding new vents and was adhering in the study of their departments of knowledge too. After twenty, he was well up in the art of deciphering old manuscriptss His assistance was sometime.

Walter Scott's father was a writer to the Signet. The young child had descended from a hardy race of a Border family which had never shrunk from war. He always took pride in his pedigree, and said that " according to the prejudices of my country (my birth) was esteemed gentle, as I was connected though remotely with ancient families both by my father s and mother s side..............I am, therefore, lineally descended from that chieftain whose name I have made to ring in many a ditty, and from his fair dame, the Flower of Yarrow no bad geneology for a Border ministrel.' His high estimation of his own family was a lesson to him and not a ban to painstaking hard work and progress. It was not shallow or sham. This estimation of good birth was above all sordid and mean feelings and had its own effect on his creative power and imagination. Scott justifies his pride of birth calling it as " natural to a man of imagination in this motley world, the family pride of the North has its effect of good and evil." All this had a double influence on him. It fetched him into courses that resulted as a consequence in the commercial ruin but it was also a spur to persevering exertion.

Though ruinous in the first case, it also became a working and guiding principle of his life, capable of inspiring and maintaining a most healthy and chivalrous conception of duty. His critics say that "it was his pride in their real or supposed feudal dignity and their rough marauding exploits that first directed him to the study of Border history and poetry, the basis of his fame as a poet and romance." However, this feeling or sentiment had an immense hand in the course of his future life.

At the age of 18 months a great misfortune fell on Walter Scott. He was attacked by a teething fever. Somehow or other he recovered from the fever but it resulted in the permanent lameness of the right leg. In childhood he had a desperately bad health so he was sent to his grandfather's farm at Sandyknowe to improve his condition. It made much for his health but what it did best to him was that it taught him the "delights of country life." There he developed a love of external nature and acquired the taste for ancint stories, traditional songs, and tales of old chivalry. He would attentively hear to the stories of Bruce and Wallace. After wards Scott was taken to the seaside and to London. On his return he was sent to the Edinburgh School and later to the University. He was generally irregular at school and was

sidered to be actually part of the Vedas. Brahmanas treat of religious ceremonies and contain "sacrificial directions, explanations, legends accounting for the history of different ceremonies of the sacrifices," The Upanishadas treat of God and the soul of man, embody the beliefs of holy Rishis about God, life, death, the soul and the origin of the world These beliefs were later on incorporated in the famous six schools of Indian Philosophy.

The hymns of the Rig Veda are of the character of prayers addressed to various gods "conceived as the powers of nature personified,' either as a thanksgiving for favours already received, or to avert the anger of a god, or for blessings and benefits yet to come. Sama Veda is the Hymn book or Psalm book of the Aryans. The hymns taken from Rig Veda are set to music to be chanted at the Sama sacrifice. Yajur Veda is the Prayer Book consisting of the hymns to be chanted by the priests in performing the acts of the several sacrifices. Athur Veda deals with the hymns and incantations to be chanted at the ceremonies to be observed at birth, marriage and death. It deals with the beliefs and customs of the masses of the people.

The Vedic Aryans were nature worshippers worshipping the forces of nature as the living manifestations of a Supreme Power. They worshipped the Sky, the Sun, the Moon, the Stars Thunder, Wind, the Air, the Dawn—all the powers and forces of nature which they looked upon as living beings. They worshipped these gods as they loved them, feared them or admired them. Agni was the 'god of fire.' "He bringeth property to the house of the worshipper.' Agni "provided warmth, purified the daily meals and kept away sickness." Surya was the Sun which dispelled the darkness of the night and brought light and warmth with it.

> "Let us think upon the longed for light of the divine Sun (Surya) and may he inspire our prayers.'

Varuna, the great blue sky overhead was the greatest of the old Vedic gods.

> "O Varuna, O thou of great power, have mercy, have mercy: I come trembling like a cloud driven by the wind. We are but men, O do not destroy us for our sins. We have not sinned wilfully. Have mercy, have mercy."

In the Rig Veda we find all the differment stages in the development of religious conceptions of the early Aryans. At first a simple minded people looking with awe at the ordinary

Afghanistan. Others went eastward and wandered slowly down the valleys of the Kabul, Kurram and Gumal rivers in the Punjab. Years afterwards another stream of Aryan families seems to have entered India by the difficult routes in Gilgit and Chitral and spread over the plains of the Ganges and the Jumna. These people seem to have mingled much more freely with the natives of the country than the first, as these people were not followed by their wives and children and they took to themselves wives from the dark-skinned aborigines of the country. It were these people who had a large share in the Aryanisation of the people.

All that we know of the history of the Indo-Aryans is derived from their Sacred books. Unlike the Egyptians and the Babylonians, no written records either on stones or bricks exist to tell us the story of these people. All that is known of them is contained in their hymns composed by their Rishis and committed to memory to be handed down from father to son for hundreds of years. These hymns were later on collected and systematised into the Rig Veda which is the oldest document of Indo Aryan history. It is a collection of about one thousand hymns to various deities composed between 2,000 B. C. and 1400 B. C.

Veda means knowledge in general, but among the Indo-Aryans it denoted their unwritten sacred love "the best of all knowledge in Hindu eyes." The Veda is a most valuable document "on account of its unique character, and the light which it sheds upon the evolution of mankind especially in India." The whole life of the people centred round their daily religious rituals of which the sacrifices formed an important part and which quickened the intellectual life of the people.

According to the accepted usage there are four Vedas namely, 1. The Rig Veda. 2. The Sam Veda. 3. The Yajur Veda and 4 The Athar Veda. These four Vedas represent the selections made by the Rishis in later centuries as the earlier hymns composed at various times and under different conditions "represent a whole era in Aryan history" and are wanting in order, unity and system.

Of these four Vedas, the Rig Veda is unquestionably the oldest and the most important. It has come down to us in the form of a compilation of over 1000 hymns composed by the Rishis and edited by Brahmans for sacrificial purposes. In addition to these hymns certain supplementary writings of the nature of commentaries, such as Brahmans and Upanishadas are con-

# The Aryans in India

Modern historical research has not yet been able to fix the definite centre from which the early Aryans radiated in all directions, or to mark out with any reasonable certainty the roads followed by these people in their wanderings. The only reasonable assumption is that long long ago there lived in the wide plains of *Eastern Europe and Western Asia* a number of tribes and families who called themselves Arya. The primitive man reflects most closely the character of the land around him and the *early Aryans inhabiting the vast treeless grassy plains stretching across Europe and Asia were no exception to this rule.* It was there that these people developed their primitive system of agricultures and cattle farming, and besides acquiring a considerable knowledge of wood-craft " they achieved an immense advantage in hunting and warfare by taming the horse." The same environment led inevitably to a self contained and nomadic life, independence and love of freedom, pride and contempt for settled life.

The coming of the Aryans into India marks a turning point in the history of this country. The tribes living in the steppes in course of time grew larger and larger and it was thus either due to an increase in number, or changes in climate, or the restlessness of a nomad that set these people roaming across the wide plains and cross into neighbouring lands with their cattle and their waggon, their wives and their children ; and backwards and forwards like the waves of the sea went these people in search of new homes and rich pastures.

The Aryans were beyond doubt one of the foremost races of the world. Leading a semi-nomadic life as a result of their surroundings, they came to be "expert road and bridge makers.' Living an open air life with abundant food both animal and vegetable, they grew up skilful hunters and mighty warriors sound in body and alert in mind. Both in Europe and Asia they tood the first place in the new nations formed by them when they mingled with the old inhabitants and taught them their own language, their laws, their customs and their religion.

Some of these tribes seem to have come first into Bactaria and then moved over the passes of the Hindu Kush into South

and it will be not out of place if I very strongly suggest here that some separate arrangement for us for the purposes of accounts should be made as early as possible in our Intermediate College.

Gentlemen, I feel I have not made many promises in my address as is customary, which may not be charitably viewed by you. It is not because I have no promises to make, but because I and you both have no faith words. So my cherished desire to serve you is not confined merely to what I have said in my address. It extends to all those reasonable demands which I as your humble representative may be called upon to meet from time to time ; and need I assure you here once again gentlemen, that I shall never fail to the best of my ability to respond to the impositions of this office which you have entrusted to me, as long as I am allowed to exercise my rights. Duties and rights are co-relative terms and go together.

Gentlemen, I thank you once more and thank you from the bottom of my heart.

SYED AHMAD RAFI
*Vice-President, elect.*

needs no asking. He has never needed any.

Some of the interesting features of our College are the various Literary Societies, and in all the moving spirit has been and is the endless love of our dear Principal for his equally loving and dutiful pupils. The Literary Societies which are of recent growth have considerably added to our literary activities and tend to create an intellectual atmosphere around us. The Presidents and Sercetaries deserve our warm thanks for their energetic efforts to make these Societies greatly useful to us in many ways.

Gentlemen, it is very gratifying to note that a long felt need of a separate magazine for the inter college has been realized. This will be great incentive to many of us who are capable of it to contribute articles to this Magazine, and I believe it will be our constant care that this Magazine does not suffer in tone or standard owing to our neglect and indifference to its estimable utility. It will be my earnest effort to lend my utmost support and co-operation to the editorial staff of this Magazine and I need not say that they will extend theirs to me. I may be allowed to say a word here about the position of the"editorial in the Magazine. The great privilege of an editor to usher in his personal remarks, which my extend to the entire range of our College life, makes it only too clear that the editor should possess an unbiassed mind, independent opinion and an intellectual out look, if he is to rectify the ills that may exist here and there by critising them.

The present incumbent who I believe is possed of the necessary equipment shall maintain this privilege for what it was.

Gentlemen, I believe you are one with me in pressing here for the necessity of having a separate hospital under the charge of a fully qualified man for our College. The present incumbent willing as he always is to serve us, is but only a compounder and hardly competent to administer the general medical aid which is sought of him, being the man on the spot Considering the respectable distance which separates us from the main hospital and the quarters of the doctors situated in the University, makes it only too clear that a separate medical officer who may be one of the present staff, is our right and I hope it will not be denied to us.

The present arrangement of our accounts departments in the University is a source positive inconvenience to all of us and an unnecessary drain no our time,

in the hostels. The latter has been removed by he addition of New Circle but a decent building for the College is still badly needed. The third, a very telling drawback in the beginning was the lack of proper adjustment of the teaching staff to this new system.

The Saddler Committee when suggesting this novel combination of the two higher classes of school with the two lower classes of the then Colleges, laid particular emphasis on the necessity of providing an efficient teaching staff to the Intermediate Colleges. And only then this scheme should bear the desired fruite. I do not mean to say, gentlemen, that efficiency was entirely lost sight of by the authorities concerned when the Staff was being manned, but there are certain limitations to our scope of selection which we who belong to the denominational University can not altogether ignore. Besides, every scheme in its transitional period presents its own peculiar difficulties which can only be gradually removed.

The clouds that hovered over our University ever since the non-co-operation days need no recapitulations by me here. But there are unmistakeable signs of awakening at Aligarh.

Gentlemen, when we look to our College as it is today we can unhesitatingly say that it ranks amongst the first and foremost Colleges in the Country.

Gentlemen, it is the students of an institution who make or mar the reputation of it to a considerable extent, and it is our sacred duty to impress the country with our character and conduct that Aligarh has not departed from the great ideas of its founder. We are not here merely to keep a certain number of terms, take our examinations, which one could more conveneintly do at his own place but we are here to learn to serve our religion our community and our nation.

It is out pride and a piece of good luck to possess a Principal who can rightly be called one of the enviable products of the late M. A. O. College. Since he has come at the helm of affairs, the College has been steadily advancing on the right lines, and we are confident that under him the sacred task of preparing the Muslim Society for the service of the Country shall, be carried on smoothly. As a Principle of the College and as a President of our Union Club. Mr. A. M. Kureishy, has left his impress on all our activities, social and intellectual, and we cannot fail to profit by that. I have not yet formally craved for his co-operation as President, because I know he

The credit of introducing the Elocution class goes to my worthy predcessor in office who has set an inspiring example of how much good can be done by integrity and honesty of purpose. The need of such a class becomes more glaring when we feel that there has been of late a conspicious want of good speakers in the House and no wonder like all other arts, the art of public speaking can be systematically acquired by the necessary training under experts. The purpose of this class was to provide the willing members with that training.

Gentlemen, there are many amongst us who have potentialities of becoming good speakers, and this is the fit stage when those potentialities should be developed and brought out to an active display. I realise how awkared one must feel when called upon to speak on some occasion to find that his tongue is helplessly tied up and his lips would not open.

And generally it is not because we have nothing to say on that subject, but because you fail to find expressions for your thoughts. If we take advantage of the Elocution class we are sure to gradually acquire the free expression, and impressive delivery, the valuable assets of a speaker.

In Provincial and Central Legislatures and in all other local bodies, like the District and Municipal Boards when we are face to face with the members of the other communities, the question of securing our rights mainly depends upon how we put our case. While I appeal to the members of this House to make this class a really useful one, I may be permitted to request other members of the Staff to kindly spare some time to take up this class. The Elocution class as it is at present constituted, is hardly sufficient to cope with the work that may otherwise be entrusted to it. It is my ambition, and my earnest effort will be to see it realised that the Elocution class serves the purpose for which it was created.

Gentlemen, the Intermediate College came into being in 1921 in accordance with the recommendation of the Saddler Committee. In the beginning for a considerable time the wisdom of this step was doubted and debated upon widely here as elsewhere, and may not be untrue to say that the Intermediate College scheme is still in its experimental stage. Our College had some peculiar handicaps from its very start, the greatest of which was the inadequacy of lecture rooms. The other was the want of accomodation for the students

tunities the Indoor Games hold out need no explanation. Besides, for those who do not for some reasons, like the heavier physical strain of the outdoor games, the Indoor Games serve an amusing diversion after days of hard labour. It is my desire to introduce Badmingtonalso which tachically speaking does not fall within the domain of Indoor Games, but if provided, will certainly widen the interest of the members and attract greater numbers.

In the Reading Room, gentlemen, there is very undesireable dearth of periodicals and magazines with an equal paucity in the number of people who go to it. The necessity and importance of paper reading was at no period felt so keenly as it is felt to-day.

Gentlemen, irrespective of the intrinsic merits of paper reading, which are many, its significance in the realm of politics and the prominent part the papers play in propagating their policies which by a continued appeal to public minds acquire a driving force in shaping the destiny of our country. Make it an .imperative duty for every one of us to spare sometime for the papers. You cannot do without the newspapers, as certainly you cannot do without politics these days. The duty of citizenships is a duty above all and how can we faithfully respond to it if the true position of our country and its demands on us have not been carefully studied by us.

Gentlemen, we have failed in achieving the primary object of education which is beyond doubt to make us good and useful citizens, if we do not side by side with the academic persuits, cultivate and develop the idea of citizenship in us. The country would have been spared much of the indignity and injustice that has fallen to its lot if only its people were true citizens. Need I then emphasic it on you gentlemen, that with this almost suicidial neglect on our part, we are paving the way for our own ruin.

The Library needs thorough overhauling. It has been a victim to the ill consequences of undemocratic spirit in the Library Committee. This leads me to quote from Mr. Baldwin here. He said on one occasion, "Democracy means nothing if it does not mean the realisation of one's responsibilites." It is here that we can learn to work with and under one another in Committees harmoniously and responde to that training in the country for democratic work. While it will be my earnest effort to put the Library in order, it can serve the right purpose only if more members make a liberal use of it.

observance of right within the constitution.

I can carry on the work smoothly only when you recognise my rights as your elector representative and respect them; and no less necessary and binding is it on me also to recognise and respect yours gentlemen, if they are not opposed to the constitution and the equally sacred traditions.

The sanction behind the democratic forms of Government is the voice of majority drifted in one direction; and the very vital object of democracy is defeated if having elected their representative all parties do not join hands with him to let him carry on the necessary measures and give him ungrudging support and co operation so long as he is advancing their interest and acting for them within the the constitution. Learn to obey when it is your duty, and you will have learnt to rule. In the country with the cry of democracy in every quarter, the real democratic spirit has a rare display and that accounts for so many instances of unnecessary splits and dissensions and no substantial work. We have seen gentlemen, that the lack of this very spirit has been the source of much unpleasantness and often undesirable impediment in the smooth running of this Union Club. It is here that we can best imbibe this spirit. My appeal to you therefore, is to take a more active interest in the affairs of this Union. do not fight shy of expressing your views or at least of hearing what others have to say. In this connection I may be excused if I say that the percentage of the student's speeches is deplorably low and the attendance of the House has been as usual thin. This indicates the apathetic attitude of my brother members towards their own Club, and what fact can be sadder? If the honourable members could only maintain half of the enthusisam they display during the Election Days in the affairs of the Union, I am sure, things would assume brighter aspects. But however sad our present position may be, I am confident my appeal to the members in this connection will not fall flat on their ears.

Let me now turn to the important branches of the Union Club such as indoor games, Reading Room, Library and last but not the least, the Elocution Class.

Gentlemen, the indoor games have always been maintained as a necessary part of our Union Club and more or less in well equipped form. As a healthy recreation, and a place where people can meet and thus promote fellow feeling, the opport-

It is to those important aspects of this Institution that I shall draw your attention. Not that I belittle its function of holding debates but I draw attention to better objects.

The Union Club, as its very nomen-clature suggests should represent and organise the life of the student community. It should be a pivot of all our activities, legislature of our social code, a custodian of our rights, and a preserver of our traditions. In a word, it is truly reflective of our intellectual and social activities. It is the instrument through which we can get our legitimate grievances heard and redressed. It is the vehicle through which we can express our views on and contribute our small share to solving the political, social and economic problems with which India is faced today.

Gentlemen, the country is passing through a very critical stage of its national awakening. The Musalmans as a minor community have grave problems before them. Their is a keen struggle between the two communities, and or ours has not yet been able to present a united front, I will not enter here into the details of this split which is very unfortunate. But I may point out at this juncture that this very fact speaks volumes on our disorganised life. In present times, a clear notion of our political position in India and a solid organization can alone save us from loosing our identity and solidarity.

This Institution being the central place of Muslim Culture and intelligentsia is looked upon and rightly too, as a guiding factor in the political deliberations in which our leaders are often engaged to devise means for the honourable preservation of the Musalmans in India. We are expected to lead the Musalmans of India to a right and safe path, and is it not incumbent upon us to be well up to the task before we leave our dear and sacred Institution? Hence my fervent and earnest appeal to you gentlemen, is to rub your eyes and hasten to the call of the hour ere it is too late. The Union Club has many potentialities. It affords us all possible facilities for hearing others, expressing ourselves and learning from the speeches of eminent and experienced politicians and literary men who grace this Club with their presence every now and then. Here is our chance, and the fault will lie but with us if we fail to avail of it. The object of this Union Club is to train us up in a really democratic sense. This is the only democratic Institution and the main spirit underlying this system is the mutual

**Inaugural Address of Mr. S. A. Rafey, the newly elected Vice-President, I. C. Union, delivered on the occasion of the Installation ceremony**

Mr. President, Mr. Pro-Vice-Chancellor, worthy guests and brother members of the Club,

No words can adequately convey the deep sense of gratitude with which I am filled when I stand to night in response to a time honoured tradition of delivering my inaugural address.

I attribute my election to this office only to the generosity and kindness of my friends who with the best of intentions, did not take a true stock of my deficiencies while confiding in me the greatest trust with the heaviest responsibilities.

I thank them most cordially and take the first opportunity to appeal to all my brother members of this Club, that now that they have elected me, they will forgive and forget what little unpleasantness may still linger, after the elections and join me in my endeavours to maintain the prestige and the noble traditions of the august House. It is only with your co-operation and support that I can hope to discharge efficiently the onerous duties, which my capacity as your representative imposes upon me. I am now your representative and it will be upto you gentlemen, as of course it will mean the exercise of my utmost efforts to that end, to make the agency useful and conducive to guard and advance the best interests of the Union in particular and the Alamater in general.

Gentlemen, the aims and objects of this Union and your part in it have been repeatedly told to you by every successive Vice-President and not without happy results. A comparative study of the state of affairs of a few years past shows that though there has been a flaw here and there as is bound to be, our march towards progress has been steady. But no amount of optimism can justify me from falling to strike a note of despondency here on the question that now presents itself to me. Whether the real aims and objects of this Union have been realised and fulfilled by us? If the Union were only a Debating Society as is commonly understood, my verdict about its achievements would have been satisactory and probably I would not have cared to sermonise on it.

But the Union is something more sublime and far above a mere Debating Club.

" It is a world of shadows' not realities,

" It is appearance and not the thing in itself, says Kant.

Thus, we have the same doctrine in three different parts of the world. And does not the Sufi utter the same cry as of the unreality of the world ? He says the same thing, and with no less emphasis. Thus on the highest planes, the highest thoughts of the Indian, the Mohammedan, the Greek, and the European nationalists meet together.

I now conclude. From what I have said it will be seen that it was the Arabs who carried to Europe the accummlated intellectual treasures of the East, and handed down the torch of learning from the ancient to the modern world.

B. Ghosal

been only an instinct that attracted one essentially of a deeply pantheistic spirit to the great home of Pantheism. " Life not the painted veil ' he said, "which those who live call life, even though unreal shapes be pictured there " But in none of his works so much as in his "Adonais" does the pantheism of Shelley, appear in such dazzling radiance, embellished with all the charm of poetical colouring. The exquisite beauty of the following lines expressing the Oneness of Existence demands citation :

" The One remains, the many change and pass,
Heaven's light for ever shines earth's shadows fly,
Life, like a dome of many coloured glass,
Stains the white radiance of Eternity."

In tracing the scope of Eastern thought in England, one has also to mention the names of English mystics such as Law, George Herbert, Henry Vaughan and the Cambridge Platonists. Of modern Poets, Arthur Symon s lines on 'A Dancing De vish " and Browning's " Paracelsus' will have been read by many. Harris's poems are full of Sufi nature. In Philip s beautiful poem "Marpessa" there are lines full of Sufi mysticism. Tennyson gives indications of being influenced by Oriental thought in " Akbar s Dream," and especially in "the Ancient sage" he has give expression in perhaps more fascinating form than any other poet, to some characteristic Oriental ideas. Mathew Arnold's mystic melancholy bestows upon him a kinship with the Indian temperament. Edwin Arnold Ralph Griffith Maxmiller and a host of other Orientalists have drawn their inspiration from Oriental Literature.

**Of American Writers.**

Longfellow depicts the Universe as an immeasurable wheel turning for ever more in the rapid rushing river of time. You also find Emerson playing Pantheistic mysticism of the Oriental type. In short, I find that so far as it has been borne in upon the thinkers of the East that the things of sense deceive and betray, so far as they utter with tremendous emphasis that the things that are seen are shadows, so far not a few in the West have hearkened to their teaching.

**Concordance of India, Grecian and European Metaphysics.**

You will readily recognize the concordance of Indian Grecian and European Metaphysics in the following lines :—

" The world is Maya, says Sankara ;

and the Vedantists add "Not a part, not a mode of that, but identically that, that absolute spirits of the world." The Buddhists hold the same idea. "As pure water poured into pure water remains the same, thus O Gautama, is the Self of the thinker who knows. Water in water, fire in fire, ether in ether, no one can distinguish them ; likewise a man, whose mind has entered into the Self." "Every man," says the Sufi Gulshan Raj, "whose heart is no longer shaken by doubt, knows with certainty that there is no being, save only one. In his divine majesty the *me*, the *we*, the *thou* are not found, for in the *one* there can be no distinction. Every being who is annulled and entirely eparated from himself ...hears . . .."I am God." In the vision of God, says Plotinus,"what one sees is not our reason, but something prior and superior to our reason. He who thus sees does not see ..... ...two things. He changes, he ceases to be himself, preserves nothing of himself. Absorbed in God, he makes but one with him... .. . " 'Here' writes Suso, "the spirit dies, and yet is all alive in the marvels of the God head."

**The Influence of Sufi Poetry on Western Thought.**

As regards the influence of Sufi poetry on Western thought it may be noted that many of the European mystics wrote as the Sufi poets had written before them, particularly Echart, the greatest of all speculative mystics, Tauler and Suso. There was rapturous language both with the Eastern and Western mystics. In the 19th century Hegel was loud in the praise of Jalaluddin Rumi. You find the same influence in Diadactic Literature, in Ibsens's "Caesar and Galilean."

**English Literature and Oriental Thought.**

**Shakespeare**

Let us take the case of Shakespeare first. It would have been strange indeed if among the many motions of his mind no pantheistic ideas were to be met with in Shakespeare. A passage in " The Tempest' will illustrate my meaning :

" We are such stuff
As dreams are made of,
and our little life
Is rounded with a sleep."

A translation of a verse from the Upanishad could not have expressed with greater lucidity and elegance the Vedantic doctrine of " Maya."

**Shelley.**

Of all English poets there is none who is so closely akin to the pantheistic type of mind as is Shelley In ' Prometheus Unbound" Asia is the goddess of his worship. It may have

permanent shape. By the end of the 3rd century A. H. Quietism had changed into Pantheism and kindled a belief that the Beloved and Lover are one and identical. Two theories are advanced as to the origin of Sufism :

(1) Reaction of the human mind from the Transcendental to the Immanent type, and (2) neoplatonic influence.

It is highly probable that the Seven Philosophers who were forced to leave their homes through the tyranny of Justinian, who forbade the teaching of Philosophy at Athens, should have execised a considerable influence upon a few of the more thoughtful Persians when these Neoplatonists paid a visit to the Persian court in the 6th century and Neoplatonism is the doctrine of Ecstacy, and this bears directly upon Sufism. These points form a broad outline of Sufism. The later sufis elaborated the ideas, gave them a rich and beautiful setting, and built about them one of the most interesting phases of mystical poetry the world has even known. They, however, changed the Neoplatonists purely abstract conception of God to an essentially personal one, and were strongly opposed to a distinct personality from the Beloved.

Finally, the "Abu Bram" of the Indian Vedantists found an echo in the "analhaq ' of the Sufi Mansur, who had to pay with his life for this bad utterance. Alshibli's remark that "Tasawoof ' is control of the faculties and observance of breath, certainly points to the belief that the later sufis got certain ideas from the Vedantic Philosophy. In seeking to submerge themselves in God, the sufis arrived at the Indian conception of 'The All-One."

All Pantheistic methods and utterances, are curiously alike. In William James book called "Varieties of Religious Experiences" we read : "This overcoming of all the usual barriers between the individual and the Absolute is the great mystic achievement. They say that in mystic states we become one with the Absolute and we become aware of our oneness. This is the everlasting and truimphant mystical tradition, hardly altered by differences of clime or creed. In Hinduism, the Neo-Platonism, in Sufism, in Pantheistic Christian mysticism, in Whitmanism we find the same recurring note, so that there is about mystical utterance an eternal unanimity which ought to make a critic stop and think, and which bringest about that which the mystical classics have, as has been said, neither birthday nor native land. Perpetually telling of the unity of man and God, their speech antedates language and they do not grow old. 'That art Thou' say the Upanishads,

the study of Philosophy in the Islamic world after Alfarabi —we shall find the balance inclining rather on the side of Ibn Baja or Avenpace.

**Averroism.**

The Eastern doctrines of Absorption and Emanation were first introduced by Aristotle into Eastern Europe. Philo, the jew, based his philosophy on the theory of Emanation. From the Alexandrian Greeks these ideas passed into the Saracenic philosophers. In the intellectual history of Arabism the jew and the Saracen are continually seen together. From them conjointly Europe derived its philosophic ideas, which in course of time culminated in Averroism Now, Averroism is philosophic Islamism. The work of Averroes invaded Christendom by two routes: (*a*) From Spain, thro' Southern France, they reached Italy, and (*b*) from Sicily they passed to Naples and South Italy. The doctrine of Emanation and Absorption thus introduced into Europe affected the ranks of intelligence and fashion all over the continent. Even as early as the 10th century persons having a taste for learning found their way into Spain, a practice in subsequent years still more indulged in when it became illustrated by the brilliant success of Gilbert who passed from the University of Cordova to the Papacy of Rome. Petu, and many ecclesiastics and learned men even from Britain were found studying in Andalusia. Into Italy and England, Averroism had silently made its way. It found favour in the eyes of the Franciscans, and a focus in the ancient University of Paris. Michael Scott made the writings of Averrois known by his translations. You meet continually Arabian ideas in Roger Bacon, the fore-runner of his great namesake, and eventually in Spinoza. The Aristotelian or Inductive Philosophy clad in the Saracenic costume that Averroes had given it, found favour with Leonardo da vinci to whom some would attribute the Renaissance of Learning in Europe.

**Sufism.**

A mention of Averroism—or the doctrine of Emanation and Absorption, that the soul of man has emanated or issued from God and shall finally be absorbed into God—naturally leads one to say a word or two on Sufism, which has also exercised its quota of influence on Western thought. Sufism owes its origin to a little Persian sect who early struck out a path for themselves by discarding all costly robes and clothing themselves in white woolen garments. These were henceforth known as Sufis, and their way as "Tasawoof." Abu Hashim was the first to bear the name of Sufi. Al Misri may be said to have given Sufism its

**Science**

The Saracen Empire was dotted all over with colleges, and in the heyday of Muslim power, Spain alone boasted of 70 Libraries. Colleges were also established in Mongolia Tartary, Persia, Mesopotamia, Syria, Egypt, North Africa, Morroco and Fez. Great was the patronage that learning received at this time. To give an adequate statement of the results of this imposing scientific movement would far transcend the limits of this paper. The ancient Sciences were gradually extended and new ones brought into existence. The Indian method of Arithmetic was introduced, Algebra was developed. Bin Musa furnished the solution of Quadratic Equations, Bin Ibrahim thatof Cubic Equations. Al-Baghdadi has left a work on Land Surveying. In Astronomy they made catalogues and maps of the Stars. They ascertained the size of the Earth, determined the obliquity of the Ecliptic; fixed the length of the year, and verified the precision of the Equinoxes. They introduced the use of pendulum in clocks. In experimental Science they originated Chemistry. They discovered Sulphuric acid and Nitric Acid. From a political point of view the invention of gunpowder revolutionised the history and method of war. They introduced the Chinese silkworm in Europe and their methcd of making paper from linen rags and cotton. They applied Science in the practice of Medicine The first Medical College established in Europe was founded by the Saracens. The first Astronomical Observatory was that erected by them at Seville, in Spain. Here are a few great names of this period : Aricina, Rehazes, Averoes, Alhazeen, Alghazali and others who have left their intellectual impress upon Europe. Some idea of Avicina's influence can be gathered from the fact that Scaliger considered the study of Avicina as an indespensible preliminary to the study of Medicine.

**On Philosophy.**

The reign of Hakam II was indeed the golden age of Arabian learning in Spain. The Caliph was passionately devoted to letters. His agents were sent to all parts of the East to collect rare books. It was under him that the study of philosophy was commenced and cultivated. Among the Muslim Philosophers of Spain Avenpace and Averroes occupy the first and foremost place. Besides the honour of having Averroes for his pupil, it is said of Avenpace by some Arab writers that " if we establish a comparison between his essays and those of Ibn Sina and Alghazali, the two authors who most promoted

The refined society of Cordova prided itself on its politeness. A gay contagion spread from the beautiful Moorish miscreants to their sisters beyond the mountains. The south of France became full of witcheries of female fascinations and dancing to the lute and mandolin. Even in Italy and Sicily, the love song became the favourite composition ; and out of these genial but not orthodox beginnings the polite literature of modern Europe arose. Moslem Spain inaugurated the age of chivalry and her influence passed thro' Provence into the other countries of Europe, bringing into birth a new poetry and a new culture.

**Influence on English Literature.**

Across the Pyrennes, literary, philosophic and military adventureres were perpetually passing, and thus the luxury, the taste and above all the chivalrous gallantry and elegant courtesies of Moorish society found their way from Granada into Provence. The French and English nobles imbibed the Arab admiration of the horse. Hunting and falconry became their fashionable pastimes, It was a scene of grandeur and gallantry, the pastimes beingtilts and tournaments. And this reminds me of the Normans. Normandy you know, is in France. The battle of Hastings is considered one of the decisive battles of the world. The effects of the Norman invasion on the English mind and fancy, which had been hitherto provincial and uncouth, were to infuse the lightness, grace and selfconfidence of romance into the literature of the period The genesis of Modern English literature points to the North of France and the Trouveres, who were themselves influenced by the polished Moors of Spain. Just take the case of one of the great Romances of the East, the Arabian Nights, and notice its influence. Many romantic writers of Europe have acknowledged their debt to even an imperfect translation of the Tales. Balzac never turned to them in vain, when his prodigious imagination needed a spur. Thackeray has told us in a charming passage how the "Nights" fascinated and inspired him. In the life of Charles Dickens we are told that the dormant imagination of the future novelist was roused to action by a perusal of the "Thousand Nights and a Night.' Hawthorne's letters are filled with allusions to the stories whose influence can be traced as clearly in many of the shorter stories. Stevenson, who knew the Burton version, tells us in his "Memoirs and Portraits" that the Arabian Nights was one of the books that helped to form his mind and style.

Learning passed on to England.

**Civilization and splendour of the Spanish Arabs.**

With the Persian dynasty of Ispahan, and the Moghal dynasty of India we are not concerned here Every school-boy knows the story of Nadir Shah, Babar, Akbar and Aurangzib. So, I shall now pass on straight to my next subject.

The discord between Ommaiyad, Fatimites and Abbasides—the deep seated results of the old tribal jealousies—resulted in the tripartite division of the Mohammedan Empire in the 11th century into the Khalifates of Bagdad, Cairo and Cordova. The Abbaside dynasty in Asia, the Fatimite in Egypt and the Ommaiyad in Spain became rivals not merely in politics but also in letters and science. The Fatimite Library in Cairo numbered a lakh volumes, the great Library of the Spanish Khalifs numbered six lakhs volumes, the catalogue alone consisting of 40 volumes.

Having crossed the straits of Gibraltar, the Arabs continued to carry out the precepts of Ali—the 4th successor of the Arabian Prophet—in the patronage of literature. Scarcely had they become firmly settled in Spain, when they commenced a brilliant literary career. In art and Science, the Caliphate of Cardova rivalled, if it did not outshine the glory of Bagdad.

**CARDOVA.**

Under the administration of the Arabs, and at its highest point of prosperity, Cordova became a beautiful city of palaces and gardens. After sunset a man might walk through its solidly paved streets, in a straight line, for ten miles by the light of the public lamps. Other cities as Granada, Seville and Toledo considered themselves rivals of Cordova. The palaces of the Khalifs were magnificently decorated. They stood forth against the clear, blue sky or were embossed in wood. They had over-hanging orange gardens and courts with cascades of water. The walls were adorned with arabasques. Huge chandeliers hung from the ceilings: the apartments of the Sultanas were sometimes incrusted with lapis-lazuli.

*The Alhambra* is still counted as one oi the wonders of the world, worthy to be mentioned in the same breath as the Taj of Agra. The furniture was of sandal and citron wood, inlaid with mother of pearl, ivory, silver or relieved with gold, Such was Cordova.

And now, a word about The Influence of the Spanish Moors on European Literature, Philosophy, and Science.

of a dress of honour for Jafar, the son Yahyah, the Wazier." A few days after he saw beneath this entry written: "Ten Karats, the price of naptha and reeds for burning the body of Jafar, the son of Yahya." The end of Jafar, the Barmecid, was like unto that 'of Buzrchemehr the vizier of Nawsherwan, the just.

**The Literary History of Bagdad.**

To dwell at length on the literary history of Bagdad would amount to writing a history of Moslem Science and Literature. Sedillot did not a whit exaggerate the truth when he said that from the beginning an essentially scientific character was the marked feature of the school of Bagdad. To accept uothing as truth what was not born out by experience and experiment. was its cherished aim. The literary history of Muslims cannot be dismissed without a passing reference to that most singular society called, "Ikhwanussafa." It consisted of forty members, a curious anticipation of the French academy, and the transactions of this most unique society have thrown a flood of light on the literary and scientific aims of the Mussalmans and our thanks are due to Professor Dietrice for his indefatiguable labour in having unearthed its forgotten treatises. The Professor goes so far as to say that the "forebodings of even the Newtonian law of gravitation are fouud among the Arabs."

**The Break up of the Islamic Empire.**

After the death of Harun (809) A. D. the mighty Moslem Empire began slowly to collapse. The unity of Islam, in political sense, was now destroyed but out of the chaos which ensued, three Mohammedan Empires gradually took shape in the East:—

1. The Turkish,
2. The Persian,
3. The Moghal.

*The Turks*: About the year 1,000 A. D. Islam was in a bad way. The Turks arrived not a moment too soon. Their timely conversion was very serviceable to the cause of Islam. They revived the old-dream of the conquest of Constantinople and supplied the element of vision which was so sadly lacking in the Islamic body politic. In 1358 the Turks crossed the Hellespont, and in 1453 they conquered Constantinople, which had been till then the home of Greek, aud Latin scholarship. In that year the scholars fled, taking with them their books and 'manuscripts, and passed on to Italy and France. It was in Italy that they obtained the warmest welcome and most notable hospitality, and from Italy New

**The City of Bagdad**

A splendid and glorious life was that of Baghdad in the days of the mighty Abbasides when their capital had towered to the zenith of power. The centre of human civilization was then confined to the metropolis of the Mohammadan Empire, exceeding in extent the widest limits of Rome. And Bagdad was essentially a city of pleasure, a Paris of the 6th century. Bagdad—the Darul Islam—was a worthy successor of Babylon and Nineveh, which had outrivalled Damascus and possessed unrivalled advantages of site and climate. The city of palaces and Government offices hotels, 'pavilions, mosques and colleges. of kiosks, and squares bazars, markets, pleasure grounds and orchards adorned with all the graceful charms which Saracenic architecture had borrowed from the Byzantines, lay couched upon the banks of the Dajleh under a sky of marvellous purity and in a climate which makes life a luxury of tranquil enjoyment It was surrounded by far extending suburbs and villages, dear to the votaries of pleasure. With the roar of a gigantic capital mingled the hum of prayer, the thrilling of birds, the thrilling of harp and lute and bewitching strains of the professional singers. Such was Bagdad and who could have believed in those days that this great city would one day be pillaged by Halaku (556 A. D.), and later on by Taimur, the lame.

**The Magnificence of the Khalifa.**

Arab princes and their great men have been famous for highly respecting and liberally rewarding men of light and learning, especially the poets. Ar. Rashid used to pour water on the hands of a blind man. who was one of the most learned persons of his time, previously to his eating with him. It is related of Abdul Malik who ruled towards the close of the first century of the Flight, that when on one occasion a learned man elegantly informed him of an error of some kind or other, he ordered his mouth to be filled with pearls. "These," he said "are things to be treasured up, not to be expended." and for this delicate hint he was further rewarded with 30 000 pieces of silver and several costly articles of apparel. The following striking record will convey an idea of the magnificence and liberality of a Muslim Prince, and at the same time it shows how heinous crimes even in those highly placed officials used to be punished. A person chancing to look at a register kept by one of the officers of Harun, saw in it the following entry: "Four thousand pieces of gold, the price

Peninsula and but for Charles Martel, the Mohammedans would have conquered all France also. Can a study of the Mohammedan conquests fail to show us how large a measure of their success was due to the marvellous enthusiasm that had its roots in their religion, and in their religion alone. Certainly they were not lukewarm Mohammedans of our degenerate days.

In short, in only ninety year's time, the Ummayads made of Islam an Empire. In their days the Islamic Empire grew strong and stronger then it ever was. By 732 A.D ,the Moslem conquests had reached the utmost limit which they—or for the matter of that even Alexander, Caesar or Napoleon, ever attained. The Caliph in Damascus had his lieutenants beyond the Oxus and the Pyrennes, on the shores of the Caspian, and in the valley of the Nile. We next find the Abbasides overthrowing the reigning House.

**The Abbasides, (750-1258 A. D.)**—Hitherto the Arbas had played a dominant role in the Moslem community. Now the tables were turned. We pass from the period of Arabian nationalism to one of Persian ascendency of Persianised Abbasides and cosmopolitan culture. Almansur the Khalif, transferred the seat of Islamic Government to Bagdad. It was not a mere casual circumstance that the Abbasides favoured the Persian element and that they transferred the seat of Government to where it had been held successively by Achemenids, Arsacids and Sassanians in the plains of the lower Euphrates and Tigris. They needed it. Damascus could never have suited them. Almansur established schools of Medicine and Law in Bagdad. His grandson Harun (786 A. D.) placed all his schools under the superintendence of a Nestorian and ordered that to every mosque in his dominion a school should be attached. But the Augustan, the golden age of Saracenic learning was during the Khalifate of AlMamoon (813-832 A. D). He made Bagdad the centre of Science, collected great libraries, and surrounded himself with learned men. Under the influence of Indians, Greeks, Nestorians, and Jews the Saracens overran the realm of Science and Philosophy as quickly as they had overrun the Provinces of the Roman Empire. In less than a century after the death of the great prophet of Arabia, the works of the chief Greek and Indian philosophic authors had been translated into Arabic. It must be borne in mind that the Saracens cultivated Science after the manner of Alexandrian Greeks, *i. e.* they preferred the inductive method of Aristotles, as suiting a young and virile race, to the reveries of Plato.

Cyprus and Rhodes fell and the army of the Khalifa lay in front of Constantinople, but it was not till the year 1453, that the Turks captured it. During the time of the conqueror of Jerusalem all Syria was completely reduced. The fate ot Persia was settled at the battle of Cadesia, under the 3rd Khalifa ; the battle field of Nahavand saw the last of the Chosroes flying for his dear life-Magianism received a heavy blow. The country beyond the Oxus was reduced. You next see the victorious banner of the Prophet displayed on the banks of the Indus, and the Emperor of Pekin demanding the friendship of the Khalifa at Medina. The Khalifas now turned their eyes further to the west. Memphis soon fell and Alexandria was invested. When the veteran troops of Syria captured this famous city of the Ptolemies the Saracenic movement took an intellectual shape. Egypt was the material and spiritual granary of the Byzantines, and when Heraclius received the fatal tidings of the fall of Alexandria in his palace at Constantinople, the Emperor was so ovewhelmed with grief that he lived scarcely a month after the fall of the city. It was not the intention of the Khalifa to limit their conquests to Egypt. Osman, the third Khalifa contemplated the annexation of the entire North African coasts. His general Abdullah set out from Memphis and beseiged Tripoli. Twenty years afterwards the Muslim armies forced his way from the Nile to the Atlantic.

The Khalifa Abdul Malik resolved on the reduction of Carthage. His general conquered the great rival of Rome. The captured Christian capitals numbered three by now: Jerusalem which was the birth place of Christianity. Alexandria, which was the home of Greek Christianity and lastly, Carthage, the home of St. Augustine and of Latin Christianity. In little more than a single generation all the population of North Africa had become Mohammedan and their children were speaking Arabic. The new religion conferred upon the converts a sense of dignity, self-reliance and self-respect to which they had been totally unfamiliar. It gave hope to the so-called slave, and a wonderful sense of brotherhood to its followers, and brotherhood which freely allowed the water carriers of the Khalifa to stand on the same prayer mat on which stood his lord and master to pray with him to God.

**The Invasion of Europe.**

The Khalifa Alwalid next authorised the invasion of Europe, and the conquests of Andalusia. Musa, ably aided by his lieutenant Tarik, pushed northwards and finally completed the reduction of the Spanish

# Influence of Islam on the Middle Ages of Europe

BY

B. GHOSHAL, M. A.,

FOUR years after the death of Justinian, who had put an end to Philosophy in Greece, the great Prophet of Arabia was born at Mecca, in 569 A. D.

A member of the noble family of Qureish, he was himself initiated into the mysteries of commerce, and had already won the exalted title of "Alamin', while trading on behalf of his noble mistress, the lady Khadija. Later on, by his solitary meditations this sincere man of God was drawn to the conclusion that, "There is but one God."

This momentous decision opened a new chapter, in the world's history. A new era had begun. His life was entirely spent in weaning Arabia from idolatory, and he saw what is given to so few to see. The fruits of his labour were gathered even in his life-time. His greatness lies in the tremendous force and enthusiasm which *he imparted to his creed which may be called* "the rationalistic creed par excellence."

**The Saracenic Conquest.**

The formula, "There is but one God," united the Arabians into one nation, which they had never been before, and the country quickly left its "times of ignorance' far behind. Moreover the domination of the world was soon to pass over into the hands of a great nation, whose chief traits were chivalry, munificience, characteristic high-mindedness and hospitality.

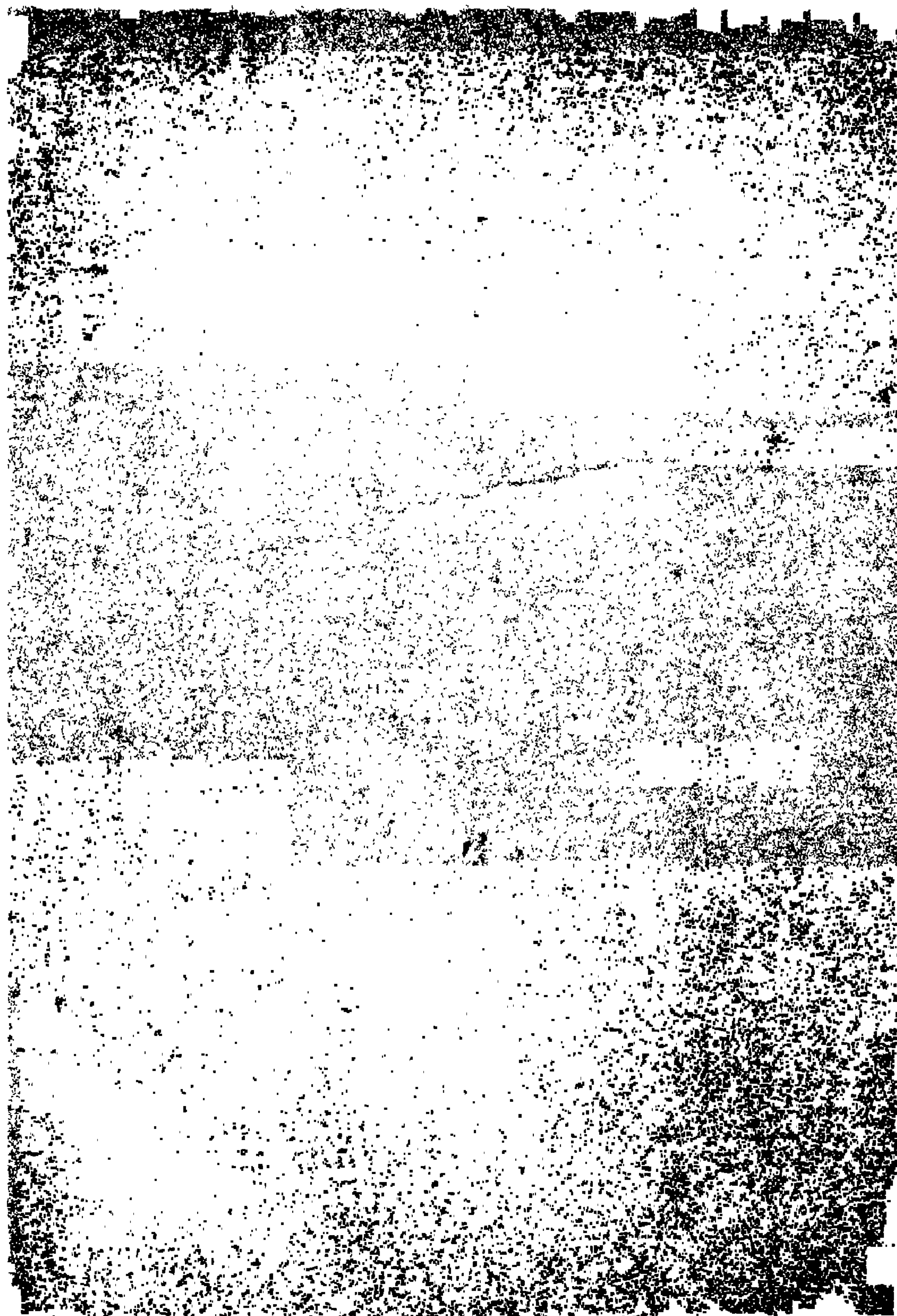
On the death of the Prophet, the Mussalmans were governed in turn by four of the most eminent among his companions, Abu Bakr, Umar, Usman and Ali. (Peace be on them).

Abu Bekr had scarcely seated himself on the Khalifate, when the Saracenic conquests began. At Damascus the Roman army was overthrown. Haraclius saw the complete overthrow of his Roman army at the battle of Yarmek

Jerusalem was the *next* objective. *Khalifa* Omar journeyed from *Medina to take formal possession of that historic* city : and you *know how unostentatiously he arrived at the* gates of Jerusalem. Tripoli, Tyre and Casaria fell next. The sailors of Phoenicia equipped the Saracenic fleet which drove the Roman navy into the Hellespont. The Arabs now gained the command of the sea.

## CONTENTS





Vol. I April, 1929 N°. IV

# The Intermediate College Magazine

Editor : Abbas D. Saeed

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# اِنٹرمیڈیٹ کالج میگزین

جلد (۱) | بابت ماہِ مئی سنہ ۱۹۲۹ء | نمبر (۵)

## شذرات

خدا کا شکر ہے کہ ہمارا رسالہ علی گڑھ اور بیرونِ علی گڑھ کی ادبی حلقوں میں مقبول ہوتا جا رہا ہے، اور ہمارے دار العلوم کے ادب نواز اور علم پرور اساتذہ نے اس کی قلمی معاونت پر کمرِ ہمت باندھ لی ہے، جناب سیدین صاحب کا ایک گراں قدر مقالہ ہم فروری نمبر میں شائع کر چکے ہیں جس کو ہمارے طلبا نے نہایت دلچسپی سے پڑھا، اور جس پر عمل پیرا ہونے کا اُنھوں نے تہیّہ کر لیا ہے، جناب رشید صدیقی صاحب نے مارچ نمبر میں "مغالطہ" پر ایک غائر نظر ڈالی، اور اپنے دلکش ظریفانہ انداز میں علی گڑھ کے ماحول کی اس "جنسِ خاص" کو ناظرین کی خدمت میں پیش کرکے ہر کس و ناکس سے داد تحسین لی۔ اپریل نمبر میں جناب نوشہ صاحب زیبِ قرطاس ہیں، اور اپنے مضمون کی ہر ہر سطر سے تبحرِ علمی اور بلاغتِ نظر کا ثبوت دے رہے ہیں، کیا یہ اُمور ہمارے لیے باعثِ صد افتخار و نازش نہیں؟

ہمیں یقین ہے کہ ہم اُن حضرات کے نتائجِ افکار اکثر آپ کے سامنے پیش کرتے رہینگے، کیونکہ موجودہ صورت میں یہ ناممکن ہے کہ ہمارا عجز و نیاز اُن کے ناز و استغنا پر غالب نہ آجائے، اور وہ کچھ نہ کچھ لکھنے پر مجبور نہ ہوں، اس سلسلہ میں ہماری تگ و تاز اور ان حضرات کی ذرّہ نوازی دونوں قابلِ ستائش ہیں، لیکن آخر الذکر نے ہم سب کو بندۂ بے درم بنا رکھا ہے۔



مئی نمبر میں جناب قاضی صاحب نے ہمیں مرہونِ منت کیا، اور اپنے کلامِ معجز نظام سے ہمارے رسالہ کے صفحات کی عزت افزائی فرمائی، جناب قاضی صاحب اپنے مخصوص رنگ کے مالک ہیں، اور اپنی فطری جدت طرازی اور معنی آفرینی سے ایسے ہنگاموں کے موقع پر حاضرین سے خراجِ تحسین حاصل کرتے رہتے ہیں، یہ نظم "یلدرم" کے رخصت ہونے کے موقع پر لکھی گئی تھی، وہی ہمارا محبوب یلدرم! جو آج کل طہران اور شیراز کے مرغزاروں میں سرگرمِ سفر ہوگا، اور جس کی نغمہ سنجی کی بدولت ایران کی فضا رنگین لطافتوں سے یقیناً معمور ہو چکی ہوگی۔



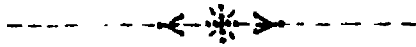
۲ اپریل سے ہمارے کالج میں امتحانات کا سلسلہ شروع ہوا، جو پورے ایک ماہ تک جاری رہیگا، اس امتحان کے بعد کالج کی کثیر آبادی قفس کی تیلیوں سے فرار ہو کر اپنے اپنے نشیمن میں جا پہونچیگی، اکثر طلبا امتحانات میں پاس ہو کر یونیورسٹی میں داخل ہونگے یا "روزی" کی فکر میں سرگرداں پھرینگے، بہرحال ہم اور کالج دونوں اُن سے جُدا ہوئے، اور بعض صورتوں میں مستقلاً، اسی لیے

"آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے"

جدائی ہر حالت میں تکلیف دہ ہوتی ہے، بالخصوص ایسی صورت میں کہ فطرت ہمیں اُن سے جُدا کرے جو چار سال تک ہمارے کالج کی آغوشِ محبت میں رہے، اور جنھوں نے اپنی عمر کا بہترین زمانہ اس چار دیواری میں بسر کیا، بہرحال یہ جدائی ایک بدیہی امر ہے، آپ جائیں اور ضرور جائیں، مگر یاد رکھیے کہ مادرِ کالج کی بہترین دعائیں آپ کے ساتھ ہیں اور اُس کی بہترین آرزوئیں بھی آپ ہی کی ذات سے وابستہ ہو چکی ہیں، آپ جہاں بھی رہینگے مادرِ کالج کی شفقت آمیز نگاہیں آپ پر پڑتی رہینگی، وہ ہمیشہ اپنی بہترین برکتوں سے آپ کو نوازتی رہیگی، اور اس کی کوشش ہوگی کہ آپ پروان چڑھیں، ملک کے لیے مایۂ ناز ثابت ہوں، قوم کی رہبری کر سکیں، اور دنیا کو ایثار اور رواداری کا وہ درس دیں جو اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔



یاد رکھئے کہ جب تک آپ کالج میں رہے، کالج نے اپنے محدود ذرائع کے باوجود آپ کی بہترسے بہتر مدد کی لیکن کالج سے نکلنے کے بعد آپ کا فرض شروع ہو جاتا ہے، اب آپ کالج کی مدد پر کمربستہ ہو جائیے اور اپنے اعمال اور افعال سے اپنے آپ کو کالج کا بہترین ثبوت ثابت کیجئے۔ اگر آپ اس فرض کے انجام دہی میں کامیاب ہو گئے باور کیجئے کہ پھر نہ مخالفوں کی نظر بد ہمیں نقصان پہونچا سکیگی اور نہ اغیار کا پروپیگنڈا ہمارے لیئے ضرر کا باعث ہوگا۔



یہ فرض جس کی جانب ہم نے ابھی اشارہ کیا ہے آپ کا اہم ترین فرض ہے، محض اس لیئے نہیں کہ آپ "علیگ" ہیں بلکہ اس لیئے کہ شہنشاہ کونین کے نام لیوا ہیں، اور نبی آخر الزماں کے پیرو، آفتاب اسلام سرزمین بطحےٰ سے بلند ہوا، دمشق اور بغداد کے افق پر ضیا پاش ہوتا ہوا آسمان ہند پر آچمکا، لیکن خوف ہے کہ کہیں گنگا کی وادی میں غروب ہو کر ہند سے روپوش نہ ہو جائے، اس آفتاب کی کرنیں آپ ہیں، جس قدر آپ کے کیرکٹر میں جلا ہوگی اسی قدر یہ آفتاب آسمان ہند پر زیادہ درخشانی کے ساتھ تاباں نظر آئیگا، اس لیئے اس کے عرض کر دینے میں تردید کا ذرا بھی خوف نہیں کہ اسلام کی کامیابی اور کامرانی کی ذمہ داری آپکے شانوں پر ہے، آپ کا فرض ہے کہ آپ اس فرض کے انجام دینے میں اپنی بہترین قوتیں بروئے کار لائیں، اور دنیا پر ثابت کر دیں کہ ابھی تک آپکے ایمان میں صداقت، دل میں جوش و خروش اور بازوؤں میں دم خم باقی ہے۔



ہماری دعائیں اگر بارگاہِ اجابت تک پہونچ سکیں تو آپ سب کے سب یکے بعد دیگرے صوبہ بہار کے گورنر ہو جائینگے، لیکن اس قدر کامیابی حاصل کرنے کے بعد اگر آپ اپنے کالج، یا اپنے کالج کے میگزین کو بھول گئے، تو حشر کے دن اپنے دامن اور گریبان کی خیر منائیگا، آپ کے دامن اور گریبان کا وہی حشر ہوگا جو "بھائی صمدانی"[1] کے لیمپ لالٹین اور گلاس کا ہر ہفتہ ہوا کرتا ہے، یہ ضرور ہے کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ آپ کی ذہنیت ترقی پذیر ہوتی جائیگی، لیکن کیا آپ حقیقتاً ان ایام کو فراموش کر سکتے ہیں جو آپنے منٹو سرکل اور نیو سرکل کی چار دیواری میں گزارے، عہد طفلی کے وہ ایام جن میں "عیش با فراغت" کے مزے لوٹے، دوستیاں کیں، عہد و پیمان کیئے، دوستانہ محبت کے پینگ بڑھائے، لکھنا، پڑھنا، تقریر کرنا، کھیلنا، کودنا اور گپ کرنا سیکھا، انعامات حاصل کیئے، کامیابی کا سہرا باندھا اور پھر

[1] جن کے متعلق ہمارے ایک گورکھپوری دوست فرماتے ہیں ؎

چشمِ دیدار تو دیوانہ گردم	کجائی بھائی صمدانی! کجائی"

چل کھڑے ہوئے، یہ میگزین اس زندگی کا ہمیشہ آئینہ دار رہیگا، اور ہمیں یقین ہے کہ آپ اس آئینہ میں اپنے طفلانہ خد و خال ہمیشہ دیکھ سکینگے۔



۸ و ۱۰ رمئی تک کالج کی دو تہائی سے بہت زیادہ آبادی رخصت ہو جائیگی، فرسٹ ایر اور نویں درجہ کے طلبا ہونگے اور سرزمین علی گڑھ کی آتش بار جہنم نشان گرمی، ہمیں یہ سُن کر نہایت خوشی ہوئی کہ ہمارے موجودہ وائس چانسلر نے ڈرینیج اسکیم (Drainage scheme) کی جانب توجہ کی ہے، اور اس مسئلہ کے حل کرنے میں ایک حد تک کامیاب ہو گئے ہیں جو ہمارے نظام تعلیمی میں ہمیشہ رخنہ انداز ہوتا تھا، سنا جاتا ہے کہ یہ اسکیم اب بہت جلد عملی صورت اختیار کرنے والی ہے اور کالج کی تعطیل کلاں بجائے موسم برشگال میں ہونے کے موسم گرما میں ہوا کریگی۔ ہمیں یقین ہے کہ کالج کا ہر بہی خواہ اس تجویز کا خیر مقدم کریگا، اور تعطیلات کا یہ نظام جلد سے جلد نافذ ہو جائیگا۔



۱۳ رمئی کو اس صوبہ کے ناظم تعلیمات یعنی جناب ایچ آر ہیرپ صاحب بالقابہ نے ہمارے کالج کا معائنہ کیا، صبح کے وقت وہ شعبۂ سائنس میں معائنہ فرماتے رہے، اور شام کو پانچ بجے جناب پرنسپل صاحب کے ایٹ ہوم کی شرکت کی غرض سے منٹو سرکل میں رونق افروز ہوئے چا رنوشی کے بعد جناب ممدوح نے باسکٹ بال، والی بال، جمنیسیم، ٹینس، فٹ بال، ہاکی، کرکٹ کے میدانوں میں چل قدمی فرمائی، اور ہر گیم میں چند عملی تجاویز دیکر اپنی اس دلچسپی کا ثبوت دیا، جو جناب کو مختلف کھیلوں سے ہے، دوسرے دن معائنہ ختم کرکے الہ آباد واپس تشریف لے گئے، ہمیں اس کا علم نہیں کہ جناب ممدوح نے یہاں کے حالات کے متعلق کیا رائے قایم کی، لیکن قرائن اس کے شاہد تھے کہ یہاں کا نظام عمل اُن کو پسند آیا۔ اور وہ یہاں سے مطمئن و مسرور واپس ہوئے۔



ایک اور اہم تجویز آج کل زیر غور ہے جو ہمیں یقین ہے کہ اگر جلد عملی صورت اختیار کر لی تو ہمارے کالج کے لیئے بہت سود مند ثابت ہوگی، ہمارے سائنس کی جماعتیں اب تک یونیورسٹی سے وابستہ ہیں اور سائنس کے طلبا کے تمام مضامین کی درس و تدریس اب تک یونیورسٹی کی نگرانی میں ہوتی ہے، اب یہ تجویز ہے کہ انٹرمیڈیٹ کالج کی ایک علیحدہ عالیشان عمارت تعمیر کرادی جائے جو آرٹ اور سائنس دونوں شعبوں کے لیئے مکتفی ہو، یونیورسٹی اور کالج دونوں کے ہمدرد اس تجویز کا نہایت سرگرمی کے ساتھ استقبال کرینگے اور دعا کرینگے کہ یہ عمارت جلد تیار ہو کر کام میں آنے لگے، کہ ہر درسگاہ کی جو [illegible] ہو جائے [illegible]۔

ہمارے کالج کے سرکاری جلسے، مثلاً جلسۂ تقسیم انعامات تعلیمی، جلسۂ تقسیم انعامات کھیل کود وغیرہ وغیرہ سالہا سال سے ماہ فروری میں منعقد ہوتے ہیں اور کبھی کبھار مارچ کے آخری ہفتہ تک ملتوی ہوتے چلے جاتے ہیں، چونکہ ان مواقع پر کوئی نہ کوئی ڈراما اسٹیج کیا جاتا ہے اس لیئے امتحانات میں شریک ہونے والے طلباء کا وقت اُن مشاغل میں صرف ہونے لگتا ہے جن کو وہ اس زمانہ میں جائز طور سے زیادہ وقت نہیں دے سکتے، اس لیئے ہماری مؤدبانہ گزارش ہے کہ یہ جلسے دسمبر یا زیادہ سے زیادہ جنوری تک ہو جائیں تاکہ سارے انتظامات سہولیت کے ساتھ سرانجام ہو سکیں، ہمیں خوشی ہے کہ جناب پرنسپل صاحب نے ہماری اس تجویز کو منظور فرما لیا ہے، اور آئندہ سے اس پر عمل درآمد ہوگا۔



ہمارے کالج کے دو لایق، باہمت اور پُر جوش فرزند ظہیر بابر قریشی صاحب اور ایم اے خاں صاحب (آف مدراس) جو حال ہی میں اسٹیج پر اپنے کمالات دکھا چکے ہیں سیاحتِ ہند پر تیار رہے ہیں، اُن کا قصد ہے کہ یہ سفر تمام و کمال سائیکلوں پر کیا جائے، اور اس سلسلہ میں جو جو تکالیف سامنے آئیں اُن کا مردانہ وار مقابلہ کیا جائے، اُن کے سفر کی اسکیم آج کل زیر ترتیب ہے، اور ہماری دلی دعا ہے کہ یہ سفر ہر طریقہ سے کامیاب ہو۔

مہمات کے سر کرنے کی یہ ہمت بے حد قدر کے قابل ہے، بالخصوص اس وجہ سے کہ ہند میں اس کا فقدان نظر آتا ہے، ہمیں اُمید ہے کہ اس جماعت میں روانہ ہونے سے قبل کچھ اور اضافہ ہوگا، اور یہ مع الخیر واپس آئیگی، ہماری بہترین دعائیں اُن کے ساتھ ہیں۔



اِسی سلسلہ میں ہم کیوں نہ جناب پرنسپل صاحب کی خدمتِ والا میں کشمیر کی سیاحت کا مشورہ پیش کریں، کیونکہ تعطیل گرما کا وقت اب قریب آگیا ہے، اور تھوڑی سی عملی توجہ سے یہ اسکیم جلد سرسبز ہو سکتی ہے، ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے ہر دل عزیز محترم جناب عبد العزیز صاحب پوری بھی ہماری اس ناچیز تجویز پر غور فرمائینگے، اور اپنے ذرائع سے طلباء کی ایک مخصوص جماعت کو فائدہ حاصل کرنے کا موقع دینگے ہم اپنی کسی گزشتہ اشاعت میں عرض کر چکے ہیں کہ اس تجویز کا خیال بلاد ہر سال کیا جاتا ہے، لیکن کچھ عجب نہیں کہ اس سال یہ عملی جامہ پہن سکے، "فلوٹنگ یونیورسٹی" کے لیئے ہمارے پاس نہ دولت ہے، اور نہ سرمایہ، مگر کالج روا ان کے لطف سے ہم اُمید کرتے ہیں کہ ہمیں مستفیض ہونے کا موقع ملیگا، اور ہماری یہ صدا صدائے صحرا ثابت نہ ہوگی۔



ہمارے طلبا کو جو طبی امداد کالج سے پہونچتی ہو اُس کے نقائص ارباب حل وعقد کی توجہ کے محتاج ہیں، مثلاً کالج کے تمام بورڈنگ ہاؤس میں رہنے والے طلبا، یا تو منٹو سرکل میں مقیم ہیں یا نیو سرکل میں، ان طلبا کی تعداد چھ سو اور سات سو کے درمیان ہو، ان کے لیئے شفاخانہ جہاں دوا اور اطبا دونوں دستیاب ہوسکتے ہیں ایک میل کے فصل پر ہو، ناظرین خود اندازہ فرماسکتے ہیں کہ اس بُعد مکانی سے طلبا کو کتنی تکلیف اور زحمت ہوگی، منٹو سرکل میں ایک نام نہاد ڈسپنسری ہو جس کے انچارج "کرنل ٹونی" ہیں، مگر اس دورِ جدید میں یہ کون کہہ سکتا ہو کہ یہ ڈسپنسری کسی حیثیت سے بھی قابلِ اطمینان ہو۔ انچارج سر سید کے زمانہ کے ایک بوسیدہ کمپاؤنڈر، دواؤں کا کمرہ بہت تنگ اور تاریک، دوائیں اکثر ناکافی اور ہمیشہ غیر مرتب! کیا ہمارے طلبا کی اس کثیر جماعت کو ارباب حل وعقد ان حالات میں چھوڑ کر جانب طور سے مطمئن ہوسکتے ہیں، ہم نے جناب پرنسپل صاحب کی توجہ اس جانب مبذول کرائی ہو، اور ہمیں اُمید ہو کہ وہ اس کی اصلاح فرمائینگے

---

یہ مسودات پریس میں جانے ہی والے تھے کہ ہمیں عالی جناب نواب نواب علی صاحب چودہری سی آئی ای سینیر ممبر بنگال گورنمنٹ کی وفات حسرت آیات کی خبر ملی، مرحوم مسلمانان بنگال میں اپنی صلح پسندی اور بیدار مغزی کی وجہ سے ممتاز تھے، اور کلکتہ کے سرکاری و نیم سرکاری حلقوں میں آپ کا اچھا اثر تھا۔ آپ کو ہمارے دار العلوم سے بہت خاص اُنس تھا، چنانچہ اپنی پیرانہ سالی کے باوجود آپ نے اپنے سب سے چھوٹے صاحبزادے مسٹر حسن علی چودہری کو تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے علی گڑھ بھیجا تھا، برادر موصوف امسال ایف۔ اے کا امتحان دے رہے تھے کہ ناگہاں نواب صاحب مرحوم کی خطرناک علالت کا تار آگیا، اور اُنھیں امتحان ختم کیئے بغیر دارجلنگ جا کر صفِ ماتم میں شریک ہونا پڑا۔ ہماری دلی دعا ہو کہ خداوند کریم مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے، اور برادر موصوف اور خاندان کے دیگر افراد کو صبر جمیل عطا فرمائے۔



# رُباعیاتِ رؔواں

(از عالی جناب منشی جگت موہن لال صاحب رؔواں ایم اے ال ال بی)

(۱)

بدعہد کا اعتبار کرنا ہوگا　　اس جبر کو اختیار کرنا ہوگا
مانا کہ حیات و موت یکساں ہیں رؔواں　　کچھ دن ابھی انتظار کرنا ہوگا

(۲)

پھولوں سے تمیزِ خار پیدا کرلیں　　یک رنگیٔ اعتبار پیدا کرلیں
ٹھہرو چلتے ہیں سیرِ گلشن کو رؔواں　　پہلے دل میں بہار پیدا کرلیں

(۳)

اندازِ جفا بدل کے دیکھو تو سہی　　پانوٗں سے یہ پھول مل کے دیکھو تو سہی
رنگِ گُل کاریٔ جبینِ سجدہ　　اِک دن گھر سے نکل کے دیکھو تو سہی

(۴)

سرمایۂ اعتبار دیدیں تم کو　　رنگِ حُسنِ بہار دیدیں تم کو
اس سے بہتر کہ نت نئے شکوے ہوں　　ہر جبر کا اختیار دیدیں تم کو

(۵)

چھوٹوں کی بڑوں کی دستگیری دیکھوں
اپنے ہاتھ اپنی ہی اسیری دیکھوں

جب فرق نہ ہو قید میں آزادی میں
اللہ نہ کرے کہ میں وہ پیری دیکھوں

(۶)

عیب و حسنِ حیات کہہ دوں تم سے
جو دل کی ہے کائنات کہہ دوں تم سے

آؤ، سن لو، فسانۂ دار و رسن
قلوبات کی ایک بات کہہ دوں تم سے

(روان)



# وداعی جلسے

(از عالی جناب قاضی جلال الدین صاحب ایف آر جی ایس)

جناب سید سجاد حیدر صاحب یلدرم رجسٹرار مُسلم یونیورسٹی کا دَورِ ملازمت ۳۱ رجنوری ۱۹۲۹ء کو ختم ہوا۔ حسبِ دایات کالج ممدوح کے دفتر اور یونیورسٹی کے اسٹاف اور دیگر احباب نے رخصتی پارٹیاں اور ڈنر س شے کران کی ہر دل عزیز ذات کے ساتھ خلوص و محبت اور غم و الم کا اظہار کیا بالالتزام ہمارے کالج کے پرنسپل صاحب یعنی عالی جناب مسٹر عبدالمجید قریشی ایم اے اور یونیورسٹی کے قایم مقام پرو وائس چانسلر صاحب نے ہر جلسہ میں شرکت فرما کر اظہار خلوص اور حسنِ کارگزاری فرمایا۔ ایٹ ہوم ارپارٹی اولڈ بوائز کلاج میں ہوئی، دوسری اس سے زیادہ وسیع پیمانہ پر میدانِ نمائش گاہ میں دی گئی۔ قبل الذکر من جانب اہلکاران و عہدہ دارانِ دفتر یونیورسٹی اور مابعد الذکر یونیورسٹی اسٹاف کی طرف سے تھی۔ دوسری قدیمی روایت کی پیروی میں علاوہ دیگر شعرائے یونیورسٹی کے پروفیسر قاضی جلال الدین صاحب نے جو نظمیں پڑھیں وہ ناظرین کی دلچسپی کے لیئے درج ذیل ہیں۔ نیا انداز ملاحظہ ہو۔ قاضی صاحب نے اس نئی صنعت کا اضافہ کرکے اس کا نام "صنعت تغیر الاعراب فی القوافی ذو النونین" رکھا ہے! اڈیٹر

---

## سہ بند جلالی بمقام اولڈ بوائز کلاج

ہر اِک اِنسان کو درپیش ہے زیر و زبر ہونا

اِسی نسبت سے ہیں حرکات قافیے کے بندھن میں

## بندِ اوّل بالفتح

ہے نغمہ کی جگہ شورِ عنادل آج گلشن میں ۔۔۔ تپِ فرقت سے کس کی لگ رہی ہے آگ تن من میں

بہت ہیں عالم و فاضل پر سجاد حیدر سا ۔۔۔ بہت ڈھونڈا مگر پایا نہ برلن میں نہ لندن میں

دیا فطرت نے ہے خلعت مرنجی و مرنجاں کا ۔۔۔ مزہ تم کو کبھی آیا نہ سلطے میں نہ اَن بَن میں

تمھاری وضع پر تھی سادگی سو جان سے قرباں
اگرچہ کم کسی صاحب سے بنتے تھے نہ بن ٹھن میں

پڑ رہے آپ کی غیبت میں از غیبی کوئی روڑا
نہ یونیورسٹی کے آکے اٹکے چلتے انجمن میں

کیے جاتے ہیں خالی آپ صحرا کے علی گڑھ کو
کہاں ڈھونڈینگے آہو کا نکلکے دور بن بن میں

سخندانی کی جس بو سے مشام جاں معطر تھا
وہ خوشبو کیش رنجن میں چمیلی میں نہ چندن میں

کبھی دندانِ حرص و آز نے تیزی نہ دکھلائی
قناعت کی عجب تاثیر دیکھی تیرے منجن میں

ادیب کامل الفن در ہو سکتے نہیں پیدا
ہو شہرہ جن کا قسطنطنیہ میں اور کنگھن میں

حریر کلک میں تیرے تھی ضم اوقات کی بندش
نہ تھی وہ بات روزِ امتحاں گھنٹہ کی ٹن ٹن میں

تری جنت نگاہی گلشن علمی کے حد تک تھی
نہ تھی فردوسِ گوش اصلا تری سکو کی جھن جھن میں

عروسِ علم اترائے نہ ہرگز یاں کے زیور پر
کہ آخر کو دمک رہتی نہیں کانچ کے کنگن میں

ترے اخلاص نے سب کو یہاں اس طرح جکڑا ہے
نہ ہرگز ڈھیل آئیگی جلالِ الفت کے بندھن میں

---

## بندِ دوم بالکسرہ

صفات اتنی ہیں تم میں ہو سکے توصیف کِن کِن کی
بھلا دفتر تو دفتر ہی خبر رکھتے تھے پن پن کی

عنانِ دفتر یونیورسٹی ہاتھ میں لے کر
یہ خوش اسلوبیِ مت اُن سے لی ڈیوٹی تھی جن جن کی

ہر اک کے دل پہ کندہ نقش ہے خلق و مروت کا
نبھایا اُن کو بھی اچھا جنھیں عادت تھی بن بن کی

زمانہ امتحاں کا سال بھر میں جب کبھی آیا
تمھیں مصروفیت راتوں کی تھی اور دوڑ دن دن کی

---

## بندِ سوم بالضّم

بھڑک اُٹھینگے شعلے دہر میں میرا سخن سُن کر
بھنینگی ہڈیاں جسمِ اَدب کی آج چھَن چھَن کر

سُن اے کیفِ زبان دانی ہوئی بزمِ اَدب خالی
بس اب فرصت ہے اکتارے کو لاو بیٹھو تُن تُن کر

ہزاروں تشنگانِ علم کیا ہندی ہیں کیا سندھی
تمھارا شہرۂ ذوقِ اَدب آتے تھے سُن سُن کر

"زبانِ ترکِ من" کی ترجمانی کا جو دن ہوگا
زبان دانانِ کالج سر کو سہ جائینگے دُھن دُھن کر

تمھارا کچھ نہ بگڑیگا۔ ہمیں یہ خوف لاحق ہے
کہیں آٹا نہ ہو اب رزقِ علم گھُن گھُن کر

عجب ہے انقلابِ ہر دَورِ ہفت سالہ میں
گُلِ تر لے گئی بادِ خزاں کالج سے چُن چُن کر

تمھارے دوست دُنیا میں رہینگے شاد و خرم
کلیجے دشمنوں کے راکھ ہو جائینگے بھُن بھُن کر

---

## نوٹ

ہمارے میگزین کا گزشتہ نمبر ہمیں افسوس ہے کہ کتابت کی غلطیوں سے بھرا پڑا ہے۔ جناب نوشہ صاحب اور جناب ضیا صاحب کے مضامین بالخصوص ان غلطیوں کا شکار رہے۔ حالاں کہ یہی مضامین ہمارے گزشتہ نمبر کی زیب و زینت تھے ان غلطیوں کا ہمیں دلی افسوس ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اس قسم کی غلطیوں سے ہمارا میگزین آئندہ حسب معمول پاک و صاف ہوگا۔

اڈیٹر

# سرابِ کائنات

آہ: اے طلسمِ نظر فریب: اے منظرِ ہوش رُبا: تو اپنی بوقلموں نیرنگیوں کے دامِ شعور کُش میں مجھ جیسے کروڑوں، شکوہِ ہست نما کو پھانس کر طوفانِ حوادث کے برق قوت پنجے میں دے یا اور چُور چُور کر کے اُڑا اور پٹک، گرا اور ٹکڑے ٹکڑے کر۔ تو میرا سیہ چشمۂ حیات اور میں تیرے راہِ ظلمات کا ایک ادنیٰ ذرۂ تاریک ہوں۔

اُف: وہ نظارۂ خرد رُبا وہ منظرِ اُمید افزا کس قدر جاذبِ دل تھا کہ ایک تشنۂ حیات تیری پُر افسوں فضا کی جھلک دیکھ کر للچا کر زلالِ بقا کی اُمید میں کس شوق، کس تمنا سے تیری جانب کھنچا، کھنچا اور دوڑا اور تیری فضائے بسیط میں قدم رکھتے ہی سموم حیات سوز کے متواتر طمانچوں سے جاں بلب، تیری زہریلی فضائے ہوائی کے چند روح سوز جھونکوں کی تاب نہ لا کر اپنی داستانِ افسانۂ نامرادی کی پُر حسرت یادگار اِک آخری دم توڑ ہچکی کی صدائے بازگشت چھوڑ گیا -------------

کیا مہمان نوازی کا یہی دستور ہے؟ کیا اخلاق و شرافت کے یہی معنی ہیں؟ یہ ذراتِ ریگ کے گھومنے والے بگولوں کا قصرِ فلک نما بلند ہونا۔ ذرّوں کا گردش میں آنا۔ اور فضا کو دھواں دھار کر نا کیا: کیا تو اپنے مظالم کا ثبوت کسی پیکرِ سایہ کو یعنی تودۂ فضا نشین میں زندہ دفن کر دینے دیگا۔؟

اچھا: خفا نہ ہو، ان مردہ اجسام کے مسحورِ اثر اور عبرتِ نظر ذرّوں کو چمکا چمکا کر نہ ڈرا۔ میں بھی تیرے دشتِ ہولناک کا ایک ادنیٰ مطیع فرمان ذرہ ہوں۔

پس اے پر گردشِ فضا: گھومے جا، گھمائے جا، ہستیٔ فانی کے ذرّوں کو، پیکرِ خاکی کے پتلوں کو اُڑائے جا۔ مٹائے جا، فنا کے گھاٹ اُتارے جا، لیکن یہ تو بتا دے: راہرو کو راہ سے بھٹکانا، مہمان کو شربتِ فنا پلانا، عقلا کو فریبِ حیات کے دام میں پھانسنا، ہوشیاروں کو نشۂ غیر منقطع میں چور رکھنا تو نے کس سے سیکھا ہے؟۔ کیا حافظ شیرازی کا شعر تیری ہی توصیف میں ہے؟

ہر کہ آمد بجہاں نقشِ خرابی دارد
در خرابات مپرسید کہ ہشیار کجاست

آہ تیری اصلیت کسی کو معلوم نہیں، تو کیا ہے، کب سے ہے اور کب تک رہیگا۔ لیکن میں تشنۂ دریافت ہوں۔ کاش: تو میرے دورانِ زندگی میں ہی اپنے نقابِ اخفا کو تھوڑی دیر کے لیئے علیحدہ کر کے اپنے اصلی چہرہ کی چمک دمک دکھاتے، لیکن افسوس: یہ تیرا شعار نہیں۔ تُو نے جامِ فنا میں نشۂ رازِ حیات کو مُضمر کر کے محققین سے بھی اپنے مُستحکم طلسم کا لوہا اس طرح منوایا ہے

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو

کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

تو پھر۔ کیا تو ایک قلزم بے آب و عمانِ تراب ہے؟ جس میں حیات کی کروڑوں بیش بہا کشتیاں ڈوبیں اور پھر کبھی نہ ابھریں۔ آخر ان عظیم الشان ہستیوں کا رجن کے مُبارک وجود تیرے انقلاباتِ عظیمہ کے باعث ہوئے۔ جن کے زرّیں کارناموں نے تیرے حصۂ عمر کی تعیین کر کے تجھ میں چار چاند لگائے) تیرے صفحاتِ موصفات پر کہیں نام و نشان باقی ہے؟ لیکن، نہیں۔ کیوں نہیں! البتہ اگر ان کی شاہدِ صادق کچھ ہیں تو کتبِ تاریخ و سیر ہیں۔

تو اس الزام کا جواب دے سکتا ہے کہ ان قیمتی ہستیوں کو میں نے اپنے صندوقِ سینہ میں محفوظ و مصئون کر کے چشم زخمِ حوادث سے نجات دے کر سچی قدر دانی کا حق ادا کیا ہے۔ لیکن افسوس! کہ یہ الفاظِ یاس انگیز، یہ جوابِ خشک کیونکر باعثِ تسکین ہو سکتا ہے۔ پس: اگر سرگرمیوں کا یہی انجام اور تیرا یہی معیارِ قدر ہے تو اے بحرِ بیکرانِ کائنات! جوش میں آ! طوفان اُٹھا! حیات کے حبابوں کو، زندگی کے ربابوں کو توڑے جا۔ مروڑے جا۔ زندگی کے بیڑوں کو۔ عیش کے بجھیڑوں کو۔ ڈبوئے جا۔ اور کھوئے جا۔ ٹکرائے جا۔ بہائے جا۔ تو نے کسی کی سُنی نہ سُنے۔

کیونکر نہ کہوں کہ تو اس عارضی و موہومی زندگی کا ایک خطرناک لیکن دلچسپ خواب ہے۔ جس کا اختتام طلسمِ وجود کی شکست پر منحصر ہے۔ یا ایک سینمائے خیال ہے جس کے صفحۂ سادہ پر ہزاروں انقلابات کے ڈرامے چشم زدن میں باصرہ افروز ہو کر جذباتِ رنج و مسرت پیدا کرتے اور قدرت کی عظیم الشان میجک لنٹرن کی ادنیٰ حرکتِ انقطاعی پر نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

اے برقِ حیات سوز! چمک اور دمک، دُنیا کے اسٹیج پر ہستیوں کے ڈرامے دکھا۔ اور مٹا۔ جلا اور بجھا۔ نہ تجھ میں قرار نہ تیرے گرویدوں میں ثبات!

بلاشبہ تو ایک چمنِ سدا بہار ہے۔ تیرے گل و غنچے باوجود کہنگی ہر وقت تازہ، ایک پھول کے مُرجھانے پر دوسرا کھلنے کو آمادہ۔ مگر، افسوس! نہ تیرے گلوں میں بُو نہ وفا کی خُو، بُلبلیں ظاہری رنگ روپ پر لوٹ ہیں۔ آتی ہیں اور غنچہ کی

موسیقی نواز چنگ پر اپنے پرونستار پھیلا کر دل کش نغموں۔ سُریلی آوازوں۔ مستانہ انداز وں اور پُر درد نالوں سے ہنگامہ برپا کر دیتی ہیں۔ چند لمحے گزرتے ہیں، اور گل ہاتھوں ہاتھوں میں بکھر کر اپنی ہستی کے خواب کو ختم کر دیتا ہے۔ بلبلیں اپنے فانی محبوب کے جنازہ پر ایک آخری نوحہ حسرت کے ساتھ آشیانۂ اصلی کی جستجو میں پرواز کر جاتی ہیں۔ غرض اس دَور تسلسل کا آغاز و انجام ہر غنچے کے وجود و فنا پر ہوتا چلا آیا ہے۔ اور جب تک مشیّتِ ازلی و قدرتِ لم یزل کی خواہش رہیگی یوں ہی جاری رہیگا۔

اے چمنِ ناپائدار۔ اے خارزارِ پُر بہار، اپنے پھول کھلائے جا۔ پرندوں کو چہکائے جا۔ اور چشم زدن میں اس بزمِ اجتماع کا خاتمہ کر کے نئے نئے دَور دکھائے جا۔

میں نے تو نی الحال راہِ تسکین پیدا کر لی اور تیری حالت کا دھندلا سا خاکہ اپنی نظروں میں جما کر ایک ذرۂ اُفتادہ کی طرح ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا: کہ ؎

یہ چمن یونہی رہیگا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائینگے

ادیب فاضل
**محمود زماں خاں**
(رامپور)



# مُسلمانوں کا مُستقبل اور مذہب

(عنفران احمد صاحب مُتعلم فرسٹ ایر کلاس)

موجودہ زمانہ میں مُسلمان جس پستی کی حالت میں ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ آج کل ہمارے اندر مذہبی جوش مفقود۔ قومی روح غائب اور فتنہ وفساد کی بہتات ہے۔ ہماری اخلاقی حالت نہایت پست اور افسوسناک ہے۔ کیا کبھی آپنے اس کے اسباب پر غور کیا ہے؟ کیوں اب ہمارے سینوں میں ترقی کا جوش موجزن نہیں ہے؟ کیا وجہ ہے کہ ہم باوجود دُنیا میں ایک زبردست تعداد میں موجود ہونے کے مُردہ قوم تصوّر کیئے جاتے ہیں؟ وہ کونسی چیز ہے جس نے ہمیں اس حالت کو پہونچا دیا ہے؟ وہ ہم میں کونسی کمی ہے جس کی وجہ سے ہم آج کل قعر مذلت میں پڑے ہوئے ہیں؟ وہ کونسی ایسی شے ہے جس کے نہ ہونے نے ہمیں پستی کے ایسے گہرے غار میں جا گرایا ہے؟ اے میرے معزز ناظرین! یہ قیمتی شے۔ یہ بے بہا موتی۔ یہ بیش قیمت لعل۔ یہ قومی زندگی کی روح۔ یہ مُردہ قوموں کو زندہ کرنے والی۔ یہ گم گشتہ قوموں کو راہِ راست پر لانے والی چیز **مذہب** ہے۔ ہاں یقیناً یہی وہ چیز ہے جس کی ہمیں اشد ضرورت ہے۔ ہاں مذہبی جوش ہی ایک ایسی اکسیر ہے جس کی ہماری بیمار قوم کو حاجت ہے۔ ہاں بے شک یہی وہ تریاق ہے جس سے ہماری زہر خوردہ قوم دوبارہ زندگی حاصل کرسکتی ہے۔

آج کل مادیت کا رنگ غالب ہے۔ مذہب جیسی مقدّس اور ضروری چیز کی اہمیت دلوں سے مفقود ہے یورپ جو مادیت کا مرکز ہے مذہب کے خلاف بہت زبردست جدوجہد کر رہا ہے۔ خیر وہ تو اوج کمال کو پہونچ چکا ہے مگر غضب تو یہ ہے کہ "مینڈکی را زکام پیدا شد" مُسلمانوں نے بھی یہی سمجھا کہ یقیناً مغربی اقوام کی ترقی کا راز "لامذہبی" ہے۔ مگر افسوس خواب کی تعبیر غلط سمجھی۔ اُنھوں نے بھی یہی خیال کیا کہ بے شک الحاد پرست ٹھیک کہتے ہیں کہ مذہب دُنیا کے امن وامان میں خلل پذیر ہوتا ہے۔ پیشتر اس کے کہ میں مُسلمانوں کی موجودہ حالت اور اُن کے مستقبل سے بحث کروں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند تواریخی مثالوں سے مذہب کی اہمیت پر روشنی ڈالوں۔ مذہب کی غرض وغایت قیام امن۔ اصلاح نفس اور تزکیۂ روح ہے دُنیا میں جتنے مذاہب بھی موجود ہیں ان کی تعلیم اس کے علاوہ نہیں۔ پھر نہیں سمجھ میں آتا کہ الحاد پرستوں کے اس دعوے کی سچائی کہ مذہب دُنیا کے امن وامان میں

خلل پذیر ہوتا ہے کس طرح قایم رہتی ہے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ بعض اوقات مذہب نسلِ انسانی کے امن و عافیت کی تباہی کا باعث ہوتا ہے مگر یہ اس کا قصور نہیں - یہ اس کی تعلیم کا اثر نہیں بلکہ اس کے ناقص العقل پیروں کی غلط تقلید کا نتیجہ ہے۔ یہ تو سب مذاہب کی عام تعلیم ہے۔ اب میں اصل موضوع کی طرف رجوع ہوتا ہوں۔

اسلام دنیا میں صرف ایک ہی پیام لے کر آیا تھا اور وہ یہ کہ انسانیت کے بکھرے ہوئے عناصر کو ایک ملک میں منسلک کردے اس کا مقصد قوموں کو مجتمع کرنا ہے نہ کہ منتشر کرنا۔ اسی کی تعلیم کا اثر تھا کہ عرب جیسا فرقہ بند ملک اسلام کے جھنڈے کے نیچے قومیت اور یگانگت کے رنگ میں رنگا گیا۔ کسی شاعر نے مذہب کے بارے میں کیا خوب کہا ہے ؎

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں

آج قدیم قومیں رو بہ تنزل ہیں اور ضعف سے کانپ رہی ہیں۔ ان کے نظام کا ہر ستون پے درپے گر رہا ہے لیکن اگر ہم ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کی تباہی کا موجب۔ ان کی بربادی کا باعث۔ ان کے تنزل کا سبب قوتِ ایمانی کی کمی اور نظامِ اخلاق کا انحطاط ہے۔ یہی ایک ایسی چیز ہے جو قومی زندگی کی روح کہلائے جانے کی مستحق اور ہر قوم کی ترقی و تنزل کا محور ہے۔ جب کسی قوم کے جوشِ مذہبی میں ضعف آجائے یا اس کے نظامِ اخلاق میں کمزوری پیدا ہوجائے تو فوراً سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ قوم بہت جلد صفحۂ ہستی سے مٹنے والی ہے۔ جس طرح ہر شخص میں ایک خاص روح ہوتی ہے جس سے وہ اپنے تمام کام انجام دیتا ہے اسی طرح ہر قوم کی بھی ایک خاص روح ہوتی ہے اور یہ اس کے مخصوص اخلاق و خواص ہوتے ہیں جو اس کے تمام تغیرات اور انقلابات کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اخلاق مذہب کا جزوِ لاینفک ہے کیونکہ کوئی قوم بغیر اخلاق کے اور کوئی نظامِ اخلاق بغیر مذہب کے زندہ نہیں رہ سکتا اسی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر قوم کی زندگی کے رُکنِ اعظم صرف دو ہیں مذہب اور اخلاق اور تاریخ عالم شاہد ہے کہ یہ ہمیشہ سے قوموں کی زندگی نہایت اہم عنصر اور تاریخ کا نہایت نمایاں جزو رہے ہیں۔ اور میں تو یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہوں کہ ہماری زندگی کا اہم اصول اگر کوئی چیز ہے تو "مذہبی اصول" ہیں۔ قدیم سلطنت ایران کی مثال ہمارے لیئے بالکل کافی ہے۔ اس کے تنزل میں ایک زبردست راز مضمر ہے۔ اُس کا نتیجہ ہمارے لیئے سبق آموز اور عبرت خیز ہے۔ جس وقت تمام عرب اسلام کی روشنی سے منور ہوچکا تھا تو اس کی ہمسایہ عظیم الشان سلطنت ایران کفر کے بحرِ بے پایاں میں غرق تھی۔ یہ اسلام کا وہ زمانہ ہے جس کو ہم مذہبی نقطۂ نظر سے اپنا عہدِ زریں کہہ سکتے ہیں۔ اُس وقت ایران کا شمار دنیا کی زبردست اور عظیم الشان قوتوں میں تھا۔

اس کا نظامِ حکومت عرب کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مستحکم تھا۔ ذہانت کے اعتبار سے اُس طاقتور سلطنت کا یہ زمانہ عہدِ کمال کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ مگر باوجود اس تمام شان و شوکت اور طاقت و دولت کے اس کو عرب کے خانہ بدوش بدّوؤں کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا وہ مسلمانوں میں کونسی ایسی طاقت موجود تھی جس نے ایران جیسی سلطنت کے پرخچے اڑا دیئے ؟ وہ کونسی ایسی شے تھی جس نے دم بھر میں ایران کو تہ و بالا کر ڈالا۔ دربارِ کسریٰ میں تہلکہ ڈال دیا۔ ایران کے عظیم الشان محلوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی مسلمانوں کی شاندار فتوحات کا راز دولت و حشمت نہیں۔ طاقت و قوت نہیں بلکہ ان سب سے بالاتر چیز "قوتِ ایمانی" تھی جس پر ہمارے آباؤ اجداد کے برگزیدہ اخلاق کا دار و مدار تھا۔ اس مثال سے ثابت ہوتا ہے کہ ذہانت کتنی ہی ترقی کر جائے لیکن مذہب اور اخلاق کی قائم مقام نہیں ہو سکتی۔ ایک قوم اگر مالی حیثیت سے مفلس ہے تو وہ زندہ رہ سکتی ہے۔ علمی افلاس بھی کسی قوم کو دفعتہً تباہ نہیں کر سکتا لیکن جو قوم اخلاقی حیثیت سے مفلس ہو جس کے اندر مذہبی جذبہ بالکل ناپید ہو اُس کی زندگی کی کون ضمانت کر سکتا ہے۔ دُور کیوں جائیے اپنی ہی قوم کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لیجئے اور اس کے گزشتہ کارناموں کو یاد کیجئے۔ یہ ہماری ہی قوم تھی جس نے دنیا میں سب سے پہلے حقیقی معنوں میں جمہوری سلطنت قائم کر دکھلائی۔ عباسی حکومت کے کارنامے کیا سیاسی کیا ادبی دنیا کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ تمام ممالک مشرق سے مغرب تک ہمارے ہی زیرِ نگیں تھے ؎

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا

آہ اپنے قومی کارناموں کو کہاں تک یاد کروں۔ کس طرح بتلاؤں کہ ابو عثمان، البیرونی، ابو علی ابن سینا اور ابن رشد مسلمانوں ہی میں پیدا ہوئے تھے۔

تواریخ کے اوراق کی ورق گردانی سے معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے جب احکامِ شریعت کو فراموش کر دیا اور اخلاقی کمزوریوں اور بداعمالیوں میں مبتلا ہو گئے تو بالآخر پامال ہو گئے۔ قرطبہ، بغداد، دمشق، قاہرہ اور دہلی وہ مقامات ہیں جہاں دنیا اسلامی جاہ و حشم کے حیرت انگیز نظارے کر چکی ہے۔ کس کو یقین آسکتا تھا کہ یہ ساری دولت و قوت ایک دن ہماری قوم سے رخصت ہو جائیگی۔ چونکہ قوم احکامِ الٰہی سے رُوگردانی کر چکی تھی۔ اخلاقی کمزوریاں پیدا ہو گئی تھیں۔ گھن لگ چکا تھا وہ اس شان و شوکت۔ جاہ و حشمت اور طاقت و قوت کو زیادہ دیر تک نہ سنبھال سکی اور اُن کی اُولوالعزمی حوصلہ مندی اور وہ تمام اوصاف جو مسلمانوں کے مایۂ ناز تھے رخصت ہو گئے اور بالآخر کار مسلمانوں نے اپنی قوم کی بربادی کا حسرتناک منظر دیکھا۔ آج کل ہم اُسی اخلاقی انحطاط کی حالت

# غزل

(از فیاض الحق صاحب اختر بھوپالی)

حیات جاوداں ہے اس طرح جی سے گزر جانا  
کہ اک کروٹ کی حسرت میں مریضِ غم کا مر جانا

نتیجہ کچھ بھی آخر کار ہو جینا کہ مر جانا  
بہر صورت شبِ فرقت کو آنا اور گزر جانا

دلِ مرحوم یہ کفارۂ عیشِ گلستاں تھا  
چمن میں بسنے والوں کا قفس میں آکے مر جانا

حقیقت میں کمالِ عشق و معراجِ محبت ہے  
مرے آنسو کسی دامانِ رنگیں پر بکھر جانا

وہی شانِ تبسم ہو وہی اندازِ بے پروا  
تم آنا، اور نظامِ زندگی برباد کر جانا

جہانِ عشق و الفت میں وقارِ آدمیت ہے  
کسی اُمید پر جینا، کسی حسرت میں مر جانا

ٹھہر او بیخودیٔ دیدہ دل سے دو گھڑی مل لوں  
نگاہِ ناز کو آتا ہے سینہ میں اُتر جانا

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے اب تک وہ نظارہ  
نظر ملتے ہی اک طوفانِ رنج و غم گزر جانا

بتا اے ہم نفس مجھ کو یہ کیا تھا دورِ الفت میں  
کہ اپنی موت کو خود میں نے قصہ مختصر جانا

بس اتنی جانتے ہیں ہم تو تاثیرِ نظر اختر  
ہزاروں بار جی اٹھنا ہزاروں بار مر جانا

# چوگانِ ہستی

(از "پریم چند")

## تبصرہ

(از عبدالشکور صاحب ایم۔ اے)

ایک عرصہ سے "پریم چند"، کے چھوٹے چھوٹے افسانے ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہو رہے ہیں، مخزن۔ ادیب، زمانہ، ہمایوں، اور اردو کے دیگر رسائل پریم چند کی قلمی معاونت سے بہرہ اندوز ہوئے اور ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ فخر زمانہ ہی کو حاصل ہے کہ اس نے اس بے مثل فسانہ نگار کے سب سے زیادہ قصوں سے اپنے صفحات کو مزین کرکے ایسا بیش قیمت اور پاکیزہ لٹریچر افراط کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ان افسانوں کی بہت بڑی تعداد مجموعوں کی صورت میں نکل کر ملک کے ہر گوشہ میں مقبول ہو چکی ہے، ان کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ جب کبھی آپ پڑھتے پڑھتے تھک جاتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ دماغ کو فرحت حاصل ہو تو آپ لائبریری میں جاکر کسی ایسی کتاب کی تلاش میں مصروف ہوتے ہیں جس کا مطالعہ آپ کو کچھ عرصہ کے لئے بے خود بنا دے، الماری کھولتے ہی ایسی پہلی کتاب جو آپ کے ہاتھ میں آئے گی مجھے یقین ہے "پریم بتیسی" ہوگی یا "پریم پچیسی" خواہ آپ نے ان کتابوں کو کتنی ہی مرتبہ پہلے کیوں نہ پڑھ لیا ہو، جہاں تک ہر دلعزیزی کا تعلق ہے میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اردو داں طبقہ کے لیے پریم چند اور سدرشن اسی قدر عزیز ہیں جس قدر کہ انگریزی داں طبقہ کے لیے "کنن ڈائل" ٹامس ہارڈی اور ایچ جی ویلس۔

ان افسانوں کے علاوہ "پریم چند"، نے ایک ڈرامہ بھی لکھا تھا، جو عرصہ تک زمانہ کے صفحات پر "کربلا" کے نام سے شائع ہوا، میں نے اس ڈرامہ کا غور سے مطالعہ نہیں کیا، بالخصوص اس وجہ سے کہ "باقی دارد" کا جھگڑا مجھے بالطبع ناپسند ہے لیکن اس کے تیور بتاتے تھے کہ کسی واقف کار اور پختہ مشق مصنف کی جوشش

طمع کا نتیجہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس ڈرامہ کی اشاعت ایک مقتدر گروہ کو ناگوار ہوئی، خصوصاً اس وجہ سے کہ اس ڈرامہ میں چند ایسے پاکیزہ افراد کو اسٹیج پر لایا گیا ہے جن کی ہم شدت سے عزت کرتے ہیں، اور جو مسلمانوں کے نزدیک خدا اور رسول کے بعد سب سے زیادہ قابل احترام ہیں مگر یہ ماننا پڑیگا کہ آرٹ کی دست برد میں آنے کے بعد شخصیت اسقدر اہم نہیں رہتی جسقدر کہ آرٹ کی خوبیاں، اور یہ ظاہر ہے کہ واقعۂ کربلا سے زیادہ ڈرامٹک واقعہ مسلمانوں کی تاریخی لٹریچر میں اور کوئی نہیں ۔

علاوہ ازیں پریم چند کا ایک اور ادبی کارنامہ ایک دلپذیر ناول ہے، جس کا نام "بازارحسن" ہے۔ اور جس کو پڑھنے کے بعد مجھے یقین ہے کہ آپ "پریم چند" کی تصنیف سے زیادہ خوبیوں سے روشناس ہو سکتے ہیں۔ یہ ناول اُردو کے ناولوں کی صف اول میں عرصہ ہوا جگہ پا چکا ہے، بہت عرصہ ہوا میں نے اس ناول کو دو تین مرتبہ پڑھا تھا، مگر ابتک اُس مطالعہ کی لذت دل و دماغ میں موجود ہے، اُس زمانہ میں میرا یہ خیال تھا کہ جہاں تک ناول نویسی کا تعلق ہے 'بازارحسن' پریم چند کی انتہائی بلندی ہے، لیکن چوگانِ ہستی کے شائع ہونے کے بعد اکثر حضرات کو یہ رائے تبدیل کرنا پڑی، اور یہ تسلیم کرنا پڑا کہ جس طریقہ سے پریم چند افسانہ نگاری کا مالک ہے، اسی طریقہ سے ناول نویسی میں بھی اُس سے گوئے سبقت لے جانا کچھ آسان نہیں، افسانہ اور ناول کے ساخت میں بین فرق ہوتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ جو افسانہ کامیابی کے ساتھ لکھ سکے، وہ ناول نویسی میں بھی ممتاز ہو جائے، مگر پریم چند کے ادبی کارناموں نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ ادب کی ان ہر دو اصناف پر یکساں قادر ہے ۔

"چوگان ہستی"، ایک بڑا ناول ہے جو دو حصوں میں شائع ہوا ہے، اس ناول کے شائع کرنے کا فخر دارالاشاعت پنجاب کو حاصل ہے، کل ناول کچھ کم ایک ہزار صفحات پر پھیلا ہوا ہے لکھائی، چھپائی، اگر بہت اچھی نہیں، تو کچھ ایسی زیادہ بُری بھی نہیں ہے، ہر حصہ کی جدا جدا جلد ہے۔

قیمت درج نہیں، مگر غالباً دونوں حصے پانچ روپیہ میں حاصل کئے جا سکتے ہیں



قبل اس کے کہ ہم چوگان ہستی کی معنوی خوبیوں پر تبصرہ کریں یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ہم مجملاً اُردو زبان

کی فسانہ نگاری کے ارتقا اور اُس کی چند نمایاں خصوصیات سے ناظرین کو آگاہ کردیں۔

محمد یحییٰ صاحب تنہا اپنی کتاب سیرالمصنفین میں فرماتے ہیں:

"ہماری زبان میں خدا کے فضل سے افسانوں اور قصوں کی کبھی کمی نہیں ہوئی، سوا سو برس سے زیادہ زمانہ گذرا کہ اُردو زبان کی نثر معرض وجود میں آئی تھی، اس وقت سے اب تک زیادہ تر قصص ہی ہمارے علم ادب کے سرمایۂ ناز و افتخار رہے، میرامن کے باغ و بہار سے لیکر شررؔ کے آخری ناول تک سوائے افسانوں کے اور یہاں کیا دھرا ہے"۔

ان سطور میں تنہا صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اُس سے ہمیں انکار نہیں، لیکن میرامن کے باغ و بہار کے زمانہ کا شاید ہی کوئی قصہ، افسانہ، یا ناول ایسا ہوگا جو آرٹ کے نقطۂ نظر سے کامیاب اور مکمل کہلایا جاسکے۔ میرامن کی قدر و منزلت اگر آپ محض اس لئے کریں کہ اُردو زبان کی تاریخ لکھتے وقت اُردو کی ابتدائی حالت کا اندازہ اُس کی تحریر سے بخوبی ہوسکتا ہے تو کچھ مضائقہ نہیں، لیکن اُسے ایک کامیاب اور سحر طراز فسانہ نگار تسلیم کرنا انصاف کا خون کرنا ہوگا۔

ناول یا تو محض آرٹ ہی آرٹ کا خاکہ ہو، یا اس کے ذریعہ سے بعض مسائل کی تبلیغ کی جائے، مثلاً تاریخی و سیاسی علوم، قومیت، فلسفہ، سائنس کے اہم مسائل آپ آسانی کے ساتھ ناولوں کے ذریعہ سے ملک میں پھیلا سکتے ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ ناولوں کی معرفت آپ اخلاق اور معرفت کے رموز دنیا پر روشن کرنے لگیں گے، مغربی ممالک کے ناول نگار یہ سب کچھ کر رہے ہیں، مگر ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ خود ہمارے ملک کے ادیب اس امتحان میں کہاں تک پورے اُترتے ہیں۔

میرے خیال میں پنڈت رتن ناتھ سرشار اُردو ناول نگاری کے باوا آدم ہیں، اس لئے نہیں کہ اُنھوں نے سب سے بیشتر ناول لکھا، بلکہ اس لیے کہ یہی وہ پہلا فاضل ادیب تھا جس نے اس آرٹ کو ایک آرٹ سمجھا، اور اُس کی خصوصیات سے آگاہی حاصل کی، ان کا سب سے نمایاں کارنامہ فسانۂ آزاد ہے جس کا حجم اس قدر زیادہ ہے کہ اب اُس کے مطالعہ کا مشورہ دینا کچھ قرین مصلحت نہیں معلوم ہوتا، پھر بھی تعطیل گرما میں اگر اسے پڑھ لیا جائے تو بہتر ہوگا، اگر اور کچھ نہیں تو کم از کم اُس زمانہ کی بول چال، طرز معاشرت، اخلاق، سوسائٹی کی

حالت کا آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائیگا، اور آپ یقیناً اُن اسباب سے آگاہ ہو جائیں گے جو ہمارے سیاسی تنزل اور اخلاقی پستی کا باعث ہوئے، اس ناول کا آغاز ۱۸۷۸ء میں اودھ اخبار کے صفحات پر ہوا، اور ایک عرصہ تک اس کی قسطیں اس جریدہ میں شائع ہو کر ملک میں مقبول ہوتی رہیں، سرشار فطرت انسانی سے کماحقہ واقف ہے، اور اس واقفیت کو اُس نے ایک دلآویز انداز کے ساتھ اپنے افسانہ میں جابجا ظاہر کیا ہے اُس کے فسانہ کے اشخاص گو ایک بڑی حد تک غیر معمولی افراد شمار کئے جا سکتے ہیں لیکن وہ کسی مقام پر انسانیت اور آدمیت کے حدود سے متجاوز نہیں ہوتے، سرشار کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے قصہ کے تسلسل کے ساتھ ساتھ مختلف کردار کی خصوصیات کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، محلسرا میں، کونسل میں، قسطنطنیہ میں آزاد ہمیشہ آزاد ہے، آپ جہاں چاہیں اُسے دیکھیں ہمیں یقین ہے کہ اُس کی خصوصیات ہمیشہ اُس کے ساتھ نظر آئیں گی، میرے خیال میں سرشار ہی اُردو کا وہ پہلا قصہ گو ہے جس نے افسانہ کے تسلسل اور کردار کی خصوصیات کی جانب توجہ کی، اور ملک کے ہونہار ادباء کو ناول نگاری کا یہ زرین اصول سکھایا۔

اس تقریر سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ناول سراسر مکمل اور عیوب سے پاک ہے مناسب نہ ہوگا، فسانۂ آزاد میں تمام خامیاں موجود ہیں جو ہر زبان کے پہلے بڑی اور اصولی ناول میں ہوتی ہیں، مثلاً خود قصہ کے ہیرو کو لیجئے، حضرت آزاد ابتدا میں پکے اوباش، آوارہ منش، نظر آتے ہیں، لیکن آگے چلکر ظاہری اسباب کے بغیر اُن کے مزاج میں ایک تغیر عظیم پیدا ہوتا ہے، اور وہ یکایک نکوکاری، تہذیب شائستگی، کا جامہ پہن لیتے ہیں، اور یہ خوبیاں اُن کی رگ رگ میں پیوست ہو جاتی ہیں، ہم یہ ماننے کے لیئے طیار ہیں کہ اس قسم کے تغیرات سرشت انسانی کے منافی نہیں ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ تبدیلی، چند در چند مؤثر اسباب کے بغیر ناممکن ہے، مثلاً ٹیگور کا افسانہ "حاشی" لیجئے، ہیروئن نظر آتی ہے لیکن کس انداز میں؟ ایک تیتری صورت میں، الہڑ، بے پروا، خود، اُس کا شوہر بستر مرگ پر پڑا ہوا دم توڑ رہا ہے لیکن وہ اپنی دلچسپیوں میں اس قدر محو ہے کہ اُسے اس آنے والی مصیبت کی بھی پروا نہیں ہوتی، اور وہ اسی بات پر مصر ہے کہ اُسے میکے جانے کی اجازت ملجائے، اس پر طرہ یہ ہوتا ہے کہ اجازت حاصل کئے بغیر سب کی مرضی کے خلاف چلدیتی ہے پھر واپس آتی ہے، اور موت کی اندوہناک تصویر اُس کے کردار میں ایک عظیم الشان تبدیلی پیدا کر دیتی

یہاں تک کہ اُس کی قلب کی پرانی خصوصیات یکلخت بدل جاتی ہیں، اس تغیر کے اسباب موجود ہیں اور کافی سے زیادہ اسباب، لیکن پھر بھی ٹیگور سے یہ بجا شکایت کی جاتی ہے کہ یہ یکلخت تبدیلی کچھ بھلی نہیں معلوم ہوتی، اسی طریقہ سے آزاد کے کیرکٹر میں زمین وآسمان کا فرق پیدا ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ کایا پلٹ جاتی ہے، آزاد وہ آزاد ہی معلوم نہیں ہوتا۔ مگر سرشار اس تغیر عظیم کے معقول وجوہات پیش نہ کرسکا۔

اس کے ساتھ ساتھ حسن آرا کے طرز معاشرت پر غور فرمائیے، وہ سوائے اُردو، فارسی کے اور کسی زبان اور علم سے واقف نہیں، وہ مشرقی بیگمات کی صحبت میں پلتی اور بڑھتی ہے، جہاں وہ مغربی سوسائٹی کی خصوصیات سے بھی واقف نہیں ہوسکتی، پھر حسن آرا کے دور حیات کو بھی ذہن میں رکھئے، آج سے کم از کم ۵۰ برس قبل پیدا ہوتی ہے، اور ایسے خاندان کا چشم وچراغ بنتی ہے کہ جہاں مغربیت کو کفر سمجھنا چاہیئے تھا، پھر بھی اُس کے خیالات میں مغربی رنگ وروغن موجود ہے، مغربی تہذیب سے وہ کماحقہ آگاہ ہے، اُس کی چال ڈھال، رفتار وگفتار میں مشرقیت کا اُسی قدر فقدان ہے جسقدر کہ مغربیت کی بہتات، چنانچہ اس معمہ نے ایک عقدۂ لاینحل کی صورت اختیار کرلی ہے کہ آخر یہ تبدیلی کیسے وقوع پذیر ہوئی۔

خیر۔ ان فروگذاشتوں کے باوجود آپ اسے باور کرلیجئے کہ ناول نگاری کے لیے سرشار کے ادبی کارنامے اُسی قدر اہم ہیں جس قدر کہ انگریزی نظم کے لیے چاسر کے۔

---

سرشار کے بعد شرر آجاتے ہیں جن کے ناول آج سے پانچ چھ سال پیشتر تک بہت کثرت کے ساتھ فروخت ہوتے اور پڑھے جاتے تھے، اب بھی اُردو داں پبلک کا ایک طبقہ ایسا موجود ہے جو اُن کے ناولوں کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ جس قدر انگریزی زبان پھیلتی جائے گی، اُسی قدر شرر کی ہردلعزیزی کم ہوتی جائے گی، شرر کو اگر سر والٹر اسکاٹ کا ہم پلہ تصور کیا جائے تو کچھ زیادہ بیجا نہ ہوگا، ان کے چند خصوصیات ایک دوسرے سے مشابہ ہیں، مثلاً دونوں تاریخی ناول لکھتے ہیں، دونوں بہت کثرت کے ساتھ خامہ فرسائی کرتے ہیں، دونوں کو پبلک ایک خاص زمانہ میں بڑے چاؤ سے پڑھتی ہے، اور اُن کے بعد چھوڑتی چلی جاتی ہے، دونوں ناولوں میں تاریخی مواد فراہم کرتے ہیں لیکن تاریخی صحت کی زیادہ پروا نہیں

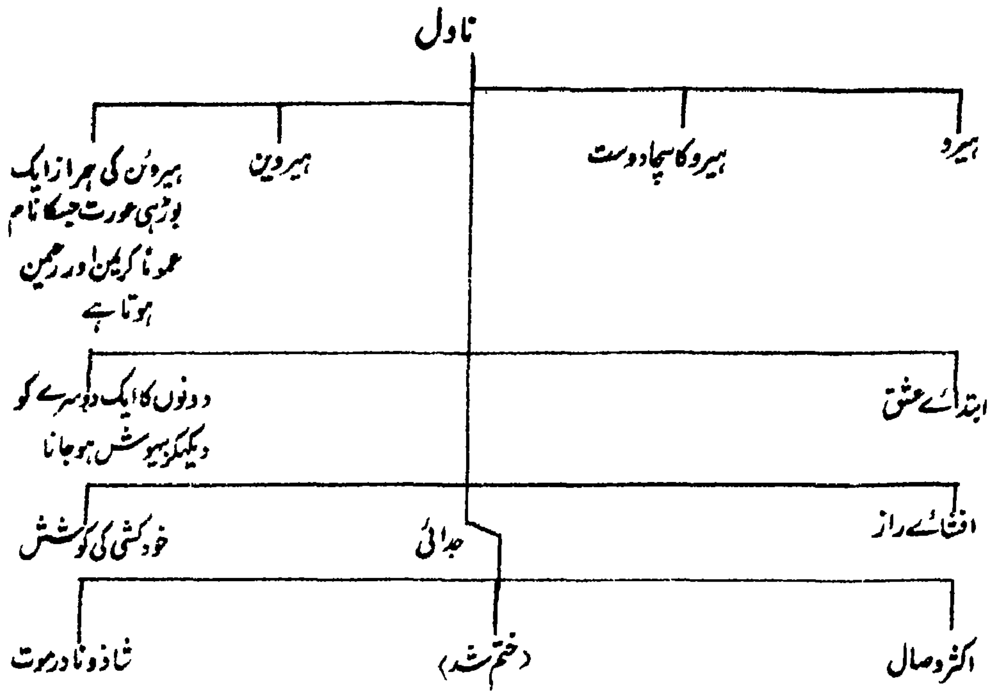
کرتے، ان کے ناول کثرت سے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیلے اور مقبول ہوئے، جہاں تک زبان کی درستی عبارت آرائی، اور تاریخی مواد کا تعلق ہے اُن کے ناول عدیم النظیر اور بے مثل ہیں، لیکن فردوس بریں، اور حسن کا ڈاکو کے علاوہ اور کوئی شرر کا ناول ایسا نہیں ہے جو آرٹ کے لحاظ سے مکمل اور کامیاب کہا جا سکے، ان میں فردوس بریں کا پایہ سب سے بلند ہے، اور شرر کے اس شاہکار کو ہم بلا کسی خوف کے دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں، مجھے اس سے انکار نہیں کہ شرر نے اُردو ناول نگاری میں بہت بیش قیمت اضافہ کیا، لیکن میں اُن کا ہم خیال نہیں ہوں جو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ شرر نے اُردو ناول نگاری کو آسمان پر پہونچا دیا، شرر کے ساتھ ساتھ حکیم محمد علی خاں، اور مرزا رسوا کا نام نہ لینا سراسر بے انصافی ہوگی، اور جب کبھی اُردو علم ادب کی مبسوط تاریخ لکھی جائے گی ان کے کارنامے بھی جلی قلم سے لکھے جائیں گے، ان تینوں حضرات میں آرٹ کے لحاظ سے رسوا کا پایہ بلند ہے، حالانکہ ان کے ادبی کارناموں پر اب تک پوری روشنی نہیں ڈالی گئی ہے، امراؤ جان ادا گو بادی النظر میں ایک حسن بازاری کی عشوہ طرازیوں کا خاکہ ہے لیکن اُس میں غدر کے زمانہ کے لکھنؤ اور مضافات لکھنؤ کا ایسا دلپذیر اور صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

ہندوستانی ناول نگاری کی خصوصیات پر بحث کرتے ہوئے یوسف الزماں صاحب بی۔اے اپنے ایک مضمون[۱] میں فرماتے ہیں۔

> فسانہ نگاری کئی لحاظ سے سوسائٹی کے لئے ضروری ہے، یہ ایک دلچسپ پیرایہ اُن سوشل خامیوں کو طشت ازبام کرنے کا ہے جو سوسائٹی میں کچھ اس طرح جڑ پکڑ جاتی ہیں کہ بادی النظر میں ہم اُن کو یا تو نظر انداز کر جاتے ہیں یا اُن کو مفید تصور کرتے ہیں، لیکن اُردو میں فسانہ نگاری ابھی ایام طفولیت سے گذر رہی ہے، یہاں (اگر تمام نہیں تو) زیادہ تر ناولوں کا خلاصہ ذیل کے نقشہ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

---

[۱] زمانہ اپریل ۱۹۲۱ء




اردو لٹریچر میں ایسے ناول بہت کم ہیں جن کے ذریعہ سے سوسائٹی کی خرابیوں کی دور کرنے، یا اصلاح خیالات کی کوشش کی گئی ہو، شرر نے پردہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا، اور اپنے نقطۂ نگاہ کی تبلیغ کے غرض سے "بدر النسا کی مصیبت" لکھا تھا، لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ ناول نہایت لچرا ور پژمردہ ہے، بہتر ہوتا اگر اس کی تصنیف سے شرر اپنے ناول نگاری کے دامن کو ملوث نہ کرتے، مغرب میں یہ دستور ہے کہ فلسفیانہ، اخلاقی، معاشرتی، اور علمی خیالات کی ترویج ناولوں کے ذریعہ سے کی جاتی ہے، اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل قصہ اور کہانی کی صورت میں عوام الناس تک پہونچائے جاتے ہیں، اس انداز کے ناول اُردو زبان میں بہت کم ہیں اس سلسلہ میں "جمیلہ کی ناکامیابی" کا ذکر کرنا ضروری ہے جس کو حکیم عبدالوالی صاحب لکھنوی نے تصنیف کیا تھا، اور جو بالاقساط "معلومات" میں شائع ہوتا رہا، گمان غالب ہے کہ یہ ناول کتابی صورت میں شائع ہوگیا ہوگا، جس کا مجھے علم نہیں، مگر میں بلاخوف تردید عرض کرسکتا ہوں کہ یہ ناول ہر لحاظ سے ملک کے بہترین ناولوں میں شمار ہونے کے قابل ہے، یہ پہلا ناول تھا جس میں اس بات کی کامیاب کوشش

کی گئی تھی کہ قصہ کے ذریعہ سے علمی اور سائنٹفک نکات ملک میں پھیلائے جائیں، مگر مجھے افسوس ہے کہ زمانہ نے اُس کی قدر نہ کی، اور وہ اس قدر مقبول نہ ہوا جسقدر کہ اُسے ہونا چاہیئے تھا، اس کی خاص وجہ اغلباً یہ ہوئی کہ عوام الناس کی ذہنیت اُن علمی خیالات کی بلندی کی تاب نہ لاسکی، مگر مجھے یقین ہے کہ اگر اب اُس کی کوئی اڈیشن نکالی جائے گی تو یقیناً ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگی۔

---

اس قدر طویل دیباچہ کے بعد ہم چوگان ہستی کی معنوی خوبیوں پر متوجہ ہوتے ہیں، قصہ کے ابتدا ہی میں ہم سورداس سے روشناس کئے جاتے ہیں جو وستنے کے حسن وجمال اور صفات کے باوجود قصہ کا ہیرو ہے، سورداس ایک اندھا، مفلوک الحال، بے روزگار ہے جو دن بھر بھیک مانگتا ہے، اور شام کو مندر میں ہو نچکر بھجن گاتا ہے، اُس کی بے نفسی، شرافت، حلم، بردباری، اور نیک نیتی سب پر روز روشن کی طرح ظاہر ہے، اور گاؤں کا ہر کہ ومہ اُس کی قدر و منزلت کرتا ہے، اور اُس کی تعظیم و تکریم کو اپنا فرض اولین تصور کرتا ہے،

> "سورداس ایک نہایت نحیف و ناتواں اور سادہ مزاج شخص تھا، جسے شاید قدرت نے بھیک مانگنے ہی کے لئے بنایا تھا، وہ ہر روز لاٹھی ٹیکتا ہوا پکی سڑک پر آبیٹھتا، اور راہ گیروں کی جان کی خیر مناتا، "داتا بھگوان تمہار اکلیان کریں،" یہی اُس کی صدا تھی، اور اسی کو وہ بار بار دہراتا تھا، شاید وہ اسے مسافروں کے تالیف قلوب کا منتر سمجھتا تھا۔"

سورداس سڑک پر آس لگائے بیٹھا ہی تھا کہ یکایک ایک فٹن کی آواز سنائی دی، اور معاً مسٹر جان سیوک مسز جان سیوک، پربھو سیوک اور مس صوفیا نمودار ہوتے ہیں۔ یہ چاروں ایک ہی گھر کے افراد ہیں، مگر ان کے خصائص میں ایسا نمایاں اور مسلسل فرق ہے جو ناول کے آخری صفحہ تک یکساں قائم رہتا ہے، صوفیہ اور پربھو بھائی بہن ہیں، ایک ہی آب وہوا میں پلے بڑھے، ایک ہی ماحول میں جوان ہوئے لیکن دونوں کے مزاج ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں، علاوہ ازیں ماں بیٹی میں قطبین کا سا فرق معلوم ہوتا ہے،

مسٹر جان سیوک، پکی دنیادار، کٹر عیسائی، تنگ نظر، بدمزاج، مغرور ہے، یہاں تک کہ کبھی کبھی بداخلاق تک ہو جاتی ہے، اس کے برخلاف صوفیہ اپنے حسن وجمال رعنائی و برنائی، اخلاق وشرافت، ہمت و دلیری، وسعت نظر و رواداری میں آپ اپنی نظیر ہے، اور بجا طور سے قصہ کی ہیروئن کہلائی جاسکتی ہے، اُس کے کیرکٹر کی جاذبیت، اور اُس کے انداز کی دلکشی ناممکن ہے کہ آپ سے خراج تحسین حاصل نہ کرے۔

دراصل ناول میں دو جدا جدا قصے ہیں، لیکن یہ پریم چند کے آرٹ کا کمال ہے کہ دونوں قصے ایک خاص نقطہ پر پہونچکر ایک ہو جاتی ہیں، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کل افراد ایک ہی نظام، اور ایک ہی سلک میں پرو دئے گئے ہیں، مثال کے طور پر شکسپیر کے ڈرامہ "ایز یو لائک اٹ" کو لیجئے، ایک طرف تو آرلینڈو اور روزالینڈ کی حسن وعشق کی داستاں ہے اور دوسری جانب سینیر ڈیوک کی تباہی و بربادی کا المناک قصہ فرآرڈن کے مرغزار میں کل اشخاص ڈرامہ ایک ہی نظام کے ماتحت عمل پیرا ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، یہی انداز اس ناول کا ہے۔ قصہ یوں شروع ہوتا ہے کہ جان سیوک ایک قطعہ زمین حاصل کرنا چاہتے ہیں جو سورداس کی ملکیت ہے، اس افتادہ قطعہ میں گاؤں کے جانور بھینسیں اور گائیں چرتی ہیں، سورداس زمین کے اس قطعہ کو چند در چند وجوہات کی بنا پر فروخت کرنا نہیں چاہتا، اول تو یہ موروثی ملکیت ہے جس کا فروخت کرنا باعث ذلت ہوگا، دوم، اس میں ہمسایہ دوستوں کی گائیں چرتی ہیں، اگر اسے فروخت کردیا گیا تو ان کا کیا حشر ہوگا، سوم سورداس یہ چاہتا تھا کہ اس قطعہ زمین میں ایک شوالہ بنا دیا جائے اس لئے ایک عیسائی تاجر کے ہاتھ اس کا فروخت کرنا بعید از قیاس تھا، سورداس اور جان سیوک میں ایک جنگ چھڑ جاتی ہے، اور جنگ بھی کیسی اَن میل بے جوڑ، ایک طرف فقر و فاقہ، غربت و افلاس، بے بسی، اور کس مپرسی، دوسری جانب دولت، عزت، رسائی، اثر، حکام سے میل جول، مگر اس اندھے فقیر نے اپنی روحانی قوتوں کے ذریعے جان سیوک کو بار بار شکست دی، اور آخر دم تک اپنے خیال میں مردانہ پختگی کے ساتھ قائم رہا۔ اسی قصہ میں یہ قصہ نکل آتا ہے کہ صوفیہ عیسائی تعلیم سے غیر مطمئن ہوکر اپنی ماں سے آزادانہ بات چیت کرتی ہے، جس کا نتیجہ اُس کے حق میں بہت برا ہوتا ہے، اُس کی ماں اُس سے سخت ناراض ہوتی ہے، اور نہایت برہمی کے لہجہ میں اُسے جائز و ناجائز طریقہ سے ملامت کرتی ہے، صوفیہ کا نسوانی غرور بیدار ہوتا ہے، اور وہ گھر سے نکل کھڑی ہوتی ہے

بنارس کی کشادہ سڑکوں پر وہ چکر لگا رہی تھی کہ یکایک ایک مکان میں آگ لگ جاتی ہے، صوفیہ مردانہ وار بہادری سے کام لیکر مکان میں جا پہونچتی ہے، اور اُس شخص کو آگ سے نکال لاتی ہے جو بے بسی کی حالت میں نذر آتش ہونے والا تھا، یہ کنور صاحب کا اکلوتا بیٹا ونے ہے جو آگے چل کر اس کا عاشقِ زار، اور قوم کا ایک باہمت خادم بن جاتا ہے، اس دوا دوش میں خود صوفیہ بیہوش ہو جاتی ہے، اور اپنی جان کی پروا نہ کرکے ایسا کام کرگذرتی ہے جس کا خیال ہی بڑے بڑے سورماؤں کو لرزہ براندام کر دیتا ہے، ونے کی ماں رانی ان الفاظ میں صوفیہ کا شکریہ ادا کرتی ہے۔

"صوفیہ (تین دن کے بعد ہوش میں آکر)..... میں نے جس آدمی کو پکڑ کر کھینچا تھا اُس کی کیا حالت ہے؟ رانی - بیٹی! ایشور کی دیا سے وہ بہت اچھی طرح ہے، اُسے ذرا بھی آنچ نہ لگی، وہ میرا بیٹا ونے ہے ابھی آتا ہوگا، تمہیں نے تو اُس کی جان بچائی، اگر تم دوڑ کر نہ پہونچ جاتیں تو آج نہ جانے کیا ہوتا، میں تمہارے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی، تم میرے خاندان کی حفاظت کرنے والی دیوی ہو"

کنور صاحب، رانی صاحبہ، ونے اور اُس کی بہن، اندو (صوفیہ کی پرانی ہم مکتب سہیلی) صوفیہ کی پرستش کرنے لگتے ہیں، اور اُس کے علاج معالجہ، خاطر، تواضع میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے،

"صوفیہ دل ہی دل میں ان لوگوں کی باہمی محبت کا مقابلہ اپنے گھر والوں سے کرتی تھی، آپس میں کتنی محبت ہے، ماں باپ دونوں اندو پر جان دیتے ہیں، ایک میں بدنصیب ہوں کہ کوئی منہ بھی نہیں دیکھنا چاہتا، چار دن یہاں پڑے ہو گئے کسی نے خبر تک نہ لی، کسی نے کھوج ہی نہ کی ہوگی، ماں نے تو سمجھ لیا ہوگا کہ کہیں ڈوب مری ہوگی، جی میں خوش ہونگی کہ اچھا ہوا سر سے ایک بلا ٹل گئی، میں ایسے نیک دل لوگوں کے ساتھ رہنے کے قابل نہیں ہوں، میری ان سے کیا برابری؟

اس کے بعد اندو اور صوفیہ میں شادی بیاہ کے مسئلہ پر گفتگو ہونے لگتی ہے، اس سلسلہ میں اندو کے یہ خیالات خاص طور سے دلآویز ہیں: "میں تمہیں متنبہ کئے دیتی ہوں کسی ملک و قوم کے خادم سے بیاہ نہ کرنا، ورنہ پچھتاؤگی

تم اُس کے فرصت کے وقت کی محض ایک دل بہلاؤ کی چیز رہو گی"۔ الغرض قصہ شروع ہو جاتا ہے، صوفیہ اور ونے میں محبت پیدا ہوتی ہے، ایک زمانہ تک دونوں آگ کی چنگاریوں کے اثرات سے بے خبر رہتے ہیں، رفتہ رفتہ آگ سلگنے لگتی ہے، اور دونوں کے دلوں کو جلا کر خاک کر دیتی ہے، اسی اثنا میں رانی صاحبہ اس راز سے واقف ہو جاتی ہیں، اور اُن کے غصہ کی کوئی انتہا نہیں رہتی، وہ ونے کے کیرکٹر میں خاص خصوصیات پیدا کرنا چاہتی ہیں اور اس عشق کو اُن خصوصیات کا برباد کرنے والا آلہ سمجھتی ہیں"، ایک طرف تو وہ صوفیہ پر برس پڑتی ہیں، اور دوسری طرف ونے کو جلا وطن کیا جاتا ہے، اور اُسے حکم ملتا ہے کہ وہ سیوا سمتی کے ساتھ راجپوتانہ کی ریاستوں میں قومی اور سوشل کام کرے، ونے جاتا ہے مگر اپنا متاع صبر و قرار سب صوفیہ کے آغوش محبت میں چھوڑ جاتا ہے۔

راجپوتانہ کی جانب گام زن ہونے سے قبل ونے اور پربھو میں دوستانہ تعلقات قایم ہو جاتے ہیں، اور یہیں موقعہ ملتا ہے کہ ہم پربھو کے خصائل سے پوری واقفیت حاصل کر لیں، پربھو ایک حد تک دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہے، اُسے صنعتی تعلیم دی جا چکی ہے مگر اب تک وہ صنعت اور تجارت سے اسی قدر دور ہے جسقدر کہ ایک حقیقی شاعر ہو سکتا ہے، مسٹر جاں سیوک روپیہ کی پرستش کرتے ہیں، اور اس لئے ان کے نزدیک پربھو مردود خلائق ہے جس نے اس قدر روپیہ اپنی تعلیم میں برباد کیا، اور کمانے کے وقت شاعر بن بیٹھا۔ ونے کی صحبت پربھو کے لئے نہایت مفید ثابت ہوئی، اور پربھو اپنے کلام معجز نظام میں وہ خوبیاں اور کمالات دکھانے لگا جو ایک فطری شاعر کا طرۂ امتیاز ہو سکتے ہیں، ونے نے راجپوتانہ میں جو جو مصائب اُٹھائے اُن کو اس دردناک ٹریجڈی کا جزو اعظم سمجھنا چاہئے، اُس کا در در بدر پھرنا، ریاست کے سخت قوانین کے شکنجہ میں پھنسنا، جیل خانہ کی سختیاں اور درد فرقت کی بے قراریاں، ناممکن ہے کہ آپ اُنھیں پڑھیں اور متاثر نہ ہوں، اس کے ساتھ ساتھ صوفیہ پولیٹیکل ایجنٹ کی منگیتر کی حیثیت سے اسی ریاست میں پہونچتی ہے، اور ونے سے جیل خانہ ہی میں جا ملتی ہے، ایجنٹ اور کارکنان ریاست کے خلاف بغاوت شروع ہو جاتی ہے، ونے جیل خانہ سے بھاگ کر صوفیہ کی حفاظت کرنے کی غرض سے صفوں کو چیرتا ہوا منصۂ عام پر جا پہونچتا ہے، اور ایک اضطراری حالت میں باغیوں پر فیر کر دیتا ہے، عام رعایا اُس کے خون کی پیاسی ہو جاتی ہے، اور آبادی کا ہر طبقہ اُس پر لعنت بھیجنے لگتا ہے، خود صوفیہ بھی اُس سے کبیدہ خاطر

ہوتی ہے، آخر کار دونوں کے دلوں کی کدورت دور ہوتی ہے، اور دونوں بنارس پہونچتے ہیں، یہاں سورداس کی بدولت سیتا گرہ کا بازار گرم ہے، ایک طرف بے بس رعایا ہے، دوسری جانب سرکار دولت مدار کا جبروت اور طنطنہ جو اکثر خوفناک ہوائی جہازوں، دہشت ناک مشین گنوں، اور بیرحم سپاہیوں کی صورت اختیار کرلیتا ہے، قوم کا سچا، راست باز، باہمت اور نڈر خادم وِنے بھی اس میدان رستخیز میں جا کودتا ہے، اور ایک خاص موقعہ پر پہونچکر خودکشی کرلیتا ہے، اس کے بعد صوفیہ کی موت اور سورداس کا اسپتال میں دم توڑنا، کچھ اس انداز میں لکھے گئے ہیں کہ پڑھنے والے کا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

---

ناول کی زبان کا جہاں تک تعلق ہے ہمیں پریم چند صاحب سے جائز شکایت ہے کہ انھوں نے کہیں کہیں ہندی اور سنسکرت کے ثقیل الفاظ کی بھرمار کی ہے، اُن کے افسانوں کی زبان سے اس ناول کی زبان زیادہ مغلق، پیچیدہ اور مشکل ہے۔ مثلاً

(۱) کیا میری دیہہ میں تاڑی پوتی ہوئی ہے۔

(۲) ابھی نہیں، وہ تمہاری سیوا بھی کرے گی، اور تمہیں بھوجن بھی دیگی، بیچن ساہ کے یہاں تمہیں جھاڑیگی تو چار آنہ روز پائے گی،

(۳) لو بہانے سے میرا دل شانت نہ ہوگا، آپ لوگوں کی دعا سے یہ آگ اور یہ جلن شانت ہو گی، پرماتما سے کیئے میرا دکھ مٹائیں، بھگوان سے بنتی کیجئے، میرا اسنکٹ برین . . . . اُن لوگوں کے دلوں میں دیا دھرم جاگے۔

(۴) کیوں اندھے کے پیچھے پڑے ہوئے ہو؟ چلو کچھ بھجن کیرتنا ہو؟

(۵) جو استری اپنے پرش کی ہتک کرتی ہے اُسے لوک پرلوک کہیں شانتی نہیں مل سکتی۔

آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ زبان کہاں تک عام فہم ہو سکتی ہے، لیکن یہ مغلق عبارت بسا اوقات اُسی مقام پر پائی جاتی ہے جہاں سورداس، اور اُس کے گاؤں کے احباب آپس میں گفتگو کرتے ہیں، کتاب کے باقی حصہ میں زبان ایک حد تک صاف شستہ اور دلکش ہے، بعض مقامات پر تعجب ہوتا ہے کہ کیسے مشکل پیچیدہ دور (بعید) از قیاس خیال کو کیسی شستہ و رفتہ عبارت میں تحریر کردیا گیا ہے، پریم چند صاحب بہت پختہ مشق اور ہوشیار

نثر لکھنے میں ہیں اور جذبات و واقعات کو دلفریب پیرایہ میں بیان کرنے کا اُنھیں خاص ملکہ حاصل ہے،

"صوفیہ کو اُن دنوں بناؤ سنگار کا بڑا شوق ہو گیا تھا، اب تک اُس نے مانگ چوٹی یا زیور اور لباس کی کبھی پروا نہ کی تھی، تن آسانیوں سے دور رہنا چاہتی تھی، مذہبی کتب کی یہی تعلیم تھی کہ جسم فانی ہے، دنیا بے ثبات اور زندگی سراب، پس اُس کے لئے آرائش و زیبائش کی ضرورت نہیں، اصلی آرائش کچھ اور ہی ہے، اُسی پر نگاہ رکھنی چاہئے، لیکن جب وہ زندگی کو اس قدر حقیر نہ سمجھتی تھی، اُس کے حسن میں کبھی اتنی شان رعنائی نہ تھی، وہ بننے ٹھننے کے لئے کبھی اتنی بے قرار نہ تھی"۔

دیگر "اراولی کی پہاڑیوں میں ایک برگد کے درخت کے نیچے ونے سنگھ بیٹھے ہوئے ہیں، برسات نے اُس سنسان، سخت خشک، اور پتھریلے مقام میں کشش، فرحت اور رونق پیدا کر دی ہے گویا کوئی اُجڑا ہوا گھر آباد ہو گیا، لیکن ونے کی نگاہ اس قدرتی حسن کی طرف نہیں ہے، وہ تفکر کی اُس حالت میں ہے جب آنکھیں کھلی رہتی ہیں، اور کچھ نہیں دکھائی دیتا، کان کھلے رہتے ہیں اور کچھ نہیں سنائی پڑتا، ظاہر حواس معطل ہو گئے ہیں، اُن کا چہرہ اُترا ہوا ہے، جسم اتنا لاغر ہے کہ پسلیوں کی ایک ایک ہڈی گنی جا سکتی ہے"۔

پریم چند نہ فارسی کی ترکیبیں، اور نہ عربی کے مغلق الفاظ استعمال کرتے ہیں پھر بھی اُس کے انداز بیان میں اسقدر حلاوت اور لطف ہوتا ہے کہ عبارت کے آخری حصہ تک پہونچے بغیر چین نہیں آتا، ممکن ہے کہ اُن کی بعض تراکیب، اور لفظوں کا استعمال قواعد کی رو سے ناجائز ہو لیکن اُن کی پختگی، اور شیرینی مسلم ہیں۔



ناول کا قصہ مجملاً ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، جس سے ناظرین نفس مطلب بخوبی اخذ کر سکتے ہیں، اب رہا یہ سوال کہ آیا اس قصہ کو اس قدر پھیلانے کی ضرورت تھی یا نہ تھی، ممکن ہے کہ اس جگہ اختلاف آرا پیدا ہو جائے، یہ ضرور ہے کہ اس ناول کے حجم میں اگر معتد بہ کمی کر دی جاتی تب بھی اختصار کے ساتھ یہ قصہ بیان کیا جا سکتا تھا، لیکن میرے خیال میں اس ناول کا مقصد فوت ہو جاتا۔ قصہ اس قدر اہم نہیں ہے جس قدر کہ وہ تعلیم جو اس

قصہ کے ذریعہ پھیلائی جارہی ہے، ناول کا ہر باب اور ہر سین قومیت کی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے، قصہ کی فضا سراسر قومی ہے، اور ہر کیریکٹر انڈین نیشلزم کا علمبردار معلوم ہوتا ہے صفحہ صفحہ پر ایثار، خدمتِ خلق، قومی آزادی حقوق کے تحفظ اور اغیار کی چیرہ دستی کا راگ گایا ہے خود ونے کو لیجئے، ایک نہایت دولت مند باپ کا تعلیم یافتہ بیٹا ہے، لیکن رانی صاحبہ اس امر کی کوشش کرتی ہیں کہ جہاںتک ہوسکے وہ سخت سے سخت اور کٹھن سے کٹھن دشواریوں کا خوگر ہوجائے، ونے راجہ صاحب کی ساری جائداد اور بے شمار دولت کا بلا شرکت غیرے مالک ہے لیکن اپنے عنفوان شباب کے ایام اس طرح گذرتا ہے۔

"کمرہ میں کوئی سامان نہ تھا، صرف ایک کمبل بچھا ہوا تھا، اور زمین ہی پر دس پانچ کتابیں رکھی ہوئی تھیں، نہ پنکھا نہ خس کی ٹٹی، نہ پردے، نہ تصویریں، ہوا سیدھی کمرے میں آتی تھی، کمرے کی دیواریں جلتے توے کی طرح تپ رہی تھیں، وہیں ونے سرجھکائے کمبل پر بیٹھے ہوئے تھے ......"

بنارس میں جب تک رہا تو اس شان سے رہا، قوم وملک کی خدمت کو اپنا فرض اولین سمجھا، اور سیوا سمتی کو فروغ دینے میں دامے، درمے، قدمے کوئی کوتاہی نہ کی، حتیٰ کہ اگر صوفیا نہ وقتی مدد نہ دیتی تو کب کا بھسم ہوچکا ہوتا، اس کے بعد ٹھیک وسط گرما میں راجپوتانہ کی راہ لی، کمر میں کھدر کی دھوتی، بدن پر کھدر کا کرتا، ہاتھ میں سوٹا، مگر دل میں ہمت، شجاعت، ایثار اور خدمت خلق کا ولولہ، مہینوں اس سنگلاخ زمین پر مارے مارے پھرے، دریوزہ گری کی، سختیوں پر سختیاں جھیلیں، تکالیف اٹھائیں، کال کوٹھری میں بند کئے گئے لیکن قوم کے حقوق کے تحفظ کو اپنا فرض اولین سمجھا، خود راجہ صاحب بنارس سرکاری اعزاز سے دست بردار ہوکر قومی رہنما بنے، ادھر اندو نے اپنے شوہر کو سیاسی آزادی کا درس دینا شروع کیا، صوفیہ تو عرصہ ہوا اس رنگ میں رنگی جاچکی تھی، ایک پربھو رہ گئے تھے، انھوں نے بھی سگرٹ کے کارخانہ کو خیرباد کہا، اور ملک کی فضا میں اپنے نغموں کے ذریعہ سے صور پھونکنا شروع کردیا۔ یہ نیشنل تعلیم دراصل اس افسانہ کی روح رواں ہے، جس سے قصہ کی پوری فضا معمور ہے، صرف خود پسند مسٹر سیوک اور دولت پرست جان سیوک رہا ہے اُن کے والد بزرگوار جن کا بخل، اور جن کا تکیہ کلام

جو اُن کے سائے کے ساتھ ساتھ چلتا ہے) تو اس اعلیٰ تعلیم سے محفوظ رہتے ہیں، ان کے علاوہ اور کوئی فرد ایسا نہیں
ہے جو اس شراب کا جام پی کر متوالا نہ بنا ہو، یہ بحث کرنا کہ ناول کے لئے یہ ( [illegible] )
کہاں تک جائز ہے مجھے فضول معلوم ہوتا ہے، ایک کثیر جماعت ایسی ضرور ہے جن کے خیال میں اس سے بہتر
[illegible]) فی زمانا ہندوستان کے ناولوں کے لئے اور کوئی نہیں ہوسکتا، اس جماعت کی تو یہ سفارش ہے
کہ اس قسم کا لٹریچر نویں درجہ سے لیکر ایم۔ اے تک کے ہر طالب علم کو نہایت غور و خوض اور دلچسپی کے ساتھ پڑھنا چاہیئے



ونے اور صوفیہ کے علاوہ دو کریکٹر اس ناول میں ایسے ہیں جن کی رعنائی اور دلکشی سب پر حاوی ہے،
سورداس اندھا ہے، فقیر ہے، مفلس اور کنگال ہے، اپنے موضع کی سب سے زیادہ کم مایہ ہستی ہے، یہاں
تک کہ اُس کی بے بضاعتی ضرب المثل ہوگئی ہے، لیکن ان امور کے باوجود وہ بعض ایسے ملکوتی صفات کا
حامل ہے جو اُس کے قلب میں نور خداوندی کا جلوہ پیدا کردیتے ہیں، اُس کی شرافت کی پختگی، اُس کی
عالی حوصلگی، اُس کی بلند نظری، اور اُس کی اولالعزمی اس دنیا کی آلائشوں سے پاک وصاف ہیں، مگر ان
باتوں کے ساتھ ساتھ وہ سراسر ایک انسان ہے، اُس کی صفات اُسی حد تک ملکوتی ہیں جہاں تک کہ ایک انسان
فرشتہ بن سکتا ہے، دھن کا ایسا پکا ہے کہ حکومت وقت سے لڑجاتا ہے پیچھے تو ہٹنا درکنار، پیشانی پر بل تک نہیں
آنے دیتا، جان سیوک، چیرمین میونسپل بورڈ بنارس، حاکم ضلع غرض ہر متعلق شخص نے لاکھ لاکھ جتن کئے لیکن
وہ اپنی موروثی زمین جدا کرنے پر راضی نہ ہوا، دفتری چال بازیوں سے زمین اُس کے ہاتھ سے نکل گئی
لیکن اُس کی آہیں اُس خوں ریزی کا موجب ہوئیں جس نے حکومت کی بنیادیں تہ و بالا کردیں یہاں تک کہ
ایک عالم میں کہرام مچ گیا۔

اس کے علاوہ آخر زمانہ میں اُس کی گھریلو زندگی بھی مسموم ہوگئی تھی، گاؤں کے شریر افراد اُس کے
صداقت سے خائف تھے، اور اُس پر طرح طرح کے اتہامات لگاتے تھے، ایک مرتبہ اُس کے ہاں چوری ہوئی
اور کل اثاثہ جاتا رہا، پھر اُس پر بدچلنی کا الزام لگایا گیا، آخر میں اُس کا بھتیجا جسے اُس نے پیٹ کاٹ کاٹ کر پالا تھا

اُس کے ہاتھوں سے نکل گیا اور اُسے آنکھیں دکھانے لگا، لیکن ان آفات ارضی کو اُس نے اُس ہمت اور مردانگی سے برداشت کیا کہ جس کی مثال اس دنیا دروں میں کم ملتی ہے، لطف یہ ہے کہ صداقت اور راست بازی کو اُس نے کبھی اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیا، ثابت قدمی کوئی چاہے تو اُس سے سیکھ لے، رفتہ رفتہ یہ ساری آفات دور ہوتی ہیں، اور اُس کا منور چہرہ اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ نمودار ہوتا ہے ـــــ اُس کی موت! وہ بھی اُسیقدر شاندار ہوئی جس قدر کہ اُس کی روزانہ کی زندگی، اور اُس کی جدوجہد شاندار تھیں، اپنے زندگی کے ابتدائی دور میں وہ ایک غیر معروف گاؤں کا ایک گدلا بے نوا تھا لیکن مرنے سے کچھ دنوں قبل اُس کی شہرت دور دور پھیل چکی تھی، اور بنارس کی کل آبادی نے اُس کی موت کو ایک قومی سانحہ سے تعبیر کیا، یہ اُس کی بلند خیالی اور شرافت نفس کا ثمرہ تھا، وہ دنیاوی دولت کو دولت ہی نہ سمجھتا تھا ورنہ اُس قطعہ زمین کی منہ مانگی قیمت پاتا، ایک عارف کی نظروں میں دنیاوی وجاہت خزف سے بھی زیادہ بے حقیقت معلوم ہوتی ہے، سورداس کو کچھ اور ہی لگن لگی ہوئی تھی جس نے اُسے دنیاوی مکروہات سے بے پرواہ کر دیا تھا، ایسا مکمل اور دلکش کریکٹر آپ کو بہتر سے بہتر ناولوں میں بھی کم ملیں گے!

رانی صاحبہ (جانہوی) کے عادات وخصائل دیکھنے کے بعد مجھے مہاراجہ جسونت سنگھ کی اہلیہ کا قصہ یاد آیا جس نے اپنے قلعہ کا پھاٹک بند کروا دیا تھا، اور اپنے شوہر نامدار کو کہلا بھیجا تھا چونکہ تم دشمن کو پشت دکھا کر آئے ہو اس لئے اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں قلعہ میں اندر آنے کی اجازت دی جائے، بہتر تھا کہ تم مر جاتے یا فتح حاصل کر کے واپس ہوتے، یہی حال جانہوی کا ہے، رانی کی دو اولادیں ہیں، اندو، اور ونے، لیکن دونوں کی تربیت میں اُس نے اپنے لاڈ پیار کو کہیں جگہ نہ دی، اندو کی شادی ہو چکی ہے، اُس کے شوہر میں اور اُس میں اکثر اختلاف خیال ہو جاتا ہے، جانہوی کہتی ہیں۔

"میں تم کو شوہر پرست دیکھنا چاہتی ہوں جسے اپنے شوہر کے حکم یا مرضی کے سامنے اپنی عزت یا ذلت کا ذرا بھی خیال نہیں ہوتا، اگر وہ تمہیں سر کے بل چلنے کو کہیں تو بھی تمہارا فرض ہے کہ سر کے بل چلو، تم اتنے ہی میں گھبرا گئیں۔"

"اندو۔ آپ مجھ سے وہ کرنے کے لیے کہتی ہیں جو میرے لیے ناممکن ہے۔

"جانوی - چپ رہو، میں تمہارے منہ سے ایسی باتیں نہیں سن سکتی۔ ....."

آپ خود اندازہ کریجئے جانوی کے خیالات میں کس قیامت کی پختگی اور بلندی ہے۔

ونے۔ صوفیہ۔ دونوں رانی صاحبہ کے پاس بیٹھے ہیں، رات کا وقت ہے، ہر طرف سناٹا ہی سناٹا ہے، صوفیہ رانی صاحبہ کو اخبار پڑھکر سنا رہی ہے، ونے عاشقانہ نگاہوں سے صوفیہ کو دیکھ دیکھکر مزے لے رہے ہیں کہ معاً رانی صاحبہ نے یہ ماجرا دیکھ لیا، اور

"تیز نگاہی سے ونے سنگھ کی طرف دیکھکر بولی: "تم کب جا رہے ہو؟"

ونے۔ بہت جلد

"جانوی، میں بہت جلد کا مطلب یہ سمجھتی ہوں کہ تم کل ہی علی الصباح روانہ ہو جاؤ گے"

صوفی نے ہمت کرکے کہا۔ آج کل تو راجپوتانہ میں آگ برستی ہوگی۔

"جانوی نے طے شدہ انداز میں کہا۔ "فرض کو کبھی آگ اور پانی کی پروا نہیں ہوتی ....."

ونے پر راجپوتانہ میں جو جو مصیبت کے پہاڑ ٹوٹے اُس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں، جانوی کو ان امور کی برابر اطلاعیں پہونچتی رہیں، راجہ صاحب نے ہزار بار چاہا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو بلالیں، لیکن رانی صاحبہ اپنی بات پر قائم رہیں، اُن کی بس یہی صدا تھی 'جب تک کام پورا نہ ہو جائے واپس نہ آؤ'، چاہے اس جدوجہد میں تمہیں جان ہی کیوں نہ دینا پڑے،

ایک عورت کی اس دلیری، ہمت اور شجاعت کو دیکھئے اور اندازہ کیجئے کہ اُس کے دل میں قومیت کا دریا لہریں مار رہا ہے، جس پر وہ اپنی عزیز سے عزیز شے قربان کرنے کو طیار ہے، اگر اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ خصلت انسانی نہیں ہے، اور اگر ہے تو فی زمانہ معدوم ہے، مگر میرے خیال میں یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، مادرِ ہند کی آغوش میں اب تک ایسی دیویاں موجود ہیں جو بسا اوقات راجہ جسونت کی اہلیہ کی یاد تازہ کرتی ہیں" اور اب تک ایسی ایسی قربانیاں کر سکتی ہیں جن کا مس میو کو وہم و گمان بھی نہیں گذر سکتا، مگر عورتوں کی یہ شجاعت اور فراست اسی وقت تک ہندوستان میں قائم ہے جب تک کہ یہاں مغربیت نہیں پھیلتی، جانوی اور روز الینڈ میں ایک خاص مشابہت ہے "آرڈن کا مرغزار" اور یہی پیکر روز الینڈ سراسر انگلستان کی ملکیت ہے، یہ ناممکن ہو کہ آپ اس مرغزار کا سین

کسی اور سرزمین میں کامیابی کے ساتھ پیدا کرلیں، اور جب آرڈن کہیں اور پیدا نہیں ہوسکتا ر وز الینڈ کا بھی کسی بیرونی مقام پر جلوہ طراز ہونا بعید از قیاس ہے، بالکل اسی طرح جانوی بھی سراسر ہندوستان کی پیداوار ہے، ان خوبیوں کے مجموعہ کو آپ ہندوستان سے باہر ہرگز نہیں پاسکتے، کیونکہ یہ عادات اور خصائل ہندوستان ہی کی آب و ہوا کا نتیجہ ہیں اس لئے ان کو کہیں اور تلاش کرنا سراسر بے سود ہوگا، ہند سے محبت کرنے والے، اور ہند کے تمدن پر فدا ہونے والے ان خصائل اور ان خوبیوں کو ہمیشہ عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھیں گے، اور اُن کو اپنے ملک کی ہزار سالہ تہذیب کا ثمر نورس تصور کریں گے، ہندوستان کی آزادی کا ہر غیر متعصب اور ہندی نژاد آرزومند ہے، لیکن یقین کرلیجئے کہ جب تک ہم میں یہ خوبیاں پیدا نہ ہونگی آزادی ایک خواب و خیال اور سراب ہی کی طرح نظر آتی رہیگی۔

میں اوپر عرض کر آیا ہوں کہ ناول ایک ہزار صفحات پر پھیلا ہوا ہے، لیکن یہ ناول محض ناول ہی نہیں ہے، اس میں جا بجا ڈرامہ کا لطف بھی موجود ہے، قصہ کے شروع میں آگ لگنا، اور صوفیہ کا کمر ہمت کسکر آگ میں کود جانا، علاوہ ازیں آخر میں سورداس کے موضع میں سیتا گرہ کا شروع ہونا، گولیوں کا چلنا، اور ونے کا خودکشی کرنا، یہ واقعات بڑے سے بڑے ڈرامہ کی زیب و زینت بن سکتے ہیں، مگر ان اہم واقعات کے علاوہ بعض مقامات پر کچھ ایسے چھوٹے چھوٹے نکتے اس رنگ میں لکھے گئے ہیں کہ پڑھنے والے کو پریم چند کی ڈرامہ نگاری پر ایمان لے آنا پڑتا ہے۔ مثلاً ونے اور صوفیہ دونوں بھیلوں کے ایک پہاڑی گاؤں میں فروکش ہیں، ونے کو یہ وہم ہوا کہ صوفیہ اب اُس کی اسقدر گرویدہ نہیں ہے جسقدر کہ پہلے تھی، اس لئے وہ جڑی بوٹی اور جنتر منتر سے کام لینا شروع کرتا ہے، اور اس دام تزویر میں گرفتار ہوکر اسقدر بدحواس ہوتا ہے کہ سب کچھ بھول جاتا ہے، اس سلسلہ میں پریم چند نے بعض ایسے ڈرامیٹک واقعات قلمبند کئے ہیں جن کو میں قصہ کی جان سمجھتا ہوں، اس نوعیت کے اور بہت سے واقعات بھی ہیں جن کو بیان کرنا طوالت کا باعث ہوگا، اُن کا اندازہ کرنے کے لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ اس ناول کو بار بار پڑھیئے اور لطف اندوز ہوجیئے۔

# غزل

(از منظور حسین صاحب شورؔ، متعلم سکنڈ ایر)

نگہِ اضطراب کو دیکھو، ق ایک سعیٔ خراب کو دیکھو
میرے عہدِ شباب کو دیکھو اور اس اضطراب کو دیکھو

واسطہ گیسوئے پریشاں کا تم مرے پیچ و تاب کو دیکھو

دیکھو اب دلمیں درد اُٹھتا ہے اب اُٹھا دو نقاب کو دیکھو

گر نہ دیکھا ہو قطرہ میں دریا اشکِ حسرت مآب کو دیکھو

بے نیازِ سرورِ ہستی ہوں لذّتِ اضطراب کو دیکھو

میں ہوں خاموش ہے جہاں خاموش شورشِ اضطراب کو دیکھو

ابتدائے گناہ واحسرت انتہائے عذاب کو دیکھو

میرا رونا مجھے ڈبوتا ہے میری چشمِ پرآب کو دیکھو

# ملکۂ سحر و شاہِ خاور

(از سید محمد عارف صاحب فاطمی متعلم فرسٹ ایر کلاس)

طیورِ گلشن کی نغمہ سنجی پیامِ خورشید لا رہی ہے
فلک کی چادر میں لیلیٔ شب وہ اپنا چہرہ چھپا رہی ہے

صدائے مرغِ سحر کو سُنکر گلوں کے بستر سے جلد اُٹھکر
نسیم ہاتھوں سے آنکھیں ملتی جگاتی گلشن کو جا رہی ہے

لباس آبِ رواں ہے در بر ہے نور کا ایک تاج سر پر
سحر کی زہرہ جمال ملکہ نہا کے چشمے سے آ رہی ہے

جو کھینچ رکھا ہے عطرِ شب میں چمن نے فردوس کے گلوں سے
شمیمِ گلشن جھکائے سر کو بصد ادب اُسکو لا رہی ہے

خوشی کے آنسو چھلک رہے ہیں لبوں پہ رقصاں ہے مسکراہٹ
گہر کے ہاروں کے ساتھ شبنم نکل کے پھولوں سے آ رہی ہے

اُٹھا کے سر جو ہیں دیکھتی ہیں حباب بھی اُٹھ رہے ہیں صدہا
جو جھیل کے آئینے میں چہرے کو دیکھنے ملکہ جا رہی ہے

فضا پہ ہے خامشی کا عالم پہاڑیاں چپ کھڑی ہوئی ہیں
صبائے دوش پر خوشی میں سنہرے بادل کو لا رہی ہے

طیور ملکر ہیں گیت گاتے شجر ہیں جھک کر سلامی دیتے
کہ شاہِ خاور سے آگے ملنے سواری ملکہ کی جا رہی ہے

تڑپ کے مشرق سے نکلا سورج نقاب کرنوں کی زرنگار لے ۔ سحر کی ملکہ کے پاؤں چھونے شعاع خورشید آ رہی ہے

ظہور فطرت کے محفلوں میں بلائے جاتے ہیں صرف شاعر
لگا کے سُن کان تو بھی عارفؔ صدا یہ ہر سو سے آ رہی ہے

---

# غـــزل

(جناب پروفیسر عبدالمنان صاحب۔ پٹنہ کالج)

تیری محفل میں تو کس طرح سے بیدلؔ آئے ۔ آپ میں بھی جو وہ آئے تو بمشکل آئے

کوئے دلدار میں ہم پا بہ سلاسل آئے ۔ ہیں تو دیوانے مگر تا سر منزل آئے

قیس دیوانہ اگر آنکھ اُٹھا کر دیکھے ۔ پردے پردے میں نظر لیلیٰ محمل آئے

زحمت زیست یہ پامالیٔ ارماں پیہم ۔ جان میں جان ذرا آئے جو قاتل آئے

تابِ نظارۂ مجنوں ترا پردہ نہ سہے ۔ کبھی بے پردہ اگر لیلیٰ محمل آئے

راحتِ بیکسی و رنج تھا گردش کا مآل ۔ رکھتے ہیں پاؤں سفر میں سر منزل آئے

جلوۂ حسنِ حقیقی بھی ہے محتاجِ مجاز ۔ کیوں نہ پھر طالب لیلیٰ پس محمل آئے

تیغ بیداد کو کیوں شکوۂ بیکاری ہو ۔ امتحانِ ہوس و عشق ہو۔ قاتل آئے

خود کو بھی کھو کے چلے آئے تری بزم سے ہم ۔ اور احباب سمجھتے ہیں کہ ہم دل آئے

حسنِ الزام کو کیا تیغ ستم کی حاجت ۔ ہوں خطا کار وفا شوق سے قاتل آئے

زندگی موت ہے بے گرمیٔ الفت بیدلؔ
لطف جینے کا جبھی ہے کہ کہیں دل آئے

# ترکی جذبۂ وطن

(گذشتہ سے پیوستہ)

## باب چہارم

### جان پہچان کا ذریعہ

ہمت آفندی نے اپنا وعدہ پورا کیا اور سامی کو سنیچر سے لیکر پیر تک کی ۲ دن کی چھٹی دلوادی۔ اور اس سے کہا کہ وہ اتوار کی صبح کو اُس کا انتظار کرے۔ چنانچہ اس کی عنایت کا اُس نے شکریہ ادا کیا اور امیدوں کو آغوش میں لیکر خوش وخرم مدرسہ سے واپس چلدیا۔ اب وہ اپنے گھر پہلے سے بہتر حالت میں پہونچا۔

جمعہ اور ہفتہ گذر گیا اتوار کی صبح ہوئی اور سامی اپنے دوست ہمت آفندی کی آمد کا انتظار کر رہا ہی یہاں تک کہ ہمت آفندی آگیا اور اُس نے اُس کے شایانِ شان ہمت آفندی کا استقبال کیا اور چا اور قہوہ نوشی کے بعد دونوں ۹ بجے کے قریب یورپین محلہ کی طرف چلدیئے تاکہ ہمت آفندی سامی کی محبوبہ کا مکان دیکھ لے۔

دونوں اُس پریوش کے متعلق بات چیت کرتے ہوئے چلے جارہے ہیں اور حصول مقصد کی تدبیریں سوچ رہے ہیں۔ وہ اُسی نتیجہ پر پہونچے کہ تعارف مقصد برآری کے لیے کافی ہوگا اور غالباً اُنھوں نے یہی خیال کیا کہ جب ارتباط اور دوستانہ سامی اور اس کی معشوقہ میں پیدا ہوجائے گا تو عاشق غمگین کا محبوب سے دائمی رشتہ قائم ہوجائے گا۔ دونوں چلتے چلتے مذکورالصدر کے گھر پر پہونچے حسن اتفاق سے ایک یونانی فقیر اس گھر کے سامنے کھڑا ہوا ہارمونیم بجا رہا تھا اور سریلی آواز سے گا رہا تھا تاکہ گھر والے کے دست کرم سے مستفیض ہو۔ سامی کی محبوبہ ایک کھڑکی میں کھڑی ہوئی اُس کو سن رہی تھی اور سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی سامی کا رنگ زرد پڑگیا اور اُس کا دل ہاتھوں اچھلنے لگا۔ چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں خیالات کے اتار چڑھاؤ کبھی اس کو خوش کر دیتے تھے تو کبھی غمگین۔ غرضکہ وہ ٹکٹکی باندھ کر اس کو دیکھنے لگا اُس مہ جبین کی طرف سے بھی توجہ کی جھلک

پائی گئی اور اُس نے بھی اُس نوجوان خوبصورت کو دیکھ لیا جو سر اٹھائے ہوئے اسی کو دیکھ رہا تھا جس کے چہرہ پر عشق و محبت کی علامات ظاہر تھیں اور جس کی آنکھیں سوز و گداز کا آئینہ تھیں اب اس کو خیال ہوا کہ اس سے قبل اس نوجوان کو اس نے دیکھا ہے چنانچہ ان تمام واقعات کو وہ یاد کرنے لگی جو اس دن سے لیکر جس روز کہ وہ سرزمین مصر پر اُتری تھی اس وقت تک ہوئے کیونکہ اس کو آئے ہوئے ڈیڑھ ماہ سے زائد نہیں ہوا تھا غرضکہ اس کو یاد آگیا کہ اس کو پہلی بار اس نے چنگی خانہ کے پاس جہاز سے اترتے وقت دیکھا تھا اور دوسرے ہفتہ میں جبکہ وہ اپنی ماں کے ہمراہ ایک دوکان پر گئی تھی تو وہ اس کے مکان کو دیکھ رہا تھا اور پھر جاتے آتے پیچھے پیچھے ہو تا تھا۔

ان واقعات کو یاد کرکے اُس نے سامی کو ذرا غور سے دیکھا تو اس کو نوجوان۔ حسین۔ خوبرو۔ نازک اندام پایا نگاہ لطف سے پھر اُس کو دیکھا۔ چنانچہ جب دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو اُس نے دندان جواہر ریز کا مظاہرہ کیا اب کیا تھا یہ تبسم عاشق کے دل کو لے اُڑا اور وہ اپنے دوست کی طرف جھک کر کان میں کہنے لگا۔

سامی۔ دیکھئے میری معشوقہ وہ کھڑکی میں کھڑی ہوئی ہے۔

ہمت آفندی۔ میں نے بھی اس کو آتے ہی دیکھ لیا تھا اور دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ تمہاری راہزن ہے۔

سامی۔ تو پھر میں اس کے دام میں پھنسنے میں حق بجانب ہوں اور وہ قابلِ التفات ہے؟

ہمت آفندی۔ ہاں ہاں میں تم کو سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہتا ہوں کہ اُس تک پہونچنا بہت ہی دشوار ہے۔ لیکن باوجود اس کے میں تمہاری کامیابی کی اپنی طاقت بھر کوشش کروں گا اس لئے کہ جب وہ تم کو غور سے دیکھ رہی تھی اور پھر تم کو دیکھ کر مسکرائی اسی وقت میں تاڑ گیا تھا کہ اس کا تمہاری طرف کچھ میلان ہے۔

اسی اثنا میں اس نے کچھ دام نکالکر گویئے کی طرف پھینکے اور کھڑکی بند کردی گویا واپس چلا گیا اب ان دونوں کے لیے کھڑا رہنا بے سود تھا چنانچہ دونوں وہاں سے چلدیئے۔ لیکن ہمت آفندی پھر ٹھہرا اور اپنے دوست سے کہنے لگا۔

ہمت آفندی۔ اس گلی میں ایک بڑا افسر ہے جو میرا مخلص دوست ہے اور اس کے تعلقات حکومتوں کے سفارت خانوں سے بھی ہیں چلو وہاں چلیں تاکہ اس کے سامنے تمہارے معاملہ کو پیش کریں وہ ہر اس خدمت کے لیے تیار ہوگا جو میں اس سے کہوں گا۔

سامی۔ جیسا آپ کا ارشاد ہو میرا نفس موجود ہے اور وہ اس وقت اس بچہ کی مانند ہے جو اپنے باپ کی حسب منشاء چلتا ہے اور تعمیل حکم کرکے اُس کی مرضی حاصل کرتا ہے۔

ہمت آفندی۔ تم یقین جانو کہ میں تمہارے مسئلہ میں گریز نہیں کر رہا ہوں چنانچہ اُس نے سامی کا ہاتھ پکڑا اور تھوڑی دور گلی میں جاکر ایک گھر کے دروازہ پر جو اس کی محبوبہ کے مکان کے مقابل تھا۔ کھڑا ہو گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا وہاں سے ایک سپاہی نکلا اور ہمت آفندی کو دیکھتے ہی اُس نے سلامی دی اور ادب سے کھڑا ہو گیا ہمت آفندی نے پوچھا۔

ہمت آفندی۔ کیا ہدایت بے گھر میں ہیں ؟

سپاہی۔ جی ہاں۔

ہمت آفندی۔ "ان کو میرے آنے کی اطلاع کرو اور یہ بھی کہو کہ میں اپنے ایک دوست کو ملانے کے لئے لایا ہوں"۔

چنانچہ سپاہی نے پھر سلامی دی اور زنانہ دروازہ کے پاس جاکر اُس کو کھٹکھٹایا اور ماما سے کہا کہ صاحب کو جاکر اطلاع کردے اور ملاقات کے کمرہ کا دروازہ کھولدے چنانچہ ماما بھاگی ہوئی گئی اور کمرہ کا دروازہ کھولکر اپنے آقا سے جاکر دونوں مہمانوں کے آنے کی اطلاع کی اسی عرصہ میں اس سپاہی نے ہال میں ان دونوں کو ایک اچھی جگہ پر لیجاکر بٹھلایا اور سگریٹ پیش کئے تھوڑی ہی دیر بعد ہدایت بے آگئے جو معمولی گھر کے لباس میں تھے اُن کو سلام کرکے خوش آمدید کہا اور بیٹھ گیا۔ دونوں کی مزاج پرسی کی اور اس کے بعد قہوہ منگا کر ان کے ساتھ پیا ہمت آفندی نے سلسلۂ گفتگو میں کہا۔

ہمت آفندی۔ میں آپ سے ایک عجیب وغریب بات کہنے آیا ہوں۔

ہدایت بے۔ فرمائیے میں اس کو نہایت خوشی سے سنونگا۔

ہمت آفندی۔ جناب نے اجازت مرحمت فرماکر عزت بخشی۔ لیکن میں صرف اس واقعہ کو آپ کی سُننے ہی کے لئے نہیں آیا ہوں بلکہ اس میں آپ کی مدد کا بھی طالب ہوں جو کچھ آپ حسب مرتبہ کرسکیں۔

ہدایت بے۔ نہایت خوشی سے میں حتی الامکان مدد میں کچھ دریغ نہیں کروں گا۔

ہمت آفندی۔ خواہ کیسا ہی کام ہو اور کیسی ہی خدمت ہو۔

ہدایت بے۔ آپ یقین جانئے میں ہر قسم کی مدد کے لئے تیار ہوں۔

ہمت آفندی۔ تو پھر مجھے لازم ہے کہ میں اس دوست کا تعارف کرادوں کیونکہ اسی کا کام ہے یہ میرا عزیز دوست ہے بلکہ ہم سب افسروں کے محسن جنرل کامل بے کا لڑکا ہے۔

ہدایت بے۔ خوش آمدید۔ خوش آمدید۔ مرحوم کو خدا جنت نصیب کرے۔

ہمت آفندی۔ یہ اب فوجی ہائی اسکول میں ہے اور صرف ایک سال باقی رہ گیا ہے یہاں سے کامیاب ہو کر فوجی کالج آستانہ میں چلا جائے گا۔

ہدایت بے۔ ماشاء اللہ۔ خدا اس کی مدد کرے اس کے لیے کچھ بڑی بات نہیں ہے کیونکہ بڑے ہوشیار لڑکا ہے۔

ہمت آفندی۔ علاوہ اس کے یہ ہمیشہ کامیابیوں میں اول رہا ہے لیکن ان چند دنوں میں یہ ایک مصیبت کا شکار ہو گیا ہے جس نے اس کے عقل و ہوش پر بھی اثر کیا ہے۔ یہانتک کہ اس کی محنت رائیگاں جانیوالی ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہی رہا تو اس بُری طرح گریگا کہ اس کے بعد پھر ابھرنا ناممکن ہے۔

ہدایت بے۔ خدا خیر کرے۔ کیا مصیبت آپڑی۔

ہمت آفندی۔ پہلے میں آپ سے یہ امید کروں گا کہ جو کچھ میں کہوں اس کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں۔

ہدایت بے۔ خواہ کچھ ہو اس کے باپ اور اس کی کوشش اور محنت کے احترام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

اس کے بعد ہمت آفندی نے اس یونانی لڑکی اور سامی کے عشق کا قصہ اُن کو سُنایا اور یہ بھی کہا کہ اس کے دیکھنے کا اسقدر مشتاق ہے کہ اس کی حالت غیر ہو گئی۔ عقل گم ہو گئی۔ پڑھنا لکھنا سب غارت ہو گیا اور مستقل مریض ہو کر رہ گیا۔

ہدایت بے تھوڑی دیر تک قصہ سننے کے بعد سر اٹھا کر بولا۔

ہدایت بے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ موسیو یانی پر دیوش یونانی قنصل کے فوجی اٹاچی ( Attache ) کی بیٹی ہے اس کا نام ایلینا ہے اور اس کا گھر اسی گلی میں ہمارے مکان کے سامنے ہے۔

ہمت آفندی۔ جی ہاں جس کو آپ کہہ رہے ہیں وہی ہے جناب کی زبانی اس وقت اس کا نام معلوم ہوا۔

ہمت بے۔ اچھا مجھ سے آپ کیا کرانا چاہتے ہیں کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اس کے ساتھ سامی کے منگنی کرادوں

ممکن ہے کہ اُس کا باپ میری درخواست کو رد کردے۔

ہمت آفندی۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ وہ اس وقت یہ نہیں چاہتا ہے۔ وہ ہوشیار۔ دانشمند۔ اور سمجھ بوجھ والا ہے۔ معمولی بات پر بھی وہ خوب غور کرتا ہے اور خوب جانتا ہے کہ یہ معاملہ کامیابی سے بہت دور ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اب یہ چاہتا ہے کہ اس سے جان پہچان کا ذریعہ پیدا ہو جائے اور اس کے اعزا کے ساتھ تعلقات دوستانہ قائم ہو جائیں تاکہ وہ کبھی کبھی اس سے مل لیا کرے ممکن ہے کہ ایک زمانہ کے بعد وہ اس کو اپنی طرف مائل کرے۔ اور جب تعلیم ختم کر چکے اور حسب خواہش جگہ پا جائے تو پھر ایلینا سے ملکر اس کے باپ سے منگنی کی درخواست کردے۔

ہدایت بے۔ خیال تو اچھا ہے۔ مگر وہ ترکی زبان تو جانتی نہیں ہے۔

ہمت آفندی۔ لیکن سامی آفندی یونانی خوب جانتا ہے اور ایک زباں داں کی طرح سے بولتا ہے۔

ہدایت بے۔ "مجھے اس سے بہت ہی محبت ہوگئی اچھا حصول مقصد تو بہت آسان ہے کیونکہ آج اتوار کا دن ہے اور وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ۴ بجے سیر کو نکلے گی اور مجھے وہ جگہ معلوم ہے جہاں وہ لوگ جایا کرتے ہیں میرے پاس اُسی وقت آپ دونوں آجائیں تاکہ یہاں سے اُن کے پاس ساتھ چلیں۔ پھر معاملہ معاملہ کے ہاتھ ہے میں آپ دونوں سے معاہدہ کرتا ہوں کہ جب کبھی مجھے فرصت ہوا کریگی میں اس کو اس سے ملا دیا کروں گا امید ہے کہ خدا یا تو اس کے دل سے یہ خواہش دور کردیگا اور یا اس کی مراد پوری کریگا"۔ ہمت آفندی نے اس کی اس عنایت کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس کے بعد سامی آفندی نے بھی نہایت اچھے الفاظ میں اس طرح سے اس کا شکریہ ادا کیا کہ ہدایت بے کے دل پر اس کا بہت ہی اثر ہوا اور اس سے پھر اپنا وعدہ دُہرایا۔ پھر دونوں اس سے رخصت ہو کر واپس چلے گئے۔ اور شام کو ۴ بجے آنے کے لئے کہہ گئے۔

# پانچواں باب

## ملاقات

شہر کے ایک جانب جو "جافرجہ" کو راستہ جاتا ہے وہاں ایک نہایت دلفریب باغ ہے جس کو "باغ کنبجی" کہتے ہیں۔ اُس کو ایک یونانی نے کرایہ پر لیکر عمومی سیرگاہ بنا دیا اور وہاں وہ تمام ضروری سامان عیش مہیا کر دیا ہے جو امرا کے لئے موزوں ہو سکتا ہے مثلاً عمدہ عمدہ کھانے پینے کی چیزیں۔ قیمتی اور خوشنما ظروف۔ شاندار موٹریں۔ جو پھولدار پودوں کے جھنڈ میں کھڑی ہوئی ہیں۔ چنانچہ سمرنا کے بڑے بڑے لوگ وغیرہ پردیسی ہر روز شام کو اور بالخصوص ہر اتوار کو وہاں ضرور پہنچتے ہیں۔ ہر طبقہ کے سیاح اور سیلانی سے وہ جگہ بھر جاتی ہے۔ اُس کے مالک نے اُس کو ترتیب وار کئی طبقوں پر منقسم کر رکھا ہے۔ تاکہ لوگوں کے مرتبہ کا لحاظ رہے۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک قسم کا تھیٹر ہے جس میں اول۔ دوسرا۔ اور تیسرا درجہ ہے۔ اور ہر درجہ کا ٹکٹ جداگانہ ہے۔ ایلینا کا والد موسیوپانی سمرنا میں پہنچنے کے بعد پہلے ہی ہفتہ میں اس باغ میں گیا تھا پھر ہر اتوار کو مع اپنے بیوی بچوں کے جانے لگا۔ اور بعض اوقات اور دن بھی جس روز اُس کا جی چاہتا تھا سیر کو وہاں چلا جاتا تھا۔

اُس روز بھی حسب دستور مع کنبہ کے باغ میں گیا۔ سب کے سب اول درجہ میں ایک ہی میز کے گرد جا بیٹھے۔ میز قسم قسم کے خوبصورت اور خوش وضع گلدستوں سے سجی ہوئی تھی۔ ہر قسم کے کھانے پینے کی چیزیں اُس پر رکھی ہوئی تھیں۔ چنانچہ سب کھانے پینے میں مشغول ہو گئے۔ مختلف معاملات پر گفتگو ہونے لگی۔ باغ کی خوبصورتی سے کھلے جاتے ہیں اور پھولوں کی خوشبو سے باغ باغ ہو رہے ہیں۔

تھوڑی ہی دیر میں ہدایت بے بھی مع ہمت آفندی افسر فوجی ہائی اسکول اور سامی مصری آفندی وہاں پہنچ گیا ہدایت بے اپنے فوجی وردی میں ہے جس پر کرنیلی کا نشان آویزاں ہے چنانچہ یہ تینوں ٹہلتے ہوئے موسیوپانی کی طرف جا نکلے۔ سامی آفندی کا محبوبہ پر نظر پڑتے ہی دل بانسوں اچھلنے لگا۔ چہرہ پر ایک رنگ جاتا تھا تو ایک آتا تھا جگر

قرب وصال پر جو عاشقوں کو ہیجان ہوتا ہے وہ ہی اُس کی اُس وقت حالت تھی۔

وہ سب ٹہلتے ہوئے موسیو یانی کی جگہ پر پہونچ گئے۔ موسیو نے جب یہ دیکھا کہ ہدایت بے ادہر چلا آرہا ہے تو اپنی جگہ سے اٹھکر اس نے اس کا استقبال کیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ چنانچہ ہدایت بے نے اس سے مصافحہ کیا اور اس کی بیوی کو سلام کیا۔ پھر ہمت آفندی کا اپنے بہترین دوست کی حیثیت سے ان دونوں سے تعارف کرایا اس کے بعد سامی آفندی کو اُن سے یہ کہکر ملایا کہ یہ اس کے مرحوم مخلص دوست کا بیٹا ہے۔ مرحوم کی یاد آجتک چھوٹے بڑے تمام فوجیوں کے دلوں میں تازہ ہے۔ سامی محنت۔ جانفشانی۔ اخلاق ہوشیاری۔ اور سمجھ میں بالکل اپنے باپ کے قدم بہ قدم ہے۔ غرضکہ اس کی تعریف کے پُل باندھ دئے۔ اور آخر میں کہنے لگا۔

ہدایت بے۔ "اسی وجہ سے میں اس سے بے حد محبت کرتا ہوں کہ اس کو اپنی اولاد کے برابر سمجھتا ہوں۔ یہ صرف اس کی اچھی عادتوں اور بہترین خصلتوں کا طفیل ہے" یہ تمام باتیں یونانی زبان میں کر رہا تھا تاکہ اس کی لڑکی کے کانوں میں پڑیں۔ چونکہ یہ تینوں اس زبان پر کافی عبور رکھتے تھے اس لئے اس مدح سرائی کا متوقع اثر موسیو یانی اور اس کی بیوی پر بے انتہا ہوا حتے کہ وہ لڑکی بھی سن رہی تھی اور سامی کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اور اس کے دل پر جو اثر ہو رہا تھا اس سے چہرہ پر ایک رنگ جاتا تھا اور ایک آتا تھا۔ جب تعارف ہوچکا تو وہ سب کے سب ایک میز کے گرد بیٹھ گئے ہدایت بے نے سامی کو لڑکی کے برابر اپنے داہنی جانب بٹھایا اور ہمت آفندی کو اس کے والد کے برابر اپنے بائیں جانب اور مسز یانی سامنے بیٹھی۔

قریب سب کے سب بیٹھ گئے تو موسیو یانی نے آدمی سے کہکر قہوہ خانہ کے بیرہ کو بلایا اور اس سے کہا کہ تین خالی گلاس لے آؤ۔ کیونکہ ممالک ترکی کے اس قسم کے باغوں میں دستور ہے کہ بوتلیں میز پر رکھ دی جاتی ہیں اور حاضرین کی تعداد کے اعتبار سے خالی گلاس میز پر رکھدئے جاتے ہیں یہاں کی طرح سے نہیں ہوتا ہے کہ بھرے بھرائے گلاس لائے جاتے ہیں ایسی حالت میں کوئی اور مہمان آگیا تو اس سے صرف خالی گلاس منگوالیں گے اور پینے کے بعد اس سے دوسری بوتل منگالیتے ہیں یہانتک سب کے لیے کافی ہوجائے۔

بیرہ نے خالی گلاس لاکر دئے چنانچہ موسیو یانی نے گلاس لیکر اپنے مہمانوں کی طرف بڑھایا سب نے لیا مگر سامی

آفندی نہایت ادب سے انکار کرکے پینے سے باز رہا اور پاکیزہ اور موزوں الفاظ میں عذر کرتے ہوئے کہنے لگا کہ اس کا سن وسال اس بات کی اجازت نہیں دیتا ہے کہ وہ اس قسم کی تفریحات میں پڑے جو اس کے ذہن اور فکر کو مدرسہ کی زندگی سے باز رکھیں اور اسی وجہ سے وہ ان چیزوں سے دور رہنے کو ترجیح دیتا ہے تاکہ اس کی ذکاوت و ذہن کی روشنی برقرار رہے۔ سب نے اس کے اس خیال کو پسند کیا اور اس کی اس بیدار مغزی پر تعجب کیا چنانچہ وہیں بیٹھے بیٹھے سب نے گلاس خالی کئے اور پھر سب کی سب ترکی قوم کی جو مختلف عناصر اور متضاد مذہبوں پر مشتمل ہے۔ اخلاق و اطوار پر گفتگو کرنے لگے۔ سامی آفندی بھی سب کے ساتھ شریک تھا اور فصاحت و بلاغت سے بدلائل اس کے اقوال کی تائید کرتے ہوئے ان کو جواب دے رہا تھا جس سے اس کی بیدار مغزی کا پتہ چلتا تھا اس کی مدلل گفتگو کو سنکر ہدایت بے بھی بہت ہی متعجب ہوا اس کے بعد اندرونی اور بیرونی سیاست پر گفتگو شروع ہوگئی اور سب کے سب اس میں بے انتہا منہمک ہوگئے۔ اس لیے کہ ترکی قوم حمیدی عہد میں سیاست کے متعلق ایک حرف زبان سے نہیں نکال سکتے تھے لیکن دستوری حکومت کا اعلان ہوتے ہی سب کی زبانیں کھل گئیں اور سیاست پر گفتگو جائز ہوگئی اب ان مسائل سیاسی میں ان کو اسقدر انہماک ہوگیا تھا کہ سیاست کی اس کنہ معلوم کرنے کے درپے تھے جس سے اب تک وہ بالکل نابلد تھے ہمارے اس ناول سے کچھ ہی زمانہ پہلے دستوری حکومت کا اعلان ہوا تھا۔ چنانچہ ہر جگہ اب بھی سیاسی گفتگو اور اسی کی چھان بین رہا کرتی تھی۔ اگرچہ وہ طبقہ کلیتاً اس سے ناآشنا ہوتا تھا۔ پھر فوجی اور سیاسی لوگ کیونکر یہ گفتگو نہ کیا کرتے بالخصوص ایسے مجمع میں جہاں موسیو یانی بروش جیسے ہوں اور جن کا تقرر سمرنا کے قنصل خانہ میں صرف اسی سیاسی غرض سے ہوا ہو جس کو اس کی حکومت اہمیت دے رہی تھی۔ جیسا کہ آگے چلکر آپ کو اسی ناول میں معلوم ہوجائے گا۔ چنانچہ سیاست داں حضرات سے وہ اسی وجہ سے ملتا تھا اور فوجی افسروں سے اسی غرض کے پردہ میں تعارف حاصل کیا کرتا تھا۔ جہاں کسی سے ملا اور اس نے فوراً سیاسی گفتگو شروع کردی کیونکہ اس کی حکومت اس زمانہ میں ریاست ہائے بلقان سے ایک خفیہ معاہدہ کرنیوالی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ترکوں کو یوروپ سے نکالکر صرف ایشیا میں ان کو محصور کردے۔ اس سیاسی کوشش کا سہرا موسیو وینیزولاس کے سر تھا جو عثمانی سایہ میں پیدا ہوا تھا اور وہیں پرورش پائی تھی۔ غرضکہ سیاسی مسائل خوب چھڑے اور ان کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی حتی کہ وہ تمام واقعات روشنی میں لائے گئے جو برسے یا بھلے اس روز سے رونما ہوئے جس روز سے کہ انجمن اتحاد و ترقی کی بنیاد دسالونے کا میں پڑی اور اس وقت تک جب تک کہ انجمن نے آستانہ کے زمام حکومت اپنے

ہاتھ میں لی اور اس کے ساتھ ساتھ بلغاریہ نے آزادی کا اعلان کیا دوسری طرف آسٹریا نے بوسینیا اور ہرسک کو ہڑپ کیا اور اس سے جو کچھ اندرون ترکی میں اقتصادی کشمکش برپا ہوئی۔

سیاست کا میدان بہت وسیع تھا چنانچہ بڑی لمبی گفتگو چھڑ گئی۔ لیکن سامی اور وہ لڑکی خاموش تھے۔ اور ہونٹ تک نہیں ہلاتے تھے کہ اسی دوران میں اس کی ماں نے دونوں سے محض اس لیے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تاکہ اس کے خاوند کے مقاصد نہ ظاہر ہو سکیں جب یہ گفتگو زیادہ لمبی ہو گئی تو ہدایت بے ایلینا کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔

ہدایت بے۔ "ہم نے اپنی اس گفتگو سے جس سے میرا خیال ہے کہ تم کو کچھ دلچسپی نہیں ہے تمہاری تفریح کو مکدر کر دیا اور اپنے بیٹے سامی کو بھی دیکھ رہا ہوں کہ وہ بھی کچھ مکدر ہے لہذا تم دونوں کے لیے مناسب ہے کہ اٹھ کھڑے ہو اور باغ میں ٹہلو اور جگمگاتی روشنی شاداب درختوں اور بھینی بھینی خوشبوؤں سے اپنے میں تازگی پیدا کرو جیسا کہ تمہارے برابر کے اور دوسرے سیلانی کر رہے ہیں۔" موسو یانی نے یہ سنتے ہی خیال کیا کہ ہدایت بے کچھ کہنا چاہتا ہے اور اس لئے سامی کو ہٹاتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی لڑکی سے کہا۔

موسیو یانی۔ "بیٹی! اگر تمہارا جی چاہے تو تم بھی سامی کے ساتھ کچھ دیر باغ میں ٹہل آؤ اس میں کچھ ہرج نہیں ہے" اس کے ساتھ ہی اس نے اس کو اشارہ سے سمجھایا اور وہ سمجھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور سامی آفندی کو ساتھ لے لیا۔ یہ موقع جو اس کے خواب میں بھی نہ تھا پاتے ہی سامی تو خوشی کے مارے پھولے نہیں سمایا اور فوراً اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر ٹہلنے لگا دونوں چلے جا رہے ہیں اور سامی خاموش ہے اور دل بانسوں اچھل رہا ہے باغ فردوس میں ایک حور کے ساتھ ہے لیکن اپنے جی کی بات نہیں کہہ سکتا ہے چنانچہ اس موقعہ کو اس نے اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت شمار کر کے بھی مناسب سمجھا کہ خاموش رہے اور وقتی لذت جو ہاتھ میں ہاتھ دیکر حاصل ہو رہی ہے اس سے مستفید ہو۔ خوشی اور مسرت کے دریا میں غرق ہے کہ اتنے میں اس نے سر اٹھایا تاکہ اس نور مہ جبیں کو دیکھے چنانچہ دیکھا کہ اس کے جمال میں وہ جگمگاہٹ ہے کہ جس نے تاریکی میں روشنی پیدا کر دی گویا آسمان پر چودھویں رات کا چاند ہے۔ یہ سوچتے ہی اس نے فوراً اپنی آنکھیں بند کر لیں تاکہ یہ خواب جلد ختم نہ ہو اور فکر کے دریاؤں میں جو اپنی موجوں سے اس میں تلاطم پیدا کر رہے تھے ڈوب گیا کہ اس لڑکی کی آواز سے چونکا۔

ایلینا۔ یہ چپ کیوں ہو اور بولتے کیوں نہیں ہو؟

اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف ذرا گھور کے دیکھا اور لڑکھڑائی ہوئی زبان سے کہا۔

سامی۔ میڈم ازیل! میں کیا بولوں اور کونسی ایسی بات ہے جو کہوں۔

ایلینا۔ کم ازکم اس باغ کی خوبصورتی اور رات کا سماں جس میں ستارے گویا موتیوں کی لڑی ہیں اور جس سے تمام آسمان جھل مل جھل مل ہو رہا ہے ایسا ہے کہ اسی کے متعلق کچھ کہو۔

سامی۔ میری زبان اس بیان سے عاجز ہے کہ جس طرح سے تم نے انتہائی بلاغت سے اس مختصر عبارت میں اس کی بہترین تعریف بیان کر دی۔ لڑکی اس کے جواب سے متاثر ہو کر بولی۔

ایلینا۔ اچھا تو سمرنا اُس کی عمارات اس کی سڑکوں اس کی مجلسوں اس کی سوسائٹیوں اس کے کھیلوں اور سیر گاہوں ہی کے متعلق کہو کیونکہ میں تو نووارد ہوں اور تم یہیں کے رہنے والے ہو۔

سامی۔ میڈم ازیل! ۔ بہت اچھا۔

چنانچہ وہ اپنے شہر اس کے عمارات اور سڑکوں کی خوبیاں اور کھیلوں اور سیر گاہوں کی تعداد بیان کرنے لگا وہ سن رہی ہے اور خوشی کے آثار اس کے چہرہ پر نمایاں ہیں۔ پھر مختلف باتیں ہونے لگیں اور وہ باغ میں ٹہلتے ٹہلتے دور نکل گئے اور آنکھوں سے اوجھل ہو گئے باتوں میں ایسے لگے کہ ان کو خاصی دیر ہو گئی یہاں تک کہ ایلینا کا نوکر آ کر دونوں کو بلانے گیا کیونکہ اس کا باپ واپس جا رہا تھا چنانچہ دونوں اس جگہ واپس آ گئے۔ جی تو اُن دونوں کا یہی چاہتا تھا کہ کاش یہ چہل قدمی اور زیادہ دیر تک رہتی۔

غرضکہ اب سب کی سب باغ سے باہر نکلے اور ایک دوسرے سے آیندہ کی ملاقات تک رخصت ہو گئے اور گاڑیوں میں بیٹھ بیٹھ کر اپنے اپنے گھروں کو چلدئے سامی اپنے دوست کے ساتھ اور ایلینا اپنے باپ کے ساتھ ہے مگر دل دونوں میں سے ہر ایک نے ایک دوسرے کو دیدیا۔ جب دونوں گاڑیاں ایک دوسرے سے دور ہو گئیں تو ہدایت بے سامی کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

ہدایت بے۔ کہو۔ شام کیسی گذری۔ تم اس سے خوش بھی ہوئے ؟

سامی شرم سے سرنگوں ہو گیا اور اُس نے کچھ جواب نہ دیا لیکن ہدایت بے نے پھر کہا۔

ہدایت بے۔ کہو کہو! شرماؤ مت! تمہاری گفتگو کا موضوع کیا تھا۔ اور گفتگو شروع کیونکر ہوئی ؟

چنانچہ سامی نے جو کچھ گفتگو اور جس طرح سے شروع ہوئی تھی سب بیان کر دی حتیٰ کہ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی سب باتیں اس کو سنا دیں۔ اس پر ہدایت بے نے کہا۔

ہدایت بے۔ اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کا میلان تمہاری طرف ہے جو میری خوشی کا باعث ہے۔ اب میں دل سے چاہتا ہوں کہ تم دونوں میں محبت مضبوط ہو جائے کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ اس کا باپ دولت علیا کو آزار پہونچانے کی کوشش کر رہا ہے اس صورت میں اگر تم دونوں میں محبت بڑھ جائے گی تو ہم بیٹی کی زبان سے باپ کی نیتوں کا حال معلوم کرسکیں گے۔ میں تم دونوں کے ملانے میں اپنی تمام کوشش صرف کرتا رہونگا تاکہ تمہاری محبت بڑھے اور ہمارا کام نکلے۔

پھر ہدایت بے نے ایک ہوٹل کے قریب اپنی گاڑی روکی اور اپنے دوست کے ساتھ کھانا کھایا اس کے بعد دونوں اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔



# نقد و نظر

(از اڈیٹر)

## تصحیح اللغات

یہ تقریباً سو صفحات کی کتاب ہے جو ہمارے پاس ریویو کی غرض سے آئی ہے۔ حضرت مؤلف یعنی جناب مولوی رفیع احمد صاحب عالیؔ وکیل بدایونی ایک خاموش اور سنجیدہ علمی و ادبی ذوق رکھنے والے بزرگ ہیں جو عرصہ سے ادب اردو کی خدمت میں مصروف ہیں۔ آپ کا دیوان جو تقریباً تمام اصناف سخن پر مشتمل اور آپ کی کہنہ مشقی کا روشن ثبوت ہے مدت ہوئی کہ شائع ہو چکا ہے حال میں آپ نے تصحیح اللغات ترتیب دے کر زبان اور لغت کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ زمانۂ موجودہ میں عربی و فارسی کا مذاق اٹھ جانے کی وجہ سے اکثر اردو ادیبوں کی تقریر و تحریر میں جو بے راہ روی اور بے قیدی کی شان پیدا ہو گئی ہے اُس کو دیکھتے ہوئے زبان کے بہی خواہوں کا فرض تھا کہ ان امور کی اصلاح کی جانب متوجہ ہوتے۔ مؤلف علام کی ہمت قابل ستائش ہے کہ اُنھوں نے سب کی طرف سے یہ فرض کفائی ادا کر دیا۔ اور مختلف مستند کتب لغات سے تحقیق کر کے اکثر ایسے الفاظ جمع کر دئے جن کو نہ صرف عوام بلکہ خواص بھی غلط بولتے یا لکھتے ہیں۔ آپ نے ہر لفظ کے معنی دیکر اُس کی غلطی اور صحت کی کیفیت بہ قید اعراب ظاہر کر دی ہے جس کی وجہ سے کتاب مذکور نہایت مفید اور دلچسپ بن گئی ہے۔ ہم ذیل میں چند مثالیں تصحیح اللغات سے پیش کرتے ہیں جن سے ہمارا مفہوم زیادہ واضح ہو سکے گا۔ مثلاً

| غلط | صحیح | غلط | صحیح |
|---|---|---|---|
| اژدہام | ازدحام | استدعا (بضم دال) | استدعا (بسکون دال) |
| آصف (بہ کسر صاد) | آصف (بفتح صاد) | بقراط (بہ ضم با) | بقراط (بہ فتح با) |

| غلط | صحیح | غلط | صحیح |
|---|---|---|---|
| جدّہ (نام معلم) (بفتح جیم) | جدّہ (بضم جیم) | جلوہ (بہ کسرِ جیم) یا جُلوہ (بزبان مستورات) | جلوہ (بہ فتح جیم) |
| حجامت (بہ فتح حا) | حجامت (بکسر حا) | خراج (بکسر خا) | خراج (بہ فتح خا) |
| رمضان (بسکون میم) | رمضان (بہ فتح میم) | سیّد (بہ فتحہ یا) | سید (بہ کسر یا) |
| شجاعت (بضم شین) | شجاعت (بہ فتح شین) | صندوق (بہ فتحہ صاد) | صندوق (بہ ضم صاد) |
| نواب (بلا تشدید واو) | نواب (بہ تشدید واو) | نوید (بہ فتح واو) یا نوِیل (بزبان جہلا) | نوید (بہ ضم نون و کسر واو) |

ہمارا خیال ہے کہ یہ کتاب زبان کے اغلاط کی تصحیح میں ارباب ادب خصوصاً شعرا اور طلبہ کی کامل رہنمائی کرے گی اور نہایت کارآمد ثابت ہوگی۔ سررشتۂ تعلیم کا فرض ہے کہ ایسی کتابوں کو مدرسوں میں رائج کرے تاکہ طالبعلموں میں صحت زبان کا ذوق پیدا ہو۔ آخر میں جیسا کہ خود جناب مولف نے دیباچہ میں ظاہر کر دیا ہے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ "وہ الفاظ عربی و فارسی جو اردو میں اپنی اصل کے خلاف جمہور فصحا کی زبان و قلم پر رائج ہوگئے ہیں گو اصلاً صحیح نہ ہوں اردو ادب میں صحیح ماننے چاہئیں کیونکہ یہ ایک قسم کی تہنید ہے۔" مگر ظاہر ہے کہ عوام کا استعمال مستند قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کتاب مذکور دیدہ زیب تقطیع اور خوشنما طباعت کے ساتھ نظامی پریس بدایون سے شائع ہوئی ہے اور اسی پتہ سے ۸ر میں ملتی ہے۔ حسنِ طباعت کے لیے نظامی پریس کا نام ہی کافی ضمانت ہے۔ شروع میں حضرت مولانا احسن مارہروی کا محققانہ مقدمہ ہے۔

# HERE AND THERE.

BY
**Sulaiman Mohammad**
*Class X. A.*

(1) Sunday Island, in the Pacific is really the tallest mountain in the world. It rises 2,000 ft. out of five miles of water, and is thus nearly 30,000 ft. from base to summit.

(2) Thirty-one cities in the world have more than 100,000 telephones.

(3) At sea or over a level plain the human eye, at a height of 5 ft. from the ground can see an object 2·9 miles away.

(4) Bannanas are banned in Italy because they do not grow in Italy or in any Italian Colony.

(5) The height standard for infantry soldiers is now 5 ft. 2 ins.

(6) The fly, as a germ carrier, is capable of doing more harm than a mad elephant.

(7) Fish, either fresh or salt water, is much more digestible than any other form of flesh.

(8) Syria, Persia, and Iraq are the latest countries to adopt the right hand rule of the road.

(9) A diamond, under pressure in the jaws of a vice becomes phosphorescent and emits a light like that of a glow-worm.

*Servant:* "No, sir; he comes once a month to read the magazines."

---

*He:* "You wouldn't marry me for my money, would you?"

*She:* "Why, no, you silly boy! I wouldn't marry you for anything."

---

*Student:* "I have just bought an encyclopaedia and there is everything in it that you want to know."

*Landlady:* Then just look and find out when I am to receive the money for your rent.".

---

*Mistress:* "I am Cornish by birth."

*New Maid:* "You don't say so! I always thought they was caused by tight shoes."

*Employer (to office boy):* "How do you find yourself these cold mornings, Tommy?"

"Quite easily, thank you, sir, I just throw back bed clothes and there I am!"

---

"My Lord," said the foreman of an Irish jury, when giving verdict, "We find the man who stole the mare 'Not Guilty."

---

*Doctor;* "Your coughing seems to be easy."

*Patient:* "It should be so—been practising all night."

---

*She*: "How did you manage to come here?"

*He;* "On my feet."

In two mintues she had returned to the box-office.

"I am afraid there's been a mistake," she stammered.

'I thought this was a picture show, but when I got downstairs I discovered that a man with asthma was giving a lecture in German."

---

Harassed carpet salesman (appealing to husband): "you won't beat this, sir.'

*Wife* (snappily): "You'll pardon me—he will if I buy it."

---

"That man cheats," said a golfer, as he entered the club-house. "He lost his ball in the rough and played another ball without losing a stroke."

"How do you know he didn't find his ball?" asked a friend.

"Because I've got it in my pocket."

---

*Teacher:* "What is a cannibal, Tommy?"

*Tommy:* "Please, teacher I don't know."

"Well, if you ate your father and mother, what would you be?"

"An orphan, miss!"

---

*Sunday School Teacher:* "Johnny, what can you tell me about Aaron?"

*Johnny:* His name was the first in the telephoe book."

---

*Wife:* "I read the other day that the giraffe has a tongue eighteen inches long"

*Husband:* "Aren't you jealous?"

---

Noisy soup drinker (in restaurant): "Whatcha looking at"

Another Diner: "Sorry, thought you'd fallen in."

---

*Author:* "May I have some further details about this magnificent estate you offer for sale?"

*Agent:* "Do you wish to buy it?"

"No; but I think I can use your glowing description of it in my new novel.

---

*Teacher:* "What is an island?"

*Bright Lad:* "A place where the bottom of the sea sticks up through the water."

*Uncle:* "You speak seven langvages, do you? Well, let's hear you say 'good morning' in Italian."

*Nephew:* "Gooda mornin'!"

---

*Doctor:* "Is that a patient in the waiting room?"

## WIT AND HUMOUR.

BY

**Sulaiman Mohammad,**

*8, Jubilee Hostel.*

*Suspicious Butler* (downstairs at 2. a. m. after hearing noise) :

" Is that your lordship ?"

*Voice from the Darkness* :" Yes that's me!"

---

After terrific struggles, the school boy finished his examination paper. Then, at the end, he wrote:

" Dear Mr. Examiner,—If you sell any of my answers to the papers, I expect you to hand me half the profits."

---

*Pretty Waitress* : " Are you the fried haddock ?"

*Susceptible Diner*: " No, the lonely sole."

---

"You'll be round to night. Bob?" "said Dora.

"Rather! But you must tick off that ugly-looking fellow who drives your car and works in your garden; he gives me a nasty look when he sees me."

"Oh, don't worry." replied Dora airily: " that's only father."

---

" Is he one of the landed gentry?"

" No, he's still a bachelor."

---

*Father* speaking to prospective son-in-law) :

" The man who gets my daughter will get a prize."

---

*Suitor*: "May I see it please?"

*Customer*: "You say this material is the very latest fashion?"

*Assistant*: "The very latest, madam."

" But will it fade in the sun?"

"No! It's been in our window for two years.'

---

An old lady with an hour to spare went into a cinema without realising that a talking film was being shown.

and philosophy Bacon holds a very sublime position. Cowley compared him to "Moses standing on Mount Pisgah, surveying the promised land" To judge Bacon's character is a painstaking task. Pope said

"If parts ailure thee, think how Bacon shined!

"The wisest, brightest, meanest of mankind!"

He had an instinct for worldly ambition which brought him disgrace in his gray years. But Bacon had a solemn and tranquil mind. His religious views were exceedingly good. He said that "a little knowledge of Philosophy inclineth man's mind to atheism, while *depth in Philosophy bringeth* man's mind about to religion." About him there is a very deplorable though transient obscurity. Bacon is blamed for selfishness and faithlessness but these are misguiding remarks. They are but gross mis-representations of his conduct. Macaulay has well said that "no reports are more easily believed than those which disparage genius, and soothe the envy of conscious mediocrity." But to disclose the truth Bacon had a very serene temperament, a good and genuine purpose, correct judgment administrative capacity and an innocent and pure heart. Moreover there is much difference in "Bacon the philosopher and Bacon the Attorney General; Bacon seeking for truth; and seeking for seals." To examine him we have to see "Bacon in speculation and Bacon in action: a useful innovator at one time and an obstinate champion of abuses at another." Nevertheless Bacon's is an example which can bring success and aggrandizement to the people of all ages, if it is pursued with necessary caution and regard to the expediency of its precise and rightful application.

---

Bacon says that Arithmetic should be above these trifles, it should be employed in framing convenient expressions which may be of use in physical researches.

2.—*Geometry*:—About Geometry Plato said that it was degraded by being used in the construction of some machines. He thought that its office was to discipline the mind and not to minister the base requirements of the body. Even long afterwards Plutarch and Archimedes considered the mechanical science to be unworthy of their deep notice though the latter was a great scientist. Archimedes always spoke slight of the wonders of other nations. Bacon had a different view and "pronounced that it should be an auxilliary to other sciences. Mathematical science is the hand maid of natural science, it should demean herself as such and that the more discoveries are made in Physics, there will be more branches of Mixed Mathematics.

3.—*Astronomy*:— As regards Astronomy, Plato and Socrates were of opinion that they should go beyond the stars as the real astronomy was as free of the stars as Geometry was independent of ill drawn lines. Bacon thought that Astronomy should not be separated from natural philosophy. It should be annexed to Mathematics, as through Astronomy the world could study the nature, the motion and the influence of heavenly bodies.

4.—*Alphabet*:—The use of Alphabet Plato thought to be the same as the use of go-carts in learning to walk or of cork in learning to swim, which he thought detoriated man's real worth of mind. Bacon thought without writing the powers of memory would not do much in the advancement of any science, hence alphabet was indispenssible.

5.—*Medicines*:—The use of medicine Plato thought to be odious. It would heal lossels and men not worth living, while Bacon thought that it would make imperfect and suffering men comfortable.

6.—*Legislation*:—As regards Legislation Plato thought that a law which did not convince reason or enlighten it was morally a baseless law. Becon's view was that the function of law was to improve society, to maintain order and peace the imparting of religious and moral training and the establishment of judicial, financial and commercial systems.

## VI.—OUR ESTIMATE OF THE PHILOSOPHER.

Bacon had liberal views. He believed in necessity of the Parliament though not with a democratic point of view. For the Parliament he said, "Do not be afraid of it deal with it frankly. Use all adroitness of knowledge and necessary firmness and majesty managing it." Bacon's Philosophy was a means of future success to the mankind. Lord Macaulay says "Bacon fixed his eyes on a mark which was on the earth and within bow-shot and hit it in the white. His philosophy began in observation and ended in arts." In science

ready man .and writing an exact man. And therefore if a man write little he had need have a great memory if he confer little he had need have a present wit and if he had read little he had need have much to seem to know that he doth not. Histories make men wise, poets witty, the mathematics subtle, natural philosophy deep; moral, grave; logic and rhetoric, able to contend."

Really his manner of writing did not depend on style but the nature of the work he undertook. He wrote much in Latin. "The Majesty of Latin suited his taste and his thoughts." He was fond of quoting Latin phrases. His tendencies at different periods can be well marked in Macaulay's words that "his boyhood and youth were singularly sedate. In youth he wrote on emotions. At forty his reason and judgment had reached full maturity. At fifty his rhetoric was quite as rich as good taste would permit, and at seventy it had become ungracefully gorgeous."

*Philosophy and Science.*—As Bacon himself said he wanted to be a "true pioneer in the mine of truth." His doctrines of philosophy can be well explained in two words, Utility and Progress. Bacon thought that the "ancient Philosophy disdained to be useful and was content to be satisfactory. It could not condescend to the humble office of ministering to the comfort of human beings. This sort of Philosophy it is evident, could not be progressive. There had been plenty of ploughing, harrowing, reaping, threshing. But the garners contained only smut and stubble." Lastly the old Philosophy had takn shelter in the Church, which it had always persecuted, but the Church also condemned it and instead of improving upon it, filled it with shallow graces. Becon's love of the noble pursuit had directly tended him to believe that they should improve the general condition of the mankind. He thought that all the power of man should be utilised in extending his empire over matter. His opinion was as W. Church says that "the systematic and wide examination of facts was the first thing to be done in science." Bacon thought that by verified inductions, and starting from lowest facts we should arrive at realities and truths. With such notions he came into collision with the Philosophers of antiquity, with Plato, with Socrates and with others. Let us take various branches of philosophy and science and compare his dictates with the principles and maxims of the Antiquarians.

1. *Arithmetic.*— About Arithmetic Plato held that we should study the properties of numbers which would help us in our contemplation of truth. Through them we should free our mind from the spectacles of this evershifting world and should fix them "on the immutable essences of things." But

care was that his books should be put in Latin. To by Mathew he wrote "these modern languages will at one time or another play the bankrupt with books.' His plan of the "Instauratio Magna" was of a unique character. His two wonderful treatises the famous Novum Organum p ublished in 1605 and the Augmentis Scientarum published in 1621 were put into Latin. In them the highest peculiarities of his mind are found in perfection. Both made a revolution in the mode of thinking of the people, and threw down much prejudice. His Advancement of Learning was the first attempt to teach English readers how to think of knowledge and to make it the interest of society In it Bacon taught how knowledge can be. practically employed in all phases of life. There in he had dealt with the realities of nature and mind. His other productions like Sapientia Veterum and Index Expergatus are his valuable gifts to the mankind. His Digest of the Laws and the Laws of Ecclesiatic Polity are books which were written with the intent of eradicating all unworthy notions, suspicions and practices entered into or prevailing in the Church, the Court and the law. The famous history of Henry VII. was much appreciated even in his own age. But the paramount soverignty of Bacon as a witer. lies in his volume of Essays. The first form of the "ten" composed in 1597, is much like notes. But soon they were enlarged and improved. About them is said that "they are like chapters in Aristotles Ethics and Rhetoric on virtue and character." About the popularity of the Essays, Macaulay says "it is by the Essays that Bacon is best known to the multitude. The Novum Organum and De Augmentis are much talked of but little read." The periods in his essays come "like strokes of a great hammer" shaking the heart with their piercing delicacy and truth. Hi s essays" "On Truth, or Death, or Seeming Wise, of Cunning, Of Wisdom for Man's Self, Of Despatch and of Great Place" are moral educators in self. They are products of Bacon's long experience and observation. About truth, he says "truth which only dealt judge itself, teacheth, the inquiry of truth which is the love making or wooing of it, the knowledge of truth, which is the presence of it and the belief of truth which is enjoying of it, is the sovereign good of human nature." His other essays Of Studies, Of Revenge, Of Adversity, Of Friendship and Of Empire" are equally full of practical lessons In the essay of "Studies there is not a sentence nay even a word which can be better replaced by. His flourishing style can be well studied by an extract from his essay "Of Study." In it he had given best possible advices to a student. He says that "read not to contradict nor to believe but to weigh and consider. Some books are to be trusted, others to be swallowed, and some few to be chewed and digested. Reading maketh a full man, conference a

£ 40,000. He was to be imprisoned in the Tower during king's pleasure, and was declared incapable of holding any office or of sitting in the Parliament. He was "banished from the verge of the court." Bacon new that the trail would prolong his agony He conciously avoided it, and shrank from looking the Peers in face for shame and disgrace. To his deep distress he was sent to the Tower to satisfy the terms of the sentence. On March 31st, in his gloom and sorrow, he wrote to Buckingham, "procure my warrant for my discharge this day. Death is so far from being unwelcome to me." But he was released after two or three days.

Bacon had been held guilty for gifts but his was not the sole fault. The taking of gifts was customary, it was analogous to doctors' practice of taking fees. Moreover the offices were underpaid. The charges against him were really the outcome of long negociations and plots. Anyhow his fall was accomplished. He was suffering from mental depression, but to his great relief his fine was remitted in 1624. Bacon wanted to get his full pardon from Buckingham even at the cost of York House, which Buckingham sometime before wished to purchase. The transaction was lastly done through Sir E. Sackville. Bacon said that "whether in a straight line or a compass line, I meant it for his Lordship." He now retired to Gorhambury at London, he would stay at the old Inns. He still did not cease to petition to the king. To James he wrote "Your Majesty hath power: I have faith. Therefore a miracle may be wrought." But his hopes were all futile; they were always frustrated. Still he was not dull. He was incessantly writing, and produced his History of Henry VII. To please the king he prepared a Digest of the Laws, but all this was in no way better than to roll to big stone uphills. Besides these he wrote other books in the meantime.

*His death.*—As Macaulay says "the Great Apostle of experimental philosophy was destined to be its martyr." Bacon had always thought that snow could prevent animal substances from putrefying. On a very cold day in March 1626, he alighted from his coach at High Gate and bought a fowl. He stuffed it with snow, but soon he felt a sudden chill. He could not return to Grays Inn and was forced to stop at Lord Arundale's house. Here after a week's illness Bacan expired on the morning of Easter Day. Bacon left after him a fame which would never decay, a luster which would never tarnish. He for himself said, for my name and memory, I leave it to men's charitable speeches, and to foreign nations, and to the next age."

## V.—BACON'S WORKS, AND HIS NOTIONS OF PHILOSOPHY AND SCIENCE.

*His Works*:—It is for his splendid writings and works that Bacon shall be remembered in all ages. He wrote in English and Latin both. His supreme

ceremonial speech spoke so high of the blessings of James reign that every one in the kingdom thought him the most fortunate. The Parliament soon complained of the state of affair. Two committees were early appointed by the House of Commons; one, a committee on Grievances such as monopolies, and the other to inquire into the abuses of the courts of Justice.

Meantime Bacon had committed another blunder. His malevolence towards Coke had darkened his mind. He had wrongly intervened in a marriage question, which was proposed between Buckingham's brother and Coke's daughter. The King and the Duke had been in Scotland. The intellegence of this infuriated Buckingham, who gave a harsh threat to Bacon. Lord Chancellor being of a very pusillanimous nature begged the Duke's pardon. He went to Buckingham's palace with the Great Seal on his back, and as is reported "he flung himself on the door, kissed the favourites feet and vowed never to rise till he was forgiven." But greater evils were to overtake him. The pending hour of peril had reached. The referees that is the accused were named, the Chancellor was at the head of the list. On March 10, the King came to House of Lords and declared that "he was not guilty" but those who "had misled him." Many petitions and evidences were put forth against the Chancery Bacon's enemies exaggerated his illegal gains to £1,00,000. He was charged of bribery, of prerogatives, and other misdoings. All this horrified Bacon, who was perplexed and lost control of his mind. He addressed a message to the Committee, but inspite of that the case was referred to the Commons. Bacon soon perceived an unfavourable feeling among the Lords. He had powerful enemies like Coke and Southampton, who had old grudges. The Commons soon laid the complaints before the Lords. Bacon was required to appear before the House which he could not as he was too ill to do so. Instead of producing any defence, he tendered a submission in which he confessed all charges, but it was treated with "impatient scorn" (April 24). He had already resigned the Chancellorship on April 21st, and begged king's favour to be spared of sentence. On May 1st a commission was sent to receive the Seal. Bacon said "by the king's great favour I received the Great Seal; by my own great fault I have lost it." As regards the veracity of his confessions he addressed the Lords who went to his house in these pitiful words. "My Lords it is my act, my hand, heart. I beseech Your Lordships to be merciful to a broken reed." In every quarter of the country there were new additions to his humiliations. Lord Pembroke said, "shall the Great Seal come to the bar? Bacon was excused of his personal appearance at the bar through Pembroke's favour. On May 3rd, the sentence was announced. Bacon was fined

and outrageous letters to the king complaining against the late Lord's gross misconduct. On May 29th, he wrote to James that for the late Lord, he could not show his affection to His Majesty, "having been as a hawk tied to another's fist." Bacon now had begun to dream fanciful visions but they all were subdued, and he could not assume the office In 1631, Coke was sent to the king's Bench. Hobart, the Attorney succeded him and Bacon was endowed with the office of Attorney Generalship on October 27.

After resuming the new office, Bacon in a "proposition" urged on the king the necessity of revising and codifying the law. His friend George Villiers, in 1616, became the all powerful Duke of Buckingham. Through Bacon's pursuasion the king deprived Coke of his post in 1616. Lord Chancellor, Ellesmere, was fast falling. Bacon had been on best terms with Buckingham, who upheld his cause. In a burst of gratitude, Bacon wrote to Buckingham on Feb. 15, 1617, that "I will now wholly rely on your excellent and happy self. I am yours surer to than my own life." At last on March, 1617, through the Duke's favour, he received the Seals. Bacon rode to West Minister Hall that day with a magnificient procession. The Lord Treasurer was on his right, and the Lord Privy on his left. It was the proudest moment of his life. His illimitable joy was but transient. At his court he made a very dignified speech and declared that "he would walk in the light; that men should see that no particular turn or end led him but general rule." But these were unworthy words; he did not abide by them. He had plucked the feather, but it was a curse unprecedented. What he cosidered the pinnacle of honour and glory was ordaind to be the point of his fall and ruin. The serpent of power had bitten him The venom had spread. His senses were overpowered. The following—an unconscious death—was natural. Bacon proved to be a venal judge. He was under two pernicious influences—the influence of the most powerful man in England, Buckingham, and the influence of presents in money and gifts. Silver and gold was largely adulterated in the country. It was his business to have interposed but he only made slight and lukewarm reports of it to the king. Under him the wisest and the noblest man of England like Raleigh and Suffolk were prosecuted and punished. Bacon largely favoured monopolies. He had received greater honours as he had been created Baron Verulum and was subsequently raised to the dignity of Viscount St. Albans, but his evil days were hiddingly approaching fast, and he never knew what imminent dangers were awaiting him.

## IV—BACON'S FALL AND DEATH.

*His fall*:—The Parliament met on Jan. 30, 1621, Bacon in the

worked havoc in the country. It came as a shock to Elizabeth's popularity. She asked Becon to produced an explanation of her late proceedings Bacon, a teacher of morality, did what even an ordinary man would have declined to do. In "cold blood" he sat to blacken Essex using his intimate personal knowledge of the past to strengthen his statments against a friend who was in his grave. Bacon wrote the "Declaration of the Treason of the Earl of Essex" Though it had no misstatements, its language obviously, revealed Becon's "coldness of heart and meanness of spirit." His mind was perhaps sat on things much below his dignity, titles, patronage, wealth and precedence. "The moral qualities of Becon" says Macaulay "were not of a higher order." The Queen afterwards regretted her favourite's death much, and the pitiable melancholy of her last years ended at her death in 1601. She was succeeded by James of Scotland.

*James:*—Every one was anxious to serve James I of England. Bacon wrote letters to Robert Cecil and to Duke of Northumberland. He also petitioned to the king, but his chance only came in 1604, when James first's Parliament met. The House of Commons was envoled in a contest with the king about prerogatives and monopolies. Bacon took an active part in the controvercy between the king and the Commons and managed to please both the parties; the king for he recongnised his absolute sovereignty and the House as he maintained its honour. Bacon who had hitherto been an unpaid Learned Council for the first time received his office with a patient. In 1605 he published his two books of the Advancement Knowledge. Through Cecil's favour Bacon was created a peer on the Coronation Day. In May 1606, he married Alice Burnham an alderman's daughter. The same year the Parliament met. Coke, Bacon's hostile enemy, was appointed as Chief Justice for Common Pleas. Bacon inspite of adverse opposition was gaining king's heart.

## III.—BACON AS A SERVANT OF CROWN.

Doddeiige, the Solicitor was provided with some other post His vacant place was invested upon Bacon on June 25th, 1607. Bacon now had risen to a post of honour. He soon became a rich man with a property worth £24,155 and an income of £4,975. As characteristic of him he would always be writing memorial and letters of advice to the king, Robert Cecil, now Lord Salisbury, and others Bacon had contrived to be closely familiarised with George Villiers, who afterwards became Duke of Buckingham. In 1611, the Attorney fell ill. Bacon reminded the king and Lord Salisbury for his claims. The attorney recovered but Bacon thanked the Lord for his "good will." On May 24th, 1612, Lord Salisbury died. Bacon coveted his office and wrote very bitter

Solicitorship, but again an inferior man was given preference to Bacon. The earl's magnanimity found another vent to help his friend. He presented to Bacon an estate worth £ 2,000 situated at Twickenham, which he owned till long afterwards.

At the end of year 1596 Essex had won greater love in Queen's heart by his success at Cadiz. Bacon admonished the Earl against the risky ambitions and wrote him that he wished to see him with a "white staff in this hand" as a vigilant spectator of the Queen's humours and moods. But Essex made light of such bits. He undertook the Irish campaign in 1599, where he proved an utter failure. He intrigued with Tyrone and James of Scotland, but on his return to England he was disgraced and publicly upbraided by the Queen. His rivals and enemies had provoked Queen's anger. Essex in a fit of desperate stupidity committed the blunder of the ignominous outbreak of Feb. 1600. The Queen was now agog with rage. She suspected the Earl's loyality and held him to be a State enemy. Essex was brought to trial. Coke conducted the prosecution. Bacon was then occupying the place one of the "Learned Counsel." His duty was to gather matter and evidence against the prosecuted. He was in the most irksome position. He was between the devil and the deep sea. But he could have observed neutrality at the time of trial, which he did not. Instead of that he did more harm to Essex than any one else did. Coke is said to have blundered in the course of prosecution. But suddenly Bacon came forward and said that "no man can be ignorant that knows matters of former ages and all history makes it plain that there was never any traitor heard of that durst directly attempt the seat of his liege prince but he always coloured his practices with some plausible pretence. For God hath imprinted such a majesty in the face of a prince that no private man dare approach the person of his sovereign with a traitorous intent." Becon had a hot discussion with the Earl, but he proved him an incorrigible, silly traitor. Bacon was used for this very prupose by the Queen, and his meanness of conduct seems to be in explainable in this affair. He tried to make a reconciliation but his efforts were foiled. He was abhorred by the Earl and the Queen both. As Lord Macaulay says, "Essex thought him wanting in zeal as a friend; Elizabeth thought him wanting in duty as a subject. The Earl looked on him as a spy of the Queen; the Queen as creature of the Earl." Becon thus had incurred universal infamy for him and was conceived to be an insincere and treacherous friend. Essex was sentensed to death and as R. W. Church says, "that career, so brilliant full of province of good, ended in misery, in dishonour in remorse on the scaffold of the Tower" Becon was bestowed £ 1,200 out of a fine as a reward for his services. The death of the Queen's favourite

## II.—BACON'S RELATIONS WITH THE STATE.

*Elizabeth*:—The Queen had yet been indifferent to Bacon but in 1590 he somehow or other obtained the first show of favour. He was sworn in the Queen's Counsel extraordinarily. The Cecils too were now generous to him and procured for him the Registrarship of the Star Chamber. In 1582, a pamphlet was published on the Continent in Latin and English in which grave charges were made against the Queen's policy towards the Catholics. Bacon in answer to it wrote his observations on a Libel, with much ability and circumspection. For this he attained a high reputation in the country. In the next year he sat in the Parliament as a member for Middlesex and soon attained eminence as a debator. In the Parliament he would speak like an angel. Ben Jhonson about him says, "no man ever spoke more neatly, more precisely, more weightily or suffered less emptiness less idleness in what he uttered. His hearers could not cough or look aside from him with out loss. The fear of every man that heard him was lest he should make an end." Meanwhile he had made intimate friendship with the Earl of Essex, who was gaining Queen's kind regard. Leicester was now dead and Burghley had grown old. Essex was an accomplished, eloquent, generous and aspiring courtier. He was a great scholar and turned his studies to full accounts and had the insight of perceiving in Bacon a singular instinct which could guide him safe in the execution of the most responsible duties. Bacon, to avail of his new acquaintance, created an interest in the Earl's heart for his affairs.

The post of Attorney-ship fell vacant in 1593. Bacon hoped to get it He had been under heavy debts and had long been hankering after some high post. Essex, who was now Privy Councillor, supported Bacon Robert Cecil who was to be appointed Secretary of States upheld the cause of Edward Coke who was a famous lawyer. Coke was thought to be a more deserving candidate for the post even by the Queen. "Bacon" said she, "hath a great wit and much learning, but in law showeth to the utmost of his knowledge and is not deep" Essex put forth Bacon's cause most ardently. Robert Cecil advised Essex to be content with the Solicitor's place for Bacon which was soon to fall vacant. But the Earl said, "Digest me no digestions, The Attorney for Bacon is that I must have, and in that I will spend all my power authority, amity and credit; and with tooth and nail procure the same for him against whomsoever; whosoever getteth this office out of my hands for any other, before he have it, it shall cost him the coming by." But it was to carry water into a sieve. Coke was made Attorney General in April, 1594. Essex next pressed for the

charm that made him loved by good and worthy friends, amiable courteous, patient. delightful as a companion, ready to take any trouble,—there was in Becon's "self" a deep fatal flaw. He was a pleaser of men. Brought up in a Puritan atmosphere, Bacon deserves the credit of not yielding to the obstinate and prejudicial tendencies of that school of thought

Bacon manfully bore the loss of fortune cast by his father's death and resorted to law, although with reluctance. Soon Bacon was admitted into Gray's Inn, but he laboured there in obscurity. At the age of 25, he wrote a philosophical dissertation giving it the "pompous title" of "The Greatest Birth of Time." How Bacon had begun to realise his powers when he was 31, he wrote a letter to Lord Burghley seeking his help to procure for him some office in the Queen's court "I have taken all knowledge to be my province," Bacon writes, "I wish Your Lordship all happiness and to myself means and occasion to be added to my faithful desire to do you service." But these words fell on deaf ears—ears which were disinclined to hear for jealousy and prejudice. Bacon had tried all his usual adulations therein but all to no purpose. Bacon always looked for help from his kinsman, but he was always disappointed for the Lord disliked him. Lord Burghley's second son Cecil, a few months younger than Bacon, was no match to the latter in wit and intellectual capacity. Burghley's wish that his greatness should descend to his son never allowed him to show any favour to his cousin, lest Bacon may throw himself in a closer indulgence of the Queen on account of his superior wisdom and special literary tastes. This personal envy of the Cecils always suppressed any chance of the State favour which could give Bacon an opportunity to prosper.

Bacon still pushed on through the mire He produced a panegyric in praise of the Queen. Meanwhile he also brought forth a wonderful discourse entitled as the Praise of Knowledge. It was a sufficient vindication of his love for knowledge and his bold spirit and aims for a reform in philosophy and science. There he said that "the sovereignty of man lieth hid in knowledge, and that we govern nature in opinions but we thrall unto her in necessity ; but if we could be led by her in invention, we should command her in action." In 1584, Bacon entered the Parliament from Melcombe. After a prolonged courting and many humble appeals, he became a bencher at his Inn in 1586, probably through Lord Burghley's help. In the year of the Armada (1588) he returned to the Parliament from Liverpool. Now he began to scrutinize the affairs and the proceedings of the House with much deliberation and skill. But still there was no prospect of the fulfilment of his ambition. He was yet a failure.

Cambridge. At the age of twelve Francis Bacon was also sent to the Trinity College. In his student life he received much help in Greek and Latin languages from his mother, who was a sister of Lady Cecil. Thus William Cecil, who later become Lord Burghley, was his uncle. Having distinguished himself as a painstaking and intelligent student, Bacon was admitted into the Society of Ancients of Grays Inn at the age of sixteen. He then visited Paris and resided there with Sir Amias Paulet, Elizabeth's minister at the French Court. "The system of academic education in England was radically vicious," says Lord Macaulay. Bacon formed a very poor idea of it, all the more because the course of study was obsolete and included Aristotle's Theories, while Bacon thought that the Followers of Aristotle had wasted their sole energies on petty and negligible questions. They held Aristotle in a lukewarm reverence, and in Bacon's opinion could not render his theories much valuable for the posterity.

On the continent Bacon had been mainly busy in the study of ctatistics and diplomacy. This sourse was largely perturbed by the shocking news of his father's sudden death in 1580. He returned to England with a heavy heart. Bacon's father's death was a great calamity for it ruined the brilliant prospects of his future career. It left him in the lurch. It was a very plaintive and ominous prognostication to the future vistas of a novice like the young and zealous Bacon. But this forecast did not deprive him of his peace of mind. He rallied all his forces, as he had strong expectations for a good compensation in Elizabeth's Court. He had claims for it, and was noticed by the Queen; moreover his uncle Lord Burghley was Prime Minister. Bacon pressed on him for help. He aimed at becoming powerful and still more to be rich because "without power and without money," as R. W. Church says, "he could not follow what was to him the only thing worth following on earth—a real knowledge of the amazing and hitherto almost unknown world in which he had to live." But Bacon was doomed to live in penury. Nothing could avert his ill-luck. He strove hard to be great and really possessed the qualities required for that. He had a creative mind, which was keenly sensitive to all analogies and affinities. Bacon's power of observation was exquisitely fine and nothing was too minute for his notice. Besides his "affluence in topics" he had a command over what he knew and had at his disposal an immense vocabulary of apt words, illustrations, proverbs, quotations and anecdotes. In him could be seen all marks of greatness, but to quote Church's words "with all his greatness, his splendid genius, his magnificient ideas, his enthusiasm, for truth, his passion to the benefactor of his kind, with all the

# A DISSERTATION ON "BACON"

BY

Syed Rashidul Haque,

*II Year Science*

## I.—BACON'S EARLY LIFE.

Francis Bacon, the great philosopher and scientist, idealist and thinker was born in an age which proved ungrateful to him. His was a twofold life—a life of genuine love for knowledge and of sordid aims for wordly greatness. Although madly anxious to win over his wordly superiors, he never lost sight of his sacred pursuits after truth. Yet "his is a blissful rememberance!" His respect and love are stamped in all hearts for eternity. His fame for sobriety of manners, tranquillity of mind, chastity of heart and enthusiasm for all noble works has perhaps never been surpassed. It is hard to recollect a grander and more magnificent career. He was endowed with special gifts. His mission to the mankind was, as he himself said, "to awake better spirits like a bell-ringer, which is first up to call others to church." His chief aim of life was "to enlighten and to elevate his race, to enrich it with new powers and to lay up in store for all ages to come a source of blessings which should never fail or dry." He was a "great seer of the world of knowledge." From his father, Sir Nicholas Bacon, who was Lord Keeper of the Seal during Elizabeth's reign and held a conspicuous position among these politicians, who had been the guiding spirit of the country since Henry VIII's time, Bacon had inherited a keen taste for current politics.

Francis Bacon, who himself had a deep interest and was later to distinguish himself in that province of activities, was born on January 22nd, 1561 at York House in London. He was a promising ingenious lad but was slender in constitution and weak in health, and as Lord Macaulay says, "to this circumstance may be partly attributed that gravity of carriage and that love of sedentry pursuits which distinguished him from other boys" The quick wit and dignified deportment of the young Bacon so much affected the Queen that she began to call him "her Young Lord Keeper." From his boyhood he had a contemplative turn of mind. He watched with credulity the activities of his father and of other politicians of that age. Bacon had love and sympathy for the politicians who were one and all Protestants. They neither coveted aristocracy, nor were envious of the nobility. They had all been members of the same University and had received as liberal an education as could be afforded by that age at the well reputed sanctuary of knowledge,

To sum up, it will not be unjustifiable on my part to quote here those words of Wordworth which he spoke about Coleridge in extolling his praise. He said, "The only wonderful man I ever met was Coleridge" These words unfathomable in their meaning bear an eloquent testimony to the greatness of the man who even to this day is not loved but honoured, not only admired, but esteemed and revered by the true lovers of poetic Art. All his writings are of a philosophical type The sublimity of thought and conception and the loftiness of language that these books embody, speak highly of the master mind behind them and as such the place of Coleridge in the gallery of English writers will remain always secure.

deeply mourned and sadly missed by his friends and admirers.

On the firmament of letters Coleridge rightly deserves to be considered as a 'star of the first magnitude.' As a poet, half a dozen of his works, no doubt, display greatest brilliance but even in those of lesser excellence he displays an imaginative and artistic power. He wrote nothing that was worthy to be rejected The main beauty with his speculation lay in the fact that he could visualize unseen things and compose poems on them. As a lyrical poet he stood unrivalled and unchallenged. His originality, insight, grace, naturalness and charm of diction has marked him as a poet of the highest order and he may be said to have 'inaugurated a new era by his poetic idealism.' In the gallery of English poets his place is secure; and of nobody can it be more emphatically said that he was 'imagination all compact.' He was an accomplished meterist. The exquisite perfection of his metre and the fine alliance of thought and expression has won for him an inestimable position. It is also contended that in his best moments he was a fine sublimity 'not even surpassed by Milton.'

As a critic of general poetry, and especially as that of Shakespeare, he stands supreme In the criticism of non poetical subjects as well he was not a whit lagging behind and is reputed to be one of the most suggestive of critics of political questions. His famous book 'Literary Remains' is an elegant display of his superior power.

He was also a deliberate political theorist and belonged to the school of Burke. At first he vehemently opposed the policy of Pitt but later on his outlook changed and he became reconciled.

It is, however, in philosophy that he leads. He was a true lover of light and eagerly desired that all philosophical investigation should be carried out in an independent spirit The influence he exerted in inspiring and stimulating testifies to the greatness of the service he rendered to philosophy. His reputation as a philosopher no doubt has suffered a good deal of diminution but still it occupies a considerable place in the hearts of the real seekers of truth. He started a new school in which he taught philosophy and religion and among those who owe their development of speculative capacity to this new institution was Hazlitt. The writings of Coleridge, especially those devoted to religion have, to a large extent, modified the ideas and thoughts of the people.

Sometimes he indulged in play-writing as well, but in this path his effort were not awarded with success. His dramas, though comprise much material suitable for quotation, contain nothing as a story. It was only here that his creative imagination betrayed him.

time, could not totally dispell the attacks of rheumatism which he had incurred upon himself so to say, by one act of foolhardiness, in his boyhood. In the biting chill of a winter morning he had attempted to swim scross the river of his own village with the simple motive of making an adventurous achievement This resulted in an immediate attack of rheumatism.

He was also a regular consumer of opium. He had acquired this bad habit in his early college and which produced a bad effect upon his already ruined health.

Besides these physical maladies he suffered from lack of financial resources as well. Indeed it is a fact that in this respect he was greatly helped by Southey and Sir Beaumont, but their helps only proved a mote in the face of his ever growing need When both poetry and prose failed to fill his pocket he took to lecturing and delivered a series of vivacious lectures under the auspices of the various colleges and societies. They were throughout successful. But it was not the matter but manner which revealed the nature and the genius of the orator.

His outward appearance was very awkward. Dorothy Wordsworth has depicted a beatiful portrait of his external bearing and speaks of him as possessing dominant nose, wry face, wide mouth and high chin. But all these affected not a jot the hearts of his admirers and visitors.

He was a man of easy temper and amicable disposition, and besides, there lay in him a natural attractiveness, something which kept all those who met him spellbound.

He was a garrulous sort of person and would go on chatting unceasingly for hours and hours together. But the words that slipped out of his lips were no rambles. He exercised an extraordinary influence in his discourse. This is why 'many of the most remarkable among the younger men of that period resorted to Highgate (the place where he lived) as the shrine of an oracle.' It is also said that since Sammuel Johnson there has been no such power in England.

He married Sara Fricker ; but this union soon turned into a life of woe and misery. The forward temper of his wife combined with the pecuniary want depressed him very much. But the deep waters of his high intellect were not easily stirred. Ripples on the surface left the depth unmoved. Still it cannot be argued with vehemence that it was altogether without some effect. His intellectual capacities became wane and were on the eve of total collapse. Then occurred his reunion with his wife, and to gether they passed the remaining days of life, sharing each other's joys and sorrows till Coleridge died on the 25th of July, 1834,

# APPRECIATION OF COLERIDGE

BY

S. Moinul Ahsan.

*Class XII. B. 2.*

In appreciating the life or work of a man we should, under all circumstances, shun the allure ments of prodigous elevation , for, it both wraps up the man in mystery and keeps us in dire ignorance about his real worth or status. It is possible that our attempts at accuracy and precision may be foiled but still we should at least try if we actually cannot, to abide by this rule, the transgression of which is considered a flagrant violation of the law of criticism.

But there are persons, or rather personalities, in whom qualifications so abound that appreciative words, piled up as they be, fail to give adequate expression to their merits. Samuel Taylor Coleridge claims rank among them.

Born on the 21st of October, 1772, at Devon, Coleridge received a desultory sort of education. He kept constantly changing his school and never settled in one, which produced a sinister effect upon his early education. From his very boyhood he had a strong bent of mind towards versification. With the lapse of time this celestial fire began to burn in him more and more fiercely and he began to feel in himself a growing imaginative impulse. But it was not before he came in close contact with William and Dorothy Wordsworth that the full realization dawned.

He declares his first inspiration for versification to be due to his perusal of Bowle's sonnets. But a deeper study reveals that it is probably to Gray that he owes more. The lesson of sentiment and poetry of affection he received from Cowper. But the real awakening of genius which is an indispensable requisite for a poet, he owes to Wordsworth.

In the year 1828 he went to Germany and took admission in the University of Gottingen. For four months of eager studentship he worked with a will at German literature, laying the foundation, of his after work as a critic, theologian and metaphysician, and in later years did more than any one to learn English philosophy, literature and theology with the sublime spirit of Germany. After he had crossed the age of thirty he became preoccupied with metaphysical speculations. But here also he upheld his glory. Whatever land he traversed he traversed it masterly.

But like Stevenson in the midst of his literary activities he kept constantly waging wars against disease, which in the later stage of his life became almost a second nature with him. In his youth he was very fond of pedestrian trips and would go out with friends on long walking excursions. But these and other physical exercises, though kept him in condition for some

This state of things without the least moderation lasted till four o'clock. Then the rain ceased and the sun burst out again and slowly the clouds vanished away. The sky was lit up with the radiant glow of red clouds bordering the western horizon. A few fleecy clouds were floating on the surface of the sky. A damp but refreshing air was blowing, leaves were fluttering, and trees were dancing and small birds were chirping and singing. Thus they all joined in a melody of nature. The ground was still flooded every where and water was fast flowing. The river Gomti was seen swelling every minute with the muddy rain water. She, unweildy as it had become, ran through cutting right and left, moaning, roaring and foaming.

Now the sun bade us good-bye and sank to rest. With it I also went to bed after having taken my meal. This is one of the very best and interesting events of my life. This was for the first time that I enjoyed the company of the children of Oxygen and Hydrogen so well. It was a good rainy day: indeed the best I ever enjoyed. It was good from every viewpoint: landscapes, breezes, thunder, lightning and kissing of its bank by the pool ripples, and all these were very well enjoyed too. I take the same delight in them even now when I review and picture them to my mind.

a brook could be seen. I approached to cross it, but its hideous roars and painful moanings did not give me courage enough to attempt it. I could not wait for it to subside for it seemed as if the rain would never cease.

So I wandered along its bank for a long time to find some ford whereby to gain the other side, but invain. To reach home I must cross it at any cost. Therefore I threw myself into it desperately. I knew but very little of swimming, thanks God that I came out safely. It was ten and the rain mas falling with the same vigour but I hurried on. My clothes were all wet and I was shivering like anything. I was nearing home and now I began to be troubled by a new thought; how was I to remove the suspicions and doubts of my relatives which were apt to creep in their hearts I was confident that all would be anxious about me and every body must naturally have formed his own opinion about my sudden and not the least expected disappearance. Nevertheless I reached home quite spent up and worn out at about noon. I was not wrong in fearing my elders for I was the target of their reproach the moment I entered the house. However I changed my clothes and wrapped up in a blanket took my station before a fire. Food was served and I was summoned to meal. The long rough walking and the severity of the weather had very much sharpened my apetite and I swallowed up a good deal of the food. After I had done the lunch I was hurled down with destructive criticism. I told them all what had passed and succeeded with great difficulty in assuring them of what had actually happened.

It was twelve o'clock of the day and coming out of the room I found the sun up at its zenith. The clouds had moved away from it, and there were other gaps here and there as well. The rain had ceased, the wind fallen and the roar of thunder and flares of lightning were also dulled and dead. It was scorching sun shine with shades here and there. Now one place was in the shade, now it came into the sun and another went into obscurity. The view was a beautiful one indeed.

A little while after tiny water drops began to fall. The spray during the sunshine exhibited a good scene in the excellent landscape. Above all was the appearance of a rainbow in the eastern sky with its beautiful seven colours. It was followed by violent rush of winds and clouds and big pearl-like rain drops. The sight became very threatening. The same darkness, same thunder, same lightning recommenced and the strife of the elements followed. The rain began to fall again and in no less earnest. Thunder was roaring so pitilessly that we had to put our fingers in our ears in order to prevent them from shock. The lightning came in blinding flares dazzling every eye.

yet standing in a suspense whether to proceed farther or not when looking towards the sky I discovered two huge banks of black cloud, one opposite the other, peeping through the horizon. Now I hastened back home. A faint rumbling sound was heard and the enormous clouds which were stationary only a few minutes back were now beginning to move and a few small patches of them were seen scurrying along and join the masses. The wind blew, it grew very furious and the two troops of cloud headed and ordered by Colonel lightning and Sergeant thunder marched to begin the battle. Very soon the court of moon was withdrawn and his dominion was converted into a battle-field. The clouds shot off quickly with the muttering of thunder and gave battle. There was great bloodshed, but these red clouds soon disappeared and darkness prevailed. There was no separate cloud to be seen now; but one single black dense mass covering all the sky. The gloom was so intense that nothing could be seen except darkness. I was very much terrified and flew back homeward. Fearing rainfall I was running as fast as I could. But my speed was very poor because of two reasons : one being the force of wind and the other that the way could not be discovered but for the timely light of the lightning flashes. The thunder grew unbearable and it seemed as if the sky will be smashed down and fall. The rattle of thunder was attended with terrible lightning. I had not succeeded in going very far off when every now and then big drops of rain began to fall. They were followed by violent shower. I ran up to a yonder tree to take shelter behind it.

I was not long before the water made its way there and I had to cling to the tree. Despite all my attempts I was drenched. At this moment I remembered that they say that lightning very often strikes trees. The instant this thought entered my mind I left the tree and resumed my running, wet and shivering as I was It was furiously raining and blowing very hard. The ground before me, when lit up by lightning flashes looked like a shallow lake stretched to the farthest reach of eye. I was running in kneedeep water, flowing like a stream. I found it very difficult to run in water and hence began to walk. The storm had not decreased, but it had increased on the contrary: the deafening thunder roared ceaselessly attended with continued flare of blinding lightning.

But now objects had begun to be faintly seen and so I concluded that it was morning and looked up the watch with the help of lightning to test the accuracy of my conjecture. It was seven o'clock now. Though the day had long dawned but I could hardly see things at a distance for the rain was pourcing in torrents. Very soon a loud rushing of water was audible and on close observation

# "RAINY DAY."

BY

**Shamsul Islam Siddiqi,**

*Class X. B.*

One winter night in a dream I saw my long-offended friend who is dearest and nearest to my heart standing before me. I heard him say some such things that disturbed me from my sleep and I opened my eyes. I got up and looked around with broad dilated eyes to entertain my heart, but to my utter disappointment I found it to be only a dream. I lay down again to sleep; but sleep it would not come. I tried to forget the dream, endeavoured to console my dejected heart and strove to divert my attention, but the thought of my friend prevailed and all my attempts against it proved a failure. My anxiety was great and untold, I was praying for the dawn when the clock struck one. It made my heart sink within me. This state did not end here, but troublesome thoughts took possession of my heart and pained me more and more. At last I was obliged to leave the bed. I was out of myself and having dressed I set out aimlessly.

It was a beautiful moonlit night and the grass was sparkling all over with tiny dew-drops. The sky was spangled with bright shining stars. It was a full moon. The moon and the twilights were playing on the world in an embrace. It was a splendid scene to see the light filtering through the trees. A cool night breeze was blowing lustily. Plants were waving to and fro in a state of joyful frenzy, trees were also nodding in ecstasy. In short all nature was deeply busy in prayer to its creator, the Almighty God.

Another person would have enjoyed this sight very well, but to me, unhappy creature it was nothing: I was transported to another world. Though the light of the nightly monarch and his retainers served as a guide, but I was blind to it all. I did not know where I was and where I was going. I was hurrying along drowned in thoughts when all of a sudden a shade passed over the vast expanse before my eyes. This occurrence startled me and I found that the bride of heaven had thrown a fine thin veil over her beautiful shining face. A beautiful reddish cloud had concealed the face of the mistress of heaven. As there was nothing curious about it so I resumed my way thinking that it would clear away very soon. I had not gone very far off when I found small feathery clouds floating on the surface of the sky. This sight confounded me and I hesitated to proceed. I turned to my watch and to my astonishment it was four by it. To my dismay I found that I had gone some ten miles off. The breeze had ceased, not a leaf did stir, all was silent and still. I was

I swear that, even if I have to hunt the world round, I will find that man, and even if he be my brother, I'll kill him, spit upon him, and kick his body and – "

"What are you saying." said Sakina, " Don't you trust me "

"My angel, my star" he said and drew her again to his side.

"Ever, Ever, I'll trust you" And his gaze fell upon Byron's verse, which was on the table "Deciet, thy name is woman" it read.

He stared at it, and Sakina also stared, " Do you believe it." she said "No" he answered, and tearing it out of the book he threw it into the waste paper basket.

"Sakina! you are mine, Sakina! Sakina."

He turned to grasp her, but Sakina had fled.

## CHAPTER IV.

### Destiny.

In the sweet company of Sakina time fled quickly, from June, Sept. made its appearance and time had come for Asaf to go and appear in his examination at Delhi.

"Sakina, to-morrow I go to Delhi if good luck follows me I hope to do well in the selection, and come back in a fortnight with my brother Zaheer." Said Asaf.

"Ah! you're going," she said with a slight tremor in her voice as she lifted her head suddenly out of the knitting she was doing, "Be assured that Sakina's prayers go with you, and with them goes Sakina's heart."

"Then with Sakina's prayers I will come out successful, go to England become a Royal Engineer, and come back to claim my bride who will be waiting for me."

The next day Asaf left Murree.

(*To be continued.*)

sickness, his trip to the hills, and while in the middle of his thoughts the girl entered carrying the bottle of medicine.

He now understood everything; the girl before him was the girl he had seen when he awoke, and she was his cousin.

Their eyes met for an instant Cupid had shot another of his deadly arrows.

Asaf fell back, groaned and became unconscious, "Asaf! Asaf, my Asaf" pleaded the girl, he did not move, she knelt down beside him and kissed him on the forehead. His eye-lids shook, his mouth quivered, the warmth of the kiss the ointment of Cupid's wound, woke him.

Modesty flushed with pride of her sex, forced the girl to another hasty retreat.

Asaf got up, he saw her fleeting body, he understood that love for his cousin, love for the girl, love for his love had awakened in him, "My Sakina" he said, and fell asleep.

## CHAPTER III.

### 'Fate or Destiny.

The love of these two youngsters had ripened, Asaf with the sweet care of Sakina soon grew well, he regained his health steadily, and surely. One evening Asaf and Sakina were sitting on the bed playing chess. Asaf found Sakina's Queen in a fix and in the next move he could kill it, "Now my Queen," he said, "I will capture a Queen, that queen is you as sure as I'm going to take your Queen."

"Not so quick, brother," she said and with a move of a horse she check-mated him.

"A bad omen" exclaimed Zeenab the maid. "A horse-man will come between you both, and will steal your love."

"What! are you saying?" thundered Asaf, "who can come between us, don't you now the fair Sakina is bethrothed to me. Go you bird of ill omen." The girl humbled left the room. Asaf looked at Sakina, and Sakina looked at Asaf, "can anything come between us" he said.

"Death" she answered.

"Can any horse-man steal you from me" he questioned.

"The Lord of Death," she answered.

"Then" exclaimed Asaf, "you are mine, mine, my very own."

Till death do us apart" put in Sakina.

Their hands met, Asaf pressed her hands to his lips, then drawing her to his side he kissed her on the lips.

His eyes wandered round the room and stopped on the chess board, his king and her knight met his gaze.

"And," he swore, "If any do steal you from me, then by God

had occurred that Asaf the elder brother fell sick, for full three months he lay in bed, and then after that period he recovered but on account of his weakness was forced to go to a hill station for a change.

"Lucky fellow brother, to go to the hills," said Zahir.

"What luck, missed luck," replied Asaf, "If this is what you call luck, then I wonder what is bad luck."

"I will follow you in about a month, and then we will have some fun" assured Zahir.

3 O'clock that evening Asaf left Aligarh.

Two days' later, we see him being carried in a "DANDE" to his Aunt's house in Murree.

After a weary ride he arrived at his destination, but not in his senses, after the extreme heat of Aligarh, the evening of Murree made him feel funny, his head began to swim and he fell back on his pillow unconscious. His servant became frightened he did not know what had happened to his master, and in this attitude the party reached the house.

"Asaf Sahib's dead" lamented the servant.

"What? what are you saying?" thundered a sweet voice through the chicks of the verandah, "Miriam, Zeenab, carry the boy in."

The two servant girls carried the unconscious boy into the room.

Sakina the sweet cousin of Asaf put him to bed and sent for the doctor.

The doctor came and went as he had very little hope for the patient.

For full three days Asaf lay unconscious, at last he opened his eyes, and what did he behold, his head was lying in the lap of a girl between sweet sixteen and eighteen years of age.

"Ay! oh! What?" he exclaimed "Silence" ordered the girl" the doctor has given strict orders that you should not excite yourself."

"But? Where?, Who?" he pleaded and fell back aghast on his pillow. Love had conquered, his inquisitiveness, love for this unknown girl.

"Woman," he muttered, "all must love thee who behold thee."

Then the maiden getting up fled away from the room. "Girl! oh! angel" shouted Asaf, "come, come?"

"Why Aunt?" he said getting up "Who has come in; where am I?" "Oh yes" I remember he carried on, "I think this is Murree." "That's it my boy," answered the dame, "Now that's a good boy lie down," I will send you your medicine through your cousin Sakina.' So saying she left the room then his thoughts came back. his

# "STOLEN LOVE."

BY

By Tzaheer Kureishy, X Class.

## CHAPTER I.

### "The folly of youth."

It was a dreadful hot summer that Aligarh was having in the year 1940.

The sun was beating its rays down upon a large bungalow, it was mind-day, and under the shade of a spreading *neem* tree, two youths were sitting, the elder one, stern, tall and rigid was laughing heartily in his chair, while the younger one cracked jokes at the expense of a gypsy girl who came a-begging there.

"Sahibs," said the girl, "Why do you laugh at me, is'nt it enough that God has made me poor that you should also mock at me? Oh! God, may God bless thee both," she ended.

"I say Zahir," said the elder, "give her a copper, and show her the way out."

Zahir got up, and thrust his hand into his pocket and pulled out an anna, "Here take this," he said, "and so saying he gave her the anna, the girl shuddered and stepped back a pace, the coin fell on to the ground. "Why! how do you threaten Zahir." "Your hand, Oh! Lord bless you," she uttered. "My hand," exclaimed Zahir, "Why, what's wrong." The girl took his hand, "Your fate," she read, "is entangled with a girl whose love you'll steal, and so will God steal your life."

She turned round, fetched up the coin and fled away.

Zahir dumb founded and bewildered turned toward's his brother with a questioning look, "To Hell!" shouted Asaf, "all rot, some bogus palmistry." So saying he laughed, and not helping himself Zahir also laughed. Neither knew how far the gypsy's words would come true and fate had woven a grim adventure for both these youngmen.

"Love" laughed Zahir, "Is the last thing I would ever think of, and still to think I would steel a love." "Come," said Asaf, "let us make a treaty between us, that who so-ever goes to England first, the other man should look after his fiance if any." "Agreed, agre'd" exclaimed Zahir, upon which they both shook hands solemnly. "Come on boys" came the voice from the bungalow, "tiffin is ready."

The boys got up and went to dinner.

They had acted the first scene in the drama of their life and love.

## CHAPTER II.

### "When love calls."

It was two years after the scene which was enacted in the garden

Than the great tide that treads the shifting shore,
Strewing fresh wreckage gathered in the gales ;

Pity me that the heart is slow to learn
What the swift mind beholds at every turn.

*　　　*　　　*

Euclid alone has looked on Beauty bare.
Let all who prate of Beauty hold their peace,
And lay them prone upon earth and cease
To ponder on themselves, the while they stare

At nothing, intricately drawn nowhere
In shapes of shifting lineage ; let geese
Gabble and hiss, but heroes seek release
From dusty bondage into luminous air.

O blinding hour, O holy, terrible day,
When first the shaft into his vision shone
Of light anatomized ! Euclid alone
Has looked on Beauty bare. Fortunate they

Who, though once only and then but far away,
Have heard her massive sandal set on stone.

In such a way that the extremest band
Of brittle seaweed will escape my door
But by a yard or two ; and nevermore
Shall I return to take you by the hand ;

I shall be gone to what I understand,
And happier than I ever was before.
The love that stood a moment in your eyes,
The words that a moment on your tongue,

Are one with all that in a moment dies.
A little under-said and over-sung.
But I shall find the sullen rocks and skies
Unchanged from what they were when I was young.

* * *

What lips my lips have kissed, and where, and why,
I have forgotten, and what arms have lain
Under my head till morning ; but the rain
Is full of ghosts to-night, that tap and sigh

Upon the glass and listen for reply,
And in my heart there stirs a quiet pain
For unremembered lads that not again
Will turn to me at midnight with a cry

Thus in the winter stands the lonely tree,
Nor knows what birds have vanished one by one,
Yet knows its boughs more silent than before :
I cannot say what loves have come and gone,

I only know that summer sang in me
A little while, that in me sings no more.

* * *

Pity me not because the light of day
At close of day no longer walks the sky ;
Pity me not for beauties passed away
From field and thicket as the year goes by :

Pity me not the waning of the moon,
Nor that the ebbing tide goes out to sea,
Not that a man's desire is hushed so soon,
And you no longer look with love on me.

This have I known always: Love is no more
Than the wide blossom which the wind assails,

Wherefore I say: O love, as summer goes,
I must be gone steal forth with silent drums,
That you may hail anew the bird and rose
When I come back to you, as summer comes.
Else will you seek, at some not distant time,
Even your summer another clime.

## THE CAIRN.

When I think of the little children learning
In all the schools of the world,
Learning in Danish, learning in Japanese
That two and two are four, and where the river of the world

Rise, and the names of the mountaints and the principal cities,
My heart breaks.
Come up, children! Toss your little stones gaily
On the great cairn of Knowledge!

(Where lies what Euclid knew, a little gray stone,
What Plato, what Pascal, what Galileo:
Little gray stones, little gray stones on a cairn.)
Tell me, what is the name of the highest mountain?

Name me a crater of fire! a peak of snow?
Name me the mountains on the moon!
But the name of the mountain that you climb all day,
Ask not your teacher that.

* * * *

That Love at length should find me out and bring
This fierce and trivial brow unto the dust,
Is, after all, I must confess, but just;
There is a subtle beauty in this thing,

A wry perfection; wherefore now let sing
All voices how into my throat is thrust,
Unwelcome as Death's own, Love's bitter crust,
All criers proclaim it, and all steeples ring.

This being done, there let the matter rest,
What more remains is neither here nor there.
That you require me not is plain to see;
Myself your slave herein have I confessed;

Thus far, indeed, the world may mock at me;
But if I suffer, it is my own affair.

I shall go back again to the bleak shore
And build a little shanty on the sand.

Year be springing or year be falling,
The bark will drip and the birds be calling.
There's much that's fine to see and hear
In the spring of a year, in the fall of a year.
'Tis not love's going hurts my days,
But that it went in little ways.

## DEPARTURE.

It's little I care what path I take,
And where it leads it's little I care:
But out of this house, lest my heart break,
I must go, and off somewhere.

It's little I know what's in my heart,
What's in my mind it's little I know,
But there's that in me must up and start,
And it's little I care where my feet go.

I wish I could walk for a day and a night,
And find me at dawn in a desolate place
With never the rut of a road in sight,
Nor the roof of a house nor the eyes of a face.

I wish I could walk till my blood should spout,
And drop me, never to stir again,
On a shore that is wide, for the tide is out,
And the weedy rocks are bare to the rain.

But dump or dock, where the path I take
Brings up, it's little enough I care;
And it's little I'd mind the fuss they'll make,
Huddled dead in a ditch somewhere.

"Is something the matter, dear" she said,
"That you sit at your work so silently?"
"No, mother, no, 'twas a knot in the thread.
There goes the kettle, I'll make the tea."

* * *

I know I am but summer to your heart,
And not the full four seasons of the year;
And you must welcome from another part
Such noble moods as are not mine, my dear.

No gracious weight of golden fruits to sell
Have I, nor any wish and wintry thing;
And I have loved you all to long and well
To carry still the high sweet breast of Spring.

And a-marking in the moss some funny little saying,
That would mean just the opposite of all that he was praying !

He taught me the holy talk of Vesper and of Matin,
He heard me my Greek and he heard me my Latin,
He blessed me and crossed me to keep my soul from evil,
And we watched him out of sight, and we conjured up the devil!

Oh, the things I haven't seen and the things I haven't known,
What with hedges and ditches till after I was grown,
And yanked both ways by my mother and my father,
With a 'which would you better?' and a 'What would you rather?'

With him for a sire and her for a dam,
What should I be but just what I am?

## SCRUB

If I grow bitterly,
Like a gnarled and stunted tree,
Bearing harshly of my youth
Puckered fruit that sears the mouth;

If I make of my drawn boughs,
An inhospitable house,
Out of which I never pry
Towards the water and the sky,

Under which I stand and hide
And hear the day go by outside;
It is that a wind too strong
Bent my back when I was young,

It is that I fear the rain
Lest it blister me again.

## THE SPRING AND THE FALL.

In the spring of the year, in the spring of the year.
I walked the road beside my dear.
The trees were black where the bark was wet.
I see them yet, in the spring of the year.

He broke me a bough of the blossoming peach.
That was out of the way and hard to reach.
In the fall of the year, in the fall of the year,
I walked the road beside my dear.

The rooks went up with a raucous trill.
I hear them still, in the fall of the year.
He laughed at all I dared to praise,
And broke my heart, in little ways.

How at the corner of this avenue
    And such a street so are the paper filled
A hurrying man who happened to be you
    At noon to-day had happened to be killed,
I should not cry aloud I could not cry
    Aloud, or wring my hands in such a place—
I should but watch the station lights rush by
    With a more careful interest on my face,
Or raise my eyes and read with greater care
Where to store furs and how to treat the hair.

* * *

How healthily their feet upon the floor
Strike down! There are no spirits, but a band
Of children, surely, leaping hand in hand
Into the air in groups of three and four,

Wearing their silken rags as if they wore
Leaves only and light grasses, or a strand
Of black elusive seaweed oozing sand,
And running hard as if along a shore.

I know how lost forever, and at length
How still these lovely tossing limb shall lie,
And the bright laughter and the panting breath;
And yet, before such beauty and such strength,

Once more, as always when the dance is high,
I am rebuked that I believe in death.

* * *

And if I loved you Wednesday,
Well what is that to you?
I do not leave you Thursday.
So much is true.

And why you come complaining
Is more than I can see
I loved you Wednesday—yes -but what
Is that to me?

## WHOSE MOTHER WAS A LEPERECAUN

In through the bushes, on any foggy day,
My Da would come a-swishing of the drops away,
With a prayer for my death and a groan for my birth,
A-mumbling of his beads for all that he was worth.

And there sit my Ma, her knees beneath her chin,
A-looking in his face and a-drinking of it in,

As stretcheth me apart,—Lord, I do fear
Thou'st made the world too beautiful this year;
My should is all but out of me,—let fall
No burning leaf; prithee, let no bird call.

## TAVERN.

I'll keep a little tavern
Below the high hill's crest,
Wherein all grey-eyed people
May set them down and rest.

There shall be plates a-plenty,
And mugs to melt the chill
Of all the grey-eyed people
Who happen up the hill.

There sound will sleep the traveller,
And dream his journey's end,
But I will rouse at midnight
The falling fire to tend.

Aye, 'tis a curious fancy –
But all the good I know
Was taught me out of two grey eyes
A long time ago.

## ASHES OF LIFE.

Love has gone and left me and the days are all alike;
Eat I must, and sleep I will,—and would that night were here!
But ah!—to lie awake and hear the slow hours strike!
Would that it were day again! with twilight near!

Love has gone and left me and I dont't know what to do;
This or that or what you will is all the same to me;
But all the things that I begin I leave before I'm through,—
There's little use in anything as far as I can see.

Love has gone and left me,—and the neighbours knock and borrow,
And life goes on for ever like the gnawing of a mouse,—
And to-morrow and to-morrow and to-morrow and to-morrow
There's this little street and this little house.

* * * * *

If I should learn, in some quite casual way,
That you were gone, not to return again –
Read from a back-page of a paper, say,
Held by a neighbour in a subway train,

than ever before. Miss Millay expressed this conflict strikingly. As the Times says, "In no other regard, indeed, is she more apart from or more above most of her contemporaries of sex, race or language than in her penetrating grasp and poignant expression of this philosophical problem."

Love is the most considerable subject of poetry in the West. Western poets as a whole write as if nothing in the world were so important as women. But nearly all the leading love poets have heretofore been men who have dwelt on love and woman from the man's standpoint. Since Miss Millay is porbably the most original love poet of her generation and country, the traditional situation is reversed. This reversal may not be a mere isolated phenomenon, but it may rather be prophetic of American literature in general. Some critics of that civilization say they see such a possiblility. In this event, Miss Millay's historical position might be nothing less than epoch-making.

But that as it may, the woman's heart's quest ends in defeat, according to Miss Millay, and the subject of her poetry leads up to her own heart's apprehension of this fact. The progress of her poetry is the stages through which her heart has passed. The first stage was ecstacy, then the shock from credulity into disillusionment, then acceptance of satisfaction from life only, in precarious moments, then the development of thought through cynicism, leading to bitter-sweet aloofness, and investing even moments of passion with a tinge of malignancy. Hence her poems of a "wry perfection" of "wise and wintry" things, hence her Spring Song of a spring which never arrived. The heart coming into full consciousness of its limitations, is tamed and defeated, but the head rises to look on beauty bare. Miss Millay's clarity follows her beyond the things of sense, and sings a hymn to Euclid of intellectual beauty, which ends on a note in which a kind of triumph may be heard.

## POEMS.

By

Edna St. Vincent Millay.

### GOD'S WORLD.

O world, I cannot hold thee close enough !
Thy winds, thy wide grey skies !
Thy mists, that roll and rise !
Thy woods, this autumn day, that ache and sag
And all but cry with colour ! That gaunt crag
To crush ! To lift the lean of that black bluff !
World, World, I cannot get thee close enough !
Long have I known a glory in it all,
        But never knew I this ;
        Here such a passion is

if not ship-wreck. Miss Millay seems to me to survive this test on the whole remarkably well. And the point is after all irrelevant to her aim. Undoubtedly her homely colloquial phrases widen her own audience, and it is no concern of hers if they get in the way every now and then of a poem's unqualified appreciation on the part of distant readers.

Even the distant reader can feel however, how these peoms must strike home to their own audience, and his disquiet over unreticence may well be put at rest by their outspop'enness which comes from such great courage.

Miss Millay has great courage, and in this no less than in other respects already mentioned she may be said to express more than herself as an individual, but also the temper of the modern young woman in the West. It is the courage that attempts to meet life fairly and squarely, without shirking and without wincing under its thrusts, without mawkishness or squeamishness in pretence that it is other than it is Such courage commands admiration, admiration all the greater on the part of the distant reader, whose seasoned contact with other and older civilizations incline him to the opinion, to which Miss Millay herself seems to have come, that she is fighting a losing fight against life and its conditions, that life cannot be lead in the way that the women in her books lead it without their coming to an impasse of cynicism, bitterness, and brooding upon death. In Miss Millay's individual case, and in this perhaps lies her chief contribution to modern philosophical poetry, this impasse is made endurable, even brightened by means of the intellect and of appreciation of the intellectual element in beauty.

Assuming the change to be chronological, now she deliberately turns aside from emotion recollected tranquility, from emotional reflection, from the dominant note on the thrill-full moment, from all this she turns aside into the path of creative thought. Here is the "naked thinking heart," and she who was but now the poet of Greenwich village of transitory emotion has, even now, become an intellectual poet, moving at times in a world of pure idea. No poem of hers is more significant in itself nor indicative of her aspiration than the one on Euclid. Lack of reticence and discrimination has here grown into precision where nothing is either "undersaid" nor "oversung." In this sonnet there is an ascetic hardness, an almost algebraical exactness, and without casuistry, because though her heart has been wounded it has not yet surrendered as her mind has advanced. The two meet, and out of the clash of intent heart and intent mind her best poetry is born.

The problem of reconciling life's realism with imaginative values, passion's fever with the serenity and disinterestedness of intelligence is no exclusively modern phenomenon, but it is probably more intense and almost certainly more general

This produces upon readers outside of America two contrary effects: the first, a two-fold shock; the second, an undivided admiration. This two-fold shock springs from more than two causes, but in the first part perhaps mainly from choice of subject, and in the second part, perhaps mainly from single words. It is, in its first part ethical or at least conventional; in its second, aesthetic. The disquiet is caused by lack of reticence and is prompted by the prejudice that young ladies should not write thus and that careful poets do not.

The first of these criticisms, Miss Millay would probably construe as praise, and she might tartly reply that it took no great perspicuity to discover that she was not a lady in the Victorian sense. She speaks with the voice of women, who, like men, are thrilled by the beauty of their lovers and are stung by desire; who know, however, that love does not always vibrate at the first high pitch, and so, too faithful to love to insist upon clinging to what has become half-love merely, relinquish without desperation. She does not speak in the name of forlorn maidens or of wives bereft, but in the name of women, who dare to take love at the flood, if it offers, and who, later, if it has passed, remember not without exultation, that they had what no coward could have had. No one of them weeps because she has given, no one of them because she has been betrayed. Miss Millay has given body and vesture to a sense of equality in love; to the demand by women that they be allowed to enter the world of adventure and experiment which men have long inhabited. But she is a poet who does not, like a feminist, argue for that equality. She takes it for granted exhibits it in action.'

On the contrary, Miss Millay could not well be reticent and be representative, as she certainly is, at the same time. Travellers returned from the West do not comment on the reticence of young women, or if so, it is on the conspicuousness of its absence. Such a spokesman of her time and sex as Miss Millay, is spokesman by virtue of the fact that she is so out spoken.

The question of lack of reticence in and as an artist is another matter, and Miss Millay has been accused, especially in her early work, of lack of patience and of discrimination. The point at issue is how far daily prose can be incorporated into the body of a poem, and, speaking from the point of view of the distant reader, how far it can stand exportation.

Poets are of a given time and space, and none can survive a journey without at least some loss. This truism is known of the ravages of time and the verdict of posterity It is not perhaps so generally recognized that geographical distance effects, like posterity, a sifting of the local and temporary ingredient in literature, and that the work of no poet but doth suffer from a long voyage, a sea-change,

globe-trotter, Miss Millay is a product of America, and her most obvious claim on the attention of distant readers is that she has given utterance to, and at her best with distinction to the present-day temper of a phase of the temper of young American womanhood: or, at least she corroborates an impression of American youth of her sex which the faraway reader gets from many newspapers, magazines and novels of to-day or yesterday.

Miss Millay, to begin with, is a poet or rather the poet of Greenwich Village, which is roughly New York's counterpart to the Latin Quarter of Paris: in other words it is a symbol for Bohemia. And just as a half century ago the author of La Vie de Boheme, although he falsified and sentimentalized it, helped put the Latin Quarter on the map of the world's imagination, so Miss Millay, more briefly, and more truly and without sentimentality has indicated what a New York's "Village" stands for, that mythical village "where according to the popular legend art and mirth flourish without a care, far from the stupid duties of human life." "No one so well as Miss Millay," says Mr. Carl Van Doren in the Century, "has spoken with the accents credited to the village."

My candle burns at both ends ;
It will not last the night ;
But ah, my foes, and oh, my friends—
It gives a lovely light !

Thus she continues in "A Few Figs From Thistles." And she continues with impish songs and rakish ballads to laugh at love. There is a singing woman "Whose mother was a leprecaun, whose father was a friar ."

With him for a sire and her for a dame
What should I be but just what I am ?

Speaking in this manner, Greenwich Village seems a long way from Concord, heart of the old tradition, the classic village of American literature, where any such mixtured of leprecaun and friar would have been kept as close a secret as possible, and conscience would have been set to the work of driving the leprecaun out. In Greenwich Village the friar is made to look a little droll, especially to the mother and daughter who conspire to have their fling behind his back.

This tincture of diablerie appears again and again in Miss Millay, and it may have some connection with what seems to be the most pronounced feature of her work—its unrestrained candor on the subject of love.

She has put by the mask under which other poets who were women, apparently afraid for the reputation of their sex. have spoken as if they were men. She has put by the posture of fidelity which women in poetry have been expected to assume.

# EDNA ST. VINCENT MILLAY.

BY

Dr. Lewis Chase, Department of English, Union College Schenectady, New York (U. S. A.).

IT was in the autumn of 1916, in the office of the Poetry Magazine, Chicago, that I first heard the name of Edna St. Vincent Millay. It was from the lips of Miss Harriet Monroe and Mrs Eunice Tietjens, and it was in reply to my question as to who were, in their opinion, the principal American poets of the day. In a list of fifteen—horses could not now drag from me the names of the others—which Mrs Tietjens typed to Miss Monroe's and to her own dictation—stood, next to the bottom, Miss Millay, with the comment "very young, but interesting."

What a prophecy that was, which might now be altered into "young, but very interesting." Young and interesting Miss Millay has remained all these years. To be sure she is now well in, though not well-advanced in the 'thirties,' (b. 1892), and perhaps the youngest generation regard her as old-fashioned, if not antiquated. But for the past five years she has been acclaimed as the foremost of the younger American women poets; and if the auctioneer's voice may be trusted, she is now at the height of her popularity. For we have received recent reports of first editions of her "A few Figs Thistles' fetching $ 150 (gold) under the hammer.

In 1916 she was still an undergraduate in Vassar College, but rumours of the advent of a new poet travel fast in her country, so, while unknown to the general public, she already had an expectant it small following from the Atlantic, that is Vassar, to the Pacific. In College she had stout champions, and some of the girls knew "Renascence" by heart. This poem, unfortunately too long to quote, was published in The Lyric Year, an Anthology in 1912. Other verses appear immediately in the magazines and in other anthologies,—three in a Book of Vassar Verse—1894-1916, and three in the Monroe-Henderson The New Poetry (1917). In the same year appeared the first book, Renascence and in Other Poems, followed in 1920 by a Few Figs from Thistles, Second April, 1921; Aria da Capo, 1921; Two Slatterns and a King, 1921; The Lamp and the Bell, 1921; The Harp Weaver and Other Poem, 1923. Some of these were plays, and Miss Millay has also written short stories. In 1922, she won the Pulitzer Prize "For the best volume of verse," and in 1924, fatigued after a reading tour and accompanied by her husband Mr. E J. Boissevain, she took for recuperation, what was announced as a "quiet" trip round the world, visiting Japan, China, India and Java.

A native of the state of Maine, a one-time resident of France, a



*King Behram "Pinning the hoof to the head of wild ass."*

The portrait has been taken from a very rare manuscript of Khamsa-i-Nizami, owned by the Subhanullah Khan Library, Muslim

## CONTENTS





# The Intermediate College Magazine



"EDNA ST. VINCENT MILLAY".—Dr. LEWIS CHASE.

# The Intermediate College Magazine.



M. U. INTERMEDIATE COLLEGE, ALIGARH.

MAY, 1929

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# مُقدّمہ

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہی عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

امسال مشاعرے کے ختم ہوتے ہی میری نظر سے دو تحریریں گزریں۔ جن میں ایک تحریر بخصوصیت تعلیم گاہوں کی بزمِ مشاعرہ کے متعلق تھی، اور دوسری تحریر ایک مبسوط تالیف میں پائی گئی جس میں شعر و شاعری کی مفصل بحث کی گئی ہی اور اسی ضمن میں جا بجا ایسے فوائد لکھے گئے ہیں جن سے شعر کی ماہیت پر کافی روشنی پڑتی ہی۔

با وصف اعتراف نا قابلیت (جو بالکل حقیقت پر مبنی ہی) مجھے اس کی خواہش رہتی ہی کہ جس طرح اور جس عنوان سے ممکن ہو اُردو ادب کی عموماً اور اُردو شاعری کی خصوصاً اصلاح ہوتی رہے۔ اور چوں کہ اس خدمت کی انجام دہی کے لیئے وہ اہلِ ادب جن کو اس خدمت کا جائز استحقاق حاصل ہی کسی مجبوری و معذوری سے اپنا عزیز وقت عائد صرف نہیں کرتے بلکہ تفنناً اور وہ بھی اتفاقیہ چند صفحوں کے مقالوں یا تقریروں سے زیادہ ادائے فرض کا ثبوت نہیں دیتے اس لیے اپنے ذوقِ ناتمام کو باوجود تشنہ کامی کے جس حیثیت سے ہو سکتا ہی چنچل کیے رہتا ہوں۔

[illegible] اُردو کا فرض ادلیں یہی ہی کہ نوجوان طالبینِ علم اور نو مشق ناظمین فن کے لیئے اس تفریح اور تفنن [illegible] [illegible] پڑھنے کا سامان کیا جائیں کہ ادبِ لطیف کی پُرانی [illegible] بغیر کسی [illegible] کے محفوظ رہیں اور جس قدر [illegible] پیدا ہو سکتے ہوں وہ سب [illegible] شدہ مرتّب صورتوں میں نظر آئیں [illegible] [illegible] [illegible] کی جاتی ہی [illegible]

[illegible]

یا یہ کہ اپنے استغنا اور عروجِ شہرت کی چکا چوند میں امتیاز و اعتنا کے احساس کو غائب کیے ہیں۔

اُردو زبان اپنی مرکزی حیثیت سے دہلی و لکھنؤ پر ضرور ناز کر سکتی ہے، لیکن جب مرکزی ناز بردار اتنے نازک مزاج بن جائیں کہ ان سے کیئے بات کرنا بھی بار ہو تو پھر غریب اُردو اس کس مپرسی میں دوسروں کا سہارا نہ ڈھونڈے تو کیا کرے۔ اِس حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ زندہ دلانِ پنجاب اپنی حیثیت سے زیادہ اُردو کی ہمت افزائی کر رہے ہیں۔ یہ خدمت و اشاعت خواہ تجارتی اُصول پر مانی جائے یا علمی رعایت و مناسبت سے۔ بہر حال اُس غفلت سے بدرجہا بہتر ہے جو دوسرے صوبوں میں عموماً اور ممالک متحدہ، بلکہ صاف الفاظ میں کیوں نہ کہا جائے کہ دہلی و لکھنؤ میں خصوصاً دیکھی جاتی ہے۔

اِس قضیے کو زیادہ بڑھانا منظور نہیں، فی الحال اتنے ہی اشاروں کو کافی سمجھ کر اُن دونوں تحریروں کو نقل کیا جاتا ہے جن سے مقدمے کا آغاز ہوا ہے۔ اُن کا اندراج یہاں اِس لیئے مناسب سمجھا گیا کہ اہلِ مذاق کے سامنے اُن غفلتوں کے جو اربابِ فن کی طرف سے برتی جاتی ہیں ایسے مصلحین و حامیانِ اُردو کی حقیقت بھی واضح ہو جائے جن کو اپنی اصابتِ رائے پر نہ صرف ناز ہے بلکہ چاہتے ہیں کہ دُنیا سراپا نیاز بن کر اُنھیں کی متبع ہو جائے۔

ملاحظہ ہو:۔

"میں دیکھتا ہوں کہ مشاعرے کی بدعت طبقۂ شعراء سے گزر کر اسکولوں، کالجوں اور مسلم یونیورسٹیوں میں بھی پہونچ گئی ہے اور شاید ہی کوئی سالانہ تقریب ایسی ہوتی ہو [illegible] ضروری نہ خیال کیا جاتا ہو۔ میرے خیال میں کم از کم [illegible] نتیجہ ہے اس [illegible] قسم کی [illegible] [illegible] وقت ہندوستان کی بڑی سے بڑی درسگاہیں [illegible] کے موقع پر کسی سنجیدہ و مفید مشغلے میں صرف [illegible] نزدیک مشاعرے سے زیادہ بہتر ہوگا [illegible]

شرکت کی دعوت مجھے دی تو میں نے اُن سے دریافت کیا کہ وہ کیوں نہیں کوئی اس سے زیادہ مفید صورت سالانہ اجتماع کی قرار دیتے۔ انھوں نے جواب دیا کہ مشاعرے سے اُن کا مقصود اُردو زبان کی ترقی اور ہندو طلبا میں اس کا ذوق پیدا کرنا ہے۔ مجھے اُن کے اس طفلانہ جواب پر بے اختیار ہنسی آگئی اور میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ان کے جواب کے دوسرے فقرے کی سیاسی اہمیت کو زائل نہ کرنے کے لیئے خاموش ہی رہوں تو بہتر ہے، لیکن میں یہ کہنے سے بہر حال باز نہ رہ سکا کہ "جب آپ خود ہندی بھاشا کے سیکھنے کا کوئی اقدام نہیں کرتے تو آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ ہندو طلبا سے یہ توقع رکھیں کہ وہ آپ کی زبان کی طرف متوجہ ہونگے۔"

تب مجھے افسوس معلوم ہوتا ہے کہ غریب طلبا مختلف مقامات پر خود جا جا کر شعرا کو دعوت دیتے ہیں، ان کے مصارف برداشت کرتے ہیں اور نتیجہ اس کا سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ جب یہ کرایہ لے کر جانے والے شعرا وہاں سے واپس آتے ہیں تو اُن کی برائیاں ہی بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غریب بسم اللہ کے گنبد میں زندگی بسر کرنے والے نوجوان کیا سمجھ سکتے ہیں کہ ہندوستان کس قدر عجیب و غریب چیز ہے اور اس کے اخلاق، نفسیات کے کتنے ناحل کردہ مسائل اپنے اندر پنہاں رکھتے ہیں۔"

ممکن ہے کہ اس مفروضہ اعلیٰ ذہنیت اور بادہ ہوائی خیال رفعت کو دیکھ کر علمی نگاہیں اور ناتجربہ کار طبیعتیں مرعوب ہو جائیں، اس لیئے ان خیالات پر رائے زنی کرنے سے پہلے وہ دوسری تحریر بھی درج کی جاتی ہے جو ایک مبسوط تالیف سے اخذ کی گئی ہے۔

"شعر عربی زبان کے بہت سے الفاظ کی طرح اپنی حقیقت آپ ظاہر کرتا ہے کہ موسیقی ہی شعر کا خمیر ہے [illegible]

اسی کا اثر جسم سے حرکات و سکنات، صوت و سکوت، ادا و نگاہ بن کر نکلتا ہے اور جذباتِ غیب کی تصویریں
ظہور کے آئینے میں دکھاتا ہے ۔۔۔۔۔ یہی احساس اثر در اثر ہو کر جذبات و واردات کا ایک سلسلۂ نامتناہی
پیدا کرتا چلا جاتا ہے اور ایک سے دوسرے تک متعدی ہوتا رہتا ہے ۔ مگر شعور کے مراتب ہوتے ہیں
متفاوت ۔ فطرۃً کوئی کم پاتا ہے کوئی زیادہ ۔ کمال شعور اگرچہ کسی خاص قوت کے کمال کو مستلزم نہیں
لیکن اس کا ظہور ہمیشہ نسبتہً کامل تر قوت کے ذریعے سے ہوتا ہے ۔ اکثر دیکھا ہے دو چار بے تکلف جوانوں
کی صحبت ہے، ایک ظریف المزاج موقع پا کر یاروں پر فقرہ چست کرتا ہے ۔ اثر سب پر ہوتا ہے، مگر ایک کا
ہاتھ چلتا ہے، دوسرے کی زبان ۔ ایک کھسیانا ہو کر رہ جاتا ہے، ایک بگڑ کر کڑی نگاہوں سے گھورنے
لگتا ہے ۔ بات ایک ہی تھی، احساس سب کو ہوا، انتقام کی کوشش بھی کم و بیش سب نے کی مگر اس کا ظہور ہر ایک
سے اسی قوت کے ذریعے سے ہوا ۔ جو فی الجملہ غالب تھی ۔ غرض شعور متعدد قوتوں کے کمال کے ساتھ جمع
ہوتا ہے، یہ فطرت ہے جیسی کسی کو اللہ نے دے دی ۔"

اب جہاں کمال شعور کے ساتھ کمال نطق و گویائی جمع ہے وہ شاعر ہے ۔ اسی لئے کہتے ہیں :-

" الشعراء تلامیذ الرحمٰن ۔ یعنی شاعری فطری ہے اللہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے ۔ اب شاعر کا وہ
کلام جو فرط شعور اور کمال گویائی کا نتیجہ ہو شعر ہے اور چونکہ وہ شعور و تاثیر کی تحریک سے وجود پاتا
اور تاثیر میں ڈوب کر نکلتا ہے سامع کے دل پر جا کر بیٹھتا اور جادو کا کام کرتا ہے ۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شعر اسی حد تک شعر ہے کہ شعور کا رنگ اثر غالب ہے، اپنی اصل
حقیقت سے دور نہ ہو ۔ یہی راز ہے کہ حدیث نبوی میں آیا ہے ۔ اِنَّ مِنَ الشِّعرِ لَحِکمَۃً وَّاِنَّ مِنَ البَیَانِ
لَسِحراً ۔ یعنی بیان (خطابت) اصل میں حکمت شعر صفت ہے، لیکن کبھی کبھی حدود شعر میں داخل ہو جاتا اور
سحر بن جاتا ہے اور کبھی کوئی شعر حدود خطابت میں آ جاتا ہے اور سحر سے حکمت ہو جاتا ہے کیونکہ خطابت
کا منتہائے کمال یہ ہے کہ حکمت ہو اور تاثیر میں جادو بن جائے ۔ سننے والا سنے اور مسحور ہو جائے
اور انتہائے کمال شعر کا یہ ہے کہ شعر اگرچہ فی نفسہٖ شعور و جذبات کا نتیجہ اور جادو ہے لیکن
[illegible]

کہ کلام انسانی کا یہی درجۂ کمال وہ بلند ترین نقطہ ہے جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا، اور جن کو نصیب بھی ہوتا ہے تو ہر وقت نہیں ہوتا۔"

پہلی تحریر دسمبر ۱۹۲۸ء کے نگار سے لی گئی ہے جس کا افتتاحیہ **ملاحظات** (جس کو بعض خوش فہم ملاخطات بھی پڑھتے ہیں) کے معجبانہ لقب سے معنون کیا جاتا ہے۔

دوسرا اقتباس مرآۃ الشعر مصنفہ مولوی عبد الرحمٰن صاحب پروفیسر دہلی یونیورسٹی سے اخذ کیا گیا ہے۔ ان دونوں مضامین کو بیک وقت پڑھ کر ایک غیر متعصب مبصر جن متضاد نتیجوں پر پہنچ سکتا ہے وہ اسی قسم کے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً حسب تحریر نگار:۔

(۱) مشاعرہ عموماً بلائے بدعت ہے اور خصوصاً تعلیم گاہوں کے لئے وبائے ہلاکت۔

(۲) کسی زبان کا کسی قوم میں ذوق پیدا کرنا طفلانہ حرکت ہے۔

(۳) ہندوستان کا شاعر عجیب و غریب چیز ہے اور اس کے اخلاق میں بہت سے نفسیات کے نا حل کردہ مسائل پوشیدہ ہیں۔

(۴) تعلیم گاہوں میں رقص و سرود کا جلسہ قائم کرنا مشاعرے سے بہتر اور مفید ہے۔

مرآۃ الشعر کا اقتباس حسب ذیل نتائج کا آئینہ بن سکتا ہے:۔

(۱) شعر معنیً اور لفظاً شعور سے متعلق ہے

(۲) فطرۃً ہر شخص بادۂ سخن سے بقدر ظرف کیف شعور حاصل کرتا ہے۔

(۳) شعرا کو کمال نطق و گویائی کی وجہ سے تلامیذ الرحمٰن کہتے ہیں

(۴) جس شاعری پر شعور کا رنگ و اثر غالب ہو وہ حکمت و ساحری ہے۔

مجھے ان دونوں تحریروں کے نتائج دکھانے کے بعد زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ یہ ایک مشاعرے کی تمہیدی روداد ہے نہ کوئی **مقدمۃ الکلام**۔ ہر ذی فہم اور صاحب شعور ان نتیجوں کو پڑھ کر ترک و اختیار کے متعلق ایک رائے قائم کر سکتا ہے۔

جس طرح مدیر نگار نے طلبا کی سیاسی اہمیت زائل نہ کرنے کے لئے خاموشی اختیار کی تھی اسی طرح مناسب

معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تخلص کی حرمت قائم رکھنے کے لئے (کیوں کہ وہ بھی ہندوستانی شاعر ہیں اور صرف شاعرانہ نام سے مشہور ہیں) سراپا نیاز بن کر شعرائے ہندوستان کے اخلاق اور اُن کی نفسیات کے نامکمل کردہ مسائل کو پنہاں رکھا جائے۔ البتہ مولانا کے اس ارشاد پر کہ "شعر گوئی اور شعر فہمی سے پہلے وہ سامان پیدا کیا جائے جو شعر کہنے اور سننے کا اہل بناتا ہے" بصد نیاز عرض کروں گا کہ چوں کہ جنابِ الاتمام لوازمِ شعر گوئی اور شعر فہمی کو بدرجۂ کمال مہیا فرما چکے ہیں۔ لہذا ہمارے آیندہ مشاعرے کی زینت بخشی کے لئے پہلا عملی قدم اُٹھانے کو مع ساز و سامان تیار رہیں، مگر اُسی کے ساتھ امیر خسرو کی زبان سے یہ دو شعر بھی سُن لیں:۔

نظم را مثلے تصور کن بذاتِ خود تمام | کاں نہ محتاجِ اصول و صوتِ خنیاگر بود
در کند مطرب بسے ہاں ہاں ہوں ہاں در سرود | چوں سخن نہ بود ہمہ بے معنی و ابتر بود

یہ اقتباسات زیبِ داستان بنانے کے لئے درج نہیں کئے گئے ہیں بلکہ منشائے اصلی یہ ہے کہ ہمارے نوجوان طالبانِ علم کو اپنے مذاقِ سخن کے سُدھارنے کا کافی موقع ملے اور وہ اہلِ فن کی اچھی بُری رائیں پڑھ کر ایسے نتیجے پر پہنچ سکیں جو اُن کے آیندہ مشاغلِ ادبی کے حق میں مفید ثابت ہو۔ کوئی اچھی چیز کسی ایک شخص کی ذاتی رائے سے بُری نہیں ہو سکتی بُرے کو اچھا اور اچھے کو بُرا کہنے والا فاترالعقل ہی ہو سکتا ہے۔ اگر محاسن میں معائب ملے ہوئے ہیں تو اُن کا تجزیہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ مختلف پہلوؤں سے متعدد اہلِ مذاق اور ماہرینِ فن کی تحقیقات پر نظر ڈالی جائے۔ خوبیوں سے خرابیوں کا دور کرنا اگر بہترین خدمت ہے تو استہزا و طعن و طنز سے یہ اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اس امر کے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ بعض انداز شاعری ناپسندیدہ ہیں (اور یہ معائب و محاسن تمام علوم و فنون جملہ معاملات و حالات میں کم و بیش پائے جا سکتے ہیں) لیکن بلا امتیاز سب پر یک قلم خطِ بطلان کھینچ دینا ادب اور فنونِ لطیفہ کی جائز خدمت نہیں ہو سکتی۔ جب کہ موجودہ نصابِ تعلیم اور اصولِ تربیت کی خرابی سے ادنیٰ قسم کی ذہنیت پیدا ہو رہی ہے تو پہلے اسی کے نابود کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی جاتی جہاں تک غور و خوض کیا جاتا ہے درس گاہوں میں ایسی انجمنوں کے قیام کی علتِ غائی یہی ہے کہ جن باتوں میں اصلاح کی ضرورت ہے ان کو اس طرح درست کیا جائے کہ پچھلی بگڑی ہوئی مجلسوں کے انداز پر (جن کا ملک عادی ہو رہا ہے) نئی سوسائٹیاں قائم کر کے بتایا جائے کہ اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے اُن میں اتنے اور ایسے نقائص تھے سو اب اس طرح اُن کے قائم مقام مفید انداز بروئے کار لائے جا رہے ہیں۔ یہ تعلیم بالمثال جیسی کارآمد و مفید و مؤثر ہو سکتی ہے۔ اہلِ نظر سے

پوشیدہ نہیں۔ اسی خیال کو مدِ نظر رکھ کر مذکورہ بالا اقتباسات اس تمہید میں مندرج کئے گئے ہیں اور یہی منصوبے ذہن نشین کرکے مشاعروں کا انعقاد درس گاہوں میں کیا جاتا ہے۔ اب دیکھنے اور سننے والوں کو اختیار ہے کہ وہ اُسے نقالی سمجھیں یا قوالی ؎

من آنچہ شرطِ بلاغ است با تو می گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر و خواہ ملال

ہماری پُرانی شاعری میں غزلوں کا سرمایہ اپنے مضامین کی یکسانیت کے ساتھ اتنا بڑھ گیا ہے کہ اب اس کے پڑھنے سے کوئی لطفِ ادب حاصل نہیں ہوتا۔ اصلاحِ مذاق کی خاطر اس افراط کو تفریط کی حد تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔ اسی لئے گزشتہ مشاعرے میں طرحی غزل کے ساتھ ایسے عنوانات نظم بھی شایع کئے گئے تھے جن سے شاعر کو مضامین میں تنوع اور خیالات میں وسعت پیدا کرنے کا موقع مل سکے۔ امسال گزشتہ مشاعرے کے مقابل میں ایسی نظموں کا عنصر غالب رہا جس کا ثبوت آیندہ صفحات دیں گے۔ افزایشِ ذوق کے لئے تمام ہندوستان کے انٹرمیڈیٹ کالجوں اور ہائی اسکولوں کے طالب علموں کا انعامی مقابلہ اس مشاعرے کا امتیازِ خصوصی تھا۔ اعلان کیا گیا تھا کہ عنوانات نظم میں سے کسی ایک عنوان پر جس طالب علم کی سب سے بہتر نظم ہوگی وہ اُس ٹرافی ( Trophy ) کا مستحق ہوگا جو نوابزادہ کیپٹن رشید الظفر خاں صاحب متعلم انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی کی طرف سے جناب عبدالمجید صاحب قریشی ایم اے پرنسپل اور جناب کیپٹن نوابزادہ سعید الظفر خاں صاحب (بھوپال) کے اسمارِ گرامی سے منسوب کرکے "قریشی سعید الظفر خاں ٹرافی" سے موسوم کی گئی ہے۔

اعلان کے مطابق ۱۰ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو بصدارت عالی جناب قریشی صاحب پرنسپل انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی میرس ہال میں مشاعرہ کا افتتاح ہوا۔ یونیورسٹی اور کالج و اسکول کے طالب علموں کے سوا معززارکین مثلاً پرو وائس چانسلر۔ ہیڈ ماسٹر اسکول مسلم یونیورسٹی اور لیڈران و پروفیسران اسٹاف بھی شامل تھے۔ نیز شہر کے اہلِ مذاق کافی تعداد میں موجود تھے۔ ہال کے تمام حصے نیچے سے اوپر تک سامعین سے بھرے ہوئے تھے۔ پہلی نشست میں جناب مولوی سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی۔ جناب مولوی عاشق حسین صاحب سیماب اکبرآبادی مع تلامذہ۔ جناب جگر مرادآبادی۔ جناب ملا رموزی و جناب مولوی ظفر علی صاحب آزاد اور بلند شہر و گنور کے بیرونی مہمان شریک تھے۔ حضور صدر کی افتتاحی تقریر کے بعد ۱۲ بجے

مشاعرہ شروع ہوکر ۱۲ بجے کے بعد ختم ہوا۔ اسی طرح ۹ ر دسمبر کو حسب معمول ۸ بجے کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔ آج کی نشست میں جناب مولوی شوکت علی خاں صاحب فانی بدایونی ۔ جناب مولوی کلب احمد صاحب مانی جائسی ۔ جناب پنڈت جگت موہن لال صاحب رواں ایم اے وکیل اناؤ ۔ جناب مولوی رضی احمد صاحب رضی بدایونی ۔ جناب مولوی باقر حسین صاحب وفا سیتاپوری اور بعض معززین آگرہ رونق افروز تھے ۔ آج کا مشاعرہ ۲ بجے رات کو ختم ہوا ۔ طرح کی غزلیں پہلے دن ختم ہو گئی تھیں، جو دو چار باقی رہ گئیں تھیں وہ آج ابتدائی وقت میں پڑھی گئیں ۔ اس کے بعد طالب علموں کے مقابلے کی نظمیں شروع ہوئیں بیرونی طالبان علم میں سے صرف دو طالب علم میرٹھ سے آئے تھے، باقی اپنے کالج کے طلبا تھے ۔ اُن سب کے نام یہ ہیں :۔

(۱) ظہیر الدین حسن تاج ۔ زبیری متعلم درجۂ ہشتم فیض عام ہائی اسکول میرٹھ ۔

(۲) یوسف حسن خاں متعلم جماعت دہم فیض عام ہائی اسکول میرٹھ ۔

(۳) عبد الحلیم خاں کوثر متعلم درجۂ نہم انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۴) محمد فیاض الحق ۔ اختر متعلم سکنڈ ایر " " " " " " " "

(۵) عبد اللہ حقانی ۔ آزاد ۔ " " " " " " " " " "

(۶) خواجہ عبد الواحد کریم لدھیانوی " " " " " " " " "

(۷) سید محمد عارف فاطمی متعلم فرسٹ ایر " " " " " "

دعوت نامہ میں مقابلے کی نظموں کے جانچنے کو جس کمیٹی کا اعلان کیا گیا تھا اُن میں سے حضراتِ ذیل شامل تھے ۔

مولانا حسرت صاحب موہانی ۔ سید سجاد حیدر صاحب یلدرم ۔ مولوی سید محفوظ علی صاحب بی اے بدایونی ۔ چودھری خوشی محمد صاحب ناظر ۔ پنڈت جگت موہن لال صاحب رواں ایم اے وکیل اناؤ ۔ مگر سوءِ اتفاق کہ مقدم الذکر اور موخر الذکر کے سوا دیگر حضرات تشریف نہ لاسکے اور مقدم الذکر بھی صرف پہلی رات کو شریک مشاعرہ ہو کر واپس چلے گئے کیوں کہ انھیں تاریخوں میں الہ آباد میں اکاڈمی کا جلسہ تھا جس میں مولانا حسرت اور سید سجاد حیدر صاحب یلدرم کو شرکت کرنی تھی ۔ سید محفوظ علی صاحب اور خوشی محمد صاحب ناظر بھی بعض مقامی اور عارضی موانع سے مجبور شرکت رہے ۔ چوں کہ یہ دونوں حضرات مشاہیر اہلِ قلم سے ہیں، اور ہماری استدعا پر جو خطوط انھوں نے بھیجے ہیں وہ دلچسپی اور دل کشی سے خالی نہیں، اس لئے بے موقع نہ ہوگا اگر اُن تحریروں کا اقتباس بطور یادگار درج کیا جائے ۔

## (۱) جواب مولوی سید محفوظ علی صاحب بی اے رئیس بدایوں

........ کل شام کی ڈاک سے جناب کا گرامی نامہ باعثِ عزت اور آج صبح کی ڈاک سے قریشی صاحب کا والانامہ موجب بہجت ہوا۔ کاش تعمیل ارشادِ عالی میں بدل وجان اور بسر وچشم حاضری کے قابل ہوتا۔ مگر افسوس کہ بالکل مجبور اور ملغاً معذور ہوں۔ قطع نظر ان امور کے کہ میں :-

(۱) پیرِ نحیف ہوں، اب مشکل ہی سے سفر کی ہمت پڑتی ہو۔

(۲) افسردہ خاطر ہوں کسی ہنگامے میں شرکت کو جی نہیں چاہتا۔

(۳) آج کل موسم کی سختی کے باعث نزلے زکام اور بخار میں مبتلا ہوں، اندیشہ ہو کہ طبیعت زیادہ خراب نہ ہو جائے۔

(۴) بدایوں میں آج کل انتخاب ممبری کی تقریب درپیش ہو۔ ممبری کو اگرچہ میں اپنی حالت سے بہت زیادہ اونچا مقام اور لہذا ناقابلِ حصول سمجھتا ہوں مگر بدقسمتی سے ایک سند اور تھوڑی سی اراضی کا برائے نام مالک ہونے کے باعث رائے دہندہ ہوں۔ جس حلقے میں رہتا ہوں اور جس میں زمینداری ہو وہاں سے مولوی ...... امیدوار ہیں۔ ۲۰ دسمبر کی صبح سے بدایوں میں اور ۱۰ دسمبر کی صبح سے داتا گنج میں رائے دہی کے پرچے پڑیں گے۔ مولوی ........ سے میرے دیرینہ مراسم ہیں۔ اُن کے علاوہ مولوی صاحب کے مددگاروں اور پیروکاروں میں بڑے بڑے ابرام والحاف والی ہستیاں ہیں مثلاً ......... لہذا اگر میں اس عرصہ میں شدِّ رحال کا قصد بھی کروں تو خطرہ ہو کہ یہ حضرات ریل کی پٹری پر لیٹ جائیں اور مجھ بدایوں سے ہلنے اور ہٹنے نہ دیں۔ اصل اور حقیقی واقعہ یہ ہو کہ ۹ دسمبر کی شام سے ۱۰ دسمبر کی شام تک میں بمقام داتا گنج موجود ہوں گا ......... لہذا اس عرصے میں وہاں سے غیر حاضری میرے اغراض کے منافی ہو اور چوں کہ خیر الرازقین نے زمیں داری ہی کو مرزق قرار دیا ہے۔ لہذا میں مجبور ہوں کہ اس محدود و مقرر زمانے میں داتا گنج ہی میں موجود رہوں۔"

## (۲) جواب چودھری خوشی محمد صاحب ناظر

........ سکریٹری مشاعرہ کا باقاعدہ خط اور جناب کا گرامی نامہ آیا۔ آپ سے ملاقات ہونے پر

جوانی تازہ اور حرارت بڑھ جاتی ہی۔ بخار کی نہیں بلکہ حرارت عزیزی کو ہیجان ہوجاتا ہی اس لئے میرا خود خیال تھا کہ دسمبر میں لطفِ صحبت اٹھاؤں گا۔ مزید برآں مشاعرے کی دلکش خوشی نے اور بھی آمادہ کردیا تھا مگر افسوس کہ کارکنانِ قضا و قدر نے مجھے اس لطف سے محروم کردیا چٹھی آنے سے ایک روز پہلے نزلہ اور زکام کی خفیف شکایت تھی اور پھر اسی روز حرارت ہوئی۔ ایک دن وقفہ دے کر تیسرے روز اچھا خاصا بخار ہوگیا' اور پھر تیسرے روز کا دورہ شروع ہوگیا۔ آج باری کا دن ہی۔ دنیا بھر کی مشہور گولیاں دورہ روکنے کے لئے پیٹ میں جمع کر رہا ہوں' اگر اس دورہ سے سابقہ نہ ہوا جب بھی اس کے حملے نے اس قدر کمزور کردیا ہی کہ ہفتہ عشرہ تک سفر کی قابلیت نہیں رہی جنابنے تحریر کیا ہی کہ عدمِ شرکت کا انکار مسموع نہ ہوگا مگر مجبوری ہی کہ مجبوراً مجھ کو بخار قبول کرنا پڑا ہی۔

۱۴ دسمبر ۱۹۳۵ء از رام پور

مجوزہ ججوں کے نہ آنے کی وجہ سے پنڈت جگت موہن لال صاحب رواں کے ساتھ مولوی شوکت علی خاں صاحب فانی اور مولوی محمد فاروق صاحب ایم ایس سی پروفیسر مسلم یونیورسٹی کو شامل کیا گیا۔ اور ان حضرات نے اپنا بے لاگ فیصلہ سید محمد عارف فاطمی متعلم انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ کے حق میں صادر فرمایا۔ اور عزیز موصوف کو حسبِ اعلان ٹرافی دی گئی۔

اس مشاعرے میں جو بیرونی شعراء تشریف لائے تھے اور ان میں سے جو حضرات دونوں دن قیام فرما رہے اُن کا فوٹو لیا گیا۔ جو اس روداد سے پہلے منسلک ہی۔ میں بحیثیت خادمِ مشاعرہ ان تمام کرم فرماؤں کا بصد اخلاص شکر گزار ہوں جنھوں نے میرے مخلصانہ معروضات پر مشفقانہ توجہات سے عزت افزائی فرمائی۔ اور اسی منت پذیری کے سلسلے میں اپنے تمام معاصر اور قوتِ بازو انٹرمیڈیٹ کالج اسٹاف کا رہینِ احسان ہوں جن کی امداد گراں نے مجھے بہت سی ذمہ داریوں سے سبک دوش رکھا۔ اسی ضمن میں اپنے اُن جملہ عزیزانِ محترم کے حق میں دست بدعا ہوں جن کے وجود سے اس درس گاہ کی نمود ہی کہ خداوند جلّ وعلا اُن کی تعلیمی محنتوں کو حسب خواہ بار آور فرمائے۔ فی الحقیقۃ ان سب کی مستعدی اور پُر خلوص ہمدردی نے اس اجتماع کو ہر طرح کامیاب بنایا اور اس حیثیت سے ساری کامیابی کا سہرا انھیں فرزندانِ کالج کے سر رہنا چاہئے ؏

یہی ذرّے سے آراستہ جائیں گے کل شانِ بیاباں کو

اب میں اپنی تمہیدی روئداد ختم کرتے ہوئے اپنے عزیز ترین دوست ضیاء الملک مُلّا رموزی توحیدی فاضل الیات کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس زحمتِ سفر کی بدولت یکایک اُن کی ناسازیٔ طبیعت سے جو بے لطفی پیدا ہوئی اس کا بدرقہ معزز ناظرین کے لئے اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ گزشتہ سال سے زیادہ پرلطف اور معنی خیز اُن کی رپورٹ درج کی جاتی ہے۔ مُلّا صاحب کے بے ساختہ علیل ہو جانے نے بہت سے بنے بنائے کھیل بگاڑ دئے۔ ورنہ امسال اُن کا مضمون ایک ایسا دستور العمل ہوتا جو اس ادبی اجتماع کے لئے خضرِ راہ بنتا۔

راقم

احسن مارہروی



# اپنے علی گڑھ کالج کا مشاعرہ

(اپنے مُلّا رموزی صاحب کے قلم سے)

دنیا کے تمام علی گڑھوں میں اپنا کالج والا علی گڈھ بھی غنیمت ہی ہے، کیونکہ اس کے دم سے مسلمانانِ ہند میں طب یونانی، انگریزی ڈاکٹری، بیرسٹری، ایڈیٹری، لیڈری، اور ڈپٹی کلکٹری کے تمام علوم زندہ ہیں، صرف ذرا دینیات کا معاملہ زیرِ غور رہتا ہے اور علوم و معارف پسندی کی یہ اسی "علی گڑھیانہ مستعدی" کا حاصل ہے کہ یہاں ہر سال ایک "آل انڈیا مشاعرہ" زبان اُردو کی اصلاح و ترقی کی اغراض سے منعقد کیا جاتا ہے البتہ ڈاکٹری اور طبی حلقوں میں یہ سوال ہے کہ یہ مشاعرہ آخر شدید جاڑے کے موسم میں کیوں منعقد ہوتا ہے؟ یا یہ کہ جب یہ مشاعرہ ہوتا ہے تو جاڑا شدید کیوں ہو جاتا ہے؟ کالج کے پرنسپل سے لیکر جملہ طلبہ اس مشاعرہ کے محرک دموئید ہوتے ہیں مگر تائید مزید کے طور پر خدا نے مولانا احسن صاحب مارہروی کو جب سے اس کالج میں بھیجدیا ہے اُس وقت سے آپ کی "ذات مشاعرہ صفات" سے اس میں اور بھی شوکت پیدا ہو گئی ہے۔

---

اس مشاعرہ میں ہندوستان کے ہر شہر، ہر ضلع، اور ہر قصبہ سے شعراء تشریف لاتے ہیں اور اس سال سے تو بادہ بھی تشریف لایا کریں گے، ارکانِ مشاعرہ کی طرف سے خواہشمند شعراء کو مصارفِ سفر بھی دیئے جاتے ہیں اور تا یوم قیام چائے اور طعام، بیرونی شعراء کو بشرطیکہ وہ "خوش گلو" ہوں طلبا بھی چائے کی دعوۃ دیتے ہیں، ریلوے اسٹیشن پر عزیز طلبا اور محترم پروفیسروں کی ایک جماعت استقبال کے لیے بھی موجود رہتی ہے، پھر جب شاعر صاحب قیام گاہ پر پہونچ جاتے ہیں اُس وقت سے واپسی تک ان کے آس پاس ایک جماعت ایسی بھی رہتی ہے جو ان کے ہر فقرہ پر سبحان اللہ ماشاء اللہ بہت اچھا، حاضر ہوا، سگریٹ تو ملاحظہ فرمایئے، پان ملاحظہ فرمایئے، آرام سے بیٹھئے، ذرا سو جایئے، یہ لیجئے تکیہ، کیا غسل کیجیے گا، تو خود یونیورسٹی ہی ملاحظہ فرما لیجئے گی وہ

خدمت انجام دیتی رہتی ہے جس کا تذکرہ میزبانی کے سلسلہ میں کیا ہی نہیں جاتا۔ حالانکہ یہی وہ سب سے بڑی قر
ہے جو علی گڑھ کالج کی طرف سے مہمان شعرا کے لئے کیجاتی ہے اور حضرت محترم پرنسپل صاحب کے ایک خط
یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی مہمان بیمار ہو جائے تو اس کے لئے گل بنفشہ، عناب، تخم خطمی، گاؤزبان، در آر
ترکردہ مالیدہ ہمراہ خمیرۂ عنبری بھی بہم پہونچایا جاتا ہے، اور آخر میں ایک فوٹو بھی کھینچ دیتے ہیں اور ان کی غزلو
کو بہ اہتمام مولوی محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی ایک کتاب میں چھاپ دیتے ہیں۔

---

یہ اور اسی قسم کی بے شمار مراعات علی گڑھ کالج کی طرف سے اس لئے اور محض اس لئے ہیں کہ ادبیاتِ
یا زبانِ اردو میں "حصۂ نظم" ترقی پائے اور یہی وہ دیرینہ مراعات و خدمات ہیں علی گڑھ کالج کے ارکان اور طلبا
کی جن کے سایہ میں پل کر "ظفر علی خان"، محمد علی جوہر، حسرت موہانی، اقبال احمد سہیل، اور شوکت علی خاں فانی ایسے
سخن سنج و سخن در جوان ہوئے ہیں۔

علی گڑھ کالج کی ان ادبی خدمات و تحریکات کے سلسلہ میں ۱۹۲۷ء سے ایک اور لائق تعریف ہستی کا اضافہ
ہوا ہے اور وہ شہریارِ اسلام تاجدار بھوپال نواب محمد حمید اللہ خاں بہادر، بی اے، علیگ، دام اقبالہ کے برادر
زادے عالی جناب نواب زادہ کپتان محمد رشید الظفر خاں بہادر بالقابہ ہیں جو بہ سلسلۂ تعلیم علی گڑھ کالج میں
داخل ہوئے ہیں۔

---

ممدوح محترم نے اپنے عالی منزلت خاندان کی اُن علمی و ادبی روایات کو ایک "حیاتِ تازہ" بخشی ہے
جو علی گڑھ کالج اور یونیورسٹی سے متعلق ہیں اور جن کے سرپرست نواب زادہ ممدوح کے اسلاف ہیں، چنانچہ سنہ ۱۹۲۷ء
ہی سے آپ نے کالج کے اس مشاعرہ میں محض شعری تشویق و تحریص کے لئے ایک گراں قدر "انعام" مقرر
فرمایا ہے جو اس سال آپ کے برادر معظم نواب زادہ کپتان محمد سعید الظفر خاں بہادر (بھوپال) اور آپ کے
محترم استاد حضرت محمد عبد المجید صاحب قریشی، ایم اے، کی طرف "قریشی سید الظفر خاں تراقی" کے نام
سے منسوب ہے اور یہ نواب زادہ گرامی ہی کی ادب نوازی ہے جو "علامہ موذی صاحب کا "علی گڑھ والوں سے

اتحاد واقع ہوگیا۔

---

۲۰ر نومبر ۱۹۲۶ء عیسوی بکرمی، فصلی کو حضرت محترم مولانا سید علی احسن صاحب احسن مارہروی صدر مجلس شرقیہ ادبیہ علی گڑھ کالج کا مطبوعہ گرامی نامہ آہی تو گیا لکھا تھا: "سالانہ مشاعرہ ہے ضرور ضرور آئیے۔ دیکھئے بھول نہ جائیگا، باقی سب خیریت ہے، خرد و کلاں کو درجہ بدرجہ، المکلف احسن پریذیڈنٹ اورینٹل سوسائٹی انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ" اس عبارت کا پڑھنا تھا کہ فطری نقادی میں اُبال آہی تو گیا اور کنپٹی کے سہارے سر کو لگا کر پورے غصہ سے سوچا کہ دیکھئے اس ادبی مجلس کے ادبی اذن میں جب "المکلف" صاحب کا پتا اس قدر "دبیز انگریزی زبان میں" ہی تو مشاعرہ پھر خالص پانیر اخبار کی عبارت ہی میں ہوگا۔

---

مگر اسی عبارت سے حضرت مولانا احسن کی مصروفیت کا بھی اندازہ ہوگیا۔ کیوں کہ ممدوح مشاعرہ کے سلسلہ میں اکثر شعرا کے پاس "اصالتاً" بھی چلے جایا کرتے ہیں اس لئے مسودہ یقیناً وہ "لڑکوں" کو دے گئے ہوں گے اُنھوں نے مولانا کا پتا انگریزی میں لکھدیا اور تار کا پتا ویسے بھی انگریزی ہی میں ہوا کرتا ہی، خیال یہ ہوا کہ جو بالغ نظر لوگ زبانوں میں غیرملکی زبانوں کے الفاظ کے اخذ و نقل اور در داخلہ کے ؎

قطرہ قطرہ بہم شوُد دریا

والے راز کو جانتے ہیں وہ مولانا ہی پر اعتراض کریں گے حالانکہ مولانا کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا اور ہزار بار یہ کام "لڑکوں" ہی کا ہوگا؟

---

اب وہ جو کہا ہی کہ ؎

اہلِ قلم را ہوئے بس ست

ہم پہنچ گئے اور مشاعرہ سے ایک دن قبل پہنچ گئے دیکھئے کیا بڑے پہنچے؟ حضرت گرامی نواب زادہ کپتان محمد رشید الظفر خاں بہادر بالقابہ میزبان تھے، پھر کیا تھا تو صاحب کو کچھ فرد ہی ہوگیا ہوگا کہ مشاعرہ چند گھنٹے پہلے

ہی سے خواجہ میر "درد" کا اثر محسوس ہوا اور پھر خوب محسوس ہوا۔ پھر بخار آیا اور خوب آیا، پھر استفراغ ہوئے اور خوب ہوئے، پھر ضعف طاری ہوگیا اور خوب ہوگیا، اس حالت میں دو سوال سامنے تھے ایک یہ کہ مشاعرہ میں جاؤ مگر نہ جاؤ، دوسرا یہ کہ وطن واپس چلو مگر نہ چلو، لہٰذا اس چلو اور نہ چلو سے یہ منطقی نتیجہ نکلا کہ نہ چلو تو کہیں نہ چلو اور جو چلو تو دونوں جگہ چلو۔

---

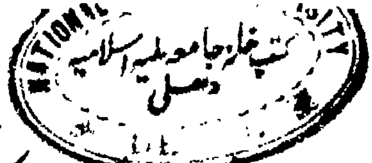
حضرت گرامی محمد عبد المجید صاحب قریشی ایم اے، پرنسپل کالج نے پہلے ہی فرما دیا تھا کہ آپ کو اور حضرت پروفیسر محمد فاروق ایم ایس سی کو مشاعرہ میں "تقریرنا" ہوگا اور یہ خبر بعض لوگوں تک "شدہ شدہ" یہی ہوگئی تھی اس لئے ایسے لوگوں کو مشاعرہ میں انتظار ہوگا کہ آخر ملا رموزی صاحب مشاعرہ میں ایسے وہ کہاں کے علمی و ادبی دریا بہاتے ہیں جو ہم نے آج تک نہیں دیکھے؟ مگر یہاں ضعف سے یہ حال کہ ایک "باسی کمبل" اوڑھ کر مشاعرہ میں یوں چلے جیسے گورنری کے عہدہ سے کمشنری کا چارج لینے چار و ناچار جا رہے ہوں۔ مشاعرہ منعقد ہونے والے گھر کا نام آج تک "یونی ین" ہی ہے اور ایک اسی پر کیا موقوف ہے۔ کالج اور یونیورسٹی کی بے شمار عمارتوں کے نام انگریزوں کے نام پر ہیں، خیر ذرا سوراج مل جانے دیجیے پھر اگر انہی عمارتوں کے نام "حویلی سید احمد خان" "احاطہ محسن الملک" اور "باڑہ مزمل اللہ خاں" نہ رکھ دیں تو ملا رموزی نہیں۔

---

غرض اس مکان میں نشستوں کا جغرافیہ نہایت درجہ مرتب و مہذب ہے اور ان کرسیوں کو دیکھ کر اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس سال کی کلکتہ کانگریس کے پنڈال کی طرح یہاں ——— اماں میری شیروانی تو چھوڑ دو، ذرا اِدھر تو ہٹو۔

ارے ارے میری پاؤں پر جوتا تو نہ دھرو، کا شور نہ ہوگا۔ مگر ہوتا ہے۔

ان کرسیوں کے درمیان سے ایک ایسا "بخط مستقیم والا معاملہ" ہے کہ اگر اسٹیج کے زینہ پر منتظم پروفیسر کا تار چڑھا دو تو شاعر سیدھا اسٹیج پر پہنچ کر دم لیتا ہے۔ تہذیب مجلس یہ ہے کہ اگر کوئی نامی گرامی شاعر یا مہمان قبل تو "تمام کھچا کھچ حاضرین" تالیاں بجاتے ہیں، جو پیشوائی خیر مقدم کا مغربی طریقہ ہے اور اب مشرقی بھی




ہم جو داخل ہوئے تو آدھے ہال تک کسی کو ضرورت بھی نہیں تھی کہ سب کچھ چھوڑ کر وہیں پہچان ہی لے اور خود ہم نے یہ پسند نہ کیا کہ ہم دروازہ ہی سے چلا کر کہیں کہ۔ ہوشیار رہو جاؤ۔ جاگتے رہو کہ ملا رموزی صاحب آرہے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ آدھے ہال تک یوں گردن جھکائے چلے گئے گویا ہم کوئی چیز ہی نہیں، مگر نصف ہال کے بعد چند طلبہ نے پہچان لیا تو انھوں نے تالی بجادی، طلبا میں کالج کی طرف سے یوں تو تالی بجانے کے تمام قواعد ضوابط جاری ہیں، مگر عمل کے وقت ہال میں صرف ایک تالی بجانا کافی ہوتا ہے۔ پھر برقی رفتار سے جملہ تالیاں بج جاتی ہیں۔ یوں کہ خود تالی بجانے والوں کو تالی کا سبب معلوم نہیں ہوتا اور اسی لئے بعد ختم تالی گردنیں اٹھا کر اور کہنی مار کر ایک دوسرے سے سبب دریافت کرتے ہیں، مگر تالی بجاتے وقت یہ تحقیق نہیں فرماتے کہ آخر تالی کیوں بجی؟ اور جو بجی تو بجے مگر ہم کیوں بجائیں؟ اس لئے ہم نے بھی ان تالیوں کے دو معنی سمجھے ایک یہ کہ یا تو ہمارے آنے سے طلبا کو بے حد مسرت ہوئی؟ یا پھر ہم سے داخلہ کے وقت ضرور کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ اس لئے ان تالیوں کے صاف معنی یہ ہیں کہ " واہ ملا رموزی صاحب! "

---

"اسٹیج" کے قریب پہنچنے میں کوئی قدم دو قدم منٹ باقی تھے کہ کسی نے ؎

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

کہا اور ہم اسٹیج سے پہلے ہی بٹھائے گئے۔ دیکھا تو برادر محترم حضرت جلیل احمد قدوائی بی اے، مشہور ادیب فسانہ نگار اور حضرت محترم پروفیسر محمد فاروق ایم ایس سی تھے، گویا ٹکٹ کے حساب سے اس وقت ہم پانچ روپے والے درجہ میں بیٹھ گئے۔ مگر فوراً ہی اسٹیج پر کسی نے حضرت عالی پرنسپل صاحب سے کہہ دیا کہ — دیکھئے وہ ہاں ہاں وہ، ارے صاحب یہ کیا فاروق صاحب کے برابر بیٹھے ہیں۔ پرنسپل صاحب نے دیکھتے ہی اشارہ فرمایا اور حضرت قبلہ احسن صاحب دوڑے ہوئے آئے اور از راہ عنایت شفقت ہمارے مصافحہ کو بوسہ دیا اور اسٹیج پر لے گئے۔

---

اسٹیج کی پہلی ہی سطر میں دیکھتے کیا ہیں کہ بیٹھے ہوئے ہیں یعنی ادیب عالی پروفیسر خاوری ایم اے۔ ان کے بعد ذرا ایک دبیز قسم کے پروفیسر صاحب ایم اے تھے، دوسری جانب کی پہلی سطر میں حضرت رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی رونق افروز اور ان کے پاس (خدا جانے کیوں) پروفیسر فاروق ایم اے سی پہنچکر بیٹھ بھی چکے تھے، فاروق صاحب کے پاس حضرت محترم میاں محمد شریف صاحب ایم اے پرو وائس چانسلر تشریف فرما تھے، ہم روشنی کی ندامت سے محفوظ رہنے کے لئے صدارت کی کرسی کے پیچھے بیٹھ گئے، پروفیسر مولانا احسن صاحب کے صاحبزادے صاحب سے بڑے ذوق شوق سے باتیں شروع کردیں، برادرم حضرت محمد فاروق چوں کہ ایک پختہ کار اور کہنہ مشق اخبار نویس اور مضمون نگاری میں ایک دل کشا طرز خاص کے مالک بھی ہیں جنھیں اخبارات میں "حاجی بلغ العلےٰ" کے نام سے سب جان جاتے ہیں اور وہ اخبار ہم ایسے وقیع اخبار کے روح رواں بھی رہے ہیں۔ اس لئے ممدوح گرامی اور ہمارے تعلقات میں ایک "اخباری ساز باز" کا ہونا ازبس کہ لازم ولابد تھا۔ لہٰذا ممدوح نے ہمیں اپنے پاس بلایا اس لئے بھی کہ حضرت پرو وائس چانسلر سے تعارف کا احسان بھی دھر دیں گے اور اپنے پاس بٹھاکر "تنقیدیں بھی اڑائینگے" یہی ہوا۔ گئے تو آپ نے بڑی لیاقت سے پرو وائس چانسلر صاحب سے تعارف کرایا اور تھوڑی دیر میں اندازہ ہوا کہ حضرت پرو وائس چانسلر ادب آردو اور شعرا اردو کے ایک نکتہ رس فرد ہیں اور شاعرانہ مذاق نہایت بلند و مختص ہے، اس حساب سے اس وقت ایک نشست پر ہم "تین ادبی اتحادیوں کا قبضہ تھا پھر مجال تھی جو تنقید، نکتہ چینی، مصرعہ چینی اور پوری غزل چینی سے کوئی شاعر محروم رہ جاتا؟



یہاں سے ایک نظر ہال پر ڈالو تو ارکان مشاعرہ، اساتذہ کرام اور عزیز طلبا کی مستعدی اور مشاعرہ کے اہتمام میں آن کی مصروفیت دیکھ کر اس لئے جی خوش ہوا کہ یہ سب کچھ محض "علم وادب" کی خدمت کے لئے ہے، بجلی کے رنگ رنگ قمقموں سے مشاعرہ یا صحن محفل یا در و دیوار محفل جگمگا رہے تھے۔ عزیز طلبا با وجود جاڑا کالج کی اسلامی وردی پہنے تھے اور محترم پروفیسر لوگ انگریزی سوٹ، محفل کی آرائش سے پتا چل رہا تھا کہ یہاں بھی قبلہ احسن صاحب کو شعرا نوازی سے بہت کم فرصت ملی اس لئے "لڑکوں"

رنگارنگ جھنڈیوں میں بجائے "ہلال" کے "جیک" کی شان پیدا کر دی اور یہ کسی قصد وارادے سے نہیں بلکہ اس جوش کے ساتھ کہ ایک ہی جھنڈی میں مختلف رنگ کی پٹیاں لگائیں گے تو زیادہ بھلی ہونگی۔ مگر یہ بھول گئے کہ جب ایک ہی جھنڈی میں تین چار پٹیاں برابر برابر لگائیں گے تو وہ برطانوی جھنڈی ہو جائے گی اور یہاں آج ضرورت تھی "قومی جھنڈی" کی اور تو کچھ نہیں ڈر فقط یہ تھا کہ کہیں مولانا حسرت موہانی کی نظر نہ پڑ جائے کیوں کہ وہی ہیں جو ذرا ایسی باتوں سے ناراض ہو جایا کرتے ہیں اور اسی لئے حضرت قبلہ احسن دل ہی دل میں کہہ رہے ہونگے کہ انشاء اللہ زندہ ہوں تو آیندہ سال ہال کو "ہلال ہی ہلال" سے بھر دوں گا۔

---

وقت سے پہلے پہونچے تھے اس لئے شعرا و اُدبا کی آمد آمد تھی اشراف شہر اور یونیورسٹی کے ارکان وغیرہ آرہے تھے اس لئے اسٹیج کے منتظم حضرات فرما رہے تھے۔ وعلیکم السلام، مزاج شریف یہاں تشریف لائیے یہاں، یہ کرسی لیجئے یہ کرسی۔ یہاں یہاں ادھر ادھر، یہ لیجئے کرسی حاضر ہے' ذرا بھئی خاموش تو رہو' لاؤ وہ کرسی ادھر اُٹھا دو' آرام سے تشریف رکھئے، ذرا آپ اپنی کرسی سیدھی کر لیجئے' بس بس تھینک یو' دیکھو بھئی شور تو نہ ہونے دو۔ ان خدمات کے افسر اعلیٰ ہمارے زندہ دل و زندہ دماغ دوست اور تاریخ کے لائق احترام عالم حضرت پروفیسر عبدالعزیز پوری ایم اے' ایل ایل بی تھے۔ اسی تشریف لانے کے سلسلے میں وہ ہمارے پاس بھی تشریف لائے اور بڑے تپاک سے سگریٹ پلایا' ان سے بے تکلف ہونے کے لئے بس یہی کافی تھا کہ ہم ان کی نظر میں پہلے ہی سے مُلّا رموزی تھے اور وہ ہمارے خیال میں "پوری صاحب"!

---

کرسیوں اور تشریف لانے کے بعد پان' سگریٹ' چائے کے انتظام میں تو پوری صاحب کو بہ کچھ دخل ہو' لیکن وہ طلبا کے "بندے ماترمی نعروں" کی روک تھام میں بہت کافی مستعد تھے۔ اور اس انتظام و بندوبست کے لئے دوسرے پروفیسر صاحبان کا طلبہ کے پاس کھڑا رہنا حقیقت میں کالج کی تہذیبی اور تنظیمی تربیت کا ... کر رہا تھا اور اس سے نہ فقط تنظیمی اور اصلاحی بیداری کا ثبوت مل رہا تھا بلکہ ان پروفیسروں کا ...

قومی مجالس کی برزگداشت اور ادبِ اردو کی خدمت کے وہ شائستہ تقلید دلائق پاس ولولے ظاہر تھے جن سے طالب موزی کا قلب کافی طور پر متاثر رہا۔ خدا ان پاک نفس اور ایثار پیشہ پروفیسروں کی صحت اور تنخواہوں میں اضافہ فرمائیے اب سب سے قبلہ احسن صاحب سو اُن کا ذہنی اور عملی انہماک اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ وہ شور کی تخفیف کے لئے کرسی پر سے کبھی کبھی ہاتھ تو بلند فرما سکتے تھے مگر وہ یہ نہیں کر سکتے تھے کہ ہال میں پہنچکر "لڑکوں" سے کہتے کہ دیکھو بھئی اب تو شور کیا ہی مگر اب نہ کرنا ورنہ حق میں اچھا نہ ہوگا۔

---

مشاعرہ کی طرح اردو تھی ؎

بے خودی کا ہی یہ عالم کہ خدا یاد نہیں

طرح فارسی تھی ؎

دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست ؟

ان کے بعد نظم کے لئے "عزتِ نفس" اور "جذبۂ قومی" کے موضوعات تھے، ان موضوعات سے انتخاب کنندہ حضرات اور کالج کے عملۂ تعلیم کے ذہنی تاثر اور مطمحِ نظر کا جو اندازہ ہوسکتا ہے اُس کی بلند پائیگی، ضرورت، محل شناسی اور "قومی تربیت کی صلاحیت اور بیداری کی داد نہ دینا حقیقت آگاہی سے انکار کرنا ہے۔ ان عنوانات سے پرنسپل اور اساتذۂ کرام کے تعلیمی نصب العین کے لئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمان بچوں کی اصلاح و ترقی اور تعلیم و تربیت کے جن بلند و برتر مقاصد کے داعی حضرت سر سید علیہ الرحمۃ تھے اُن مقاصد کے امانت دار اس کالج میں آج بھی موجود ہیں اور خدا انھیں تا دیر رکھے۔

---

یہ امر واقع ہے کہ جس قوم اور جماعت میں "عزتِ نفس" کا احساس زندہ و باقی ہے وہ زندگی کے اعلیٰ مدارج و رفعت و برتری کے ہر شعبے کو استوار و مستحکم رکھنے کے لئے ہمیشہ ساعی و کوشاں رہے گی خواہ وہ شعبہ میدانِ قتال کا ہو یا مرتبہ علم و عمل، پھر کسی درسگاہ میں "عزتِ نفس" کی روح کو بیدار رکھنا درسگاہ کے ارکان کی اُس محبت اور دردمندی [illegible] کو واضح کرتا ہے جو انھیں قوم کے نونہالوں کے ساتھ ہے۔ "جذبۂ قومی" کا موضوع بھی [illegible]

خصوصیات کو محفوظ و مستحکم رکھنے کا ایک ایسا درس ہے جس کے منتخب و مقرر کرنے والوں کی وہ قومی عصبیت اور "قومیت پسندی" ثابت ہے جسے وہ اپنی قوم کے ہر فرد میں پیدا کردینے کے لئے تیار اور مستعد ہیں، پھر جب ان اہم و اقدم موضوعات کو "محفلِ مشاعرہ" ایسی عام مجلس میں اظہار خیال کی شرط لازم اور قابل انعام عمل ٹھیرا دیا جائے تو اس سے ارکان دارالعلوم کا شکر و احسان مسلمانوں کے لئے بھی عام طور پر لازم ہوجاتا ہے خواہ ان مسلمانوں میں ہندوستانی ہوں یا افغانستان کے "شنواری"

---

حضرتِ گرامی صدر مشاعرہ کی میز کے سیدھے ہاتھ کی طرف مع کرسی حضرت قبلہ احسن صاحب تھے مگر صدر صاحب سے قریب ضرور تھے، آپ سے متصل "کرسئ شاعر" تھی، میز کی بائیں سمت ناظم مجلس مذاکرہ علمیہ کی کرسی تھی، حضرت قبلہ احسن مدظلہ "بڑھیا لباس میں" رونق فزا تھے اور شعرا کے اسماء اور ترتیب کی فہرستیں اس آن بان سے لئے ہوئے تھے گویا "جمعیتہ الاقوام" کے اجلاس میں آخری دستخطوں کے لئے "معاہدہٴ لوکارنو" اور "معاہدہٴ کیلاگ" آپ ہی پیش کرنے والے ہیں اور اسی لئے آپ کے بائیں ہاتھ پر آپ کے ایک چھوڑ دو "لٹریری اتاچی" بھی موجود تھے۔ جب ہال کے تمام حصے کچھا کچھ پورے بھر گئے تو عالی منزلت صدر مشاعرہ محمد عبدالمجید صاحب قریشی ایم اے پرنسپل کالج صدارت کی کرسی پر یوں جلوہ فرما ہوئے کہ ہم سے اخلاقاً بھی یہ نہ کہا کہ "لیجے ملا صاحب آج آپ ہی صدارت کیجے" بارے ممدوح گرامی نے افتتاح کار کے طریق پر اور اسلامی قومیت کے دستور و قاعدہ کے موافق ایما ر فرمایا اور ایک خوش آواز طالب علم نے قرآن کریم سے چند آیات تلاوت کیں اور سارا مجمع دست بستہ کھڑا ہوگیا۔ یہ وہ مؤثر نظارہ تھا جو ہماری بدنصیب آنکھوں کو سال سوا سال ہی میں میسر آتا ہے۔ اس نظارہ سے اسلامی قومیت اور خدائے جلال و جمال کی عظمت و شاہنشاہی کی وہ روح بیدار ہو رہی تھی جسے مسلمانوں میں دن رات میں پانچ مرتبہ زندہ ہونا چاہیئے تھا، مگر ویران مساجد بتاتی ہیں کہ ایسا نہیں ہوتا۔ یہی وہ نظارہ تھا جہاں عزیز و محبوب طلبا اور کالج کے معزز و محترم ارکان کو دست بستہ اور سر خمیدہ دیکھ کر کہنا پڑتا تھا کہ علی گڑھ والوں میں اب "نیچری لوگ" نہیں رہے ۔ چونکہ ملا رموزی صاحب حافظ قرآن بھی ہیں اس لئے وہ تاڑ گئے کہ قاری صاحب نے جلسہ کا اثر قبول کرلیا اور اسی لئے وہ ایک جگہ

"غلط پڑھ گئے" جس کے گواہ قبلہ احسن ہیں۔

---

تلاوت کے بعد کارروائی کا آغاز یوں ہوا کہ بائیں کرسی والے صاحب نے میز پر رکھکر کچھ پڑھنا شروع کیا
انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ کالج کی مجلس مذاکرۂ علمیہ و ادبیہ کی روداد تھی مگر ان پر بھی "جلسہ کا رعب طاری تھا
اس لئے ایسی آواز میں پڑھ رہے تھے گویا وہ کاغذات کو نہیں بلکہ کاغذات انہیں پڑھ رہے ہیں، اس کے بعد
حضرتِ گرامی صدرِ مجلس نے تقریر فرمائی۔

واضح ہو کہ پچھلے سال ہم نے صدارت سے متعلق اپنی دو حیرتوں کا اظہار کیا تھا ایک یہ کہ اس خالص
"مجلس شعر" کا صدر بھی کوئی سلطان الشعراء ہی ہونا چاہیئے تھا حضرت گرامی پرنسپل صاحب صدر کیوں ہوئے؟
دوسرے یہ کہ اس "زبان اُردو کے مشاعرہ" کی افتتاحی تقریر انگریزی زبان میں کیوں؟ اس لئے صاحب صدر نے
ابتداءِ تقریر ہی میں کسی بیرونی سلطان الشعراء کو صدر نہ بنائے جانے کے وہ مقامی وجوہ بیان فرمائے جن کا تعلق
کالج اور یونیورسٹی کی انتظامی روایات سے ہے اور ہمیں اس امر کے اعتراف میں تامل نہیں کہ واقعی یہ صدارت
ایک ایسی ہی ذات کو چاہتی ہے جو علاوہ ادبی ذوق کے مقامی نسبتوں کے اقتدار کی بھی مالک ہو، لیکن اس
موقع پر حضرت احسن نے اپنی کرسی صدارت کی کرسی سے بالکل ملاکر لگانے کی کوئی وجہ بیان نہ فرمائی۔

---

زبان انگریزی میں تقریر والے معاملہ کا جواب صاحب فضل و کمال صدر نے جس عمل سے دیا وہ یہ کہ آپ نے
ساری تقریر اُردو ہی میں کی اور ممدوح کرم کا یہی وہ طرزِ عمل تھا ہمارے اعتراض کے جواب میں جو سبق تھا
اُن کے لئے جو "اعتراض و نکتہ چینی" کی جائز تلخی کو برداشت نہیں کر سکتے، مگر ملا رموزی کا دماغ صاحبِ صدر
کی اس "فراخ حوصلگی، شرافتِ نفس اور اصول نوازی" کے لئے ممنون و شکرگزار ہے، عالی مرتبت صدر نے
پھر "غایت شعر و مشاعرہ" پر جو اہم علمی تبصرہ فرمایا اُس سے یہ حیرت انگیز اندازہ ہوا کہ ممدوح محترم تو خود بھی
"سلطان الشعراء" ہیں۔ پھر محققانہ بلند نظری کے متعلق ممدوح کا یہ حصۂ تقریر کس درجہ اہم ہے جو آپ نے طلباء کو
مخاطب کرکے فرمایا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایسے اجتماعات اقوام و ملل کی سیرت اور ان کے "ذہنی خواص کے

مظہر ہوا کرتے ہیں ؟

---

اب مشاعرہ شروع ہوگیا لیکن مشاعرہ کے " غزلی حالات " سے قبل آپ ذیل کی تشریح ملاحظہ فرمالیجیے تاکہ مشاعرہ دلچسپ صورت میں آپ کے سامنے آجائے، پس جان لیجیے کہ مشاعروں میں حسب ذیل جذبات وخیالات کے لوگ شریک وشامل ہوا کرتے ہیں۔

(۱) محض ہنگامہ پسندی کی عادت سے۔

(۲) کسی مشہور گانے والے شاعر کا کلام سن کر خوش ہونے کے لئے۔

(۳) محض اس لئے کہ صبح تعطیل ہے چلو مشاعرہ میں دیکھو کیا ہوتا ہے۔

(۴) کسی مخبوط ذہن " نوجوان شاعر " کی زبانی اور جسمانی حرکات کی لغزشیں دیکھ کر اس پر قہقہہ لگانے کے لئے

(۵) کسی ظریف شاعر کا کلام سنیں گے اور اس پر خوب ہنسیں گے۔

(۶) عمدہ عمدہ غزلیں مشاعرہ سے لکھ لائیں گے اور پھر اسی شاعر کے انداز میں پڑھتے پھریں گے۔

(۷) غزل بھی سنیں گے اور چائے بسکٹ بھی سنیں گے۔

(۸) شاعروں کے لئے پھبتی، آوازے، تالیاں اور شور بہم پہنچائیں گے " ایسوں " سے مجلسی وقار اور اصول کو صدمہ پہنچتا ہے۔

---

(۹) اپنے دوست شاعر کی غزل پر داد کے لئے خوب چیخ پکار سے کام لیں گے اور دوسروں کے لئے چپ رہیں گے، اس قسم کے شرکاء میں بعض خود شاعر کے لائے ہوئے بھی ہوتے ہیں اور بعد مشاعرہ شاعر اپنی تعریف میں خود کوئی مضمون جوڑ کر کسی " اخباری چیتھڑے " میں ان کے نام سے چھپوا دیتا ہے جس کا خلاصہ اس قسم کا ہوتا ہے کہ گو ہمارے شاعر صاحب کا کلام کیا تھا خالص الہام تھا، آرٹ تھا اعجاز تھا، معجزہ تھا، کرامت تھی، بشارت تھی، صنعت وحرفت تھی اور ایک طرح کی " زراعت " بھی تھی ایسوں سے شعراء میں رقابت، جانب داری اور کبھی کبھی مشاعرہ ہی میں " لٹھ بازی " کا میدان بھی

گرم ہو جاتا ہے۔

(۱۰) محض شعرا و رذوقِ شعر کے ساتھ آتے ہیں، متانت و سنجیدگی اور ضبط و سکون سے پورے مشاعرہ پر شریک رہتے ہیں اور چائے سگریٹ کا شکوہ کئے بغیر اسی وقار و خموشی سے چلے جاتے ہیں۔ ایسوں سے مجلسی وقار، اصول، باہمی خوشگواری، ایثار اور حسن خیال کی قوتیں فروغ پاتی ہیں۔

---

محترم شعرا میں مشاعرہ کے اندر جس ذوق و ذہن کے حضرات تشریف لاتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱- اوندھی سیدھی داد ملے گی مگر ملے گی تو۔

۲- مشاعرہ میں غزل پڑھنے سے مزاجی جھجک دور ہوگی۔

۳- اساتذہ کا "طرز پڑھ" اور "طریق گا" دیکھیں گے پھر خود اسی طرح پڑھا کریں گے، اس خیال کا شاعر مشاعرہ میں "بہت بے محل کود پڑتا ہے۔ چیخ پڑتا ہے" اس کے تال سُر میں کہیں ٹھمری اور کہیں "قوالی" کا انداز پیدا ہوتا رہتا ہے، لوگ اس کی اس حماقت پر مذاق اُڑاتے ہیں تو وہ دانستہ طور پر یہ سمجھتا ہے کہ مجھے داد مل رہی ہے۔

۴- بعض "شاعرزادے" بھی ہوتے ہیں جنھیں بعض کہنہ مشق شاعر غزل دے کر مشاعرہ میں لاتے ہیں اور اس غزل کی داد سے خود علیحدہ بیٹھے مزے لیتے ہیں، بچوں کو ان کی اہلیت سے بلند غزل پڑھوانے کی جہالت میں بعض متین اور سمجھدار لوگ بھی مبتلا ہیں اور زبان اردو کے مشاعروں میں یہی وہ ذلیل رسم ہے جس کی کھلی ہوئی بے وقوفی سے یہ لوگ نہیں شرماتے صرف "اپنے مولانا احسن قبلہ" ایسے "لڑکوں" پر دل ہی دل میں جلتے رہتے ہیں۔

---

مذکورہ اقسام کے شعرا جہاں حاضرین کے وقت و خیال کی تباہی کا باعث ہیں وہاں ان کے شعری افکار سے ادب میں نہایت پست اور ذلیل تاثرات کا بے کار ذخیرہ داخل ہوتا ہے جو کسی متمدن اور شائستہ زبان کے لئے نہایت مہلک حصۂ ادب ہے۔

۵- بعض ایک ماہ یا ایک ہفتہ پہلے سے مشاعرہ کے لئے محنت کے ساتھ غزل کہتے ہیں۔ اصلاح لیتے ہیں اُسے خوش خط لکھتے ہیں، کپڑے بدلتے ہیں۔ سواری خرچ ادا کرتے ہیں چار چھ گھنٹے تک انتظار کرتے ہیں۔ لیکن غزل پڑھتے وقت یوں انکار کرتے ہیں گویا انھیں مشاعرہ تک کی خبر نہ ہوئی مگر مسلسل اصرار کے بعد وہ پڑھتے ہیں اور غیر طرح تک پڑھ گزرتے ہیں۔ اس قسم کے شعرا کی حرکات کا اخلاقی اثر یہ ہوتا ہے کہ مخاطب میں "لا یعنی تکلفات" مضحک عادات، سست کاری اور مہملات پسندی کی ذہنیت رواج پاتی ہے ثبوت یہ کہ سنجیدہ شعر کار بھی ان کے مصنوعی انکار کی جہالت کو جان بوجھ کر اپنے پیہم اصرار سے ترقی دیتے ہیں، ترقی یافتہ قومیں ایسی کھلی ہوئی بیہودگی کو قومی ذلت تصور کرتی ہیں۔



۶- اس قسم کا شاعر آج کل کے نوجوانوں سے پیدا ہوتا ہے مگر علم، عمر، تجربے، دماغ کی ساخت اور فطرت کے لحاظ سے یہ نہایت مرعوب ہونے والی ذہنیت رکھتا ہے۔ یہ تحقیق، جدت، پرواز اور واقعیت کے مقابل ہر طاقتور اور شاندار تحریک اور کیفیت سے مرعوب ہو جاتا ہے۔ اس کی شاعری کا قوام گرد و پیش کے اُن تاثرات سے تیار ہوتا ہے جن کی صحیح نوعیت و حقیقت کی تہ تک اُس کے ذہن کی رسائی نہیں ہوتی البتہ وہ ماحول کے سطحی اثرات سے متاثر ہوتا ہے، مثلاً اُس کے عہد کے افراد کسی عظیم الشان انسان کی مصلحانہ آواز کو اگر "پیغام" کہتے ہیں تو وہ فوراً اپنی نظم کو بھی "پیغام" کہدیتا ہے، حالانکہ پیغام کی ذمہ داری حکمت آموزی اور اُس کی اثری حیثیت کے ادنیٰ اصول سے بھی اس کا ذہن عاری ہوتا ہے وہ لفظ "آرٹ" کی ترکیبی، اصولی اور معنوی خاصیت سے قطعاً بے خبر ہوتا ہے مگر وہ اپنی نظم کو "آرٹ" بھی کہدیتا ہے کسی بعید الفہم ادراک و تحریک کو جس کے اثرات بہت عمیق و بلند ہوں اگر لوگ "الہام" کہدیں تو یہ بھی اپنی نظم کو "الہام" کہنے میں تامل نہیں کرتا، اگر یہ سن لے کہ پریزیڈنٹ ولسن آنجہانی کے اصول چہار دہ گانہ کو سیاسیات میں "شاہ کار" یا "ماسٹر پیس" کہتے ہیں تو وہ بھی اپنے ہر شعر کو "شاہ کار" اور "ماسٹر پیس" کہنے میں تاخیر نہیں کرتا۔



اس قسم کے شعرا کی فکری کوششوں کا تمام زور "پرشوکت الفاظ" مہمل اور ناقابل فہم خرافات اور پیچیدگ
نظم کرنے میں صرف ہوتا ہے اور ایسوں کے کلام سے حاضرین، سامعین اور ناظرین کو وحشت، ہنسی یا ہیجان خرا
میں خواہ مخواہ کے قیاسات دوڑانے کی قوت پیدا ہو کر ضائع جاتی ہے، اس قسم کی نظم کو نشاء شعر اور اصول شعر
کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ اور اسی لئے ایسے شعرا اپنی خطابی کامیابی کے لئے "خوش آوازی" اور سطوت انگیز
الفاظ کی ہیبت طاری کرتے ہیں اور اس طریق کار سے مخاطب میں معانی و مقاصد کی تہ تک پہونچنے کی صلاحیت
پست ہو جاتی ہے اور قوم میں "شاندار لفاظی" کی قوت ترقی پاتی ہے۔

۷۔ اس قسم کا شاعر فن شعر اور نشاء شعر کے لئے ایک "درمیانی درجہ" ہوتا ہے جس کا صحیح نام رکھنا محال ہے
اسے اگر مشاعرہ کا باقاعدہ اذن نہ دیجئے تو یہ میر مشاعرہ یا منصرم سے کہہ دیتا ہے کہ میں ہر حال میں آؤں گا کیوں کہ
میں "قومی شاعر" ہوں اس حساب سے ایسے شعرا، شاعری کے "سائن کمیشن" ہوئے اور ان کے سامعین
"گو پبلک" مشاعرہ کو یہ لوگ ادب یا ذہنی خدمت کا کوئی خاص ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ ان کا پہلا مقصد "ابھرنا"
اور "شہرت طلبی" ہوتا ہے اور اسی لئے وہ شعر و خیال کی تزئین سے زیادہ اپنی زیبائش سے ناظرین کو متاثر
کرتے ہیں، باوجودے کہ یہ خود کو "قومی شاعر" کہتے ہیں مگر قومی خصائص و قومی شعائر میں سے ان کے پاس
کچھ نہیں ہوتا۔ مثلاً ان کی معاشرتی حالت صحیح نہیں ہوتی وہ ملکی اور قومی لباس کا تاثر پیدا کرنے کے عوض انگریزوں کا
کوٹ اور پاجامہ پہن کر اس ذہنی اور خیالی درس گاہ میں یوں نظر آتے ہیں گویا کسی قحط زدہ کاشتکار کی نعش
کو مصری آثار قدیمہ کی مومیائی سے لیپ دیا ہو۔ یہ اپنے کلام کو موثر بنانے کے لئے آنکھ، کان، چہرے،
کمر اور ہاتھوں سے ایسی مضحک صورتیں بناتے ہیں جن پر حاضرین و ناظرین میں جوش، مسرت، ولولہ اور
فہم و ادراک کی قوتوں کی جگہ شرم، انفعال، ملامت اور نفرت کے ذلیل جذبات بھڑک سکتے ہیں۔

---

۸۔ اس نوع کے شعرا کے پاس علوم و معارف، وسعت خیال و تجربہ، وقار، تحمل، سکون و دبدبہ،
متانت و سنجیدگی، اور خلق و سادگی کے خزانے ہوتے ہیں اور اسی لئے وہ اپنی خطابی و متاثری حیثیت میں
لوتی صنعت و جدت پیدا کرنے سے بے پرواہ رہتے ہیں مگر ان کا ہر مصرع خیال و قیاس، تکمیل و تحقیق اور سنجیدگی کے

تمام شعری لوازم کا حامل ہوتا ہے۔ وہ اپنے کمال کی پختگی کے اثر سے خود اپنی حیثیت اور قیمت سے بے خبر رہتے ہیں جیسے اپنے مولانا حسرت موہانی اس مشاعرہ میں ہرے رنگ کی بیاض پر عینک دھرے یوں بیٹھے ہوئے تھے گویا وہ اپنے ہی دولت خانہ میں آرام فرما رہے ہیں اور یہی وہ اصل شاعر ہیں جو اپنے مخاطب میں شعر کے مقاصد و اثرات کو تازہ کرتے ہیں ایسے شاعر کی تاثیری کامیابی کی علامت یہ ہے کہ سامع پر شاعر اور شعر کی عظمت سے سکوت، حیرت اور خموشی کی ایک ہلکی سی تھکن طاری ہو جاتی ہے۔ اس شاعری سے ادب میں لفظی و معنوی وزن وقار اور مقاصد کا قابلِ تعریف ذخیرہ جمع ہوتا ہے۔

---

مذکورہ ذوقیات کے لوگوں کے مجمع کو ملحوظ خاطر رکھکر اب اصل کارروائی ملاحظہ ہو۔ حضرت قبلہ احسن صاحب نے بڑے شاعرانہ دبدبہ سے شعرا کی فہرست صدر صاحب کے سامنے پیش کی اور شعرا نے غزل پڑھنا شروع کیا۔ ابتدا میں کالج کے طلبہ نے غزلیں پڑھیں۔ خیال تھا کہ ابھی طلبہ ہی کا سلسلہ جاری رہے گا کہ یکایک ایک بیرونی شاعر صاحب نے غزل پڑھی۔ بلند و بالا قامت، آواز میں وہ "فوجداری بھری ہوئی" کہ طلبہ سہم تو گئے ہوں گے۔ چار پانچ اشعار کے بعد آپ نے پانی طلب کیا۔ دیا گیا تو پیا گیا اور پھر رعد و برق کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ عمر ہوگی کوئی ایک کم پچاس برس کی۔ ہر شعر کی تان پہلے شعر کی تان سے مختلف ہوتی تھی۔ آپ جب فارغ ہو کر کرسی پر بیٹھے تو دیر تک مسرور آنکھوں سے پاس والوں کو اس لئے دیکھتے رہے کہ "کیوں کیسی لاجواب غزل پڑھی ہے"۔ جو شخص ان کی طرف دیکھتا یہ جھک کے آداب بجالاتے۔ اس حرکت سے اندازہ ہوا کہ یہ مسرت انھیں وطن تک خوش رکھے گی اور ریل کے سفر میں بھی یہ مسافروں سے کہیں گے کہ "تمھیں کیا خبر علی گڑھ میں ایسی غزل پڑھکر آرہا ہوں کہ آپ بھی سن لیجے"۔

---

آپ کے بعد پھر کالج کے طلبہ نے غزلیں پڑھیں۔ شاعر کے لئے چونکہ ایک کرسی رکھ دی گئی تھی مگر اس پر بیٹھ کر پڑھنا شاعر کی ذہنی حالت پر موقوف تھا۔ چنانچہ اکثر یہی ہوا کہ بیدار مغز طلبہ کرسی چھوڑ کر "لیکچر" کے انداز سے غزلیں پڑھنے لگے۔ یہاں سے پھر وہ مقابلہ شروع ہو گیا جو آج کل شعرا میں عام ہوتا جا رہا ہے۔ خرابی یہ ہے تو

اس مقابلہ میں۔ بوڑھے شاعروں کی ہینی لگا کر پڑھنا اور اس پر ہاتھ ہلانے کا اضافہ طرفہ مصیبت ہے۔ چنانچہ متعدد طلبہ نے "گایا"۔ اس اثنا رمیں ایک طالب علم ایسے بھی آئے جنھوں نے گانے کی مشق کئے بغیر گانا شروع کیا تو حاضرین نے بھی زبانی داد کا وہ اضافہ فرمایا کہ غـــزل سننا محال ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دوسرے طالب علم نے ان سے غزل لے کر پڑھی۔

---

ادھر تو غزلوں کا سلسلہ مشاعرہ کا رنگ رفتہ رفتہ جمارہا تھا ادھر قبلہ احسن صاحب کے انتظامی ارکان جو "پان پر پان"، "سگریٹ پر سگریٹ" اور "پانی پر پانی" پلائے چلے جارہے تھے اور پھر یہی نہیں بلکہ ہر شخص کے عین منھ کے سامنے کھڑے ہوکر یہ اصرار کہ الائچی تو لیجیے، تمباکو تو لیجیے، چھالیا بھی لی یا نہیں۔ کیا فرمایا سگریٹ بہت اچھا۔ ذرا آپ کو سگریٹ دیجیے۔ ہاں ہاں آپ کو بھی ماچس تو دو۔ یہاں حضرت مکرم پروفیسر عبد العزیز پوری۔ سگریٹ پلانے میں اس درجہ مستعد تھے کہ پہلی سگریٹ کا تار نہیں ٹوٹنے دیتے تھے اور احسان مزید یہ کہ منھ کے سامنے کھڑے ہوکر ماچس بھی خود جلاتے تھے۔ جہاں سے سگریٹ ختم ہوجاتے وہاں سے آواز دیتے سگریٹ لانا مگر خود علٰحدہ نہ ہوتے۔ اس تواضع کی ترتیب یوں تھی کہ شاعر پوری غزل پڑھ کر بیٹھ بھی جاتا تھا مگر دستیابی ضعیفین کا سلسلہ جاری رہتا، اس معاملہ سے شاعروں کے دل میں آگ لگ جاتی تھی، مگر یہ تواضع پیشہ حضرات بھی تجربہ کار تھے اس لئے جہاں شاعر غزل پڑھ کر بیٹھتا یہ حضرات پان سگریٹ کے خوان لے کر آتے پان پیش کرتے اور بے سمجھے سمجھے یہ بھی کہتے پان ملاحظہ فرمائیے ماشاء اللہ کیا غزل پڑھی۔ بے چارہ شاعر پان بھی کھاتا اور شکوہ کی بجائے شکریہ پیش کرتا۔

---

یہ وہ تواضع تھی جس سے حاضرین خوش اور شعرا ناخوش ہوں گے اور دل میں کہتے ہوں گے کہ یہ "عطر پان" غزل کے کسی ایسے خاتمہ پر کیوں نہیں پیش ہوتے جب سب طرف سکون ہو یا اس کے لئے اعلان کردیا جائے کہ "معزز شائقین بعد غزل کے ایک سگریٹ بھی پلایا جائے گا" مگر یہ مسئلہ ہے ارکان مشاعرہ کے خلوص کا اس لئے امید نہیں کہ اس میں کوئی تبدیلی واقع ہو۔ پھر اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ حضرت

پروفیسر پوری کبھی کبھی صدر صاحب کے برابر بھی کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہاں کی طرف فخر سے دیکھ سکتے ہیں اس حالت میں کوئی ان سے نہیں کہہ سکتا کہ " ذرا عمامہ اتار لیجیے " شاعر کا منھ نظر نہیں آتا۔ اسی طرح یہ شاعر کے لئے بھی یوں مفید ہیں کہ شاعر کی مذبوحی حرکات حاضرین کو نظر نہیں آتیں تو شور کم ہوتا ہے۔ بہرحال یہ سارا معاملہ حضرت احسن قبلہ کے ذوق پر موقوف ہے مگر وہ اُس وقت حاضرین کی سطروں میں کب تشریف رکھتے ہیں جو انہیں علم ہو؟

---

چوں کہ مشاعرہ ابھی ابھی شروع ہوا تھا، بیرونی شعرا میں سے بہت کم آئے تھے۔ البتہ ہمارے سیدھے ہاتھ والی سطر میں ایک صاحب یوں بیٹھے تھے کہ سر کو کرسی پر لگا کر پاؤں کو اس طرح دراز فرما لیا تھا گویا وہ سورۂ یٰسین سننے کے لئے آخری مرتبہ صحت ہو چکے ہیں۔ مزاج خشکی کا یہ عالم کہ کسی شاعر کی غزل پسند ہی نہ آتی تھی۔ آنکھیں بند فرما چکے تھے۔ پان سگریٹ والے ان کے اکڑے ہوئے پاؤں پر سے خود ہی کود کر چلے جاتے تھے مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے گویا اُن کے لئے یہ مشاعرہ بھی آگرہ کا ریلوے ویٹنگ روم تھا جہاں مسافر کرسی پر نصف بیٹھ کر اور نصف لیٹ کر سو جاتا ہے۔ ان کے منھ سے جو کسی شاعر کے لئے داد یا تحسین کے الفاظ نہ نکلے سو اس لئے کہ " خود کوئی بہت ہی بڑے ہوں گے "۔

---

ان حالات کے بعد ہمارے اوپر پھر خواجہ میر " دردؔ " کی توجہ ہوئی اور ہم مشاعرہ سے اٹھ کر صرف ذرا وطن تک چلے آئے، چوں کہ وطن تک پہونچنے میں ریل گاڑی کے دو دن صرف ہوتے ہیں اس لئے گویا ہم مشاعرہ ہی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ فرق صرف نظر اور خیال کا تھا اس لئے مشاعرہ کے دوسرے دور میں جو کچھ ہوا خیال و قیاس کی امداد سے وہ بھی قلم بند کئے دیتے ہیں۔ چنانچہ دوسری شب میں یہ ہوا ہوگا کہ ہمارے دیرینہ دوست حضرت مولانا سید کلب احمد مانیؔ جائسی آگئے ہوں گے، حضرت مولانا شوکت علی خاں فانیؔ بی اے ایل ایل بی علیگ۔ حضرت مولانا جگرؔ مرادآبادی، حضرت پنڈت جگ موہن لال رواںؔ ایم اے، ایل ایل بی، حضرت نواب زادہ کپتان محمد رشید الظفر خاں بہادر بھوپالی، حضرت مولانا اظہر علی آزاد شریک ہوئے ہوں گے

---

جلسہ پھر تلاوتِ قرآن پاک سے شروع ہوا ہوگا، حضرت محترم صدر نے بڑے تپاک سے حضرت قبلہ احسنؔ رہ سے غزل کے لئے اصرار فرمایا ہوگا۔ مگر قبلہ ممدوح نے کھانسی کا عذر فرماکر غزل سے صاف انکار کردیا ہوگا اور مشہور یہ ہوا ہوگا کہ چونکہ حضرت مولانا بعض شعرا کے پاس "اصالتاً" بھی گئے تھے اس لئے عدیم الفرصتی کی وجہ سے غزل نہ کہہ سکے آپ کے بعد حضرت گرامی میاں حامد علی خاں صاحب (بھوپالی) نے غزل پڑھی ہوگی۔ اور بہت دل نشیں انداز میں پڑھی ہوگی، اس پر برادر محترم حضرت جلیل احمد قدوائی بی اے نے ہاتھ جوڑ کر صدر صاحب سے کہا ہوگا کہ اس غزل کو دوبارہ پڑھوایا جائے تو بھوپال کے حضرت مولانا حامد سعید خاں صاحب نے اس غزل کو پڑھا ہوگا، پھر صاحب صدر نے بڑے تپاک سے حضرت جگر مرادآبادی سے غزل کے لئے اصرار کیا ہوگا تو طبیعت اچھی نہ ہونے کے باعث انھوں نے دو غزلیں پڑھ کر صاف کہہ دیا ہوگا کہ اب معافی چاہتا ہوں، پھر حضرت رواںؔ نے نہیں تو حضرت فانیؔ جالسی نے غالبؔ کی مشہور غزل پر اپنی بہترین تضمین پڑھی ہوگی جس میں یہ بھی آتا ہے کہ "یک قطرۂ خوں وہ بھی" انہیں اور حضرت رواںؔ کو بے حد داد ملی ہوگی، اس کے بعد صدر صاحب نے حضرت گرامی پروفیسر عبدالعزیز صاحب پوریؔ سے فرمایا ہوگا کہ موقع غنیمت ہے غزل پڑھ لیجئے تو ممدوح نے نہایت جانفشانی سے ترنم کے ساتھ غزل پڑھی ہوگی تو لوگ بالگ چیخ اٹھے ہوں گے کہ سبحان اللہ اور وہ جو مثل مشہور ہے کہ "پروفیسر کو دیکھ کر پروفیسر رنگ بدلتا ہے" سو آپ کو دیکھ کر ایک پروفیسر صاحب نے فارسی غزل شروع فرمائی ہوگی، مگر مارے ترنم کے دو چار اشعار کے بعد ہی کھانسی نے پکڑ لیا ہوگا، ان کے پڑھنے میں وقار، دبدبہ، شوکت، آن بان کے تمام لوازم مکمل ہوں گے تو طلبہ مسکرائے ہوں گے مگر پروفیسر ہونے کے ڈر سے وہ مرتب تالیاں نہ بجائی ہوں گی جو وہ کبھی بے اختیار بجا اٹھتے ہیں۔

---

آپ کے بعد ایک صاحب سے اور کچھ نہ بن آیا ہوگا تو انھوں نے صاف صاف غزل پڑھنا شروع کر دیا ہوگا جسے سن کر حضرت مولانا احسنؔ آپے سے باہر ہوگئے ہوں گے اور آپ نے شاعر سے کہہ دیا ہوگا، بس بس بس۔ بعد میں معلوم ہوا ہوگا کہ ان شاعر صاحب کو حضرت ملا رموزی نے مشاعرہ سے رخصت ہوتے وقت ریلوے اسٹیشن پر مشاعرہ میں جلنے کی تاکید فرمادی تھی اور ان کا تخلص اور کچھ نہیں تو بوجم ہے۔ پھر حضرت فانیؔ مدظلہ نے غزل پڑھی ہوگی تو

مشاعرہ ان کی عظمت، خوش سلیقگی، حسنِ اخلاق اور حسنِ کلام سے بے انتہا متاثر ہوا ہوگا۔ ان کے بعد لوگوں کا دل
کسی دوسرے شاعر کا کلام سننے کو نہ چاہتا ہوگا۔ مگر ایک صاحب نے یہ ضرور کہا ہوگا میں یہاں بھی سناؤں گا اور
آپ طلباء کے "گروں پر آگر" بھی سناؤں گا۔ سنجیدہ حاضرین نے اس بے چارہ کی پست ذہنیت پر دل ہی دل میں نفریں
کہکر بظاہر تبسم فرمایا ہوگا۔ اور بس

---

اب مقام ہردوئی کے گورنمنٹ ہائی اسکول کے ایک ماسٹر صاحب کے کلام کی باری تھی مگر افسوس کہ وہ خود
حاضر نہ ہو سکے۔ اس لئے ممدوح نے اپنا کلام حضرت قبلہ احسن کے نام روانہ کر دیا جو "ڈاک خانہ سے ساز باز" کی
وجہ سے بجائے حضرت احسن کے ہمیں مل گیا۔ اس لئے ہم آپ سے "کہکر پڑھتے ہیں"
اس کلام میں، عروض، علم الکلام، بلاغت، سیاست، پند و نصیحت، فلسفہ، انشاء، وغیرہ وغیرہ کے بے شمار
و بے اندازہ اصول شامل ہیں۔ اس لئے ان کی تفصیل ایک علیٰحدہ تبصرہ کی محتاج ہے جس کا یہ موقع نہیں۔ البتہ
ماسٹر صاحب نے مشاعرہ کی طرح میں جو غزل کہی ہے، پھر اسی غزل میں "عزتِ نفس" اور "جذبۂ قومی" کے دونوں
عنوانوں سے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان سے پہلے آپ کو یہ بھی ظاہر کر دینا تھا کہ "میں اس وقت کن حالات
میں مصروف ہوں" اس لئے آپ نے ان تاثرات کو بھی ایک "منظوم خط" کی صورت میں حضرت احسن قبلہ کو روانہ
فرما دیا۔ مگر یہ منظوم خط اور "غزل، عزتِ نفس" اور "جذبۂ قومی" کی دونوں نظمیں کاغذ پر جس طرح لکھی گئی ہیں ان کے
لحاظ سے بہ یک نظر یہ منظوم خط "غزل" اور طرحی غزل معلوم ہوتا ہے۔
واضح ہو کہ ماسٹر صاحب کا نام ان کا نام بھی ہے اور اسی کا ایک حصہ ان کے تخلص کا کام دے جاتا ہے
ان کا نام ہے مول چند اور تخلص کا "انچارج" ہے "شرما"

---

اب آپ نے یوں تو ہزاروں "چند" دیکھے ہوں گے مگر ذرا اپنے ان "مول چند" کو بھی دیکھ ہی لیجیے
اور فیصلہ کیجیے کہ شاعری میں "ایسے چند کو" کیا کہنا چاہیے، چنانچہ ممدوح مکرم کے "مکتوبِ منظوم" یا "غزل"
کا مطلع ملاحظہ ہو مگر مشاعرہ کی طرح کو پہلے ذہن نشین فرما لیجیے ارشاد ہوتا ہے لہٰذا وہ بھی حضرت احسن ایسے ادیب

اُستادِ فن سے ارشاد ہوتا ہے کہ ؎

مکرم قدر دان، مارہری احسن
ہیں وارسے شاعری پر جو کرتن من

مشاعرہ کی مقررہ طرح کے بعد اس مطلع سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت احسن مدظلہ نے ضرور کوئی "خفیہ طرح" بھی دی تھی جس پر حضرت شؔرما نے " احسن اور تن من" کے قوافی سے کام لیا۔

---

پچھلے سال کی "روداد" اور "سفرنامہ" میں ہم نے بعض احباب کی وطنی نسبتوں کو برنبائے تفنن اُن کے ناموں سے پہلے لکھدیا تھا۔ مثلاً "جالندہری حفیظ" اور "مارہروی احسن" ان ترکیبوں کی لطافت سے مرعوب ہوکر ایک تہی مغز دتہی مایہ "اخبارچی" نے اپنے ایک انشا پردازانہ ملفوبہ میں ان بزرگوں کے ناموں کو اسی طرح نقل کرکے یہ اطمینان کرلیا تھا کہ لوگ ان ترکیبوں کو "اخبارچی" کی ذاتی ایجاد سمجھ کر بس تڑپ ہی تو جائیں گے، لیکن حضرت شؔرما نے تو متانت واحترام سے حضرت احسن مارہروی کو "مارھری احسن" نظم فرما دیا پھر طرفہ تماشا یہ کہ "وزن" کے اعتبار سے مولانا کا نامِ نامی مع وطنی نسبت کے "رہ روی احسن" رہ جاتا ہے، یقین نہ ہو تو شؔرما صاحب کا مطلع پھر گنگنالو۔

---

اس مطلع میں اگر ہمیں قبلہ احسن صاحب معاف فرماکر اجازت دیں تو ہم بے شمار رازہائے سربستہ کا انکشاف کئے دیتے ہیں۔ مثلاً پہلے مصرع میں شؔرما صاحب نے "مکرم" کے بعد ہی "قدردان" لکھ کر ثابت کردیا ہے کہ حضرت احسن اور حضرت شؔرما کے نہ فقط تعلقات ہی "خوشگوار" اور "دیرینہ" ہیں بلکہ احسن صاحب "اس قسم کے شعرا کے" "قدردان" بھی ہیں۔ اب رہا مصرع ثانی میں یہ لکھنا کہ حضرت احسن قبلہ ؎

ہیں وارسے شاعری پہ جو کر تن من

سواس سے انکار نہیں کہ یہ ایک "واقعۂ باکل" ہے۔ ( یہ اضافت غصہ کی حالت میں جائز ہے)

---

آج کل کے انگریزی یافتہ لوگ شعر میں "گل و بلبل" کی جگہ "حقائق و تاثرات" کے بہت شائق ہیں، پھر شعر کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ شعر شاعر کے مافی الضمیر کا آئینہ ہو اس ضابطہ سے مطلع کے بعد شرما صاحب کے حقیقی اور واقعی تاثرات ملاحظہ ہوں فرماتے ہیں ؎

پریشاں سر ہے، آمد انس پکڑ
ہیں آئے ساتھ دویم ڈائے رکٹر"
"عدیم الفرصتی، کارِ گراں ہے
و میلہ رام لیلا کا مراں ہے

یہ ہیں وہ اشعار جن سے ادبیاتِ اُردو میں "وضعِ الفاظ" مصطلحات، اور اختراع و جدت کے ضوابط ترتیب پاتے ہیں، مثلاً انسپکٹر کو "انس پکڑ" کہنا، جس قدر آسان ہے اتنا ہی "پریشان سر ہے" کی بندش کس قدر محال ہے جسے شرما قسم کے شعرا ہی باندھ سکتے ہیں۔

---

بھاری یا بے شمار کاموں سے عدیم الفرصت رہنے کو دوسرے شعر میں یوں نظم کر دیا کہ ؎

"عدیم الفرصتی کارِ گراں ہے"

شرما صاحب کا کام نہیں تو کیا اُستاد غالب کا کام ہے کیوں کہ اُستاد غالب اگر اسے لکھتے تو بس اِس طرح کہ۔

"کارہائے گراں سے عدیم الفرصت ہوں"

اور بس۔ مگر شرما صاحب کی "عدیم الفرصتی کا سبب" صرف "کارہائے گراں" تو ہیں نہیں بلکہ اُن کے سامنے اس سے بھی زیادہ اہم مصروفیت کا باعث تو "و میلہ رام لیلہ کا مراں" بھی ہے (واؤ عاطفہ) کو یوں تو ہم بھی اکثر و بیشتر غلط مواقع پر لکھا کرتے ہیں۔ مگر ہم آج تک اس غلطی میں وہ حسن پیدا نہ کر سکے جو شرما صاحب نے "و میلہ" کہہ کر پیدا کر دیا ہے اب رہا "کامراں ہے" تو یہاں صفت موصوف مبتدا خبر اور "فک اضافت" کے جو بلیغ قوانین صرف کئے گئے ہیں انھیں ہم ابجد خواں ملّا رموزی کیا خاک سمجھ سکتے ہیں؟ اب کمال قادر الکلامی ملاحظہ ہو۔ اس قدر انہماک ہے کہ "انس پکڑ" اور "دویم ڈائے رکٹر" کی آمد کے ساتھ ہی "و میلہ" کامراں ہے

واقع ہوتا لیکن شرر صاحب ایسے ہزار داستان کے لئے ایک غزل کا کہدینا بات ہی کیا تھی چنانچہ فرماتے ہیں

کہی ہے چند منٹوں میں غزل یہ
محض خوشنودیٔ خاطر طبع یہ

---

قواعد کے لحاظ سے "یہ" حرف اشارہ ہے اور وہ بھی قریب کے واسطے اس لئے ثابت ہوا کہ یہ غزل حضرت مولانا احسن قبلہ کی شان میں تو نہیں کہی گئی بلکہ شرر صاحب نے اسے "محض اپنی خوشنودیٔ خاطر طبع" کے لئے کہی ہے اور وہ بھی "چند منٹوں" میں کہی ہے۔ اب آگے چل کر ارکانِ مشاعرہ کی اس "زبردست جدوجہد" کا راز بے پردہ فاش ہوتا ہے جو انھوں نے حضرت شرر کو مشاعرہ میں "اصالتاً" بلانے کے لئے کی مگر حضرت شرر نے ارکان مشاعرہ کی مسلسل التجاؤں اور تقاضوں سے تنگ آکر صاف انکار کر دیا ہے اور وہ بھی "غزل کے ذریعہ" انکار کیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ؎

نہیں ہے روبرو ہونے کا منشا
نہیں ہے فرصتِ شرکت "پڑھے آ"

عروضیوں کے نزدیک "تعقید" ایک نہایت بھونڈا پن ہے اور گو اساتذۂ متقدمین و حال اس سے بچ نہیں سکے پھر بھی "تعقید" کو شاعر کی "لفظی و خیالی بے بسی" پر محمول کیا جاتا ہے، لیکن حضرت شرر نے "پڑھے آ" کہہ کر ثابت کر دیا ہے کہ ایجاز و اختصار کو اس سے زیادہ حسین و جامع بنا دینے کا کوئی دوسرا ذریعہ ہی نہیں جسے اختیار کیا جائے اب رہا "روبرو ہونے کا منشا" سو خدا ہی نے محفوظ رکھا۔

---

اب تک تو شرر صاحب نے علی گڑھ کے طلبہ کی عمر، ان کی ابتدائی تعلیم اور معمولی قسم کی معلومات کے تصور سے نہایت سادہ اور آسان مفہوم اور الفاظ سے کام لیا لیکن آخر کمالِ علمی اور تبحر کو کہاں تک ضبط فرماتے اس لئے ایک "عالمانہ شعر" فرمایا ہے جس میں فارسی، مرکب اضافی، شوکت لفظی اور تخیل نزاکت" کے دریا بہائے ہیں اور طلبہ موزی تو طلبہ موزی ان ایسے اگر ہزار آجائیں تو آنے والے شعر کی شرح سے عاجز رہیں

فرماتے ہیں ؎

توقع تسپہ ہو پس اندخاطر
جمع ہوں گے شعرا ہند شاطر

پسند خاطر کی جگہ "پس اندخاطر" "شعری پس ماندوں" کا مخفف بھی ہے اور "ضرورتِ شعری" بھی اب رہی "شعرا ہند شاطر" کی ترکیب سو اس پورے مصرع کو اس سال بی اے، فرسٹ کے امتحان اردو میں دے دیا جائے پھر نہ حضرت حفیظ جالندھری کے بلانے کی ضرورت رہے گی نہ حضرت اصغر گونڈوی کی، مگر "توقع تسپہ ہے" کہ ایسا نہ کیا جائے گا!

---

شعرا میں یہ نقص بہت عام ہوگیا ہے کہ وہ غزل میں نہ خیریت وخیر وعافیت لکھتے نہ ختمِ غزل پہ خود دکلاں کو درجہ بدرجہ سلام، پس اس نقص کو شرما صاحب نے دور فرمادیا ہے اور وسط خط یا وسطِ غزل میں دور فرمادیا ہے ارشاد ہوتا ہے ؎

دعا فتح یمیع تسلیم سرہندی کو
ہے حسب حیثیت آداب سب کو

مصرع اولیٰ میں "سرہندی" سے مراد حضرت احسن قبلہ ہیں رہی "دعا فتح یمیع تسلیم" کی عربی سو آپ اسے دارالعلوم دیوبند، تھانہ بھون اور ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بھیجکر اس کے معنی دریافت فرمالیجے سوائے جامعۂ ازہر مصر کے اگر کوئی سمجھادے تو ہمارا ذمہ اور اسی لئے ہمارا مشورہ ہے کہ اب مولانا ابرار حسین صاحب فاروقی کو دیوبند کے ٹرسٹیوں میں لے لیا جائے اور عربی کے تمام اسباق حضرت علامہ شرما مولوی فاضل ازہری کے سپرد کردیئے جائیں۔

---

اب شرما صاحب غزل یا خط ختم فرماتے ہیں اور غزل کی تاریخ اور سنہ کو غزل ہی میں نظم فرماکر شعراء بے تاریخ کو ایک سبق دیتے ہیں، پھر ڈاک خانہ والوں کی مشہور عام چوری سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہ بھی

بتاتے ہیں ؎

دسمبر پندرہ ویں سنہ بست و ششم
لفافہ میں روانہ کر۔ نہ ہو۔ گم

مصرع اولیٰ میں حروف ربط کی کمی کو فارسی سے پورا کرنا کمال نہیں تو کیا جہالت ہے ؟ پھر شعر اب تک غزل ہی پر ٹکٹ لگا کر مشاعروں میں روانہ کر دیتے تھے اس لئے آپ نے بتا دیا کہ لفافہ میں روا. کر نہ ہو گم"

---

غالب مرحوم شاعری کے ہزار ابو الآباء رہتے مگر اُن کا یہ عجز کچھ کم قابلِ افسوس نہیں کہ وہ بے شمار مواقع پر مقطع میں اپنا تخلص نظم نہ فرما سکے اور غالب کی جگہ "اسد" یا "اسد اللہ خاں غالب" لانا پڑا اور اس مثال سے تو ساری شاعری عاری ہے کہ کسی شاعر نے اپنا نام، تخلص اور عہدہ "ملازمت" تک نظم کر دیا ہو اور وہ بھی صرف ایک مصرع میں، مگر حضرت شرما کی شعر گوئی اور قادر الکلامی کی قوت ملاحظہ ہو کہ ممدوح نے کس درجہ جامع مقطع فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے ؎

مصنف، موہن چند شرما ہیں ٹیچر
چمکتے دہر میں ہیں مثلِ اختر

بے وقوف ہی ہیں وہ یورپ والے جو حضرت شرما کے ہوتے ہوئے بھی دہر میں "مریخ" کی تحقیق میں سرگرداں و سرگراں ہیں۔

---

اس کے بعد والے اشعار پر چوں کہ خود حضرت شرما نے یہ نوٹ لکھ دیا ہے کہ :

"سامعین صاحبان، اس نظم میں عزتِ نفس اور جذبہ قومی دونوں ہیں"

اس لئے اوپر کے تمام اشعار کو آپ کی غزل سمجھنا جائز ہو گیا۔ لہٰذا آپ اوپر کے اشعار میں

خدا کے لئے ایک جگہ بتا دیجے کہ "معشوق، عاشق، حسن، عشق، وصل و ہجر، درد، گداز، آہ و نالہ، گل و بلبل، صحرا، ویرانہ، لیلیٰ مجنوں، غرض تغزل کا ایک جملہ بھی لایا گیا ہو، مگر اس "بے تغزلی" پر غزل ہو جانا شرما صاحب کی وہ غزلی فضیلت ہے جس کی وجہ سے آپ ؎

چمکتے دھر میں ہیں مثلِ اختر

---

غزل کے بعد آپ کی وہ نظم ہے جس میں "عزتِ نفس اور جذبۂ قومی" کے حکیمانہ نکات و غوامض کو حل کیا گیا ہے اور چوں کہ ما رموزی بہت معمولی قسم کے لکھے پڑھے آدمی ہیں اس لئے ان اشعار کی شرح سے عاجز آ کر اصل نظم نقل کئے دیتے ہیں، اب اگر کالج کے ارکان میں ذرہ برابر بھی قابلیت ہے تو وہ اس نظم کو نصاب میں داخل کر لیں گے و ہو ہذا ؎

ہندو مسلم کوئی بھی ہند میں آزاد نہیں
لطف گلشن میں گل و بلبل و شمشاد نہیں

رہنے گو شیخ کے پیرو بنو اطفال سبھی
جانتے آپ کیا ہیں قصۂ بغداد نہیں

کام نیکی و سخاوت کے جہاں میں کیجے
اشرف الخلق یہاں آپ ہیں ہمزاد نہیں

اپنے من ملنے سبھی کام جہاں میں کرتے
مانتے بات کوئی بھی جد و اجداد نہیں

گرسنہ غربا ہیں سردی و جاڑا تن پر
رو دیں طفلاں مگر سنتا کوئی فریاد نہیں

قول کر آئے یہاں آپ کو کیا یاد نہیں
بے خودی ہے کا یہ عالم کہ خدا یاد نہیں

فلسفہ رزم خدا یاد کی باتیں پڑھ کر
سیکھیں جا کر کہاں ملتا کوئی استاد نہیں

عیش و عشرت کا بہم کرتے ہیں یاں سامان عبث
ٹھیر جنت میں لمحہ ایک تک شداد نہیں

فکر کہ وہ کو لگی رہتی ہے نت روزی کی
کرتے محنت ہیں شب و روز مگر شاد نہیں

اپنے اعمالوں کا اب پھل ملا ہم کو آ کر
ساری تکلیف سہو۔ پر کرو فریاد نہیں

کام وہ شرما کرو جنتی میں رحمت دیویں
کیونکہ جی کسی کا اس پہ پھر زیاد نہیں

اب فرمائیے اس نظم کے اندر ایک حرف بھی ہے جس میں آپ کوئی سقم پیدا کر سکیں؟ حق تو یہ ہے کہ حضرت "تغزل" جذبۂ قومی، اور عزتِ نفس، ایسی حکمت آموز کیفیات کو جس "عالمانہ شان سے" نبھایا ہے "اس پر ستایش ہی گنگ ہے۔ پھر یہ دیکھکر کس قدر افسوس ہوتا ہے کہ مشاعرہ کے "انعام" سے حضرت شرما محروم رکھے جائے کیوں؟ محض بے انصافی اور ناقدر دانی سے۔ کاش انعام دینے والوں میں ایک جج ملّا رموزی بھی ہوتے واللہ یہ انعام آنکھیں بند کر کے حضرت شرما پر نثار کر دیتے، مگر آہ شرما صاحب زمانہ ہی قدرداں نہیں اور اس معاملہ میں جو حال آپ کا ہے وہی تو ہمارا بھی ہے کیوں کہ جس طرح آپ کو مشاعرہ کا یہ "انعام" نہ دیا، ہمیں بھی تو اس انعام کا "جج" نہ بنایا، واللہ ہم تو خوفِ خدا سے کانپ جاتے ہیں کہ آخر کار یہ ارکانِ مشاعرہ اس کھلی ہوئی ناقدردانی پر خدا کو مونھ کس طرح دکھائیں گے؟

---

یہاں پہونچ کر "مشاعرہ بخیر و خوبی" ختم ہوا اور حضرت گرامی قدر پرنسپل صاحب نے ارکان مشاعرہ کے مصارف اور آن کی شب و روز کی تکالیف اور حضرت قبلہ احسن کا تہجد کی نماز تک کھانا نہ کھانے کے ایثار و مستعدی کا احسان جتائے بغیر آئے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا، مقابلہ کی نظموں میں کالج کے کامیاب طالب علم جناب عارف صاحب کو ججوں نے "کپ" دیا۔ پھر تمام مہمان شعرا کا ایک گروپ کھچوا کر آن کے ساتھ کر دیا۔ اس گروپ میں ایک صاحب ایسے ضرور ہوں گے جنھیں اپنی تصویر کی خوشی عید کی خوشی سے زیادہ ہوئی ہوگی اور وہ کوشش کریں گے کہ کسی رسالہ میں یہ گروپ چھپ جائے تاکہ علی گڑھ کے ان "بڑے بڑے لوگوں" کے ساتھ دنیا انھیں بھی دیکھ لے

---

چوں کہ اس سال مشاعرہ میں نہ حضرت بدر جلالی بی اے ایڈیٹر اخبار "خلافت" تھے نہ آخر وقت تک ملا رموزی رہے جو مہمانوں کی طرف سے طلبہ ارکان مشاعرہ، کالج اور یونیورسٹی کے شریک کار حضرات کا "وعدہ" شکریہ ادا کرتے اس لئے ہم اس فرض کو یوں ادا کرتے ہیں کہ خدا ان طلبہ اور ارکانِ مشاعرہ کو شاد و آباد رکھے جنھوں نے ہم مہمانوں پر اپنا سب کچھ قربان کیا، یہاں تک کہ خدا آن طلبہ کو بھی کامیاب زندگی دے جنھوں نے اپنی

داد کے شور سے ہم مہمانوں کی بعض غزلیں پڑھنا دشوار کر دیا اور اسے اپنی خصوصیت بنا کر اس سے خوش بھی رہے حضرت قبلہ مولانا احسن اور حضرت گرامی پرنسپل صاحب کالج کے لئے دل ہی وقف ہے۔ شکریہ کیا؟ پھر یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ آپ حضرات کی بھی وہ نوازشیں ہیں جن سے بدنصیب اور بے وسیلہ مسلمانوں کے علوم و فنون اُن کی قومی خصوصیات اور ادبی روایات محفوظ رہ سکتی ہیں، حضرت احسن، حضرت پروفیسر تیدی اور دوسرے پروفیسر صاحبان منتظم طلبہ نے مہمانوں کے ساتھ ہی مشاعرہ کے نظم اور وقار کو جس بلند پایہ خوش اسلوبی سے باقی رکھنے کی کوشش فرمائی اُس کے لئے ہم جس طرح ان اپنے دینی بھائیوں کے شکر گزار ہیں وہاں ہم حضرت گرامی پرنسپل صاحب کو بھی مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ آپ کے خلوص نیت سے اُن کے کالج کا یہ "آل انڈیا مشاعرہ" اپنی تمام روایات کے ساتھ کامیاب رہا، خدا کرے یہ مشاعرہ انھی مسرتوں کے ساتھ اس مرتبہ بجائے شدید جاڑے کے کسی معتدل اور خوشگوار موسم میں ہو۔ آمین



یہ تو تھی " روداد مشاعرہ" اب چند باتیں ایسی بھی سن لیجئے جنھیں ظرافت و خوش طبعی کے مقابل عقل و ضرورت سے تعلق ہے اور وہ یہ ہیں:

علی گڑھ یعنی کالج اور یونیورسٹی کی علمی و ادبی روایات اور ذمہ داریوں کے یہ معنی نہیں کہ وہاں ہر سال کوئی ایسا ہی مشاعرہ ہو جایا کرے جیسا کہ ہندوستان کے ہر شہر میں ہوتا رہتا ہے، بلکہ جس طرح علی گڑھ اسلامی ہند کی ذہنی اور عقلی اصلاح و ترقی کا ایک عظیم الشان مرکز عمل یا مصلح ہے اُس کی نسبت سے یہاں کی ہر تحریک میں کوئی ایسی شان ضرور ہو جو مسلمانوں کے عام ذہنی اور فکری اداروں سے اُسے ممتاز و مفید ثابت کر سکے، اس لئے آئندہ مشاعرہ کے لئے ذیل کی تجویز و تحریک پیش ہے۔

(۱) آئندہ مشاعرہ میں جس قدر غزلیں اور نظمیں پڑھی جائیں گی وہ اس طرح روداد میں شائع نہ ہوں گی بلکہ ہر غزل اور ہر نظم پر ایک عروضی اور فنی تنقید ہوگی۔ اس تنقید سے جہاں شاعر کو اپنے نقائص کا علم ہوگا وہاں ناظرین کی علمی اور فنی معلومات میں اضافہ ہوگا، اگر کلام قابل ستائش ہوگا تو اس پر نہایت متانت سے بہتر داد دی جائے گی کیوں کہ اس تنقید سے کسی کی دل شکنی مقصود نہیں بلکہ اصلاح و خدمت مقصود ہے۔

۲ - جو کم علم، کم عمر اور کم سمجھ لڑکے یا شعرا اپنی واقعی اور علمی قابلیت سے بلند اور نمایاں غزل یا نظم دوسروں سے لکھوا کر پڑھتے ہیں اُن کا سختی سے بھانڈا پھوڑا جائے گا، کیوں کہ شعر کی خوبی کا معیار، علم و عقل ہونا چاہیے و ذہن پوشی نہیں، ورنہ بچوں سے بہترین غزلیں پڑھوانے کا مقصد یہ ہوا کہ مشاعرہ کے صاحب علم و فضل اور ارباب غور و شعر کار دانستہ طور پر "بے وقوف" بن کر یہ کہتے رہیں کہ "صاحبزادے خوب غزل کہی۔ ایسی دانستہ داد کے یہ معنی ہیں کہ ہماری علمی مجالس کا ذوق "علم پسندی" نہیں بلکہ "حماقت پسندی" ہے اس لئے ضرورت ہے کہ ہر طالب علم اور ہر "شاعرزادہ" آئندہ کلامِ غیر کو اپنا کہہ کر نہ پڑھے ورنہ اس پر ہم جو کچھ لکھیں گے اُس کی شدت کے ہم ذمہ دار نہیں

۳ - ایسے شعرا کے نہایت مضحک خاکے اُڑائیں گے جو غزل پڑھنے سے پہلے اور غزل پڑھتے وقت مضحکہ انگیز تکلفات اور لائق استہزا حرکات و اطوار کو اختیار کر کے مجلسی ذوق میں غور و تاثر کی جگہ مذاق اور ہائے وہو کی بیہودگی کو رواج دے رہے ہیں اور یہ سب کچھ اس لئے ہو گا کہ اس زمانہ کو "علم و عقل اور تہذیب و روشن خیالی کا زمانہ" کہتے ہیں، پھر کس قدر شرم ناک بات ہے کہ اس درجہ بیداری میں ہمارا مجلسی رنگ انھیں لایعنی خرافات میں آلودہ رہے جو جہل و بے خبری کے عہد کا نہایت گھناؤنا اور گندہ ورثہ ہے۔

اس گزارش کا مقصد یہ ہے کہ آئندہ مشاعرہ میں "غزل اور شاعر دونوں کو سنبھل کر آنا چاہئے اور ہماری قلمی دیانت و ذمہ داری کی یہی وہ "شرطِ بلاغ" ہے جسے ہم پورے ادب سے پہلے ہی آپ تک پہونچا رہے ہیں کیوں کہ دنیا جانتی ہے کہ ہم خوشامد کے بعد اگر حق کہنے اور حق لکھنے پر آجائیں تو پھر یہ "اپنا علی گڑھ کالج والے تو ایک طرف وہ "آف انڈیا والی گورنمنٹ" تک سے تو ڈرتے نہیں اور یہی تو راز ہے جو علی گڑھ کالج اور علی گڑھ یونیورسٹی والے بھی ہم سے دور ہی دور رہا کرتے ہیں۔

ما علینا الا البلاغ

ملا رموزی

# مصرع طرح

## بے خودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں

## آرزو۔ منشی افتتاح الرحمن صاحب ساکن ڈبائی

قیس مجنوں نہیں، یا وامق و فرہاد نہیں — کون ہے راہِ محبت میں جو برباد نہیں
مدتیں ہوگئیں بجلی کو نشیمن پھونکے — کون کہتا ہے نشیمن مرا برباد نہیں
قصۂ رنج و الم اُن کو سناؤں کیوں کر — ہمتِ نالہ نہیں، طاقتِ فریاد نہیں
پھیر کر خنجرِ برّاں رگِ بسمل پہ کہا — ظلم کرنے سے جو باز آئے وہ جلاد نہیں
رگِ بسمل سے تو لپٹے ہوئے دیکھا تھا ضرور — کتنے ارمان ہوئے ذبح یہ کچھ یاد نہیں
عالمِ نزع تھا گم ہوش تھے، لب پر دم تھا — آئے ہوں گے وہ عیادت کو ہمیں یاد نہیں
کس طرح قیدیٔ زلف اُن کے رہا ہوتے ہیں — آرزو ہم کو یہ ترکیب رہا یاد نہیں

## ابر۔ منشی احمد حسین صاحب انصاری گنوری

اب رہائی کی تمنا ہمیں صیاد نہیں — چھٹ کے جائیں تو کہاں راہِ وطن یاد نہیں
غیر تک تھے مرے ماتم میں مگر آپ نہ تھے — بات کی بات ہی کچھ شکوۂ بیداد نہیں

چھٹنے والوں کی طرف دیکھ کے رو دیتے ہیں ۔ جن اسیروں کی مقرر کوئی میعاد نہیں
مطمئن رہیے کہ پھونکے گی ہمارا ہی جگر ۔ ہو رسا آپ کے در تک وہ فریاد نہیں
داغِ دل تیری شہادت کی ضرورت اب ہے ۔ کہ انھیں حشر کے دن اپنے ستم یاد نہیں
اب یہ لذت کشِ جور آگئے ہوئے سے تھے صیاد ۔ کیوں اسیروں پہ کئی روز سے بیداد نہیں
دیکھ تو چل نہ بسے ہوں کہیں زنداں میں اسیر ۔ آج کیوں رات سے ہنگامۂ فریاد نہیں
یہ گھٹائیں یہ ترشح یہ بہاریں یہ قفس ۔ ہے مقدر کا گلہ شکوۂ بیداد نہیں
سوچ لے پھر کہ اٹھاتے ہیں مری لاش عزیز ۔ اور حسرت تو جفا کی ستم ایجاد نہیں
خونِ رگ رگ نے دیا ہو گئی تکمیلِ جنوں ۔ اب یہ وحشت مری منت کشِ فصاد نہیں

## احسن مارہروی مہتمم مشاعرہ

درسِ عبرت ہے یہ مجبور کی روداد نہیں ۔ لبِ فریاد ہیں وا، طاقتِ فریاد نہیں
ایک بلبل ہی غمِ قید سے ناشاد نہیں ۔ اس زمانے میں خیالات بھی آزاد نہیں
گھر کو بھولا ہوں غریب الوطنی میں ایسا ۔ ہے کدھر راہِ وطن یہ بھی مجھے یاد نہیں
ایک ضرب اُس کی فقط، اس کی ہزاروں خلشیں ۔ ناخنِ غم سے سوا، تیشۂ فرہاد نہیں
اُٹھتے ہیں گنجِ شہیداں سے بگولے بنتے ۔ عالم آباد وہ ہیں عالمِ برباد نہیں
اُن کو معلوم نہیں جذبۂ الفت کیا ہے ۔ اُن کے احساس کی دنیا ابھی آباد نہیں
قسم اپنی، ستم اپنا، مری خواہش، مرا نام ۔ یہی دو چار ہیں باتیں جو انھیں یاد نہیں
غم کی تخلیق مرے ساتھ ہوئی ہے احسن ۔ کون کہتا ہے کہ میرا کوئی ہمزاد نہیں

## احمد۔ محمد احمد صاحب متعلم درجۂ دوازدہم مسلم یونیورسٹی انٹر کالج

گلۂ جور نہیں شکوۂ بیداد نہیں ۔ کچھ خطا اس میں تری اے ستم ایجاد نہیں

اُن کا وعدہ جو اُنھیں یاد دلایا تو کہا — کچھ کہا ہوگا کبھی اب تو مجھے یاد نہیں
برق جب گرتی ہے تب میرے ہی کاشانے پر — ایسا دنیا میں کوئی خانۂ برباد نہیں
سن کے حالِ دلِ پُردرد یہ فرماتے ہیں — کوئی بات اس کے سوا اور تمھیں یاد نہیں
جی میں آتا ہے کہ اس بھول پہ ہو جاؤں فدا — لیکے دل مجھ سے یہ کہتے ہیں مجھے یاد نہیں
اپنے جذبات کا اظہار ہے اس میں احمد — نالۂ قیس نہیں ماتمِ فرہاد نہیں

## اختر۔ سید اختر امام صاحب عظیم آبادی متعلم درجۂ دہم

سبقِ جذبِ محبت سے ہوں اب تک زندہ — کون کہتا ہے کہ برباد ہوں، برباد نہیں
میں ہوں اُجڑا ہوا گلشن جسے ویراں کہئے — جس طرف دیکھئے دنیا مری آباد نہیں
خواب میں ایک جھلک دیکھی تھی اُن کی لیکن — بخدا اس کے سوا کچھ بھی مجھے یاد نہیں
میں تری راہ میں مجذوب بنا آخر کار — "بے خودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں"
بے کہے حالِ دل اختر انھیں معلوم ہے سب — عاشقی میں ہمیں کچھ حاجتِ فریاد نہیں

## اختر۔ فیاض احمد صاحب بھوپالی متعلم درجۂ دوازدہم مسلم یونیورسٹی کالج

جرأتِ ضبط نہیں، ہمتِ فریاد نہیں — اور یہ کیا ہے جو دنیا مری برباد نہیں
گلۂ بخت نہیں، شکوۂ صیاد نہیں — ہم اسیرانِ جنوں خوگرِ فریاد نہیں
ضبطِ گریہ نہیں، پابندیِ فریاد نہیں — قیدیوں کو ابھی آدابِ قفس یاد نہیں
پھر اسیرِ غمِ گلچین و ہوائے گل ہوں — میں رہا ہو تو گیا ہوں مگر آزاد نہیں
یا وہ حالت کہ نظر میں تھی ہر اک منزلِ دشت — یا یہ عالم کہ مرا گھر بھی مجھے یاد نہیں
طور کیا، عرش سہی، حسنِ طلب ہو تسکین — پھر کوئی سعیِ نظر حسرتِ برباد نہیں
دل کی افسردگیِ ذوق، الٰہی توبہ — کوئی جذبہ نہیں ایسا کہ جو برباد نہیں

کیا کہوں تم سے کہ افسانۂ ہستی میرا — ہے وہ قصّہ کہ کہیں سے بھی مجھے یاد نہیں

یہ بھی عرفانِ حقیقت ہے کہ خوابِ ہستی — یاد رکھنے کی تھی اک چیز مگر یاد نہیں

کیوں ہیں اخترؔ یہ زمانے کی فضائیں خاموش — کیا چمن میں کہیں ہنگامۂ فریاد نہیں

## اصغرؔ۔ مولوی محمد اصغر صاحب گونڈوی

اللہ اللہ رے ساقی تری صہبائے الست — تیرے مستوں کو وہ پیمانِ وفا یاد نہیں

یوں بھی کچھ روز محبت میں گزر جائیں گے — میں انھیں یاد نہیں ہوں وہ مجھے یاد نہیں

## امجدؔ۔ محمد امجد علی صاحب (علیگ) انسپکٹر خفیہ پولس حیدرآباد دکن

آہ کا حکم نہیں، رخصتِ فریاد نہیں — حسن بیداد جو کر جائے وہ بیداد نہیں

ہجر میں پائی وہ تکلیف کہ سب بھول گیا — اب یہی یاد کا عالم ہے کہ کچھ یاد نہیں

دل میں آتے جو نہیں آپ یہ باعث کیا ہے — آپ کا گھر ہے مگر آپ سے آباد نہیں

سوزشِ غم سے جلا جاتا ہوں میں صورتِ شمع — آہ لب پر نہیں، نالہ نہیں، فریاد نہیں

اُس نے اس ناز سے پامال کیا تربت کو — ہے مجھے ناز کہ مٹی مری برباد نہیں

جان و دل تاب و تواں ہوش و خرد ہیں راہی — ایک اُمید ہی باقی ہے جو برباد نہیں

آشیاں رکھتے ہیں ہم گلشنِ آزادی میں — خوفِ گلچیں نہیں امجدؔ غمِ صیاد نہیں

## انورؔ۔ محمد قمر الدین صاحب متعلم مسلم یونیورسٹی کالج

خوگرِ جور رہوں اتنا مجھے کچھ یاد نہیں — ظلم کچھ باقی ہیں یا اب کوئی بیداد نہیں

چاہیئے جذبۂ صادق جو پلٹ دے تقدیر — عشق کچھ منحصرِ نالہ و فریاد نہیں

حسن کی شان کہ ہو آہ و فغاں سے پیدا — میری عادت ہے کہ میں خوگرِ فریاد نہیں

خلشِ عشق ہی کافی ہے مرے دل کے لئے — تم نے کیا خوب کہا، تجھکو مری یاد نہیں

جب سے تم نے رخِ تاباں سے اٹھائی ہے نقاب — بے خودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں

ہے تعجب ترے در پر بھی نہ نکلیں ارماں — تیرا کوچہ ہے کوئی جنتِ شداد نہیں

قید میں ہو گئی اتنی ترے گھر سے الفت — یاد اب سیرِ چمن بھی مجھے صیاد نہیں

آگیا اب تو ہمیں لطفِ اسیری انور — غم بے بال و پری اب مجھے صیاد نہیں

## بسمل ۔ محمد احمد صاحب بی اے متعلم ایم اے مسلم یونیورسٹی

شاد کب تھا جو کہا تو نے کہ ناشاد نہیں — یہ ترا حسنِ نظر ہوگا مجھے یاد نہیں

کیا کہوں ہجر میں کیوں جرأتِ فریاد نہیں — سامنے تو ہے تصور میں تری یاد نہیں

آتی ہے بوئے چمن مجھکو قفس سے پیہم — شاخِ گل کی تو کہیں تیلیاں صیاد نہیں

پوچھئے آپ نہ رودادِ محبت مجھ سے — داستاں یاد تو ہے طرزِ بیاں یاد نہیں

میں قفس میں ہوں، چمن میں ہے مرا پائے نظر — میری فطرت تو ہے آزاد میں آزاد نہیں

میری آنکھوں میں ہیں یا مرے دامن پہ رہیں — قطرۂ اشکِ تمنا کہیں برباد نہیں

عالمِ یاس تو ہر لحظہ ہے ہنگامہ طلب — ہاں مگر شوق کی دنیا کہیں آباد نہیں

بابِ لعنت میں ہوں اک نکتۂ رنگیں بسمل — میری ہستی کا فسانہ نہیں روداد نہیں

## آصف صاحب

گلۂ جور نہیں، شکوۂ بیداد نہیں — پیکرِ درد ہوں لیکن لبِ فریاد نہیں

حسن کو آپ ہوا اپنا تماشا منظور — اور کچھ باعثِ ہنگامۂ ایجاد نہیں

عشق میں حوصلۂ صبر ہے شرطِ اول — کس کو معلوم زیاں کاریٔ فرہاد نہیں

مختصر ہے یہی افسانۂ ایامِ شباب — خواب تو اک نظر آیا تھا مگر یاد نہیں

لذتِ درد خدا حافظ و ناصر تیرا
وہ ستم کیش اب آمادۂ بیداد نہیں

آج گردش میں ہیں بلائے قفس کچھ تنکے
آشیاں ہی تو یہ میرا کہیں صیّاد نہیں

جذبۂ شوقِ شہادت کا بُرا ہو یا رب
دیکھ کر میرا لہو ہوش میں جلّاد نہیں

روز دنیا سے سفر کرتے ہیں جانے والے
پھر بھی بستی عدم آباد کی آباد نہیں

کیوں تأسف کو نگاہوں سے گرایا تُو نے
بے وفا کیا تجھے پیمانِ وفا یاد نہیں

## توحید - سیّد الٰہ بخش صاحب متعلم بی ٹی کلاس

ناشکیبائی کی مجرم مری فریاد نہیں
دل کی عادت ہی یہی شکوۂ بیداد نہیں

دل نشیں جب سے ہے تصویرِ ستمگر تیری
اشک رکتے نہیں تھمتی کبھی فریاد نہیں

چٹکیاں لیتی ہیں رہ رہ کے ادائیں تیری
جو نکل جائے مرے دل سے یہ وہ یاد نہیں

تیرے جلوے ہی سے روشن ہے شبستانِ خیال
دل وہ تاریک ہے جس دل میں تری یاد نہیں

وہ ارادہ ہی نہیں جس میں نہ ہو استقلال
وہ عمارت نہیں جس کی کوئی بنیاد نہیں

غم ہے مضمر مری ہر ایک خوشی میں توحید
زخم کی طرح میں خنداں ہوں مگر شاد نہیں

## جگر مرادآبادی

نالہ پابندِ نفس ہے دلِ ناشاد نہیں
یہ تو فریاد کی توہین ہے فریاد نہیں

اب یہ کیا بات کہ آباد نہیں شاد نہیں
دل گزرگاہ تری ہے تجھے کیا یاد نہیں

آنکھ کہہ دے جسے وہ عشق کی روداد نہیں
دل سے آ جائے جو لب تک مری فریاد نہیں

ہم وہ مدہوشِ ازل ہیں کہ الٰہی توبہ
دل سے کیا کہہ کے چلے تھے ہمیں کچھ یاد نہیں

مستیٔ غم کا ہے ادراک جسے کہتے ہیں درد
ہستیٔ دل کا ہے احساس تری یاد نہیں

آنکھ غافل ہے کہ ہے تشنۂ دیدار ہنوز
دل ہے آگاہ کہ تو خود ہے تری یاد نہیں

پھونک دے قیدِ تعین کو بھی اے برقِ جمال — دل ہے آزاد نگاہیں ابھی آباد نہیں
تم نے کیوں انجمنِ ناز میں تیور بدلے — دل دھڑکنے کی صدا ہے کوئی فریاد نہیں
غم سلامت ہے تو کرلے گا بہت دل پیدا — سچ کہا آپ نے ہستی تری برباد نہیں
دور ہے منزلِ عرفانِ خودی اور یہاں — "بے خودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں"
مجھ سے اے دوست مری برہمیٔ شوق نہ پوچھ — بھول جانے کے سوا اب مجھے کچھ یاد نہیں
دل ہو یا ذوقِ طلب یا نگہِ حسنِ شباب — کوئی آزاد نہیں روح جو آزاد نہیں
ہاں غمِ یار ترے دم سے ہے تعمیرِ حیات — تو سلامت ہے تو ہستی مری برباد نہیں
مختصر ہے مری ہستی کی حقیقت یہ جگر — مجھ میں آباد ہیں سب میں کہیں آباد نہیں

## حامد ۔ حامد سعید صاحب بھوپالی

چشمِ تر منفعلِ شکوۂ بیداد نہیں — یہ مرے ضبط کی اک موج ہے فریاد نہیں
وجہِ تسکیں نظرِ عالمِ ایجاد نہیں — یاں وہ جلوے نہیں وہ حاصلِ فریاد نہیں
رنگِ بربادیٔ کاشانۂ ہستی توبہ — اور در و دیوار کا خاکہ بھی مجھے یاد نہیں
نالۂ بلبلِ بے تاب ہے یا نغمۂ نے — میری فریاد کے آگے کوئی فریاد نہیں
اڑنے والے تو قفس توڑ کے اڑ جاتے ہیں — ان کو پروائے نگہبانیٔ صیاد نہیں
دیکھنا ذوقِ اسیری کہ غلامانِ جنوں — اس قدر خوش ہیں قفس میں کہ چمن یاد نہیں
ان فضاؤں میں پریشانِ جنوں پھرتا ہوں — ایک نغمہ بھی جہاں حاصلِ فریاد نہیں
نقش ہے دل پہ ہر اک حادثۂ ردِ سوال — اب یہ صرف آپ کی خاطر ہے جو کچھ یاد نہیں
بے حسی کا یہی عالم ہے تو اے اہلِ قفس — ہے یہ وہ قید کہ جس کی کوئی میعاد نہیں
کیا مٹائے گا وہ کافر کہ ہماری ہستی — وہ حقیقت ہے جو مٹنے پہ بھی برباد نہیں
حسنِ معصوم تو ہے صرفِ تبسم حامد — دلِ ناشاد اگر شاد نہیں شاد نہیں

## حزیںؔ۔ صلاح الدین صاحب متعلم درجۂ دہم

ضبط کی تاب مجھے اے دلِ ناشاد نہیں — چھیڑتا کیوں ہے کہ اب طاقتِ فریاد نہیں
اس قدر رنج و مصیبت کا ہوں عادی ہمدم — کہ مجھے قید میں بھی شکوۂ صیاد نہیں
میں وہ اک ہستیٔ ناکام ازل ہوں کہ مجھے — باعثِ رنجشِ اربابِ وفا یاد نہیں
وائے ناکامیٔ قسمت کہ ہم ایسے ڈوبے — بدنصیبی ہے مصیبت میں خدا یاد نہیں
رحم کر رحم مرے حال پہ اے چرخِ بریں — یہ دل و جانِ حزیں درخورِ بیداد نہیں

## حسرتؔ۔ سید فضل الحسن صاحب موہانی

شکرِ الطاف نہیں شکوۂ بیداد نہیں — کچھ ہمیں تیری تمنا کے سوا یاد نہیں
گیسوئے دوست کی خوشبو ہے دو عالم کی مراد — ہے یہ وہ نکہتِ برباد کہ برباد نہیں
محوِ گل ہے یہ عنادل کہ چمن میں گویا — خوفِ گلچیں کا نہیں خطرۂ صیاد نہیں
جان کر دی تھی کسی نے ترے قدموں پہ نثار — یہ بھی تو بھول گیا یہ بھی تجھے یاد نہیں
تجھ سے یا تیری محبت سے اُسے کیا سروکار — دل جو ناکام نہیں روح جو ناشاد نہیں
شکوۂ چرخِ جفا جو سے گزر کر جو کہے — کچھ تجھے بھی یہ مجالِ لبِ فریاد نہیں
قیدِ مذہب سے بھی کچھ بڑھ کے ہے قیدِ غمِ عشق — حسرتؔ آزاد ہے کہنے ہی کو آزاد نہیں

## حناؔ۔ سید نونہال مہدی صاحب متعلم درجۂ ہم انٹر کالج علی گڑھ

عادتِ شکوہ نہیں خوگرِ فریاد نہیں — تیرا جانباز ہوں آزردۂ بیداد نہیں
قتل ہونے میں تو حجت بھی مجھے جلاد نہیں — قابلِ حلق گر خنجرِ بے داد نہیں
نام ہی نام ہے حریت و آزادی کا — حال یہ ہے کوئی آزاد بھی آزاد نہیں

شور نالوں کا شبِ ہجر جو ہو جاتا ہے
یہ بھی اک یاد ہے اس کی کوئی فریاد نہیں

محوِ حیرت تھا تصور میں شبِ غم اتنا
میں تھا یا آپ کی تصویر تھی کچھ یاد نہیں

اے حنا جس کو سناتا ہے وہ سن لیتا ہے
گوشِ نااہل کے قابل مری فریاد نہیں

## دیوانہ - محمد فاروق صاحب

کہہ رہے کیا ہو کہ مجنوں نہیں فرہاد نہیں
مجھکو دیکھو تو بھلا میں بھی تمھیں یاد نہیں

تم کو جس دن سے غرض میری وفا سے نہ رہی
بس اسی دن سے مجھے شکوۂ بیداد نہیں

کل کے وعدوں کے بھلاوے یہ ہیں سے کیا خوب
اور تم کل جو یہ کہدو کہ مجھے یاد نہیں

ہاں نہیں ہے تو نہیں پیرویٔ رسمِ خلیل
ورنہ نمرود نہیں ہم میں کہ شداد نہیں

بے خودی کا یہ تقاضہ کہ خدا بن بیٹھوں
"بے خودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں"

میرے ہونے ہی سے وابستہ ہے سب کا ہونا
جس گھڑی میں نہیں یہ عالمِ ایجاد نہیں

آج کی بات کو کیوں کل پہ اٹھا رکھا ہے
کل اسے کہتے ہیں جس کی کوئی میعاد نہیں

نفی کے بعد اب اثبات کہاں سے لاؤں
اپنی ہستی نہیں اور غیر کی بنیاد نہیں

خود قفس توڑیئے صیاد کے وعدے کیسے
جن میں ہمت ہے وہ منت کشِ امداد نہیں

## رازؔ - راز صاحب چاندپوری

قصۂ حسن نہیں عشق کی روداد نہیں
حیف وہ بزم جو اس ذکر سے آباد نہیں

موردِ رنج و الم کشتۂ بیداد نہیں
وائے بر عیشِ جہاں! مجھکو خدا یاد نہیں

ہم صفیرانِ چمن واہ یہ پرسش یہ کرم
اب مجھے شکوۂ بے مہریٔ صیاد نہیں

میں ہوں ناشادِ ازل خیر مگر حیرت ہے
عشرت آباد جہاں میں بھی کوئی شاد نہیں

قصۂ جورِ فلک شکوۂ ایامِ زبوں
ایک افسانہ ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں

سر فروشانِ محبت پہ خدا کی رحمت
مدعی سب ہیں مگر ایک بھی فرہاد نہیں

واہ اے منظرِ خوش وقتیٔ منزل قرباں
دشتِ غربت کے مصائب بھی مجھے یاد نہیں

میں خطاوار مگر تیرے کرم کے صدقے
ایک مجبور تو یوں مستحقِ داد نہیں

راز یہ نامۂ احسن یہ پیامِ عزت
وائے تقدیر کہ میں آج بھی آزاد نہیں

## رضی ۔ رضی احمد صاحب بدایونی

ہمتِ ضبط نہیں طاقتِ فریاد نہیں
لطفِ بیداد بہ اندازۂ بیداد نہیں

حشر میں داد طلب کشتۂ بیداد نہیں
تھے ستم اتنے کہ تفصیلِ ستم یاد نہیں

بے اثر جلوۂ گل نغمۂ بلبل بے کیف
اب وہ رنگِ چمنِ عالمِ ایجاد نہیں

ہوش اتنا ہے اٹھی تھی رخِ روشن سے نقاب
کیا ہوا اس کے سوا پھر مجھے کچھ یاد نہیں

نہ نشانِ کفِ پا ہوں نہ غبارِ سرِ راہ
مجھسا دنیائے طلب میں کوئی برباد نہیں

حسن ہے ہفت نظر ذوقِ تماشا محدود
عام ہے جلوہ ۔ نگاہیں مگر آزاد نہیں

ہو محبت میں جو شرمندۂ احسانِ اثر
آہ میں آہ وہ فریاد میں فریاد نہیں

اے ستم پیشہ یہ اندازِ تغافل کب تک
کیا تجھے اور کوئی طرزِ ستم یاد نہیں

قید سے شاید اسیرانِ جنوں چھوٹ گئے
آج زنداں میں وہ ہنگامۂ فریاد نہیں

خاک میں مل کے ملی منزلِ مقصود رضی
غیر مشکور مری کوشش برباد نہیں

## رواں صاحب

اُن سے پوچھے کوئی یہ کیا ہے جو بیداد نہیں
منہ پہ کہتے ہیں کہ واں کون تھا کچھ یاد نہیں

روح کیا روح جو ہو قیدیٔ زندانِ حیات
دل ہے کیا دل جو غمِ دہر سے آزاد نہیں

نعمتیں سب مرے خالق نے عطا کی ہیں مجھے
پھر بھی دل کو یہ قلق ہے کہ میں آزاد نہیں

اب خزاں آئے چمن میں کہ رہے فصلِ بہار
مجھ سے کیا واسطہ جب دل مرا آزاد نہیں

یہ تو ہے بات ہی کچھ اور کہ میں کچھ نہ کہوں
ورنہ کیا مجھ پہ جو گزری ہے مجھے یاد نہیں

مایۂ روح ہے ایامِ گزشتہ کا خیال
حیف کچھ ایسی بھی باتیں ہیں کہ کچھ یاد نہیں

یادگاریں دلِ مردہ کی ہیں سوہانِ حیات
شکر ہے ایسے بھی کچھ رنج تھے جو یاد نہیں

وقت جو یاد ہے اب تک اسے ضائع نہ کہو
ہاں وہ ضائع ہوا جو وقت کہ اب یاد نہیں

سب جنھیں سمجھے ہیں قیدی وہ نہیں ہیں قیدی
جن کو سب کہتے ہیں آزاد وہ آزاد نہیں

آخر امکانِ وفا کی کوئی تدبیر بھی ہے
تم تو ہر وعدے کو کہتے ہو ہمیں یاد نہیں

دیکھیں گرتی ہے قفس پر کہ چمن پر بجلی
آج یا میں ہی نہیں یا مرا صیاد نہیں

اپنا اپنا یہ مقدر ہے شکایت کیسی
سارا عالم تو ہے مسرور رواں شاد نہیں

## رہبر۔ شجاعت اللہ خاں صاحب حیدرآبادی

روز کرتے ہیں وہ پامال مری تربت کو
شکر کی جا ہے کہ مٹی مری برباد نہیں

اس کے دامن پہ تو کچھ لختِ جگر برساتا
تجھکو رونا بھی ذرا دیدۂ تر یاد نہیں

لطف دیتی ہے جفا یار کی اب تو رہبر
اس کی بیداد بھی حق میں مرے بیداد نہیں

## ریاض۔ لسان الملک سید ریاض احمد صاحب خیرآبادی

نازنیں جان بھی لیں تو کوئی بیداد نہیں
چوڑیاں ہاتھ میں ہیں خنجرِ فولاد نہیں

لے نسیمِ سحری ساتھ لئے جا سوئے بام
نفسِ سرد ہے نامہ نہیں فریاد نہیں

سبز باغ آپ دکھائیں نہ اب آزادی کے
آپ کے باغ میں تو سرو بھی آزاد نہیں

چپکے ہیں کچھ مری آغوش میں وہ جشن کے دن
یہ وہی ہیں جنھیں پیمانِ وفا یاد نہیں

شورِ قلقل میں گم آوازِ دعا ہے اے شیخ
یہ بہت خوب کہی میکدہ آباد نہیں

ایک اک پھول کو ایک ایک کلی کو دیکھا
ہار میں ان کے ہمارا دلِ ناشاد نہیں

نکلی ہیں حشر میں دنیا کی پرانی باتیں
میں تو کیا میرے فرشتوں کو بھی اب یاد نہیں

نہ گری برق مگر آپ گرے غش کھا کر
یہ تو لے حضرتِ موسیٰ کوئی افتاد نہیں

جس سے آتا تھا نشیمن میں قفس کا کچھ لطف
تیرے قربان تری آنکھ وہ صیاد نہیں

دل سے نکلی ہے یہ دل ہی میں رہے گی ظالم
جاکے دیوار سے ٹکرائے وہ فریاد نہیں

یہ بہت ہے جو رہے دل پہ حکومت قائم
آج قبضہ میں اگر بصرہ و بغداد نہیں

حد سے آگے نہ بڑھے دیکھئے مژگانِ دراز
چھیڑنے کے لئے کم نشترِ فصاد نہیں

شعرا آپ کو بھی خوب بناتے ہیں ریاضؔ
سب یہ کہتے ہیں کوئی آپ سا استاد نہیں

## زاہدؔ۔ آفتاب علی خاں صاحب متعلم درجۂ دہم

وائے قسمت مرے نالے شررِ آباد نہیں
اب یہ فریاد ہی میں قابلِ فریاد نہیں

کھینچکر لایا ہے خود مجھکو مقدر میرا
اس میں تقصیر تری اے مرے صیاد نہیں

ستم آموزیٔ معشوق ہے اک شیوۂ عشق
یہ ترا جور۔ ستمگر تری ایجاد نہیں

## ساغرؔ۔ صمد یار خاں صاحب نظامی سیمابی (علیگ)

دشت میں قیس نہیں کوہ پہ فرہاد نہیں
ہے وہی عشق کی دنیا مگر آباد نہیں

رسمِ الفت میں روا شکوۂ بیداد نہیں
یعنی کم ظرفیٔ جذبات ہے فریاد نہیں

کب کیا شکوۂ بیداد مجھے یاد نہیں
کہوں کس دل سے کہ میں تشنۂ بیداد نہیں

وہ مری خاک نشینی کے مزے کیا جانے
جو مری طرح تری راہ میں برباد نہیں

ڈھونڈنے کو تجھے او میرے نہ ملنے والے
وہ چلا ہے جسے اپنا بھی پتا یاد نہیں

نہ وہ آہیں نہ وہ نالے نہ وہ بیتابیٔ شوق
اب بھلا سا مرا عالم ایجاد نہیں

ایک زنجیرِ طریقت میں بندھے ہیں دونوں — عشق پابند نہیں حسن بھی آزاد نہیں
عرش والے نہ سنیں ساری خدائی سن لے — اس قدر پست مذاقِ لبِ فریاد نہیں
اپنی ایجاد پہ ہے ناز مگر حال یہ ہے — فلسفہ بے خبرِ عالمِ ایجاد نہیں
روحِ بلبل نے خزاں بن کے اجاڑا گلشن — پھول کہتے رہے ہم پھول ہیں صیّاد نہیں
حسن سے چوک ہوئی اس کی ہے تاریخ گواہ — عشق سے بھول ہوئی ہو یہ مجھے یاد نہیں
خیر ہلکی اپنی جفاؤں کی ستم کی ہم کی — آخری تیر ہے ظالم مری فریاد نہیں
بربطِ ماہ پہ مضرابِ فغاں رکھدی تھی — میں نے اک نغمہ سنایا تھا تمھیں یاد نہیں
قفس و بلبل و گل سب ہیں یہ فانوسِ خیال — تیری ہستی سے زیادہ کوئی صیاد نہیں
کھول قاموسِ محبت ورقِ عشق الٹ — حسن کو معنیٔ یک لفظِ وفا یاد نہیں
لاؤ اک سجدہ کردں عالمِ بدمستی میں — لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں

## ساغر۔ محمد خلیل صاحب صدیقی سیمابی اکبرآبادی پرائیوٹ طالب علم ایف اے کلاس

آہ کرنے کا طریقہ بھی مجھے یاد نہیں — ہیں اسی سوچ میں آمادۂ فریاد نہیں
آپ کے جور کی ہر شان حریفِ راحت — میری روداد کا اک لفظ بھی روداد نہیں
گمرہِ دشتِ محبت ہوں مگر بھول یہ ہے — وہ مجھے یاد نہیں یا میں اُسے یاد نہیں
دل گرفتارِ مصائب ہے نگاہیں غمگیں — بحرِ ہستی سے سفینہ مرا آزاد نہیں
خون رُوتا ہوں میں تھامے ہوئے اپنے دل کو — سُننے والا کوئی مجبور کی فریاد نہیں
یاد آتے وعدۂ رحمت کی دلاتے ہیں مگر — ہم بھی کچھ کہہ کے چلے تھے یہ ہمیں یاد نہیں
حسن کی بات پڑھے میں یہ سمجھ کر چپ ہوں — تم سمجھ لو کہ مجھے جرأتِ فریاد نہیں
ان کی محفل میں اگر جاؤں تو کیوں کر جاؤں — ابھی دامانِ تمنا مرا آباد نہیں
فطرتِ حسن میں کچھ بھول ہے ایسی ساغر — میں ہوں انداز ستم قتل بھی نہیں یاد نہیں

## سیماب - مولوی عاشق حسین صاحب اکبر آبادی

عزمِ فریاد! نہیں اے دلِ ناشاد نہیں
مسلکِ اہلِ وفا ضبط ہے فریاد نہیں

حاصلِ عشق بجز خاطرِ ناشاد نہیں
یہ غنیمت ہے کہ محنت مری برباد نہیں

شرطِ شبنم سے نہیں ربطِ شمیم و نکہت
شبنم آوارہ ہے پھر یہ کہ چمن زاد نہیں

غم کی حد یہ ہے کہ احساسِ خوشی تک شل ہے
ابھی شائستۂ تسکیں دلِ ناشاد نہیں

انھیں بکھرے ہوئے پھولوں میں ہمارا دل تھا
تجھے اے خانہ پری زادِ چمن یاد نہیں

اے مری قیدِ تمنا کے بڑھانے والے
غیر محدود ترے حسن کی میعاد نہیں

خلوتِ عرصۂ غربت کی یہ ویرانی دیکھ!
ہے جہاں تک مری دنیا کوئی آباد نہیں

دل کی تجدید کا تھا عزم مگر کیا کہئے
فکرِ تخلیق میں گنجائشِ ایجاد نہیں

بزمِ افسانہ کرد ختم، جوانی گزری
قابلِ ذکر اب آگے کوئی روداد نہیں

عشق بر ہر قدمے حسن بر اہے گا ہے
مجھے شیریں کا قلق ہے غمِ فرہاد نہیں

موت ہے روح کی معراج تو پھر اے سیماب
یہ غلو ہے مری دانست میں افتاد نہیں

## شمیم - سید محمد مرتضیٰ صاحب بھوپالی

حسن کا ذکر نہیں عشق کی روداد نہیں
اب وہ ہنگامۂ جاں بازیٔ فرہاد نہیں

عالمِ کیف محبت میں نیا عالم ہے
بے خودی ڈھونڈتی پھرتی ہے کسے یاد نہیں

ہوسِ سیر و تماشائے چمن کیا کیجے
شاہدِ دہر نہیں اسبابِ طرب زاد نہیں

کاشفِ پردہ ہیں تمکینِ نظر کے انداز
مقصدِ شوق تنک ظرفیٔ فریاد نہیں

دل جگر پھونک دیئے آتشِ غم نے آخر
جو ہوا لاہے بجز صورتِ برباد نہیں

نالہ ہم دوشِ اثر عرش بریں پر ہو جائے
یہ مقدر نہیں ایسی لبِ فریاد نہیں

حسن در پردہ ہے آمادۂ رعنائیٔ شباب — کون حیرت زدۂ شوخیٔ ایجاد نہیں
عرش سے خاص اُترتے ہیں مضامین شمیم — طبعِ موزوں کے لئے حاجتِ استاد نہیں

## شورؔ۔ منظور حسین صاحب

اب دلِ رنج طلب کیوں خلشِ آباد نہیں — یہ تری مشق گہِ ناز ہے کیا یاد نہیں
عشق میں نالۂ فریاد مجھے یاد نہیں — مجھکو منظور تنک ظرفیٔ فرہاد نہیں
شاد کب ہے دلِ پُر درد جو ناشاد نہیں — تم نے جو دل پہ جفا کی تھیں کیا یاد نہیں
تم اسے سن کے پریشاں نہ کہیں ہو جانا — دل کا احوال ہے افسانۂ فرہاد نہیں
ہے جو تصویر کشِ حیرتِ ناکامیٔ عشق — کوئی مانی نہیں ایسا کوئی بہزاد نہیں
ناز سے اُس نے سرِ بزم کبھی دیکھا تھا — اس قدر یاد ہے کچھ اور مجھے یاد نہیں
لب پہ اک آہ تو وہ بھی نفسِ سوختہ ہے — یہ کوئی تیری نگاہِ شرر آباد نہیں
رو کشِ تارِ نگہ رہتا ہے ہر تارِ نفس — سانس تک مخمصۂ یاس سے آزاد نہیں
عمر سی عمر غم و رنج میں برباد ہوئی — شورؔ بے وجہ دلِ غم زدہ ناشاد نہیں

## شورؔ۔ غلام مرتضیٰ صاحب مرادآباد

آپ کی داد بھی بے داد ہے کچھ داد نہیں — اتنا انبوہِ شکایت ہے کہ تعداد نہیں
قتلِ عالم کے لئے تیغِ نظر ہے کافی — آپکے ہاتھ میں گو خنجرِ فولاد نہیں
ستم و جور سے کس طرح میں نالے کرتا — خوگرِ ضبط ہوں اندازِ فغاں یاد نہیں
جب کہا میں نے کہ اقرارِ وفا بھول گئے — ہنس کے فرمایا کہ ہاں یاد نہیں یاد نہیں
جذبِ دل نے تو کہیں کا بھی نہ چھوڑا مجھکو — بیخودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں
کیا سبب سیکڑوں بے سر ہیں ہزاروں بسمل — دستِ قاتل میں مگر خنجرِ فولاد نہیں

شورِ محشر میں اٹھا ہے کہ کوئی آتا ہے　　روبرو دان کے مجھے ہمتِ فریاد نہیں

## صفی - سید صفی محمد صاحب جعفری طالب علم درجۂ نہم مسلم یونیورسٹی انٹر کالج

آج قابو میں دلِ مضطر و ناشاد نہیں　　"بے خودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں"

آرزو کرتا ہے بیدرد نرالی پیدا　　میرے دل سا کوئی ظالم ستم ایجاد نہیں

بیکسی کا ہو بھلا جس نے کیا ہے تنہا　　پاس مونس نہیں ہمدم نہیں ہمزاد نہیں

درد بے چوٹ کے پیدا نہیں ہوتا ہرگز　　لب پہ بے درد کے آتی کبھی فریاد نہیں

## ضیا - مولوی ضیا احمد صاحب ایم اے لکچرر انٹر کالج

غم نہیں۔ تجھکو اگر طرزِ وفا یاد نہیں　　شائی جور ہو ایسا دلِ ناشاد نہیں

ساز آہنگِ شکایت لبِ فریاد نہیں　　ناز جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں

ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

گرچہ الفت کا ہے دنیا سے نرالا اسلوب　　مگر اچھی نہیں ایسی بھی تلاشِ محبوب

اہلِ غیرت کو یہ شیوہ نہیں ہرگز مرغوب　　عشق و مزدوری عشرت گہِ خسرو کیا خوب

ہم کو تسلیم نکونامیِ فرہاد نہیں

رنجِ غربت سے ہو کیا خاطرِ وحشی مغموم　　جس جگہ جائے کوئی ساتھ ہے اس کا مقسوم

یہی تنہائی یہی حسرت و حرماں کا ہجوم　　کم نہیں وہ بھی خرابی میں یہ سب معلوم

دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

کامیابی کا ہے ہر کوششِ ناکام سبب　　سست کیا ہو قدمِ ہمتِ دشوار طلب

ہے ہر افتادِ مصائب سبق آموزِ ادب　　اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب

ہے موج کم از سیلیِ استاد نہیں

واہ کیا خوب ملی شرطِ محبت کی جزا — شکر اس قدر شناسی کا ہو کس منہ سے ادا
ادبِ حسن سے ہم تو نہیں کرتے نالا — وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

سچ تو محوِ فغاں بلبلِ نالاں کیوں ہے — چشمِ شبنم سے بپا اشک کا طوفاں کیوں ہے
صرفِ تاراجِ خزاں حسنِ گلستاں کیوں ہے — رنگِ تمکینِ گل و نالہ پریشاں کیوں ہے
گر چراغاں بہ سرِ رہگذر آباد نہیں

میں نے مانا کہ ستم ہے غمِ غربت غالب — تھی وطن ہی میں مگر کون سی راحت غالب
کچھ ضیا سے تو کرو شرحِ حقیقت غالب — کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

## طاہر۔ طاہر حسین صاحب زبیری متعلم انٹر کالج مسلم یونیورسٹی

چمنِ دہر میں کوئی بھی تو آزاد نہیں — پا بگل سرو ہے قمری نہیں شمشاد نہیں
مئے الفت سے ہوں سرشار نہیں ہوش مجھے — "بے خودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں"
اس میں ترتیبِ ادب ہوش و خرد کا کیا کام — بزمِ مے ہے یہ کوئی محفلِ میلاد نہیں
لطف تو یہ ہے ستم توڑتے جاتے ہیں مگر — پھر بھی کہتے ہیں یہی ہم ستم ایجاد نہیں
دیکھ لو دیکھ لو مرقد ہے تمناؤں کا — خانۂ دل مرا برباد ہے آباد نہیں
لذتِ درد کا خوگر مجھے پا کر اُس کا — یہ نیا ظلم ہے اب مائلِ بیداد نہیں
ٹوٹنے کی ہے صدا شیشۂ دل کی میرے — تم کو دعویٰ کا ہوا دیکھو تو یہ فریاد نہیں
اب جو اٹھے مرے سینے سے ہوا ہی اٹھے — تاب اٹھنے کی تو مجھ میں ستم ایجاد نہیں
نالۂ شام و سحر سے نہ پریشاں ہونا — یہ تو دنیا پہ فریاد ہے فریاد نہیں
آج اس بت نے جو آنے کا کیا ہے وعدہ — "بے خودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں"

حسن فانی ہو تو ہے عشق بھی فانی ظاہر — اب جو شیریں نہیں دنیا میں تو فرہاد نہیں

## عارف - سید محمد عارف صاحب فاطمی ملیح آبادی میرس ہوسٹل یونیورسٹی

دل وہ آباد نہیں جس میں تری یاد نہیں — ہے وہ کافر جو تری راہ میں برباد نہیں
مسلکِ عشق کے قانون ہیں ادروں کے لئے — مجھکو تو تیرے سوا اور ہی کچھ یاد نہیں
لذتِ درد میں ملتا ہے مزا مجھکو سوا — تیری بیداد مرے واسطے بیداد نہیں

## سید عبدالحی صاحب جونیر بی اے ۳۰ عثمانیہ

مژدہ اے مرغِ چمن باغ میں صیاد نہیں — دیکھ فریاد نہ کر موسمِ فریاد نہیں
دید کے لطف اٹھاتا ہوں مزے لیتا ہوں — عاشقِ حسن ہوں میں مائلِ فریاد نہیں
آپ سنئے تو سہی دل نہ پریشاں کیجے — قصۂ دردِ جگر شاملِ رودا د نہیں
ظلم کی جور کی اک حد بھی ہوا کرتی ہے — آخر انسان ہوں پتھر نہیں فولاد نہیں
یا الٰہی مری مشکل کو تو آساں کردے — صبر کی تاب نہیں، طاقتِ فریاد نہیں
خلشِ دردِ جگر وجہِ تسلی کیا ہو — میری فریاد سے خوش بانیٔ بیداد نہیں

## عزیز - عبدالعزیز صاحب پوری

قابلِ رحم نہیں لائقِ بے داد نہیں — اک معمہ ہے مری ہستیٔ ناشاد نہیں
یاد ہے جلوۂ بے باک کی شوخی لیکن — دل پہ کیا گزری تھی یا رب یہ مجھے یاد نہیں
ہائے اس پیکرِ پابندِ الم کی حالت — جو غریب اپنے خیالوں میں بھی آزاد نہیں
کچھ نہیں جوشش فراوانیٔ امواجِ بہار — دل کی رگ رگ پہ اگر نشترِ فصاد نہیں
ہم نفس قصۂ رنگینیٔ عنوانِ شباب — خواب کی طرح سے کچھ یاد ہے کچھ یاد نہیں

جن پہ موجوں کی یہ جرأت ہے گناہِ الفت — تم یہ سمجھو کہ اسے طاقتِ فریاد نہیں

میں تری بزم میں خاموش نہ رہتا لیکن — ایک تصویر ہوں اور طاقتِ فریاد نہیں

کیا کہوں قصۂ ہستی کہ ستمگر مجھکو — زندگی کا کوئی عنوانِ سکوں یاد نہیں

دل کی دنیا بھی کسی چاند کی دنیا ہے عزیز — جو فقط نام کی دنیا ہے اور آباد نہیں

## محمد عمر صاحب کلارک مسلم یونیورسٹی

محشرِ درد ہوں آوارۂ فریاد نہیں — میں ہوں برباد حقیقت مری برباد نہیں

پُر اثر نالہ ہے شیون ہے سراپا تاثیر — یہ تو سب کچھ ہے مگر عادتِ فریاد نہیں

جو جھلک مجھکو دکھائی تھی اُسے بھول گئے — اپنی مستانہ ادائیں بھی تمھیں یاد نہیں

اُف رے سرمستیِ جامِ مئے پُر کیفِ الست — کیا پیا کس نے دیا کچھ بخدا یاد نہیں

زخمِ دل دیکھ کے کہتے ہو کہ کیوں کر یہ ہوا — اپنا یہ کارِ نمایاں بھی تمھیں یاد نہیں

تجربہ یہ ہے عدو پر ہے عنایت کی نظر — واقعہ یہ ہے کہ اب مائلِ بیداد نہیں

## فرحت - مرزا قطب عالم صاحب دہلوی

جب سے پہلو میں وہ لذت کشِ بیداد نہیں — شورشِ آبادِ جفا سے ستم ایجاد نہیں

خود گرفتارِ قفس کو لبِ فریاد نہیں — اس اسیری کو بھلا خاطرِ صیاد نہیں

تپشِ سوزِ دروں آگ لگی جاتی ہے — اُف کروں کیا کہ مجھے عادتِ فریاد نہیں

ہائے بے مائیگیِ صبر نے مارا ہے مجھے — ضبط ہم دوشِ جفا ہے ستم ایجاد نہیں

پھر چلی سوئے چمن بلبلِ دلدادۂ عشق — کیا اسے تجربۂ عادتِ صیاد نہیں

یاد آتا تو ہے اس نے مجھے دیکھا تھا مگر — پھر ہوا کیا یہ مجھے ہوش نہیں یاد نہیں

پھر ملیں وہ صید جسے خود ہو کاوشِ صیاد — مجھکو آزاد سمجھتے ہو میں آزاد نہیں

کس سے پوچھوں دلِ مضطر کا مداوائے سکوں
چارہ گر تجھکو بھی کیا اس کی دوا یاد نہیں

مجھکو یہ شوق کہ ہر وقت رہوں وقفِ جفا
اور وہ شوخ ابھی واقفِ بیداد نہیں

بحرِ الفت میں سبک سیر ہوں مانندِ حباب
آشنائے لبِ ساحل مری فریاد نہیں

شیوۂ عشق نہیں تیشہ زنی اے فرحت
حسن منت کشِ جاں بازئ فرہاد نہیں

## فطرت۔ مرزا عبدالرحیم صاحب حیدرآبادی

اے جنوں عشق میں تیری اگر امداد نہیں
لطفِ فریاد نہیں لذتِ بیداد نہیں

ضبط تو دیکھ نہ آہ نہ شکایت نہ گلہ
کیا ترے رحم کے قابل مری روداد نہیں

مر گئے ہم نہ ہوئی دستِ اجل کو بھی خبر
خنجرِ ناز ہے یہ خنجرِ فولاد نہیں

بے قراری دلِ زار کو کیا کہتے ہیں
بے نیازی تری گر شاملِ بیداد نہیں

تیری تصویر ہوئی وجہ فروغِ عالم
بے سبب حیرتِ آئینہ ایجاد نہیں

میں ہوں وہ بلبلِ گلزارِ مدینہ فطرت
خوفِ گلچیں نہیں مجھکو غمِ صیاد نہیں

## کریمی۔ خواجہ عبدالواحد صاحب لدھیانوی

نجد میں قیس نہیں کوہ پہ فرہاد نہیں
گھر بھی برباد ہے ویرانہ بھی آباد نہیں

جن و انسان و ملک سب ہیں اسیرانِ قضا
عرش سے فرش تلک ایک بھی آزاد نہیں

ایک جہاں چونک اٹھا ارض و سما کانپ گئے
زلزلہ ہے ترے مظلوم کی فریاد نہیں

روزِ محشر وہ مجھے دیکھ کے فرماتے ہیں
ان کو دیکھا ہے کہیں ہم نے مگر یاد نہیں

سنگدل سارا زمانہ ہے ترا فرہادی
کون ہے وہ جو ترے عشق میں برباد نہیں

موسمِ گل ہے سنا کوئی ترانہ بلبل
صحنِ گلزار ہے یہ خانۂ صیاد نہیں

لطف مرنے کا نہیں جب کہ مری بالیں پہ
وہ ستم کیش ستم گر و ستم ایجاد نہیں

مجھ پہ وہ ظلم بھی کرتے ہیں کرم بھی لیکن — یہ بھی کہتے ہیں کہ قاتل نہیں جلاد نہیں

## کوثر۔ عبدالحلیم خاں صاحب متعلم انٹر کالج مسلم یونیورسٹی

تم جو کہتے تھے کہ تو عشق میں برباد نہیں — دل کے ویرانے سے ظاہر ہے کہ آباد نہیں
اس سے ڈرتا ہوں کہ وہ بھی کہیں بدنام نہ ہو — لب پہ آہیں نہیں نالہ نہیں فریاد نہیں
وصل کا لطف کہاں ہجر کے صدمے کیسے — تم سے الفت تھی کبھی یہ بھی ہمیں یاد نہیں
حسنِ فطرت کا تقاضا ہے نگاہِ انساں — عشق پابند نہیں حسن بھی آزاد نہیں
اک جھلک دیکھ کے کیوں ہو گئے موسیٰ بے خود — پرتوِ حسن ہے یہ عشق کی روداد نہیں
یاد ہے اتنا کہ اک چوٹ لگی تھی دل پر — پھر کہاں ہم تھے کہاں وہ یہ ہمیں یاد نہیں
دل میں ہے ایک ہجوم غم و یاس و حرماں — خلد ہے خوب مگر اس قدر آباد نہیں
مکتبِ عشق کا ہر درس ہے ازبر کوثر — ترکِ الفت کا سبق ایک ہے جو یاد نہیں

## کیف صاحب

مجھ کو اتنی بھی خبر خاطرِ ناشاد نہیں — غم سے آباد جو ہوتا ہے وہ برباد نہیں
وہ غلط سمجھے کہ تسکیں ہے تغافل سے مجھے — مجھ پہ بیداد یہ کیا کم ہے کہ بیداد نہیں
عشق کو ننگ ہے پابندِ مقاصد ہونا — میں نے منزل کبھی ڈھونڈی ہو مجھے یاد نہیں
آج دل محرمِ اسرار ہے اللہ اللہ — کل جو کہتا تھا میں آباد نہیں شاد نہیں
کس قدر بزمِ تمنا بھی ہے رنگیں یا رب — کس لئے آئے تھے یہ بھی ہمیں اب یاد نہیں
اب مری خاک ہے پامالِ خرامِ جاناں — اب مری خاک کا اک ذرہ بھی برباد نہیں
رازِ رنگینیٔ گلشن ہے بہارِ گلشن — دل ہے برباد اگر دل میں تری یاد نہیں
ڈال رکھے ہیں نگاہوں پہ حسینوں نے پردے — وہ کسی رنگ میں ہوں پر ستم ایجاد نہیں

ہے مرے ذوقِ تمنا کو شکایت اتنی
کہ تمھیں دل میں ہو اور دل ہی تمھیں یاد نہیں

میرے احساس میں اک جہاں ہے عرفانِ شہود
جب سوا تیرے کہیں بھی کوئی آباد نہیں

میں نے دیکھا ہے کسی انجمنِ ناز کا رنگ
دونوں عالم یہ مری نظروں میں کچھ یاد نہیں

شدتِ درد سے کیفیتِ غم کا اظہار
کیف بے کیف ہے یہ عشق کی فریاد نہیں

## گہر - آفتاب احمد صاحب

بزمِ عشرت ہے یہ بزمِ غم و فریاد نہیں
مہرِ ہر کس پہ ہے ساقی یہاں بیداد نہیں

عالمِ وجد ہے طاری ترے دیوانوں پر
"بے خودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں"

اے گہر کوچۂ جاناں میں ہے یا اور کہیں
دل کہاں بھول کے آیا ہوں مجھے یاد نہیں

## ماجد صاحب

نالۂ محرومِ اثر آج جو صیاد نہیں
قصۂ عشق ہے کچھ درد کی روداد نہیں

آئے ہیں غیر بھی ارمانِ شہادت لے کر
آج شمشیر بکف خیر سے جلاد نہیں

کوئے دلدار میں ہے دوشِ فنا پر مری خاک
جو محبت میں ہو برباد وہ برباد نہیں

پھونک دے تو ہی کہیں برقِ تجلی مجھکو
میری دنیائے محبت ابھی آباد نہیں

بے خودی تو ہی بتا جا کے کہاں سجدہ کروں
جس جگہ کھویا تھا میں اب وہ جگہ یاد نہیں

دل وہ خالق ہے کہ کر لیتا ہے خود غم پیدا
شور و شیون اس کا بہ اندازۂ بیداد نہیں

پھونک دیتا ہے مجھے کشتِ فریبِ من و تو
کچھ عبث آج مرے نالۂ فریاد نہیں

میری آنکھوں میں وہ پڑھ لیں مری کیفیتِ دل
نہ سہی لب پہ جو مرے نالۂ فریاد نہیں

کچھ ہے ہر سانس نہیں سوز نہ سکی ماجد
رقصِ ہر موجِ نفس مستیٔ فریاد نہیں

## مبین صاحب

ایسا ہے مہر جفا کار ستم گر عیار
دہر میں کوئی بھی تجھسا ستم ایجاد نہیں

ہم نے اس راہ میں ہستی کو مٹا کر چھوڑا
کوچۂ عشق میں مجھسا کوئی برباد نہیں

عشق کافر نے ہزاروں کئے گھر ویرانے
اس کے ہاتھوں نظر آتا کوئی آباد نہیں

کر دیا اُس بت کافر نے یہاں تک مدہوش
"بے خودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں"

یوں تو دنیا میں ہزاروں ہیں حسین ماہ جبیں
پر کوئی تجھسا کہیں دیکھا پری زاد نہیں

حالِ دل میں نے کہا اُن سے تو بولے کہ مبینؔ
کوچۂ عشق میں کوئی بھی دل آزاد نہیں

## مجروح صاحب

گلۂ جور و جفائے ستم ایجاد نہیں
میں کسی رنگ میں منت کشِ فریاد نہیں

دیکھ لے چھیڑ کے مضراب جفا سے مطرب
بربطِ دل میں کہیں نغمۂ فریاد نہیں

خاکِ رہ بن کے ہو پابوسیٔ دیدار نصیب
اپنی قسمت میں تو یہ بھی دلِ ناشاد نہیں

پھول تربت پہ چڑھاتے ہیں حسینانِ جہاں
زندگانی نہ سہی موت تو برباد نہیں

دلِ مجروحؔ تڑپتا ہے زمیں پر لیکن
ہے یہ معراجِ محبت کوئی افتاد نہیں

## محمد علی صاحب متعلم درجۂ نہم

شکوہ و آہ و فغاں اے دلِ ناشاد نہیں
عاشقوں کے لئے زیبا کبھی فریاد نہیں

روز بڑھتی ہے شہیدانِ وفا کی تعداد
اے فلک تجھسا تو کوئی ستم ایجاد نہیں

ظلم کی جور کی نہایت بھی ہوا کرتی ہے
آخر انسان ہوں میں پیکرِ فولاد نہیں

عارضی حسن پہ نازاں ہے خدا کی قدرت
فخر اسی شے پہ کہ جس چیز کی بنیاد نہیں

ہو مرے ذوقِ تمنا کو شکایت اتنی
کہ تمہیں دل میں ہو اور دل ہی تمہیں یاد نہیں

میرے احساس میں اک جہل ہے عرفانِ شہود
جب سوا تیرے کہیں بھی کوئی آباد نہیں

میں نے دیکھا ہے کسی انجمنِ ناز کا رنگ
دونوں عالم یہ مری نظروں میں کچھ یاد نہیں

شدتِ درد سے کیفیتِ غم کا اظہار
کیف بے کیف ہے یہ عشق کی فریاد نہیں

## گہر۔ آفتاب احمد صاحب

بزمِ عشرت ہے یہ بزمِ غم و فریاد نہیں
مہر کس پہ ہے ساقی یہاں بیداد نہیں

عالمِ وجد ہے طاری ترے دیوانوں پر
"بے خودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں"

اے گہر کوچۂ جاناں میں ہے یاد کہیں
دل کہاں بھول کے آیا ہوں مجھے یاد نہیں

## ماجد صاحب

نالۂ محرمِ اثر آج جو صیاد نہیں
قصۂ عشق ہے کچھ درد کی روداد نہیں

آئے ہیں غیر بھی ارمانِ شہادت لے کر
آج شمشیر بکف خنجر سے جلاد نہیں

کوئے دلدار میں ہے وحشتِ وفا پر مری خاک
جو محبت میں ہو برباد وہ برباد نہیں

پھونک دے تو ہی کہیں برقِ تجلی مجھ کو
میری دنیائے محبت ابھی آباد نہیں

بے خودی تو ہی بتا جا کے کہاں سجدہ کروں
جس جگہ کھویا تھا میں اب وہ جگہ یاد نہیں

دل وہ خالق ہے کہ کر لیتا ہے خود غم پیدا
شور و شین اس کا بڑا اندازۂ بیداد نہیں

پھونک دیتا ہے مجھے کشتِ فریبِ من و تو
کچھ محبت آج مرے نالہ و فریاد نہیں

میری آنکھوں میں وہ پڑھ لیں مری کیفیتِ دل
نہ سہی لب جو مرے مائل فریاد نہیں

سچ ہے ہر بات نہیں ہونا ممکن ماجد
رقصِ ہر موجِ نفس مستیٔ فریاد نہیں

## مبین صاحب

ایسا بے مہر جفا کار ستم گر عیار　　دہر میں کوئی بھی تجھسا ستم ایجاد نہیں
ہم نے اس راہ میں ہستی کو مٹا کر چھوڑا　　کوچۂ عشق میں مجھسا کوئی برباد نہیں
عشق کافر نے ہزاروں کئے گھر ویرانے　　اس کے ہاتھوں نظر آتا کوئی آباد نہیں
کردیا اُس بتِ کافر نے یہاں تک مدہوش　　"بے خودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں"
یوں تو دنیا میں ہزاروں ہیں حسیں مہ جبیں　　پر کوئی تجھسا کہیں دیکھا پری زاد نہیں
حالِ دل میں نے کہا اُن سے تو بولے کہ مبین　　کوچۂ عشق میں کوئی بھی دل آزاد نہیں

## مجروح صاحب

گلۂ جور و جفائے ستم ایجاد نہیں　　ہیں کسی رنگ میں منت کشِ فریاد نہیں
دیکھ لے چھیڑ کے مضراب جفا سے مطرب　　بربطِ دل میں کہیں نغمۂ فریاد نہیں
خاکِ رہ بن کے ہو پابوسیٔ بیداد نصیب　　اپنی قسمت میں تو یہ بھی دلِ ناشاد نہیں
پھول تربت پہ چڑھاتے ہیں حسینانِ جہاں　　زندگانی نہ سہی موت تو برباد نہیں
دلِ مجروح تڑپتا ہے زمیں پر لیکن　　ہے یہ معراجِ محبت کوئی افتاد نہیں

## محمد علی صاحب متعلم درجۂ نہم

شکوہ و آہ و فغاں سے دلِ ناشاد نہیں　　عاشقوں کے لئے زیبا کبھی فریاد نہیں
روز بڑھتی ہے شہیدانِ وفا کی تعداد　　اے فلک تجھسا تو کوئی ستم ایجاد نہیں
ظلم کی جور کی غایت بھی ہوا کرتی ہے　　آخر انسان ہوں میں پیکرِ فولاد نہیں

عارضی حسن پہ نازاں ہے خدا کی قدرت
فخر اسی شے پہ کہ جس چیز کی بنیاد نہیں

## محو صاحب

اب کرم کر کہ ستم اب ستم ایجاد نہیں
دل پہ اس درجہ ہی بیداد کہ

روح مضطر ہی کہ اب دل میں تری یاد نہیں
دل ہی برباد کہ آباد نہیں شہ

غم کو اب تک یہ تمنا ہے کہ دل شاد نہیں
دل کو اب تک یہی حسرت ہے کہ آ

دل زرا ولولۂ شوق کو روکے رکھے
عشق پابندئ آداب سے آز

کرتے ہیں اس کو محبت میں وفا سے تعبیر
میری تصویر کا وہ رخ جو تمہیں یا

عشق کو اتنی بھی دیوانگی غم نہ سکھا
حسن کو ہوش تماشا دل ناشا

ہے وہی محو سحر کاری شیریں اب تک
محفل دہر میں لیکن کوئی فرہا

## مست صاحب

شکوہ سن کر متاثر ستم ایجاد نہیں
ایسی فریاد تو لے دل کوئی فریا

کچھ تجھے وجہ ندامت ستم ایجاد نہیں
میرے مرنے کی خبر تک تری بیداد نہ

دم نکلتا ہے مگر وا لب فریاد نہیں
پھر بھی کہتے ہو کہ اقرار وفا یاد نہ

دو ہی آہوں میں پکڑتا ہے کلیجہ صیاد
صبر کر صبر ابھی فریاد سی فریاد نہ

پائیں ہم اس کی اجازت تو چمن میں جائیں
حکم صیاد کے پابند ہیں آزاد نہیں

عاشقی خوگر ایذا طلبی ہوتی ہے
ہم کو ہر ظلم ترا داد ہے بیداد نہیں

نہیں ملتا ہمیں دنیا میں پرکھنے والا
داغ دل کس کو دکھائیں کوئی نقاد

ہم کو زنداں کی مصیبت کا نہیں کچھ بھی خیال
سچ اس کا ہے کہ اس کی کوئی میعاد نہیں

ہم قفس میں ہیں تو گرتی ہے قفس پر بجلی
آشیانے ہی پہ موقوف یہ افتاد نہیں

پایۂ عرش نہ ہل جائے تو میرا ذمہ
میرے نالے کبھی کم ظرف [illegible]

نشۂ عشق میں اپنا بھی نہیں ہوش جسے — میں وہی مست ہوں عاقل تجھے کیا یاد نہیں

## مشتاق — مشتاق احمد صاحب بٹالوی تلمیذ حضرت رسا مرحوم

آہ کی تاب نہیں طاقتِ فریاد نہیں — یعنی پہلو میں ہمارے دلِ ناشاد نہیں
پنجۂ غم سے ہیں آزاد قفس میں کیا ہیں — خوفِ گلچیں نہیں کچھ خطرۂ صیاد نہیں
اس میں راحت کے سب اسباب مہیا ہونگے — عدم آباد یقیں ہے عدم آباد نہیں
دامِ الفت میں ازل سے ہی گرفتار ہیں ہم — یہ وہ تقدیر ہے جس کی کوئی میعاد نہیں
خاک سے ان کی ابھی بوئے وفا آتی ہے — باوجود اس کے کہ شیریں نہیں فرہاد نہیں
بیکسی بیٹھی ہے تربت پہ مجاور بن کر — اُس پہ یہ لطف کہ نالہ نہیں فریاد نہیں
کس سے لے دادِ سخن آپ کا مشتاقِ حزیں — اے رسا آپ کے بعد آپ سا استاد نہیں

## مشرف صاحب

ماتمِ درد ہے یہ شکوۂ بیداد نہیں — نوحۂ عشق ہے ظالم مری فریاد نہیں
وہ بھی عالم تھا کہ آبادی ہی آبادی تھی — یہ بھی حالت ہے کہ اک شخص بھی آباد نہیں
بربطِ حسن کے موجد سے یہ پوچھے تو کوئی — اس میں کیوں نغمۂ بربادیٔ فرہاد نہیں
کیوں ترے کہنے سے میخانہ جلا دوں واعظ — تیرا کہنا کوئی جبریل کا ارشاد نہیں
جل گیا شہرِ وفا لُٹ گئی دل کی بستی — عشق کی سلطنت اب نام کو آباد نہیں
ان کو دیکھا تھا مشرف کہ گری اک بجلی — کیا ہوا بزم میں پھر کچھ بھی مجھے یاد نہیں

## مظفر — حافظ قاری سید مظفر علی صاحب زیدی

یہ غلط ہے کہ مجھے [illegible] یاد نہیں — اب وہ عالم ہے کہ گنجائشِ فریاد نہیں

دل جو ویران ہوا ہو گئی دنیا ویران — کوئی گھر خوش نہیں بستی کوئی آباد نہیں
باغ میں جاکے مجھے اور قلق ہوتا ہے — پھول پتے بھی مرے دل کی طرح شاد نہیں
جب سے دل بادۂ الفت سے ہوا ہے مخمور — بے خودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں
نغمۂ درد مظفر ہے صدا سے خالی — کیا سُنے کوئی یہ نالہ نہیں فریاد نہیں

## منظر۔ منظر صاحب صدیقی سیمابی اکبرآبادی

قابلِ داد نہیں لائقِ بے داد نہیں — سچ ہے لے عشق کہ مٹی مری برباد نہیں
جب محبت ہو تو ہر بات روا ہوتی ہے — تم سلامت رہو میں شاکیٔ بیداد نہیں
بعدِ زنداں بھی جنوں اہلِ جنوں کا نہ گیا — گھر کو جاتے ہیں مگر گھر کا پتا یاد نہیں
ہے ہر اک ذرے میں پنہاں دلِ مضطر کی تڑپ — عشق کس گوشۂ برباد میں آباد نہیں
یہ خدائی ہے کہ بھولا نہیں بندوں کو خدا — اور خودی یہ ہے کہ بندوں کو خدا یاد نہیں
وجہ بربادیٔ دل ہو گیا ہنگامۂ غم — واہ رے دل کہ ہے آباد اور آباد نہیں
طبع نازک تری نازک بھی ہاں ہیں ہم بھی — دلِ ناشاد ہمارا دلِ ناشاد نہیں
تیری بیداد سر آنکھوں پہ مگر سن تو سہی — اُس پہ بیداد ہے جو قابلِ بیداد نہیں
بانگِ مستقبلِ عالم ہیں صدائیں میری — عہدِ ماضی کا فسانہ تو مجھے یاد نہیں
یہ مرا ظرفِ محبت ہے یہ اندازۂ غم — خون روتا ہوں مگر مائلِ فریاد نہیں
نقش برآب ہے یہ عالمِ فانی منظر — اس میں مضبوط کسی چیز کی بنیاد نہیں

## منہدی۔ مہندی علی خاں صاحب متعلم بی اے کلاس

گلۂ جور نہیں شکوۂ بے داد نہیں — اک تصور کے سوا کچھ بھی مجھے یاد نہیں
ہر نفس موت کا پیغام دیا کرتا ہے — پھر بھی کہتا ہوں کہ ہستی مری برباد نہیں

مدتیں گزریں مجھے قیدِ قفس میں مہندی ۔ راستہ کیسا مجھے نقشِ چمن یاد نہیں

## نصرت ۔ نصرت علی صاحب منصوری

غیر کو ہو یہ مبارک کہ وہ ناشاد نہیں ۔ مجھکو یہ غم ہے کہ مجھ پر تری بیداد نہیں
خود بخود ہوتا ہے آہوں سے ترنم پیدا ۔ سازِ حسرت کے لئے حاجتِ فریاد نہیں
اُف بھی نکلے تو زباں کاٹ کے رکھدوں اپنی ۔ سوزِ پنہاں میں مرے گرمیٔ فریاد نہیں
اُن کے قدموں پہ گرا ہے خودیٔ عشق مجھے ۔ اس سے بہتر کوئی میرے لئے افتاد نہیں
کیوں نہ دل کھول کے میں سیر کروں چار طرف ۔ کہ چمن میرے لئے خانۂ صیاد نہیں
صنعتِ قدرتِ حق ہے یہ ترا حسن و جمال ۔ کارِ مانی نہیں نقاشیٔ بہزاد نہیں
وہ اگر حامی و ناصر ہے تو نصرت مجھکو ۔ دین و دنیا میں کہیں حاجتِ امداد نہیں

## نہال ۔ نہال احمد صاحب ملازم میونسپلٹی علی گڑھ

کب ترے جور نہیں کب تری بیداد نہیں ۔ پھر بھی چپ ہوں کہ مجھے عادتِ فریاد نہیں
دیکھکر پوچھتے ہو نام تمھارا کیا ہے ۔ ایسے بھولے ہو کہ صورت بھی مری یاد نہیں
اتنا معلوم ہے انکار کے کچھ فقرے تھے ۔ اور کیا خط میں لکھا تھا یہ مجھے یاد نہیں
پوچھتا ہوں میں وفاؤں کا نتیجہ اُن سے ۔ جن کو انجامِ ستم تک بھی ابھی یاد نہیں
پھل وفاؤں کا مجھے کیوں نہیں ملتا ہے نہال ۔ میں کوئی سرو نہیں ہوں کوئی شمشاد نہیں

## وصف ۔ محمد ظفر صاحب خورجوی

ہم نے مانا کہ انھیں طرزِ وفا یاد نہیں ۔ اپنے لب پر بھی کوئی شکوۂ بیداد نہیں
ایک بجلی سی تو البتہ گری تھی دل پر ۔ اور آغاز مجھے عشق کا کچھ یاد نہیں

میری تصویرِ خیالی کی بھی کھنچے تصویر — ورنہ کاملِ فنِ تصویر میں بہزاد نہیں
وہ زباں کیا جو ترے ذکر سے محروم رہے — دل وہ کس کام کا جس دل میں تری یاد نہیں
وصف کو یاد کبھی بزمِ عدو ہی میں کریں — اتنی امید بھی اُن سے دلِ ناشاد نہیں

## وفا۔ منشی باقر حسین صاحب

کونسا ظلم نہیں کونسی بیداد نہیں — اور میں ہوں کہ لبوں پر مرے فریاد نہیں
شکر جاری ہے زباں پر مری فریاد نہیں — ان کی بیداد بھی احسان ہے بیداد نہیں
قیدِ افکار سے آزاد ہیں محبوسِ قفس — برق کا خوف نہیں دہشتِ صیاد نہیں
لطف اندوز ہو اس باغ میں شبنم کی طرح — دل لگانے کی جگہ گلشنِ ایجاد نہیں
ایک مایوس کو کیا رنج و خوشی سے مطلب — نہیں مغموم بھی دل اپنا اگر شاد نہیں
بال و پر ہیں نہ کسی وقت قفس کھلتا ہے — مطمئن اس پہ بھی مجھ سے دلِ صیاد نہیں
نقش ہے دل پہ ابھی تک مرے پیمانِ وفا — آؤ میں یاد دلا دوں جو تمہیں یاد نہیں
دل کو قربان کروں جان تصدق کر دوں — دیکھ لینے کے لئے حسنِ خداداد نہیں
ایک دن وہ تھا کہ احسان و کرم تھے مجھ پر — ایک دن یہ ہے کہ میں قابلِ بیداد نہیں
قید اک طرح کی ہے وضع کی پابندی بھی — میں تو زنداں سے نکلنے پہ بھی آزاد نہیں

ایک میں ہوں کہ سمجھتا ہوں تمہیں جانِ وفا
ایک تم ہو کہ جسے نامِ وفا یاد نہیں

# مصرعِ طرح فارسی

## دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہِ کیست

### آبر۔ احمد حسین صاحب انصاری گنوری

طوفان دہم تلاطمِ فریاد و آہِ کیست ‏ ‏ ‏ ازکیست جلوہ سازی داین جلوہ گاہِ کیست
حشرست و نیز کشمکشِ قاتل و قتیل ‏ ‏ ‏ اے دل خیالِ خویش بگو تو گواہ کیست
دل پاش پاش می کند و سینہ چاک چاک ‏ ‏ ‏ بشنو ستم شعار کہ فریاد و آہ کیست
جز دردمندِ عشق و بجز مستمندِ حسن ‏ ‏ ‏ گردد بدردِ ہجرِ تو حالِ تباہ کیست
قاتل ترا بگفتم د تقصیر شد مگر ‏ ‏ ‏ ہر لمحہ تیغ داشتن از رسم و راہِ کیست
آمد ز سینہ تا لبِ آں بود آہِ من ‏ ‏ ‏ پیوست چوں سناں بہ جگر این نگاہِ کیست
گیرم کہ سخت جانیِ آبر از خطائے اوست ‏ ‏ ‏ دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست

### تاسّف۔ سید ناصر علی صاحب ہیڈ مولوی جی اے ایس ہائی اسکول خورجہ

دلہا کہ پیشِ چشم ربایدِ نگاہِ کیست ‏ ‏ ‏ اے دل شدہ بگو کہ دلت داد خواہِ کیست
آں ترکِ من کہ می کند از کشتنم ابا ‏ ‏ ‏ غافل ازیں کہ دامنِ پر خوں گواہِ کیست

## مسرور - آلِ حسن صاحب وارثی قنوجی

از حسنِ خود که نور دہد آفتاب را — اے دل مرا بگو که درونِ تو ماہ کیست
اینجا که نورِ قدس بہ ہر لحظہ نازل ست — اے قدسیاں بگو کہ ہمیں بارگاہ کیست
من سر بہ پیش کردہ ز زخم بری شدم — "دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست"
مسرور رہست گو کہ چرا دل گرفتہ — این نالہ ہا کنندہ ز شام و پگاہ کیست

## عشرتی - سیّد محمد مرتضیٰ صاحب

سیمائے صبح پردہ درِ جلوہ گاہ کیست — حیرانیٔ جمال دمِ صبح گاہ کیست
ہم رنگِ دیر پیرِ مغان خانقاہ کیست — دل کعبہ ہست صومعہ سازِ این نگاہ کیست
یک بار بے حجاب بیا اے خدائے حسن — دل را وقوف نیست کہ این جلوہ گاہ کیست
یارب چہ شد کہ درہم و برہم زمانہ ہست — آشفتگی ز سلسلۂ دودِ آہ کیست
حسن ست عشق عشق بحسن ست جلوہ گر — راز درون بخلق رسید این گناہ کیست
صوفی بوجد آمدہ و سرخوشی کند — این نشۂ شرابِ خمِ خانقاہ کیست
ہر زخمِ دل کہ جامۂ خونین گرفتہ است — منت پذیرِ خنجرِ چشمِ سیاہ کیست
ہر برگ کائنات شرابِ تو می دہد — مستِ وجود عربدہ سازِ نگاہ کیست
مجرم بفاشِ راز چو حلاج گشتہ اند — یارب بجرم کہ من و دل گناہ کیست
دل می برد بہ خاص ادائے تبسمے — آں شوخ پردہ دار بتِ کج کلاہ کیست
پیرایۂ جمالِ زلیخا گرفتہ است — دامانِ چشمِ شوق و دیدِ این نگاہ کیست
حسن ست خو گرفتۂ عاشق کشی ہمیں — ہر تیغ را شکایتِ بیجا گناہ کیست
نازم بہ شوخ چشمیٔ طرزِ نگاہِ تو — ظلم آفریدۂ دلِ وحشت پناہ کیست

خوش باش می بنوش بہ رندی گذار عمر [۳] — اے عشرتی خیالِ آلِ گناہِ کیست

# ایضاً

(تضمین بر غزل فارسی مرزا نوشہ غالب مرحوم)

نازِ تو بے نیاز دلِ داد خواہِ کیست — چشمِ تو پُر فریب ز تاثیرِ آہِ کیست
شانِ تو فتنہ سازِ جہانی گواہِ کیست — حسنِ تو در حجابِ ز شرمِ گناہِ کیست
جا بر کرشمہ تنگ ز جوشِ نگاہ کیست

ہنگامِ صبحِ دولتِ بیدار می رود — چوں آفتابِ دامنِ زرتار می رود
خود باغِ حسن و طالعِ بیدار می رود — مست ست رخ کشادہ بہ گلزار می رود
خوں در دلِ بہار ز تاثیرِ آہِ کیست

ای باعثِ حدوثِ قدم شانِ کبریا — آئینۂ جمالِ رخت عالم آشنا
در تابم از خیالِ وفا ایں چہ ماجرا — ما با تو آشنا و تو بیگانہ ز ما
آخر تو و خدا کہ جہانے گواہِ کیست

جعدِ تو ہست فتنۂ اربابِ خستہ تن — یا شامِ تیرگی ست پے شمعِ انجمن
رونق فزائے ظلمتِ بخت ست بہرِ من — مو بر نتابد ایں ہمہ پیچ و خم و شکن
زلفِ تو روزنامۂ بختِ سیاہ کیست

آشفتہ سازِ خاطرِ نازِ تو آہِ من — آتش زن ست طالعِ مشتِ گیاہِ من
آرے بہ اضطراب جہانے گواہِ من — بے خود بہ ذوقِ ذبح تپیدن گناہِ من
دانستہ دشنہ تیز نکردن گناہِ کیست

ہر چشم تیز نرگس و ریحان و سنبل ست — سامانِ شیفتہ گل و ریحان و سنبل ست
آئینہ دارِ گل و ریحان و سنبل ست — زیں ساں کہ سر بسر گل و ریحان و سنبل ست
طرفِ چمن فزودۂ طرفِ کلاہِ کیست

حسن ست بے حجاب تماشاکنِ جہاں ‏ ‏ ہر ذرہ می دہد بہ جمالِ رخش نشاں

عشق ست و بدگمانی بیجاست ہم عناں ‏ ‏ بامن بہ خوابِ ناز و من از رشک بدگماں

تا عربدۂ خیال عدو جلوہ گاہِ کیست

در سینہ این چہ خار ستمگر گرفتہ است ‏ ‏ ہر آئینہ خیالِ مکدر گرفتہ است

چوں عشرتی ملال سراسر گرفتہ است ‏ ‏ غالب حسابِ زندگی از سر گرفتہ است

جانا بمن بگو کہ غمت عمرِ کاہِ کیست

# عنوانِ نظم

## "عزتِ نفس و جذبۂ قومی"

عقیل الرحمٰن صاحب ندوی سہارنپوری

نفسِ عزت طلب غیور پسند — فکرِ ہنگامہ خیز حشر بدوش
شوقِ پامالِ فتنہ ہائے تپاں — عشق آوارگی سے ہم آغوش
کسب بے حاصلی وظیفۂ عمر — ذوقِ تن پروری متاع فروش
حسد و کینہ رازدار و رفیق — طبعِ خود بین و خو مذلت کوش
حرمتِ شیب و عزتِ احباب — سیلِ مغرب میں ہے فنا آغوش
رافت و حلم بار یاب نہیں — کبر و نخوت ہے بادۂ سرجوش
روز صرفِ تعیشِ بے جا — شب فروشندۂ متاعِ ہوش
ہمتیں پست خواہشات بلند — نطق آتش زبان و دل خاموش
تو ہی کہہ یوں ہو جب طریقِ شعار — اے خردمندِ ہوش در آغوش

عزتِ نفس کیسے حاصل ہو
نقش کیوں کر یہ کندۂ دل ہو

اے جوانانِ ہوش مند عزیز — آدمیت ہے جوہرِ انساں
تو کہ پابندِ دین و دنیا ہے — [illegible]
حیزِ مطلق ضمیرِ حیوانی — نفسِ بدکیش سرکش و ناداں
نکتہ آموزِ قوتِ ادراک — عقل پیراہنِ تنِ عریاں
عبد و معبود خالق و مخلوق — عقدۂ کفر و رشتۂ ایماں
ضبط و آئینِ پیامِ ربانی — جاں فدائے رسولِ فخرِ جہاں
صد ہزاراں درود بر روحش — بہرِ تصدیق ذکرِ قلب و زباں
حقِ عبدیت و حقوقِ عباد — ہیں معاد و معاش کے ساماں
پاسِ خویش و اقارب و احباب — امتیازِ مراتبِ انساں
طاعتِ امر و نہی صاحبِ امر — اتباعِ شعائرِ یزداں
ہمت و حوصلہ بلند و رفیع — عمل امروز فکرِ سود و زیاں

مدنیت پسند طبع سلیم — خدمتِ خلق شیوۂ مرداں
عزتِ نفس کے اصول ہیں یہ
غور سے دیکھ ان کو بھولیو نہ

تیرا علم و عقل بے عمل — ارتقا کے لئے ہے سمِ افعار
متحرک نظامِ عالم ہے — موت ہے حیلۂ سکون و قرار
ناز پروردۂ بہار نہ بن — کہ یہ دنیا ہے وادیٔ پُرخار
چھوڑ دامن ہیں دین اور دنیا — ہے شلِ دل بیار و دست بکار
اے طلبگارِ بامِ رفعت دیکھ — سعیٔ پیہم ہے روز و شب درکار
حق و باطل کا امتیاز و ثبات — وضع داری کا ہے درِ شہوار

وضعداری دلیل خودداری — منحصر ہے اسی پہ فرود
حلم و خلق و تواضع و رافت — ہیں یہ جوہرات خلق کے
شدت و رحم بین بین بہم — وقت پر بے خطا ہیں یہ
جانِ زر صدقہ جانِ عزت کا — غیرتِ شرق کے ہیں محسن وجہ
بات مردوں کی جان رکھتی ہے — تھا شرافت کا پہلے یہ معیار
دام حرص و ہوا و مکر و فریب — ہر قدم پر ہے مردِ حق ہشیار
راہِ حق سے نہ ڈگمگائے قدم — آدمیت کا ہے اسی پہ مدار
عزتِ نفس ہے اسی کا نام
یعنی تو نفس کا بنے نہ غلام

# جذبۂ قومی

## عبدالحلیم خاں کوثر

دل میں اک جذبۂ خاموش اٹھا ہے میرے — کاش یہ جذبہ ہی اک جوشِ جنوں بن جائے
ابتدا وہ ہو کہ اک آگ لگا دے دل میں — انتہا یہ ہو کہ اک موجِ سکوں بن جائے
دل کی ہر جنبشِ بے تاب کا یہ حال کرے — کہ ہر اک جنبشِ دل سازِ جنوں بن جائے
کہیں ظاہر ہو کسی جلوۂ صد رنگ میں یہ — اور کہیں بے خودیٔ سحر و فسوں بن جائے
آخرش جذبۂ قومی کا نگہباں بنے
دیر میں مسلم و ہندو کا ایمان بنے

# جذبۂ قومی

ظہیر الدین حسن تاج زبیری متعلم فیض عام ہائی اسکول میرٹھ

بلبل و گل بھی وہی ہے صحنِ گلشن بھی وہی (۱) بزمِ عشرت بھی وہی ہے دشتِ ایمن بھی وہی
دشتِ وحشت بھی وہی ہے اپنا دامن بھی وہی باربرداری وہی ہے اپنی گردن بھی وہی

لیکن اب پہلی سی عادت ہے نہ ہمت ہم میں ہے
اب نہ پہلی سی شجاعت ہے نہ طاقت ہم میں ہے

اب وہ اگلا سا زمانہ ہے نہ وہ فصلِ بہار (۲) اب وہ پہلی سی وجاہت ہے نہ وہ اپنا وقار
صید افگن تھے کبھی کہلاتے ہیں اب تو شکار اب کہاں باقی ہیں ہم میں اگلے جیسے دیندار

جن کا لوہا مانتا تھا جرمن و تاتار بھی
دل میں جن کے رحم تھا اور ہاتھ میں تلوار بھی

معرکہ میں سب سے آگے تھے مگر خاموش تھے (۳) اب سے پہلے وہ ہمیں تھے جو سراپا جوش تھے
شاہدِ امن و امن کی زینتِ آغوش تھے قیصر و فغفور و روم ہیبت سے سب بے ہوش تھے

سارے عالم پر حکومت تھی جہاں محکوم تھا
ہاتھ میں جب تک ہمارے دامنِ معصوم تھا

ہم سے دنیا تھی موافق ہم تھے دنیا کی طرف (۴) ہائے وہ دولت ہوئی جاتی ہے اب ہم سے تلف
ہم نظر آتے تھے ہر اک معرکہ میں سر بکف ہے بجا دنیا کہے ہم کو اگر اب ناخلف

حرف آیا ہے بزرگوں کی وضع پر نام پر
طعنہ زن ہیں مدعی اب حرمتِ مسلم پہ

لٹ رہا ہے گلشنِ اسلام ہم خاموش ہیں (۵) بادۂ بغض و حسد سے اس قدر بیہوش ہیں
ہم سے جو پوشیدہ تھے اب اُن سے ہم روپوش ہیں ذلتوں پر بھی سمجھتے ہیں کہ ہم ذی ہوش ہیں

لوگ ہنستے ہیں مگر آتی نہیں غیرت ہمیں
مثلِ آئینہ ہے اپنے حال پر حیرت ہمیں

ہائے وہ پہلی سی اپنی شان و شوکت اب کہاں (۶) اب کہاں وہ دبدبے پہلی سی عظمت اب کہاں
ناز ہم کرتے تھے جس پر وہ شجاعت اب کہاں ہے وہی سودا مگر پہلی سی قیمت اب کہاں

جان دینے کے لئے تیار تھے توحید پر
سب کے سب پابند تھے قرآں کی تقلید پر

محوِ حیرت ہیں کہ ہم کو کھا گئی کس کی نظر (۷) عیش و راحت کا ستارہ بن گیا دردِ جگر
ہم سے رخصت ہو چکی ہے دولتِ علم و ہنر نام کو بھی پاس اب اپنے نہیں ہے مال و زر

مسلمِ خوابیدہ اب تو خواب سے بیدار ہو
آفتابِ حشر سر پر آگیا ہشیار ہو

غفلتیں اچھی نہیں اتنا نہ سونا چاہیئے (۸) ذلت و بربادئ ملت پہ رونا چاہیئے
کچھ تو بیداریٔ احساس ہونا چاہیئے وقت اپنا اس طرح ہرگز نہ کھونا چاہیئے

آؤ ہم بھی جذبۂ قومی سے اب کچھ کام لیں
عزم و استقلال کا مضبوط دامن تھام لیں

ہم سنبھل جانا اگر چاہیں تو کچھ مشکل نہیں (۹) سارے عالم کی طرح دل رکھتے ہیں بیدل نہیں
آدمی بے علم ہے تو کوئی شے حاصل نہیں علم کا دریا وہ ہے جس کا کہیں ساحل نہیں

رائگاں جاتا نہیں دل سے خزانہ علم کا
اہلِ مغرب کی زباں پر ہے فسانہ علم کا

(۱۰)

اب بھی کچھ بگڑا نہیں اے تاجؔ گر ہمت کرو — جس طرح ممکن ہو حاصل علم کی دولت کرو

زندگی چاہو جو اپنی علم کی عزت کرو — قوم کی خدمت یہی ہے علم کی خدمت کرو

یا الٰہی قوم کے دل میں ہو جذبہ علم کا

موجزن ہو جائے ہر سینوں میں دریا علم کا

## محمد فیاض الحق اخترؔ متعلم انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ

اُس سے بڑھکر بھی جہاں میں کوئی ناشاد نہیں — اپنی عظمت کا زمانہ بھی جسے یاد نہیں

اس پہ ہر وقت ہنسا کرتا ہے ہر غنچہ و گل — جو گلستاں میں تو رہتا ہے اور آزاد نہیں

سچ بتا دے مجھے یہ راز کہ کیا بات ہے جو — ایک آزادِ ازل دہر میں آزاد نہیں

کیا ترے بازوئے پُرزور میں طاقت نہ رہی — یا ترے ہاتھ میں اب خنجرِ فولاد نہیں

دے دیا پنجۂ شہ زور نے کیا تجھکو جواب — یا تجھے قصۂ خیبر شکنی یاد نہیں

کیا ترے قلب میں اب رنجِ غلامی نہ رہا — یا تجھے کچھ المِ خاطرِ ناشاد نہیں

کیا ترے قبضہ میں اب برقِ جہاں سوز نہیں — یا تجھے جوہرِ شمشیر زنی یاد نہیں

تجھ میں کمزوریٔ ہمت کبھی ایسی تو نہ تھی

جیسی اب ہے تری حالت کبھی ایسی تو نہ تھی

اُٹھ اور اب اُٹھ کے ذرا شورِ قیامت بن جا — عمر و حیدر و حمزہ کی شجاعت بن جا

ایک ذرہ کے لئے چھان ابھی دشت و جبل — ایک قطرہ کے لئے قلزمِ عشرت بن جا

اپنے چہرہ پہ عیاں جوہرِ ذاتی کر دے — ہر نظر کے لئے آئینۂ حیرت بن جا

بادشاہوں کی طرح جان ہی دینا ہے پھر — زینتِ مسند و اورنگِ حکومت بن جا

آسماں سے بھی اُٹھا کر نہ تجھے دیکھ سکے — خاک سے اُٹھکے ذرا عرشِ لطافت بن جا

شبستانِ جہالت پہ چمک صورتِ مہر ظلمتِ شب کے لئے صبحِ حقیقت بن جا
اپنی ہستی سے ہٹا دے یہ حجاباتِ نظر جلوۂ شمعِ تجلائے رسالت بن جا

دیر والوں کو ذرا کعبۂ مقصود دکھا
شانِ ہارون دکھا شوکتِ محمود دکھا

تیری غفلت کا یہ منشا ہے کہ تو شاد رہے بادشاہوں کی طرح دہر میں آباد رہے
جس چمن سے تو گزر جائے بہ مستانہ روی واں نہ گلچیں رہے پھر اور نہ صیاد رہے
تو اگر دیکھ لے دنیا کو بہ اندازِ عتاب تو غریبوں پہ ستم ہو نہ یہ بیداد رہے
تیرے انصاف سے مظلوم فضاؤں میں کبھی شورِ نالہ ہو نہ ہنگامۂ فریاد رہے
جب کسی بزم پہ پڑ جائے تری چشمِ کرم واں ستمگر کو نہ پھر طرزِ ستم یاد رہے
سر بلندوں کے ترے سامنے سر جھک جائیں اور اشاروں میں ترے چرخ کی بنیاد رہے
ساری دنیا میں جہاں جائے جدھر سے گزرے ہر زباں پر یہ دعائیں ہوں کہ تو شاد رہے

ہاں مگر تیری زباں پر ہو کوئی نغمۂ قوم
اور سینہ میں رہے دل کی جگہ جذبۂ قوم

جب یہ ہو جائے تو ہر ذرۂ دنیا تیرا صرف دنیا ہی نہیں عالمِ عقبیٰ تیرا
دنگ رہ جائیں تجھے دیکھ کے اجرامِ فلک اس بلندی پہ ہو دنیا میں ستارہ تیرا
تیری صورت سے عیاں حسنِ ازل ہو جائے چاند حسرت سے تکے عارضِ زیبا تیرا
امتیازات کی جب شان یہ ہو جائے تو پھر رفعتِ مہر تری اوجِ ثریا تیرا
آسمانوں پہ ترے گیت ہوں حوروں میں کہیں اور فرشتوں کی زبانوں پہ کہیں چرچا تیرا

صاحبِ عرش بھی فرمائے کہ انسان ہے تو
آدمی کیا ہے فرشتوں کی بھی اک جان ہے تو

---

# یوسف حسین خاں صاحب متعلم فیض عام ہائی اسکول میرٹھ

درد کا افسانہ ہے اور ضبطِ غم کا راز ہے (۱) اضطرابی کیفیت اندوہگیں انداز ہے
خون کے اشکوں سے جو مل کر بنا وہ ساز ہے قلب کی گہرائی سے نکلی ہوئی آواز ہے

قوم کے حالِ زبوں پہ دل تڑپتا ہے مرا
صبر کا پیمانہ لیجے اب چھلکتا ہے مرا

ایک دن وہ تھا کہ زیبِ عالمِ ایجاد تھے (۲) ایک دن وہ تھا جہاں میں خرم و دلشاد تھے
ایک دن وہ تھا غنا سے اپنے دل آباد تھے ایک دن وہ تھا کہ ہم مالک تھے اور آزاد تھے

شرق سے تا غرب دنیا میں ہمارا راج تھا
کامیابی کی طرف ہر ہر قدم معراج تھا

اب ہمارے پاس دنیا میں کوئی دولت نہیں (۳) وہ شکوہ و شان وہ عظمت نہیں شوکت نہیں
کوثر و تسنیم کا وہ شوق وہ حدت نہیں جس سے یورپ کانپ اٹھتا تھا وہ ہیبت نہیں

ہم بزرگوں کے عمل گر دیکھتے ہر بات میں
اب عنانِ سلطنت ہوتی ہمارے ہات میں

اب تو زینت کوششِ یورپ کے مقابل اڑ چکے (۴) اب تو یاس و بیکسی سے توڑ کر جی لڑ چکے
اب تو سیم و زر ہمارے دامنوں سے جھڑ چکے اب تو محبوسِ قفس ہو کر سلاسل پڑ چکے

ایک مدت سے غلامی کا گلے میں طوق ہے
خود ہمیں رسوائیوں کا آپ اپنی شوق ہے

علم سے محروم ہیں فن تک نہ اپنے پاس ہے (۵) قیدِ ذلت سے رہائی کی نہ اب کچھ آس ہے
ہر طرف سے بیکسی ہے بے بسی ہے یاس ہے مسلمو کچھ اپنی حالت کا تمہیں احساس ہے

آفتوں پر آفتیں پڑتی ہیں تم خاموش ہو
چاہیے تھا اپنی آزادی کا تم میں جوش ہو

اپنے بچھڑے بھائیوں کو پھر ملاتے کیوں نہیں (۶) تفرقے تم اپنے اندر سے مٹاتے کیوں نہیں
دشمنانِ دین پر سکہ بٹھاتے کیوں نہیں مستحق خود کو حکومت کا بناتے کیوں نہیں

اتحادِ باہمی سے تقویت مل جائیگی
دیکھ لینا خود بخود پھر حریت مل جائیگی

گو ہر اک راہِ ترقی ظاہراً مسدود ہے (۷) کامیابی کی فضا برسوں سے گرد آلود ہے
گو تہِ دریا میں پنہاں گوہرِ مقصود ہے گو کسی حد تک ہماری آرزو محدود ہے

پھر بھی کیا کچھ ہو نہ جائے ہم اگر کوشش کریں
آؤ باہم مل کے عریاں تن کی سب پوشش کریں

آیۂ لاتقنطوا پیشِ نظر ہر وقت ہو (۸) آفتوں کے واسطے سینہ سپر ہر وقت ہو
اور ہتیلی پہ لئے تم اپنا سر ہر وقت ہو اس کی قربانی کو پھر تیار ہر ہر وقت ہو

جان تک اس راہ میں دیدو تو کچھ پروا نہیں
دین کی خاطر تمھارے پاس ہو تا کیا نہیں

جرأت و ہمت کو اپنے ہاتھ سے جانے نہ دو (۹) دوسروں کو دولتِ علم و ہنر پانے نہ دو
اپنے اوپر تم گھٹا ادبار کی چھانے نہ دو مفلسی کو اک گھڑی نزدیک تک آنے نہ دو

خوابِ غفلت ہو چکا بہرِ خدا بیدار ہو
اپنے حق کے غاصبوں سے برسرِ پیکار ہو

---

## عبداللہ صاحب حقانی آزاد کراچوی متعلم انٹر کالج علی گڑھ

میرے سینہ میں ہے اک پوشیدہ رازِ زندگی (۱) بھول کر بھی چھیڑنا ہرگز نہ سازِ زندگی
ہیں نشاط آور خیالاتِ پریشانِ حیات زندگی کہتے ہیں ہونا بے نیازِ زندگی

انتہا بحرِ سکوں ہے ابتدائے جزر و مد — خامشی کرتی ہے پیدا اہتزازِ زندگی
منتشر بادِ خزاں نے کر دیئے برگِ حیات — درس آموزِ فنا تھی سازِ نازِ زندگی
روح کی بیتابیوں نے حشر برپا کر دیا — چھیڑ کر پچھتائے ہائے ہم تو سازِ زندگی
اب کوئی سینہ میں باقی ہے نہ ارمانِ حیات — آرزوئیں ہو گئیں سب وقفِ نازِ زندگی

اُف مری بیچارگی ہے اک جہانِ آرزو
جھیلتا جاؤں کہاں تک امتحانِ آرزو

(۲)

تجھکو کچھ معلوم ہے آئینِ فطرت کا نصاب — تیرتا پھرتا ہے دریاؤں کی موجوں میں حباب
ہمکنارِ ساحلِ مقصود ہونا ہے اگر — بحرِ طوفاں خیز میں بن جا تو موجِ اضطراب
شعلہ زارِ دینِ فطرت کو فضائے ہند میں — ایسا چمکا دے ہو ذرہ ذرہ وقفِ اضطراب
دل کے آئینہ میں ہے موجود وہ تصویرِ خواب — جس کی تعبیریں ثابت ہوئی موجِ سراب
تیرا احساسِ زیاں بھی ہے متاعِ کارواں — اختلاطِ نکہت ڈلیتی ہے افگندہ نقاب
خضرِ راہ بن کر لگا بھولے ہوؤں کو راہ پر — گر بنانا چاہتا ہے زندگی کو کامیاب

وسعتِ مقصد سے دنیا میں جو تو غافل رہا
عینِ دریا میں بھی دور افتادۂ ساحل رہا

(۳)

تجھ میں پوشیدہ ہے قدرت کا یہی بس ایک راز — تو اگر بندہ ہے تو مالک ترا بندہ نواز
صبح کے آئینہ میں ہے شام کی ظلمت کا راز — آنکھ گر دیکھے تو ہر ذرہ میں ہے قدرت کا راز
طائرِ فطرت نوا اپنی نوا سنجی نہ بھول — گلشنِ ہستی میں پیدا کر وہی پھر سوز و ساز
دل کا آئینہ غبار آلودۂ عصیاں ہوا — اب ضرورت ہے کہ پیدا ہو کوئی آئینہ ساز
کملی والے نے تجھے کملی میں اپنے کیا لیا — دین و دنیا کے فرائض سے ہوا تو بے نیاز

ایک ہنگامہ ہے پوشیدہ تری آواز میں
مضطرب ہیں سیکڑوں نغمے جہاں کے ساز میں

فرقہ آرائی نے سب مذہب کا کھو ڈالا وقار (۴) اُمتِ وسطیٰ کے ورنہ تم ہی تھے اک یادگار
کافروں کی مسلم آئینی یہ دھوکا کھا گئے اپنی عظمت اپنی شوکت سب کی سب کر دی نثار
تھی تری آغوش ہی گہوارۂ علم و ہنر خالقِ عالم کا ہستی میں تو ہی تھا رازدار
طلسمِ ہستی کے پر اسرار ہنگاموں کا تو ایک مدت تک رہا ہے اس جہاں میں رازدار
صورتِ آئینہ دل کو آشنائے ضبط کر دیکھ سب کچھ اور چپ رہنا بنا اپنا شعار

ہمت قومی بڑی جاں کاہ دستوں کا نام ہے
دفترِ غم سب کا سب پارینۂ اقوام ہے

اے پرستارِ دیرِ رحمٰن خود داری کو چھوڑ (۵) اے امینِ ملتِ بیضا دل آزاری کو چھوڑ
حق پرستی کر شعار اپنا فسوں کاری کو چھوڑ عرصۂ عالم میں تو اپنی جفاکاری کو چھوڑ
خاتمِ دنیا اگر بننا ہے تجھ کو دہر میں رام کرنا سیکھ اپنی گرم گفتاری کو چھوڑ
ہو فروغِ ساغرِ مے سے چراغاں بزمِ یار صورتِ پیمانۂ لبریز ناداری کو چھوڑ
زد میں ہے برقِ حوادث کے ترا جب آشیاں خود تماشائی نہ بن آئینہ دیواری کو چھوڑ
محرمِ اسرارِ قدرت بن کے پھر غافل نہ رہ رشتۂ تسبیح کر مضبوط زناری کو چھوڑ

تو ربابِ زندگی میں نغمۂ مستور ہے
تیرا سینہ جذبۂ توحید سے معمور ہے

---

## خواجہ عبدالواحد کومی لدھیانوی متعلم انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ

نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر یہ دل لگی کیسی (۱) ہے مشہورِ زمانہ آپ کی زندہ دلی کیسی
نہ کیوں کر طولِ گلزارِ دل خاموش ہو جائے غمِ اندوہ میں دل مبتلا لب پر ہنسی کیسی
نہ مونس ہے نہ ہمدم ہے کٹ رہے ہیں کس مپرسی میں مسلط ہو چکی ہے آہ ہم پر بے کسی کیسی

نہ گل ہے اور نہ بلبل ہے نہ ساقی ہے نہ میخانہ — لہو پیتے ہیں ہم اپنا اے واعظ میکشی کیسی
نہ وہ جوشِ جنوں باقی نہ وہ برقِ نظر باقی — سراسر موت کی تصویر ہیں ہم زندگی کیسی
نہ وہ شوقِ شہادت ہے نہ وہ ذوقِ عبادت ہے — یہی حالت رہی تو آرزوئے برتری کیسی
نہ عزمِ غزنوی ہے اور نہ ہے یلغارِ تیموری — تو ہے پھر شانِ دارائی، جمی، کیخسروی کیسی
عرب کے شیرِ غراں کی محبت دل میں پیدا کر — نہ جب اللّٰہی باقی رہی سیدائی کیسی
کسی دیوانہ کو توحید کی لو پھر لگی شاید — ہوئی ہے خانۂ زنجیر میں یہ روشنی کیسی
کنارہ کش ہو غافل اس ہجومِ شرک پرور سے — تو مسلم ہے تو پھر باطل سے صلح و آشتی کیسی

حیاتِ آرزو نمرود کو پیکِ اجل ہو جا
عدوے نسر ہو عزا دشمنِ لات وہبل ہو جا

(۲)

ٹپکتی ہے قلم سے روشنائی شیر تر ہو کر — زباں رہتی ہے اب میرے دہن میں نیشتر ہو کر
اگر جینا ہے مسلم امتِ خیر البشر ہو کر — تو رہ دنیا میں غیر اللہ سے تو بے خطر ہو کر
کہاں کی زندگانی ہے کوئی پوچھے تو یہ ہم سے — نہ جاگیں باخبر ہو کر نہ سوئیں بے خبر ہو کر
اگر ہے خون میں رنگت تو کچھ پھل پھول پیدا کر — رہے گا باغ میں کب تک نہالِ بے ثمر ہو کر
مجھے امید ہے جلدی ہی وہ دن آنے والے ہیں — رہیں گے جسم جاں ہو کر ملیں شیر و شکر ہو کر
ہو رہبر منزلِ مقصود کا پھر کارواں اپنا — کہ ہوں روشن نشاں یا چراغِ رہ گزر ہو کر
ندا سنتا ہوں میں اے بے خبر یہ عرش والوں کی — جبینِ مسلم خوابیدہ چمکے گی سحر ہو کر
فلک پر محوِ حیرت ہو گیا ہے نیرِ اعظم — ہماری خاک کے ذرے بھڑک اٹھے شرر ہو کر
خدا کے سامنے رو رو کے پھر فریاد کر غافل — کہ یہ اشکِ ندامت ہے جو ملتا ہے گہر ہو کر

سرِ شوقِ حمید داستانِ عشق پیدا شد
زیک مشت غبارِ صد جہانِ عشق پیدا شد

نمودِ حشر ہوگی جب مرا نالہ رسا ہوگا (۳) فلک آ... [illegible]

بنے گا قیس پھر مجنوں شمیمِ زلفِ لیلیٰ کا
معطر عطرِ گل سے دامنِ بادِ صبا ہوگا

مبارک ہو بہارِ بے خزاں پھر آنے والی ہے
گلِ امید ہونگے اور دامن آپ کا ہوگا

فلک سے نامہ بر آئے گا بخشش کی خبر لے کر
نویدِ جاں فزا ہوگا پیامِ دل ربا ہوگا

اثر کر جائے گی ملت میں یاں تک شانِ یکرنگی
خدا پر ہم فدا ہونگے خدا ہم پر فدا ہوگا

دعائے حسن دے گا ہاتھ اُٹھا کر عشق والوں کو
ادھر خونِ جگر ہوگا اُدھر رنگِ حنا ہوگا

عدو بھی جانتے ہیں وہ زمانہ آسنے والا ہے
زمیں سے عرشِ اعظم تک ہمارا غلغلہ ہوگا

بہیں گے نور کے چشمے ہمالہ کی چٹانوں سے
کہ یہ سب کچھ جو ہونا ہے بتائیدِ خدا ہوگا

کریمی بے کسوں کی مشکلیں حل ہونے والی ہیں
سعی مسلم کرے گا اور خدا مشکل کشا ہوگا

جہاں میں سلطنت ہوگی امیرِ بدر و خیبر کی
صنم خانوں سے آئے گی صدا اللہ اکبر کی

---

## سیّد محمد عارف فاطمی ملیح آبادی متعلم انٹر کالج علی گڑھ*

تو ہی ہے زندگیٔ قوم کا اک رازِ نہاں (۱) تیرے ہی قبضے میں ہیں تاجِ سلاطینِ جہاں
گوسفندوں میں ہو پیدا تو ہوں وہ شیرِ ژیاں قوتِ نطق ہے تو قوم ہے گر مثلِ زباں

قوم گر جسم ہے تو اُس کے لئے جان ہے تو
جان کیا مال ہے واللہ کہ ایمان ہے تو

جب کہ تثلیث کے فرزند ہوئے مائلِ جنگ (۲) عَلَمِ شیر کے سائے میں تھی جب فوجِ فرنگ
آئے میدان میں تیر و تبر و توپ و تفنگ وسعتِ شام ہوئی کثرتِ افواج سے تنگ

کر دیا کفر کی آتش کو گلستاں تو نے
کر دیا آلِ براہیم کو شاداں تو نے

* یہ نظم مقابلہ میں کامیاب رہی اور مستحق انعام سمجھی گئی۔

اے کہ جب مسلمِ اسپین میں طاقت نہ رہی (۳) جب شجاعانِ عرب کی وہ شجاعت نہ رہی
دین کی سینۂ مسلم میں امانت نہ رہی جب مسلمانوں کی پہلی سی وہ حالت نہ رہی

تو نے اسپین کے باشندوں کو آزاد کیا
ان کی دنیائے تمنا کو پھر آباد کیا

اے کہ جب پاؤں میں اسکاچ کی زنجیریں تھیں (۴) حلق معصوم تھا جلادوں کی شمشیریں تھیں
رائگاں ملتِ محکوم کی تدبیریں تھیں بے گناہوں پہ عجب ظلم تھے تعزیریں تھیں

تو ہی ہے خواب سے سوتوں کو جگایا جس نے
قومِ بیکس کو غلامی سے چھڑایا جس نے

جب کہ درپیش ہوئی عسکرِ اسلام سے جنگ (۵) راجپوتوں پہ بہت عرصۂ ہستی ہوا تنگ
ہاں تری وجہ سے پیدا ہوئی پھر دل میں اُمنگ سمجھے محکومیٔ اغیار کو وہ باعثِ ننگ

مرد تیار ہوئے رن میں نکلنے کے لئے
عورتیں کود پڑیں آگ میں جلنے کے لئے

اس ہند میں عزت نہ رہی (۶) شان و شوکت نہ رہی اپنی حکومت نہ رہی
جب وہ حشمت نہ رہی اور وہ ثروت نہ رہی اپنے بیزار ہوئے غیروں میں وقعت نہ رہی

تو ہی ہے خواب سے سیّد کو جگایا جس نے
قوم کے واسطے کالج کو بنایا جس نے

ترکِ بیمار کو جب سب نے مٹانا چاہا (۷) خاک میں دولتِ عثماں کو ملانا چاہا
نوشدارو کے عوض زہر پلانا چاہا ترک کو موت کا پیغام سنانا چاہا

تو ہی تھا قوتِ بازوئے کمالِ ترکی
عیدِ مسلم ہوئی چمکا جو ہلالِ ترکی

مدتوں ملتِ افغاں پہ تھا برٹش کا اثر (۸) آستاں غیر کا تھا اور مسلماں کا سر
زنگ آلود تھے اسلام کے جب تیغ و تبر   تو نے صیقل کئے شمشیرِ اماں کے جوہر
قومیں بھر آئیں جو آزادی کا پرچم دیکھا
جو نہ جھکتا تھا کسی سے وہی سر خم دیکھا

سن ذرا ملتِ ایراں کو جگانے والے (۹) جام آزادی کا قوموں کو پلانے والے
ہندیوں سے رخِ زیبا کو چھپانے والے   ہجر میں او دلِ عارف کے جلانے والے
جب ترا ہندیوں کے قلب میں مسکن ہوگا
جو ہے ویرانہ وہ کل غیرتِ گلشن ہوگا

---

## صمد یار خاں صاحب ساغر سیمابی نظامی

اے قوم یہ اک آواز ہے جو اکثر اس رخ سے آتی ہے (۱) جس رخ پہ دنیا آج تلک اپنا فرقِ نیاز جھکا ت
یہ ہے آواز اس کی جو اپنی قوم کا یکتا بانی ہے   جو اس دنیا میں باقی ہے جس کا ہر ذرہ فانی
وہ قوم کا بانی اب تک اپنی قوم کے ہے غم خواروں میں   وہ قوم جو تاروں میں چمکی اور ڈوب گئی اندھیارد
وہ طیبہ والی قوم حجازی قومِ عرب فطرت والی   حق کی ترائی قوم ترائی قوم بڑی عظمت
چرواہا اپنی قوم کے گلے کو اب وحشی پاتا ہے
اور اپنی نوائے خاص میں اس کو اپنے پاس بلاتا ہے

ہر کوئی جو یہ آواز سنے اس دعوت کا احساس کرے (۲) جو ہے سردارِ قومیت اس کی عظمت کا پاس کرے
ہر کوئی جو اس الہام کو اپنے کانوں میں گنجائش دے   لبیک کہے اس دعوت پر داعی کو داد کاوش
ہر کوئی جسے ہے ذوق ابھی تحریم سروش آہنگی کا   حامل کوئی دل باقی ہے جذباتِ بلال ز

ہے کوئی جو اس پیغام کو سن کر برقِ مجسم بن جائے
آوازہ یہ قرباں ہو جائے غازئ اعظم بن جائے
مصروف ہیں یوں تو اک دنیا دنیا کے ناقص دھندوں میں
کیا کوئی ابن الوقت نہیں اسلام ترے فرزندوں میں

(۳) قومیت بیوہ قومیت اُن فرزندوں کی جویا ہے
جن کو اُس نے بین الاقوامی ہنگاموں میں کھویا ہے
وہ فرزندانِ قوم کہاں ہیں اپنا مرجع یاد کریں
آغوشِ قومیت کو اپنے جلووں سے آباد کریں
سب ہوئے بچھڑے پروانے شمعِ ملت کا طوف کریں
لیں درسِ گداز آزادی تکمیلِ وفا سے خوف کریں
قومیت اپنے دامن کو فرزندوں پر پھیلائے گی
پھر امن کا سایہ پھیلے گا یہ دنیا پھر لپٹائے گی
جب اپنے اصلی مرجع تک یہ قوم رسائی پائے گی
سب کچھ اس کو مل جائے گا یہ پھر سب کچھ ہو جائے گی

(۴) اے فرزندانِ قوم علی گڑھ داعیِ قومیت ہے
یہ درس گہِ قومیت ہے یہ راعیِ قومیت ہے
قومیت کا جذبہ لے کر اس قومی ایوان سے نکلو
دھوکا ہو بہاروں کا تم پر جس وقت تم گلستاں سے نکلو
اے فرزندانِ قوم تمھاری صورت دنیا تکتی ہے
تم سے ہیں بہت کچھ اُمیدیں مایوسی کر کیا سکتی ہے
مایوسی ہے اک وہم کہ قومیت کے گھر کی آس ہو تم
جس نے بھیجا ہے طیبہ سے ہر وقت اُسی کے پاس ہو تم
یہ ہے ساغر کی مست اُڑایا ساقی کی آواز سنو
ہے جذبۂ قومی کا نغمہ اور ساتھ حجازی ساز سنو

---

# عزتِ نفس

مولوی عاشق حسین صاحب سیماب اکبر آبادی

میں نے کل اک پھول سے پوچھا کہ اے مستِ نمو
نوجوانانِ چمن سے کیوں کھچا رہتا ہے تو
عرش سے موتی برستے ہیں ترے اوراق پر
روشنی پڑتی نہیں لیکن ترے اخلاق پر

سر بالا کریا تو وہ موتی گرا دیتا ہے تو
یا انھیں خورشید کے آگے بڑھا دیتا ہے تو

جمع کرتے ہیں جو سرمایہ ستارے رات بھر
تو ملا دیتا ہے اس کو خاک میں وقتِ سحر

بوسہ لیتی ہیں اگر بوندیں بگڑ جاتا ہے تو
اپنے اور نگِ تجمل پر اکڑ جاتا ہے تو

جب صبا آغوش میں لے کر جھکاتی ہے تجھے
اپنی رنگینی سے جھوٹی شرم آتی ہے تجھے

گنجِ زنگار رنگ میں گم صم پڑا رہتا ہے تو
بات سنتا ہے کسی کی اور نہ کچھ کہتا ہے تو

کیوں نہیں تو شوخیِ ہنگامہ آبادِ چمن
اے اسیرِ رنگ و بوئے حسن آزادِ چمن

نالہ ہے صد شوق در پر تو تغافل کوش ہے
شوق ہے صد نالہ بر لب اور تو خاموش ہے

ایں ہوا در سر کہ داری کج کلاہی کیستی
ایں چنیں رنجیدہ رنجیدہ نگاہی کیستی

ہنس کے بولا پھول لے شکوہ طرازِ خامشی
آج تک تجھ کو نہیں معلوم رازِ خامشی

یہ مرا حسنِ متانت میرا آب و رنگ ہے
ورنہ میرے ضبط سے خود ظرف میرا تنگ ہے

میں نہ شبنم کے اگر موتی گرا دوں خاک پر
تو ستاروں میں ہو کیوں عظمت مری افلاک پر

خندہ بر لب بوسہ یاراں سے گر ہو جاؤں میں
بجلیوں میں آشیانے کی طرح لٹ جاؤں میں

باغ میں یوں سرکشیدہ شاخ پر رہتا ہوں میں
دستِ گلچیں سے نظاماً بے خطر رہتا ہوں میں

خود اگر اپنے تجمل کا نہ اندازہ کروں
کس طرح سب کے مشامِ روح کو تازہ کروں

گر نہ سمجھوں ہر ورق کو اپنے عنوانِ بہار
مجھ سے کیوں مانوس ہو زلفِ پریشانِ بہار

آتشِ گلشن ہوں اپنی گرمیِ پر جوش سے
رونقِ محفل ہے میرے جلوۂ خاموش سے

طلعتِ دنیا مرے آئینِ بیزاری سے ہے
موجِ آغوشِ صبا تمکینِ خودداری سے ہے

خود نمائی کا گلہ برحق مگر یہ عرض ہے
اپنی عزت خود کروں یہ بھی تو میرا فرض ہے

# غیر طرح کلام

## فانیؔ - مولوی شوکت علی خاں صاحب بی اے علیگ

گریۂ جوشِ ندامت بس اب تھمنے کا تو نام نہ لے
جب تک رحمت کا ہر پہلو دل کا دامن تھام نہ لے

دل کی لامحدود فضا میں گم ہو جا یوں آپ کو ڈھونڈ
ہوش کے بس کا روگ نہیں ہے ہوش سے تو یہ کام نہ لے

راحت کا مفہوم یہی ہے جہدِ طلب سے باز نہ آ
بڑھنے دے دل کی بے چینی تڑپے جا آرام نہ لے

لغزشِ توبہ کے ہاتھوں رندوں کا ٹھکانا تھا کوئی
مستیٔ چشمِ یار اگر تو گرتے ہوؤں کو تھام نہ لے

ننگ ہے سعیِ عرضِ محبت، فرضِ محبت پورا کر
اس کے سوا کچھ یاد نہ رکھ بھولے سے اثر کا نام نہ لے

دل تو دل ہے دل کو چین آ جانا تو آسان نہیں
درد وہ ہے جو دل میں اٹھ کر آپ ہی پھر آرام نہ لے

ہونا ہے وہ ہو کے رہے گا مجبوری کی حد سے نہ بڑھ
بیٹھے بٹھائے اپنے سر آزادی کا الزام نہ لے

کافر صورت دیکھ کے منہ سے آہ نکل ہی جاتی ہے
کہتے کیا ہو اب کوئی اللہ کا یوں بھی نام نہ لے

حسنِ پشیماں کو فانیؔ بیت پہ نہ دے تکلیف کرم
وضعِ شکستِ عشق نبھا دے دیکھ کوئی الزام نہ لے

## ایضاً

اک برقِ سرِ طور ہے لہرائی ہوئی سی
دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی

محضر ہے یہی قتلِ شہیدانِ وفا کا
جلّاد کی چتون ہے جو شرمائی ہوئی سی

سنتا ہوں جو آتی ہے صدا پردۂ دل سے
امید کی آواز ہے تھرّائی ہوئی سی

اک عالمِ دل ہے وہی دنیا وہی فردوس
ہر شے نظر آتی ہے نظر آئی ہوئی سی

درپیش ہے پھر مسئلۂ طاقتِ دیدار — پھر کچھ نگہِ شوق ہے گھبرائی ہوئی سی
میرے دلِ برباد کے دھندلے سے نشاں ہیں — اس باغ میں کلیاں ہیں جو مرجھائی ہوئی سی
ہر سانس پہ فانیؔ مجھے گویا دمِ آخر — سمجھا ہوں محبت میں قضا آئی ہوئی سی

## ایضاً

وہ بے خودی کے پیالے پلا دیئے تو نے — مرے حواس ٹھکانے لگا دیئے تو نے
گرا کے قطرۂ شبنم گلوں کے دامن پر — تجلّیات کے دریا بہا دیئے تو نے
بنا کے ہجر کی راتوں کو بے نیازِ سحر — تعینات کے پردے اٹھا دیئے تو نے
دکھا کے تجزیۂ رنگ و بو کا حسنِ کمال — مشاہدات کے ٹکڑے اڑا دیئے تو نے
دلوں کو دے کے فریبِ سکونِ بے آرام — تغیرات کے نقشے جما دیئے تو نے
یقینِ عشق کی ہلکی سی لہر دوڑا کر — توہمات کے شعلے بجھا دیئے تو نے
عطائے نعمتِ سوز و گداز کی خاطر — اذیتوں کے خزانے لٹا دیئے تو نے
حجابِ خلق کو معجز نوائیاں دے کر — نظر کی آڑ میں جادو جگا دیئے تو نے
سرودِ عقل و غمِ عشق کے دوراہے پر — بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا دیئے تو نے
جمالِ یار کا افسانہ چھیڑ کر فانیؔ — شعاعِ نور سے دل جگمگا دیئے تو نے

## مانیؔ - مولوی سید کلب حیدر صاحب جائسی

قصد و طلب یعنی راہِ طلب کے مبادی کچھ بھی نہیں — سرحدِ ہوش سے آگے بڑھ، یہ جذبِ ارادی کچھ بھی
نادیدہ سکونِ ساحل ہوں، مانوس بہ آغوشِ طوفاں — میں نابلدِ آبادی ہوں، میری بربادی کچھ بھی
راہِ غم اور قافلۂ دل، کس کو خبر ہے منزل کی — شورِ جرس، آوازِ حدی خواں، بانگِ منادی کچھ بھی
اے گوشہ نشینِ یاس ارے دل اے محوِ فریبِ آزادی — ٹوٹا ہے نہ ٹوٹے بندِ وفا، یہ تو آزادی کچھ

ہستی کو عدم جس صورت میں حاصل ہو، وہی پائندہ ہے
یعنی شکلِ ثباتِ خوشی، جز مرگِ شادی کچھ بھی نہیں

دردِ نہاں ظاہر ہو تو کیوں کر آہ کی آوازیں سُن کر
میں نے سوال کیا کیا گزری دل نے صدا دی کچھ بھی نہیں

اب کیا پُرسش ہو دل تڑپا، آنسو ٹپکے دیکھ ما نی
میری کہانی اس کے سوا، جو تجھ کو سنا دی کچھ بھی نہیں

## ایضاً

وہی وہ، وہی بزم کیسے کہوں میں
کہ جو کل تھا وہ رنگِ محفل نہیں ہے
یہ کہیئے کہ سر میں وہ سودا نہیں ہے
یہ کہیئے کہ پہلو میں وہ دل نہیں ہے

---

اسے طاقتِ ضبط کا ادعا ہے
وہ جلوے کی تابش کا قائل نہیں ہے
غرض ہوش اس گفتگو کا ہے سب کو
کہ وہ زینت آرائے محفل نہیں ہے

---

بجا ہے کہ محمل ہے موجود لیکن
بلاوے میں صدائے سلاسل نہیں ہے
نہیں ہے جو دیوانۂ نجد باقی
تو وہ شانِ دل چسپ محمل نہیں ہے

---

کرے سعی ہر چند سارا زمانہ
نہیں دل کی قسمت میں آرام پانا
محالات سے ہے لکھے کا مٹانا
یہ کہہ لو کہ ہاں تم کو مشکل نہیں ہے

---

یہ محشر کا مجمع ہے میں چپ ہوں لیکن
خود انصاف سے آپ اک بات کہہ دیں
کوئی ذرّۂ کائناتِ جہاں ہے
کہ تصدیقِ بربادیِ دل نہیں ہے

---

کٹے کیسے ہستی کی راہِ مصیبت
کہ ہے ہر قدم کارزارِ محبت
یہ مانا کہ انفاس کی کچھ حقیقت
بجز سعیِ قطعِ منازل نہیں ہے

اب آنکھوں میں آنسو نہ ہونٹوں پہ نالے  نہ ایذائے حسرت نہ کربِ تمنّا
غرض جذبۂ جاں نثاری ہی اور بس  کوئی شاہدِ ہستیِ دل نہیں ہے

مرے بس میں دل ہو نہ دل کی تمنا  مگر تم کو قدرت ہے پامال کر دو
یہ سچ ہے کہ میرا دلِ بے حقیقت  تمھاری تمنا کے قابل نہیں ہے

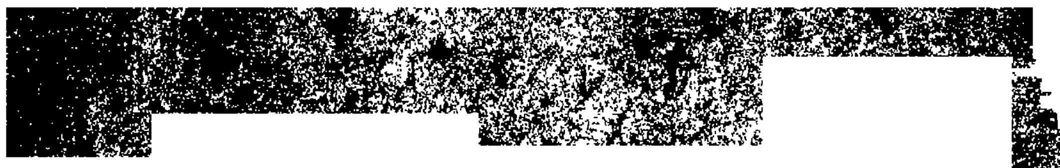
نہ پوچھو کہاں کا ہے قصد اور کیوں ہے  سکوں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں مسلسل
بظاہر سوئے موت جانا ہے لیکن  سنا ہے کہ وہ بھی تو منزل نہیں ہے

جہاں محوِ ظاہر پرستی ہے مانی  تو کچھ اہلِ دل سا تھا لیکن تجھے بھی
ذرا ہوشِ تائیدِ حق کا نہیں ہے  ذرا جوشِ تردیدِ باطل نہیں ہے

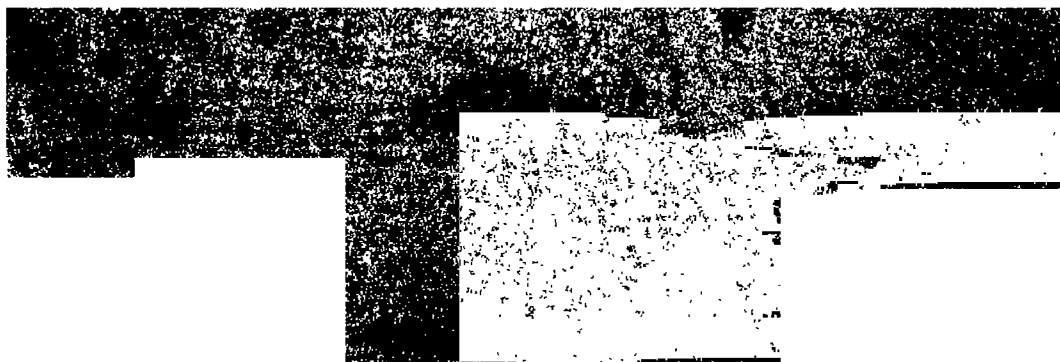
# The Intermediate College Magazine.



JUNE to SEPT., 192[illegible] Vol.







بسم اللہ الرحمن الرحیم

# انٹرمیڈیٹ کالج میگزین

جلد (۱) | بابت ماہ نومبر ۱۹۲۹ء | نمبر (۱۱)

## فہرست مضامین

# ضروری اعلان

انٹرکالج میگزین کا سالانہ نمبر بڑے آب و تاب کے ساتھ ماہ دسمبر میں شائع ہونیوالا ہے۔ اس نمبر میں طلبائے انٹرکالج کے مضامین کا ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ مضامین بالخصوص ٹھوس اور علمی ہونا چاہئے۔ عمدہ تراجم بھی رسالہ میں دیج کئے جاسکتے ہیں۔ یہ مضامین نظم و نثر ماہ نومبر کے اخیر ہفتہ تک اڈیٹر کے پاس پہونچ جانا چاہئے۔

اڈیٹر۔

# غزل

از علامہ "عیشی" (سرادہ)

منم کز غیر پنہاں عشق یار نازنیں دارم
نہاں از چشم مردم اشک خون در آستیں دارم

بجوشش عشق حسن ناز پرور را قریں دارم
درون پردۂ دل لیلئ محمل نشیں دارم

دل وارستہ دارم نے غم دنیا و دیں دارم
مگر مہر سیہ چشماں کہ بر لوح جبیں دارم

بہ مہر مست گاہ معنی جلوۂ صد عیش می بینم
بہ بزم بادہ نوشاں یک دل خلوت نشیں دارم

زحال درد و درمانم چہ می پرسی کہ من دل را
بہ ہجر تو حزیں دارم بہ یاد تو غمیں دارم

امید سود و راحت یک طرف بیم زیاں یکسو
بحمد اللہ والمنت نہ آں دارم نہ ایں دارم

خراماں می چمم در باغ حسن بے مثال او
خیال گلشن جنت نہ میل حور عیں دارم

دل سودا زدہ کوس جنوں در کوہ و ہاموں زد
ہزاراں دشت وحشت آفریں زیر نگیں دارم

ز فیضان توکل یافتم معراج استغنا
نہ کنج فقر جویم نے ہوائے شہ نشیں دارم

محبت می برم با خود پس از مرگم تماشا کن　　که از حسرت ہزاراں آسماں زیرِ زمیں دارم

بروئے حسرت آگیں چوں نظر کردم ز جاں رفتم　　نگاہ اولین خود نگاہِ واپسیں دارم

ہمہ شب داستانِ دردِ دل گفتم بہ پیشِ دل　　ہمیں یک چارۂ دردِ دلِ اندوہگیں دارم

شرشک لالہ گوں از شرم عصیاں اسلحتے دارد　　رواں از چشمِ گریاں چشمۂ ما معیں دارم

فدائے لعل شیریں ست دل و جانم چہ خوش گفتی
بہ کوئے خود چو عیشی مدگدائے رہ نشیں دارم

# رازِ ہستی

از حکیم ماجد صاحب حامدی

آج بے پردہ نظر آتی ہے تصویرِ جہاں　　ہے مگر خواب محبت کی یہ تعبیر عیاں

عشق کے نور سے روشن ہیں نگاہیں میری　　عشق کے سوز سے دمساز ہیں آہیں میری

غم نے دیدے کے جلا دل کو وہ آئینہ کیا　　صاف آتا ہے نظر جس میں ہو اچھا کہ بُرا

دیکھ لیتا ہوں میں دنیا کی حقیقت اسمیں　　نظر آتی ہے ہر اک چیز کی فطرت اس میں

ہو نہیں سکتا مجھے دہر میں دھوکا ہرگز　　میری نظروں کو حجابوں نے نہ روکا ہرگز

کب یہ ممکن ہے کہ تکلیف کو راحت سمجھوں　　بقعۂ نور کو معمورۂ ظلمت سمجھوں

دل مرا گوہر اسرار کا گنجینہ ہے　　ہے جو دنیا کی حقیقت وہ سب آئینہ ہے

مجھ سے پنہاں نہیں ماہیتِ سوزِ ہستی　　ہیں عیاں میری نگاہوں پہ رموزِ ہستی

زندگانی میری محدود سہی فانی بھی　　ہے مگر پردۂ قدرتِ ربانی بھی

جو فنا ہو کے بھی باقی ہے وہ ہستی ہے مری　　تیز تر ہوتی ہے ترشی سے وہ مستی ہے مری

زندگانی میری کیا ہے تمھیں بتلاؤں کیا　　بعد مٹنے کے بھی آج ہے یوں جلوہ نما

پھول میں پتے میں شبنم میں نہالِ تر میں　　کوہ میں دشت میں صحرا میں کہ بحر و بر میں

زینتِ گل ہے یہی زینتِ غنچہ ہے یہی　　یعنی لبستہ ہے یہی اور کشودہ ہے یہی

بربط عیش بھی اور یہی سازِ غم — لبِ خنداں بھی یہی اور یہی چشم پرنم

ہے یہی خندہ گل اور یہی بلبل کی فغاں — یہی آوازِ خوشی ہے یہی آہوں کا دہواں

یہی پابند ہے گلشن میں یہی ہے آزاد — یہی نرگس کی نظر ہے یہی قدِ شمشاد

ظلمتِ شب ہے یہی اور یہی نورِ سحر — یہی محرومی کور اور یہی بینا کی نظر

ہوشیاری ہے یہی اور یہی بے ہوشی — شور و غوغا بھی یہی اور یہی خاموشی

بادلوں میں ہے گرج اور یہی بجلی میں تڑپ — صحنِ گلشن میں یہی بلبل و گلچیں کی جھڑپ

رہتی ہے سینۂ انساں میں یہی غم بن کر — اور یہی شادی و خوش کامیِ آدم بن کر

شکل سیماب میں بیتاب ہوئی جاتی ہے — عالمِ نازِ سکوں سیم میں دکھلاتی ہے

ہے نمایاں یہی نظروں پہ یہی پوشیدہ — یہی بیدار ہے عالم میں یہی خوابیدہ

چاندکی چاندنی میں ہے یہی فرحت افزا — یہی سورج کی شعاعوں میں تمازت افزا

فرطِ شادی ہے یہی اور یہی جوشِ غم ہے — اسی آنسو سے کسی کا سرِ مژگاں نم ہے

زلفِ لیلیٰ میں یہی بن کے پریشانی ہے — یہی مجنوں کے یہاں چاک گریبانی ہے

اصلِ الفت ہے یہی عین محبت ہے یہی — حسن کی جان یہی حسنِ حقیقت ہے یہی

جو ہے عاشق وہی معشوق ہے کچھ فرق نہیں — تابشِ حسن وہی ہے جو ہے آہوں میں کہیں

گرچہ نسبت نہ تھی فرہاد کو کچھ شیریں سے — تھے مگر اصل میں دو نام یہ اک ہستی کے

عشق کب قیس کو تھا لیلیٰ صحرائی سے — اپنی ہی ذات پہ مرتا تھا خود آرائی سے

حسن اور عشق میں کچھ فرق نہیں ہے اصلا — دونوں سے ذاتِ حقیقی کا ہے جلوہ پیدا

عشق کا رام وہی حسن کی سیتا بھی وہی — یعنی بلبل بھی وہی اور گلِ رعنا بھی وہی

بسکہ ہے ذات سے میری یہ ظہورِ عالم — میری ہی ہستی تو ہے ظلمت و نورِ عالم

ابر کی طرح سے کل دہر پہ چھائی ہے یہ — جلوہ پیرائی ہے یہ جلوہ نمائی ہے یہ

صورتِ قطرہ جدا تھی کبھی دریا سے مگر — مل گئی آج ہے مرکز سے پھر اپنے جا کر

مژدۂ وصل ہے در اصل یہ پیغامِ فنا — پھر بغلگیر ہوں اُس سے تھا کبھی جس سے جدا

یعنی میں ہی تھا کہ تھا ذرہ ناچیز کبھی — اب ہم آغوشیِ صحرا سے ہوں صحرا خود بھی

# بلائے بے درماں

از جناب سید جلیل حسنی صاحب (بی۔ اے علیگ)

شمیم نے اپنی مختصر حیات بست سالہ کے دور میں جس قدر ہیجان انگیز انقلابات دیکھے تھے وہ اپنی نوعیت عجیبہ کے لحاظ سے اُس کے قوائے عمل مضمحل کرنے کے لئے کافی تھے۔ اپنی ہنگامہ خیز ہستی کی بدولت قبل از وقت رنگینی حیات تلف کر چکا تھا۔ شباب کی دل آویزیاں نذر حوادث ہو چکی تھیں ہنگامہ تخریب کا جوش عمل اب صرفہ وسکوں اور جمود بن چکا تھا گو شباب کی قیامت زائیاں ہر تزئین اور زیور آرائیوں سے بے نیاز ہوتی ہیں لیکن شبانہ روز کی بے اعتدالیاں اپنا رنگ دکھلائے بغیر نہ رہ سکیں۔ وہ شمیم جو کبھی گل کے مانند محبوب نظر تھا اب ہر کہ ومہ کی نظروں میں خار کی طرح کھٹکنے لگا۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ہر حسین شے خواہ وہ کتنی ہی دلاویز کیوں نہ ہو لیکن ارزانی عام اور التفات بے جا اُس کے حسن کو زائل کر دیتے ہیں۔ حسن کی تعریف صرف یہ ہی ہو سکتی ہے کہ یہ قوت امتیاز کا فریب دہ تخیل ہے۔ یہ کہنا کہ شمیم میں اب جاذبیت نظر کے کرشمے موجود نہ تھے ایک حقیقت تھی پھر بھی چشم عبرت کے لئے نقوش پارینہ تازیانہ عبرت کا حکم رکھتے تھے۔ پہلے وہ حسن زندہ کی تصویر تھا اور اپنی ہر روش حیات سے انسانی قلوب کو برما سکتا تھا گو اب کملائے ہوئے پھول ارباب ذوق کے لئے دلچسپیاں تو پیدا کر سکتے تھے مگر بے فکر قلوب میں فانی اور زوال پذیر عیش کے تاثرات پیدا کرنا ممکن تھا ہر شے اپنی حدود کے اندر سامان تفریح رکھ سکتی ہے مگر حد سے تجاوز ہی اُس کے قبح کے پہلو کو سامنے لا کر کھڑا کرتی ہے۔ اُس کی زندگی کچھ ایسے ہی ماحول میں گزری تھی جس میں ہر شے میں اُسے کیف نظر آتا تھا اور اسی لئے زندگی کے متعلق اُس کا یہ نظریہ تھا کہ "یہ اقتضائے حیات ہے کہ ہر شے سے کیف اندوز ہو۔ بدترین گناہ یہ ہے کہ اشیاء عالم سے لطف کوشی میں بدتوفیقیاں دکھلائی جائیں" اس کے جواز میں وہ ایسے ایسے دلائل و براہین سے کام لیتا ہے کہ سننے والے خاموش رہ جاتے وہ کہتا تھا کہ حیات مستعار کے چند لمحے جو عیش و مسرت میں صرف ہوئے ہوں وہ اُس عمر خضر سے بہتر ہیں جو یک طرفہ رہین گوشۂ عزلت ہوں یہ انبساط خواہ کسی ذریعہ سے حاصل ہو اس کے تحصیل میں خواہ کسی عزیز ترین شے کا خون ہوتا ہو ضروری ہے کہ اُس کے لئے قربان کر دی جائے۔ خود غرضی یا خود پرستی کا ہر پردہ خیانت

ردیانتی کا ہر پہلو اُسے اختیار کرنے میں کوئی باک نہیں تھا دنیا کی ہر چیز ان ہی مقاصد کو پیش نظر رکھ دیکھتا تھا وہ ظلمت جو ایک کبیدہ اور ترش رو چہرہ پر نظر آتی تھی اُس کے لئے ایک بھیانک خواب تھا جس سے دُور رہنے کی وہ امکانی کوشش کرتا تھا۔ اس کے لئے ایک شگفتہ اور مسرور چہرہ ایک ابدی رحمت تھی وہ کائنات عالم کی ہر شے میں حسن عالم سوز کی تنویریں دیکھتا تھا۔ ہر شے کا ہست ہونا ہی اُس کی رنگینی تخیل کے لئے دلچسپی کا مواد فراہم کر دیتی تھی۔ مگر کاش معصوم حُسن کو صرف پرستش کی نگاہ سے دیکھتا تو شاید اپنے پیچھے دنیا والوں کے لئے بہت کچھ سامان تفریح چھوڑ جاتا۔ لیکن حُسن کی معصومیت کو اصل سے بوجہ اُس کے معصوم ہونے کے حاصل کرنا وہ بدترین گناہ تھا جس سے اس کا دامن ملوث تھا اور وہی بالآخر اُس کی تباہی کا باعث ہوا۔

( ۲ )

جس ماحول میں ہم رہتے ہیں اُس کا اثر ہم پر ضرور پڑتا ہے مگر اپنے حوالیات کا متشکل کرنا ہمارے امکان میں ہے بچپن سے انسان ضروریات انسانی کا محتاج ہوتا ہے لیکن زندگی کی تگ و دو میں احتیاج انسانی محدود ہو سکتی ہے اگر مشاغل سے دستکشی اختیار کر لی جائے۔ ہم جس قدر تعیش کی پہنائیوں میں مستغرق ہونے کی کوشش کرینگے اتنا ہی زیادہ ہمیں مقصد حیات نامکمل نظر آئیگا یہ ایک فطری امر ہے اور اصول صریحہ ناقابل انکار یہی وجہ تھی کہ شمیم جتنا زیادہ مسرت سے ہمکنار ہوجاتا تھا اُتنی ہی زیادہ اُس کی اُمنگیں بڑھتی جاتی تھیں۔ مگر یہ کہنا کہ شروع ہی سے یہ تعیش پرستی اُس کی سرشت میں تھی غلط ہے اس بے راہ روی کی ذمہ داریاں بہت کچھ اُن میاں جی پر عاید ہوتی ہیں جن کے سپرد اُس کی پرورش ہوئی تھی اور جنھیں عرف عام میں اتالیق کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

( ۳ )

میاں جی کا کچھ مشرب ہی جدا تھا دیکھنے میں نہایت سیدھے سادے بزرگ تھے مقدس دراز ریش جس نے عاشقوں کی شب فرقت کی طرح طویل ہونے کی قسم کھائی تھی ناف تک لہرائی ہوئی تھی گول آنکھیں تھیں جس میں خطرناک قسم کی شرارت آمیز چمک موجود تھی کل قلیل فتنہ کے مصداق حضرت شاید اکیسویں صدی کے لئے زیادہ موزوں تھے اِس لئے کہ موجودہ علما یورپ و امریکہ کا خیال ہے کہ انسان پر ایک وہ زمانہ آنے والا ہے جب وہ بالکل مخنی ہو جائیگا مگر عقل و فراست میں روز افزوں ترقی کریگا فطرت کی

## CONTENTS

تو نہایت درجہ کی سادگی سے طالب کے بازوؤں سینوں اور گھٹنوں کے کچھ ذرا بالائی حصوں کو ٹٹولتے کہ علم لدنی حاصل کرنے کی اس میں ماہیت اور قوت ہے یا نہیں بہت سے تو بیچارے یہیں سے ہمت ہار دیتے تھے مگر وہ خوش قسمت ہستیاں جو اس امتحان میں کامیاب ہوتی تھیں وہ مریدین اور معتقدین کے منفرد لقب سے یاد کی جاتی تھیں۔ تیسری آزمائش تو کچھ زیادہ سخت نہ تھی مگر آزاد اور بے فکر لوگوں کے لئے سامان ابتلاء ضرور تھا اس میں نہایت پابندی کے ساتھ ہر معتقد کو ایک وقت خاص میں نہایت پابندی کے ساتھ حاضر ہونا پڑتا تھا۔ اس وقت زمین پر ایک فرش بچھا ہوتا تھا جس پر میاں جی بیٹھکر درس و تدریس دیا کرتے تھے مشائخین کا چاروں طرف ایک حلقہ ہوتا تھا جس کے مرکز خود میاں جی ہوتے تھے۔ نفسیات کا مسئلہ کہ غنا سحر کا حکم رکھتی ہے آپ اس کے (۱) سے قائل تھے چنانچہ اسوقت اکثر و بیشتر مثنوی مولانا روم یا غزلیات حافظؒ کا ورد ہوتا تھا صدائے بازگشت جسوقت حجرہ میں گھوم گھوم کر تشنہ کامان معرفت کے گوش ہوش تک پہونچتی تھی ایک عالم بے خودی سب پر طاری ہوجاتا تھا خود میاں جی بھی کچھ کم مدہوش نہ ہوتے تھے مگر اس ہجوم جذبات میں بھی اپنی قوت ارادی کے سخت پابند تھے چنانچہ جب کوئی عقیدتمند اپنے احساسات پر قابو نہ پاسکنے کی وجہ سے "یاحق" کہنے پر مجبور ہوجاتا تھا تو اب ایک تبسم زیرلبی کے ساتھ چشم حقیقت آشنا کو وا کرتے ہاتھی مارکہ سگریٹ یا بیڑی جلاتے اور منہ سے دھواں نکالتے ہوئے فرماتے۔

وصل کی ہوتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

تم لوگ ابھی سے بے خود ہوئے جاتے ہو ضبط ہے کام لیکر سچی تڑپ پیدا کرو۔ ایسا نہ ہو یہ مئے محبت چھلک جائے۔ یہ مقدس آواز شیریں لہجہ اور تالیف قلوب کی سعی بھلا باطل کیسے ثابت ہوتی۔ حاضرین میں ہر فرد بے خود و متوالا جذبات کی دنیا میں کھو جاتا۔ اس منزل کے بعد تقرب کا درجہ آتا اور ایسا کہ من تو شدم تو من شدی کی حقیقی تفسیر عشق حقیقی حاصل کرنے کے لئے پہلے مجازی سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہمارے میاں جی اس سے خوب واقف تھے ان کا ظہور ہی دنیا میں اسلئے ہوا تھا کہ گم کردہ راہ کو راہ پر لگائیں، اسی لئے حضرت جہاں بازار حسن سرد پڑ چکا ہو پہونچ جاتے تھے اور وہاں سے ایسے لعل بے بہا نکال لاتے جنھیں دنیا والوں کی ناقدری نے اپنی سوسائٹی سے علیٰحدہ کردیا ہو ایسی ہستیوں کو آپ محبت و حسن کے سبق دیا کرتے تھے۔ متلاشی کے لئے سامان تفریح بہم پہونچانا اپنے مصنوعی حسن اور تبسم زیرلبی دو سروں کو

مسحور کرنا سکھاتے تھے بڑی بات تو یہ تھی یا یوں کہئے کہ خود کا فلسفہ تو یہ تھا کہ صنف کرخت میں دلنوازیاں
بمقابلہ صنف نازک کے بدرجۂ اتم موجود ہیں اور صنف کرخت ہی کے عشق کا سلسلہ عشق حقیقی سے ملتا ہے
چشم ظاہر بیں سے خدا بچائے جنہوں نے میاں جی کو بدنام و مطعون کرنا شروع کردیا اِس سے بچنے کے لیے
اُنہوں نے صرف حضرت آدم کے رشتہ سے ایسی ہستیوں کو "بھیا" بنالیا اب دنیا والوں کی مجال تھی کہ
کچھ کہہ سکتی؟ آئے دن کی انگشت نمائیوں سے فرصت ملی۔.........

گو میاں جی کو اب زیادہ ریاضت کی ضرورت نہ تھی مگر اللہ والے آدمی کو جو ریاضت اور عبادت میں لطف
آتا ہے وہ دوسرے مشاغل میں آنے سے رہا اس خیال سے کہ ابھی اپنے زہد و اتقا میں کچھ کمی ہے آپ بھی
کیف محبت سے سرشار ہونے کی غرض سے عشق مجازی کے زینہ پر قدم رکھتے مگر ان تمام منازل کو چونکہ وہ
طے کرچکے تھے اس لئے ان ہی میں اب سینکڑوں جلووں کی پہنائیاں نظر آتی تھیں اور وہ وہ رموز و نکات
نکالتے کہ سننے والے متحیر رہ جاتے مثلاً یہ کہ حسین شخص کو دیکھکر دل بے اختیار کیوں ہو جاتا ہے۔ اُس سے
کلام کرنے کو جی کیوں چاہتا ہے اُس سے بغلگیر ہونے کی خواہش کیوں پیدا ہو جاتی ہے اور ایسی حسین شئے
کو آنکھوں اور لبوں سے مس کرنے کا جذبہ کیوں پیدا ہوتا ہے یہ تھے وہ رموز جن کو میاں جی نہایت صفائی
سے سائنس کے جدید اصولوں پر۔ واقعات ماضی کی روشنی میں نجوم فلکی کے اثر کے اقتضا پر اور فلسفہ کے دقیق
مسئلوں کے ذریعہ سے سمجھایا کرتے تھے۔ ان مواقعات خاص کے لئے ہمارے میاں جی دنیا اور آرائش دنیا
کو ہیچ ثابت کرنے کے لئے صرف ایک کمبل میں اپنے جسم کو جو علوم کا بحر بیکراں تھا مستور رکھتے تھے۔ آن کے
پاس ایک جریب زیتونی بھی تھی جو لمبائی میں آپ سے شاید انیس بیس کا فرق رکھتی ہو مگر بلحاظ جسامت
خود میاں جی سے دوگنی ضرور تھی اور یہ موٹائی غالباً آپ کے فیض صحبت سے حاصل ہوئی تھی کہنے کو تو لوگ
کہتے ہیں کہ یہ جریب اور کمبل آپ کو وراثتاً پہونچے ہیں مگر کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت موسیٰؑ کی طرح
آپ کو یہ چیزیں کرامت میں ملی تھیں لیکن افسوس یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہاں عصائے موسوی معجزہ تو ذات
باری تعالیٰ سے عطا ہوا تھا اور یہ تبرکات آنجناب کو کس دربار سے ودیعت کئے گئے اس کے متعلق لوگ
کی مختلف رائیں ہیں مگر کوئی قابل وثوق نہیں۔ بایں‌ہمہ خود کو سقراط کا جانشین سمجھتے تھے جو میاں جی کی
خصوصیات۔ خرق عادات کو دیکھتے ہوئے بھی ان کے کمالات کے قائل نہ تھے اور اُن کی ہر کرامت
تکذیب کرتے تھے مگر آپ نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ ان حوصلہ شکن واقعات کے ہوتے ہوئے بھی

قدم پڑتا تھا وہ دوسروں کے لیئے جراُت آموز ہوتا تھا۔ بسا اوقات تو ہمارے میاں جی ظاہری تعلقات کی
سلاسل بیجا کو توڑکر حالت جذب میں خود ہی نورِ حقیقی کے پرتو بن جاتے تھے اُس وقت آن کی ضیا فگنی عالم
آب وگل کے لئے شمع ہدایت کا کام دیتی تھی۔ خاص کر اپنی مصنوعی بہشت کے "بردارزادوں" کو اس نور کی
تجلّی سے معمور و منور کر چکے تھے اور بدیں وجہ اکثر مقربین ان ہی میں سے کسی نہ کسی کے سپرد کئے جاتے تھے
کہ "یہ بہشتی غلمان"، انھیں کثافت ظاہری سے دور کریں یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہ مخصوص ہستیاں بارگاہِ
خاص کی جلوہ ریزیاں سے مستفید ہوتی رہتی تھیں اور اس پرتو کی عکس کلیہ تھیں۔ اسلئے ان میں حسن و خوبی تمام و
کمال وہ صفات محمودہ جو میاں جی کے مشرب خاص میں جائز تھیں اور جو اس مسلک کی کامیابی کے سلئے اہم اور
ممد تھیں امتزاج کی ہوئی تھیں مقربین خاص ان فسوں گر اور لا اُبالی ہستیوں کے سحر حلال سے کچھ ایسے مسحور
ہو جاتے تھے کہ پھر انھیں کائنات کی کوئی شئے تلخ نہ ثابت ہوتی تھی کبھی معرفت کی یہ زندہ چھاگلیں نگاہ کو
جنبش دیکر تبسمانہ انداز سے نمک پاشی کرتیں تو طالب با سینہ چاک اپنی قلبی کیفیات میں وہ ارتعاش پاتا کہ عالم
ہمہ افسانہ نظر آتا تھا ایسی صورت میں میاں جی اپنی سعی کامیاب پر مسکراتے ان کا تبسم رہرو راہِ حقیقت کے
لئے جام مئے حقیقی ثابت ہوتا تھا جو ایک لمحہ میں اس کی ساری کلفتوں کو دور کر دیتا تھا۔ علوم کے کنز مخفی جو
قدرت نے ان کے سینہ میں پوشیدہ کر رکھے تھے آن سے دنیا والوں کو فائدہ پہونچانے کے لئے بے قرار
رہتے تھے۔ لیکن ان کا خیال کہ ہر فرد ان کے تحصیل کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ ہر شئے ایک خاص غرض کے لئے
پیدا کی گئی ہے ضمناً یہ بھی کہ کسی کام کے ابتدا ہی میں انجام کو نظر کے سامنے نہ رکھنا چاہیئے بلکہ اس سے بے نیاز
ہو کر ہنگامہ زیست کی دار و گیر میں بلا سوچے سمجھے پڑ جانا چاہیئے۔ حیات مستعار انبساط اور خوشی کا ایک مستقل
سلسلہ ہے مستقبل حال کا انجام کار ہے۔ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ لطف میں رنج کا خیال لایا جائے یہ تھے
وہ پاکیزہ خیالات و زریں اصول جن کی تلقین میاں جی ہر شخص کو کیا کرتے تھے اور ان ہی خیالات کی بنا ر
پر آپ صرف آن ہی لوگوں کو برادرزادہ بناتے تھے جن کا رنگ سیاہ ہو۔ آنکھیں اندر کو گھسی ہوں۔ بات
بات میں تبسم آتا ہو۔ آواز میں ذرا درد ہو۔ چال میں زاغیت پائی جائے گردن اندر کر لیں بات کرتے وقت لوچ
اجاتی ہو آپ کے نزدیک ان خصوصیات کا حامل ہی اس قابل ہو سکتا ہے جو اپنے نور کا عکس دوسروں پر ڈال سکے۔ اگر غور دیکھا
جائے تو آپ نے اس نظریہ میں بہت سی بیکس لوگوں کی مدد فرمائی تھی اسلئے کہ ان شہسواروں پر ظاہر ہیں نظریں کب ٹھیرتی ہیں
یہی نہیں بلکہ آپ نے اس کلیہ کو بھی غلط ثابت کر دیا تھا کہ صرف سفید فام ہی ترقی کے راستہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔
زندگی کو مسرت و خوشی کا مجسمہ بنانے کی غرض سے اور اپنے اصول کی تکمیل کے لئے انہوں نے اپنی چھوٹی سی بہشت

بنالی تھی مگر ان کی طبع تنہا لطف کوشی کی مقتضی نہ تھی اس لئے محض لوگوں کی فلاح کے لئے یہ وتیرہ اختیار کرلیا تھا۔ لوگوں کے کشود کار کے لئے حضرت کی نیم نگاہی کافی تھی۔ آپ اُن عقدہ لاینحل کو جن کے افہام و تفہیم میں بڑی بڑی عقلیں ناکام ثابت ہوتیں چشم زدن میں سلجھا جایا کرتے تھے۔ غرض یہ کہ میاں جی ہر صورت سے قابل پرستش تھے اور بے قرار دلوں کے لئے سامانِ صد نشاط۔

(۴)

یہ تھا وہ ماحول جس میں شمیم نے ہوش سنبھالتے ہی خود کو پایا تھا۔ اُس کی عمر کا زیادہ حصّہ ان ہی میاں جی کے ظلِ عاطفت میں گذرا تھا پھر کیسے ممکن تھا کہ آن کے فیض سے مستفید نہ ہوتا اِسے شومیٔ قسمت سمجھنا چاہیئے کہ وہ حسین تھا مگر نیچر نے اس رنگ کے عطا کرنے میں بخل سے کام لیا تھا "جو برادر زادہ" بنائے جانے کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر اس کا شمار معتقدین میں تھا۔ چونکہ میاں جی کے سپرد اس کی پرورش ہوئی تھی اس لئے ابتدا ہی سے اُنہوں نے اسے ایسے راستہ پر گامزن کرایا جس سے یہ بھٹک ہی نہیں سکتا تھا معرفت اور عشق مجازی کے طرفہ معجون اسے جی بھر کے استعمال کرائے گئے مئے محبت سے سرشار کرایا گیا۔ آتش شوق تیز تر رکھنے کے لئے "برادر زادوں کی بھولی بھالی باتوں کے ذریعہ مسرت و شادمانی کے مناظر سامنے لائے گئے۔ بے خودی کے خاکے پیش کئے گئے آرزوؤں اور تمناؤں کے مضطرب کن اسباق یاد کرائے گئے۔ پھر کیا تھا شمیم اپنے استاد کا شاگرد رشید ثابت ہوا۔ جو جو امیدیں میاں جی کی اُس کی ذات سے وابستہ تھیں حرف بحرف پوری ہوئیں۔

شمیم بلا ناغہ روزانہ میاں جی کی صحبت میں دو چار گھنٹے گزارتا تھا۔ جہاں اسے مئے معرفت کے جام پیش کئے جاتے اور ہر طرح کے عیش کا سامان فراہم کیا جاتا۔ ابتدا میں ہر وہ حربہ استعمال کیا گیا جس سے بجز رام ہونے کے شمیم کے لئے مفر نہ تھا۔ آہستہ آہستہ اِسی زندگی میں اُسے لطف آنے لگا اور پھر تو ایسا کھو یا کہ خود کی بھی خبر نہ رہی ایک دھن تھی جس کے لئے اس کے تمام خیالات میں انتشار تھا ایک لگن تھی جو دل سے لگی ہوئی تھی۔ شبانہ روز ان ہی سرمستیوں میں گزرنے لگی۔ آغاز کار میں میاں جی نے تعلیم اس طرح دینی شروع کی کہ اُسے حسن و عشق کے تعلقات پر لکچر دیتے رہے جب میاں شمیم اس فلسفہ میں غوطہ زن رہنے لگے اور انھیں دلچسپی آنے لگی تمام منازل ابتدائی طے کر چکے تو رفتہ رفتہ نوزُمن نوری کے درجہ تک پہونچانے کے لئے یہ حضرت ایک برادر زادہ کے سپرد کئے گئے۔ میرا خیال ہے کہ اس مسلک کے ...

ہستی کا تعرف نہ کرانا سنگین جرم ہوگا۔ آپ اُس خطۂ زمین کے رہنے والے تھے جہاں اتصال آبی کی شکل میں پنجۂ قدرت نے دولت قوت اور حسن پر قبضہ کر رکھا ہے آپ کا رنگ نیلگوں اور چمکتی تھا، قد طویل، جسم چھریرا چہرہ سے کھوئی ہوئی ملاحت کے نقوش ہویدا۔ زبان کھڑی مگر گفتگو میں بہت کچھ بنی ہوئی نسائیت سے کام لیتے تھے۔ آنکھیں شنغالی مگر چمکتی ہوئی، سر کے بال ہمیشہ سیدھے رہتے تھے اور جب کبھی کسی سائل سے گفتگو فرماتے تو نظر کبھی جھک جاتی تو کبھی دل تک پیوستہ ہو جاتی تھی، یہ تھی وہ فریب تخیل ہستی جو شمیم کے خیالوں میں رعنائی پیدا کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھی۔

کہتے ہیں کہ پیاسے کو ایک گھونٹ پانی دیدیجئے تو اُس کی تشنگی کہیں بڑھ جاتی ہے شمیم کو افسانہائے عشق و حسن سنائے ضرور گئے تھے مگر ابھی تک اُس کے اصلی لطف سے واقف نہ تھا وہ محبت کی ماہیت سے زبان آشنا کرایا گیا تھا مگر جس ہستی سے محبت کرائی جانے والی تھی وہ اُسکے سامنے نہ تھی وہ ابھی تک ان وعظوں کو محض تفریح کے خیال سے سنا کرتا تھا مگر اُسے اسکی خبر نہ تھی کہ ابھی اُس امتحان میں پڑنا ہی جہاں عقل و خرد کو سلام کرنا ہوگا۔ آہ شمیم تجھے اِس شیطان ثانی کے ہاتھوں اپنی زندگی کے تار و پود بکھیرنا ہوگا اور انجام کار مایوسی اور فنا۔ گرویدگی کا ہر وہ جادو جو بردے کار لایا جا سکتا تھا کوئی نہ چھوڑا گیا شمیم کو سراب آسا مسرت اور انبساط کے دریا میں غرق کیا گیا "شراب معرفت"، کے دور۔ برادرزادوں کی فسونگری۔ سامان تفرج و تفریح گویا دائمی شکل اختیار کر چکی تھی۔ کلفت و رنج خواب و خیال ہوئے اور افسوس دنیا کے جتنے بدترین گناہ ہو سکتے تھے انکے اسی صوفیت کے پردے میں شمیم سے مشق کرائی گئی ان گناہوں کے داغ شمیم کی زندگی کے دامن پر ابھرے ہوئے تھے اور صد حیف انھیں وہ دائمی سمجھے ہوئے تھا اُسے گمان بھی نہ تھا کہ یہ جال جو اُسکی زندگی کو عیش و عشرت میں گزارنے کے لئے پھیلائے گئے ہیں ایک روز اسکی حیات کی تابانی کو تلف کر دینگے اور ہمیشہ کے لئے موت کے آغوش میں سلا دینگے۔ سچ ہی کہ انسان کا شیطان انسان ہی ہوتا ہے۔

یہ زندگی اور یہ ماحول کچھ اتنا زیادہ لطف انگیز تھا کہ شمیم دنیا کے سارے غائب کو بھول چکا تھا اسکی طبیعت نشاط پرور ہو چکی تھی وہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ شاید حسن کی گرماگرمی سرشاری کی موجیں۔ مدہوشی کی کیفیتیں غلط کاری کی راہیں بس یہی زندگی کا ماحصل ہیں مگر تاکیے انسان جب تک کسی شے سے نا آشنا رہے سکون حاصل کر سکتا ہے مگر شے کی واقفیت ہی اُسکی طبیعت میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے شمیم جب اچھی طرح اس جال میں پھنس چکا تو پھر زمانے نے بھی رنگ بدلا اور تعلیم ثانوی کا آغاز ہوا۔ یعنی "برادرزادہ کو حکم دیا گیا کہ بس اب بے اعتنائی کا دور شروع ہو

شمیم اس کا عادی نہ تھا یکایک خوابِ غفلت سے چونکا مگر کب جب اپنا حسن، اپنا وقار، اپنی دولت کھو چکا تھا۔ تیر کمان سے چھوٹ چکا تھا اور اب دستِ تاسف ہی ملنا اس کے لئے باقی رہ گیا تھا۔ وہ حیرت میں تھا کہ آخر وہ اُس کی بہشت خود ساختہ کیا ہوئی وہ عیش و آرام کے کرشمے کدھر گئے وہ راحت و آسائش کی مصروفیتیں کہاں غائب ہو گئیں مگر آہ یہ عہدِ ماضی کا قصۂ پارینہ تھا جسکی ایک ایک کڑی سامنے آتی تھی اور تڑپا جایا کرتی تھی وہ التفات محبوبی جو اُس کے لئے مخصوص تھا اُسے وہ ڈھونڈتا تھا وہ محبت کی نظریں جو کبھی سرمایۂ حیات تھیں تلاش کرتا تھا اُس سکون کا جو اُس کے لئے دائمی تھا جویا تھا مگر وہ التفات اب کسی دوسرے کے لئے وقف تھا وہ نظریں کسی دوسرے کو مانوس کرنے کے لئے آمادہ کر دی گئی تھیں وہ وہ سکون اب ایک خواب تھا میاں جی کی وہ تقدس مآبیاں بھی اب اُس کے کام نہ آتی تھیں اب جب بھی اپنی سادہ لوحی سے وہ اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا تو بجائے ہمدردی کے اظہار کے نظروں سے دور ہو جانے کا قہاری حکم صادر ہوتا تھا۔ دنیا اُس کی نظروں میں تاریک تھی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کسی ہمدرد کی تلاش کرتا مگر کارگاہِ عالم میں کوئی بھی اسے نظر نہ آتا تھا جو اسے تسلی دے۔ دن گزرتے گئے شمیم کی حالت بھی بد سے بدتر ہوتی گئی اب نہ کسی شئے میں اُسے لطف آتا تھا اور نہ کسی شئے میں رعنائی نظر آتی تھی۔ وہ ہمدردی کا بھوکا تھا مگر کوئی شخص اُس کی طرف التفات نہ کرتا تھا وہ اپنی سابقہ حالت کو یاد کر کے پہروں آنسو بہاتا تھا۔ مگر تسکین نہ ہوتی تھی گھنٹوں اسی خیال میں مستغرق رہتا مگر اُس کی طبیعت سکون آشنا نہ ہوتی تھی اُس کی صورت سے مردم خوف کھانے لگے تھے۔ بچے اُسے مجنون سمجھ کر ستانے لگے یگانہ بیگانہ سب اُس سے متنفر رہنے لگے مگر اب وہ دیوانہ نہ تھا مجنوں نہ تھا مخبوط الحواس نہ تھا، دنیاوی تعیش کی حقیقت سے واقف ہو چکا تھا شورشِ حیات کی امواج میں سرتاپا غرق ہاتھ پیر مار رہا تھا مگر اب یہ بے سود تھا انسان انتہائی مایوسی میں نتیجہ سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ مصیبت جب مصیبت کی حد سے گزر جاتی ہے سخت ترین صعب بھی آسان نظر آتا ہے شمیم کو حیات کی شیرینی تلخ معلوم ہونے لگی وہ اپنی زندگی سے بیزار رہنے لگا۔ اب اُسے اسی کی فکر تھی کہ کسی طرح اس کشمکش سے چھٹکارا حاصل ہو۔ ایک دن انتہائی مایوسی میں اپنے کمرہ میں داخل ہو میز پر لکھنے کا سامان رکھا تھا۔ پیڈ سے ایک کاغذ پھاڑا اور حسبِ ذیل خط لکھنا شروع کیا۔

محترمی میاں جی صاحب۔ السلام علیکم۔

میں غالباً اس تحریر کے بعد آپ کو پریشان نہ کروں۔ میں اب ایسی سرزمین میں جا رہا ہوں جہاں

مجھے اپنی موجودہ زندگی کے غلط اعمال کا محاسبہ دینا پڑیگا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس مواخذہ کا کیا جواب دونگا
میرا ہر رواں گناہ سے ملوث ہے اور افسوس کہ میں نے اپنے زہریلے انفاس سے دنیا کو مسموم کر دیا ہے۔ اس سے خدا ہی
خوب واقف ہے کہ کتنی بے گناہ ہستیاں میرے فریب عمل میں آچکی ہیں، میں جب اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو
تمام جسم میں ارتعاش محسوس کرتا ہوں میری روح قفس عنصری سے پرواز کرنا چاہتی ہے دماغ مختل ہو جاتا ہے اور میں خود
بے بس اپنی شبانہ روز کی سرمستیوں کا الزام کسی پر رکھ نہیں سکتا۔ خدا نے مجھے عقل سلیم عطا فرمائی تھی جسکی مدد
سے آلایش دنیا سے دور رہ سکتا تھا مگر نہ ہو سکا۔ صرف میرے ہی لئے نہیں بلکہ ہر متنفس کے لئے دنیا ایک عمل اور
امتحان کی جگہہ ہے جہاں ہر شخص اپنی سی کرتا ہے میں بھی اسی معمل میں بھیجا گیا تھا لیکن صد حیف اپنے ساتھ وہ زاد راہ لیچلا
ہوں جس کے بار سے قدم نہیں اٹھ سکتا۔ کہتے ہیں کہ انسان کچھہ کھو کر سیکھتا ہے مگر افسوس میری آنکھ اسوقت کھلی ہے جب
دن ڈھل چکا ہے اور خود خستہ و درماندہ ہوں۔ قبلہ جسارت کی گستاخی معاف آپکے تقدس کی قربان گاہ پر میری
طرح کتنی معصوم ہستیاں بھینٹ چڑھ چکی ہوں گی اور خدا جانے کبتک یہ سلسلۂ نامحمود قائم رہیگا آپکی جنت شیطانی پہلی
ہی نظر میں کتنی معصوم ہستیوں کو گرویدہ کر چکی ہے اور کتنوں کو کرے گی اور فنا کے گھاٹ اتار دیگی۔ میں تو سمجھتا ہوں
کہ یہ خدائی ابتلا و آزمایش ہے جو دنیا میں آپ کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے بہت سے لوگ جواب تک آپ سے واقف
نہیں ممکن ہے وہ یہ کہیں کہ ہتی دستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل۔ مگر وہ جو میری طرح آپ کی صحبت سے مستفید
ہو چکے ہیں خوب واقف ہیں کہ آپ کیا ہیں اور آپ کی تعلیم کا فیض کتنا ہے خدارا اب نوجوانوں پر رحم فرمایئے انکے
کردار و اطوار پر کرم کیجئے آپ اپنی مصنوعی جنت کے مصنوعی برادر زادوں کے حسن ملیح سے دوسروں کے لئے
نظر کا سامان بہم نہ پہونچایئے۔ ورنہ ممکن ہے مجھ سے دکھے ہوئے دلوں کا صبر آپ پر پڑے۔ میاں جی یاد رکھیئے آپکو
بھی اسی خلاق عالم کے حضور میں پیش ہونا ہے۔ اسوقت بے گناہوں کے خون کے دھبے آپکے دامن پر ہونگے آپسے
باز پرس ہوگی آپ کو جواب دینا ہوگا۔ اسوقت آپکی یہ دنیا کو دھوکا دینے والی ریش دراز یہ فقیروں کا دلق یہ تقدس
ظاہری کچھہ کام نہ آئیگا آپ دنیا میں محض اپنے ذاتی اثر کے لئے جتنا چاہیں مکر و کید کا جال پھیلالیں۔ جتنا چاہیں
حسن و عشق کے لکچر دے لیں۔ جہاں تک چاہیں معرفت کے جام لنڈھالیں مگر اس منصف حقیقی پر سب عیاں ہے اسے آپکی
ریاکاری کا علم ہے میں یہ محض اسلئے آپ کو لکھ رہا ہوں کہ شاید جناب کو عبرت ہو آپ باز آجائیں اور زیادہ دنوں تک
دنیا کو فریب میں نہ رکھیں میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرے الفاظ آخری ہیں چند ساعت میں حیات ممات کا علاقہ ختم ہو چکا ہوگا
اور میں اس جگہہ پر ہونگا۔ جہاں آپ کے مکر و فن کا گزر نہیں ہے میں نے تمام عمر معصیت میں گزاری کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا

جب ایک نئے گناہ کا اضافہ نہ کیا ہو اب زندگی کی کشاکش سے بیزار ہو گیا ہوں اور جانتا ہوں کہ آخری وقت بھی روسیاہ جا رہا ہوں مگر سرزنش خلق اب زیادہ سہی نہیں جاتی خدا آپ کو نیک ہدایت دے اور بس۔

شرمندہ۔ شمیم

خط کو لفافہ میں بند کر کے ملازم کے حوالہ کیا اور اُس سے کہا کہ تھوڑی دیر بعد خط مذکور کو میاں جی کو دیدے ملازم رخصت ہوا۔ چند دنوں سے شمیم کی حالت کچھ درست ہو چلی تھی۔ چند جاں نثار پروانے جواب بھی اس شمع کے گرد موجود تھے خوش تھے کہ شمیم سنبھل گیا مگر انھیں خبر نہ تھی کہ شمع آخری انفاس خاص کرنے کی غرض سے بھڑک اٹھی ہی ملازم کے جانے کے بعد شمیم نے جیب سے ایک سفوف نکالا اور آنکھ بند کر کے چند لمحات میں حلق سے اُتار لیا کمرہ بند کر دیا بستر پر لیٹ رہا ایک غنودگی سی طاری ہوگئی اور تھوڑی دیر میں روح جسد عنصری سے پرواز کر گئی انا للہ وانا الیہ راجعون ؁

یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانہ کی خاک　　تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا

شمیم عین عنفوان شباب میں دنیا سے رخصت ہو گیا اپنی ذرا سی زندگی میں زمانہ کے نشیب و فراز سے خوب واقف ہو چکا تھا۔ میاں جی کی جنت ارضی میں اب بھی وہی چہل پہل موجود ہی۔ اب وہی عشق و حسن کی درس و تدریس ہوتی ہی اب بھی بھولے بھالے نوجوانوں کے لئے سامان تخریب فراہم کیا جاتا ہی اب بھی ہوش ربا مناظر پیش کئے جاتے ہیں اور اب بھی وہی محفل کی گرما گرمی ہی مگر آہ شمیم جو اس محفل کا جنوں زدہ تھا اب اس بزم میں نہیں، وہی ہاسے وہو ہے وہی شراب معرفت کے لئے ھل من مزید کا نعرہ ہی وہی برادر زادوں کی چشمک زنی ہی اور میاں جی جنون انگیز باتیں مگر شمیم اب اِس شورش سے دور اس ہنگامہ سے علیحدہ اس محفل کی دار و گیر سے الگ ایک سنسان جگہہ میں جہاں کی فضا خاموش، جہاں کی ہر شئے پر سکوت طاری جہاں دنیا کے کرد کید سے آزادی ہی پیر پھیلائے ہوئے موت کی نیند سو رہا ہی وہاں نہ اب میاں جی کا فریب چل سکتا ہی نہ حسینوں کی جادو نظری کچھ کام کر سکتی ہے نہ بزم عیش کا اثر پہونچ سکتا ہی اور نہ اُسے حسن کی بے اعتنائی مضطرب کر سکتی ہی وہ ہی اور قبر ایک کونا، ایک سفید چادر ہی جو حشر تک کے لئے اُسے اُڑھا دی گئی ہی کہ خواب شیریں کے لطف اُٹھائے۔

شمیم گو تو نہیں مگر تیری یاد دنیا میں باقی رہیگی جس طرح میاں جی کی روسیاہی کا داغ صفحہ دنیا سے مٹنے والا نہیں اسی طرح تیری تباہی کی باوجود تیری معصومیت کی وجہ سے ہوئی فانی نہیں تیرا نام ابدالاباد تک باقی رہیگا اور یہی حقیقت ہی۔

سید جلیل حسنی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

# غزل

از محترمہ بلقیس جمال صاحبہ بریلوی

آہِ سوزاں از دلِ خانہ خراب آید بروں
نغمۂ خوں ریز از تارِ رباب آید بروں

ابروئے خنجر بساماں از نقاب آید بروں
ماہِ نو از پردہ داریِ سحاب آید بروں

دیدۂ مخمور در چشمِ حسینت رقص خیز
یک حبابِ ناز از بحرِ شراب آید بروں

مژدہ اے تشنہ لب خارِ مغیلاں مژدہ باد
از گلستاں وحشیِ خانہ خراب آید بروں

چشمِ غمازِ فغاں اے وائے دل داری نکرد
رازِ پنہانی زیکا شک پُر آب آید بروں

چوں تماشائے دو عالم در نظر پوشیدۂ
اے چرا تارِ نگاہت از حجاب آید بروں

لذتِ این گونہ جراحت من چنیں پرداختم
سیلِ خوں از ہر لبِ زخمِ پُر آب آید بروں

سر بسجدہ داشتم چوں اے جمالہ از نیاز
تابشِ تاثیر از چشمِ پُر آب آید بروں ،

# ٹرکی میں ذہنیت آئینی کا انقلاب

از جناب سید نوشہ علی صاحب ایم۔ اے

(گزشتہ سے پیوستہ)

آغاز ۱۹۲۱ء میں جبکہ ترکوں اور یونانیوں میں لڑائی ہورہی تھی ترکوں کو مدد کی سخت ضرورت تھی۔ ایسی حالت میں بمصداق اس مثل کے کہ "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے" انکو جہاں کہیں سے مدد ملسکی انہوں نے بغیر کسی تامل کے حاصل کی۔ اسی زمانے میں روسی بالشوک اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ اپنا پروپگنڈا جہانتک ممکن ہوسکے دنیا کے ہر حصہ میں پھیلادیں۔ یہی وجہ تھی کہ دنیا کے مختلف حصوں میں (Socialist) اور اشتراکیوں کی جماعت اسقدر زور پکڑ گئی کہ بدامنی کا اندیشہ ہوگیا۔ انگلستان کی کان کنوں کی ہڑتال اسی تحریک کا نتیجہ تھی۔ غرضکہ ترکوں اور بالشوکوں میں اتحاد لازمی تھا۔ روسیوں نے سب سے پہلے اپنا سفارت خانہ انگورہ میں قائم کیا۔ اور اس میں افسروں اور دیگر ملازمین کی تعداد بہت زیادہ بڑھادی۔ بالشویک اصول ایک حد تک اسلام کے خلاف ہیں۔ انکا اشتراکیت کا اعلیٰ تخیل۔ اور انفرادی اور ذاتی حق ملکیت اور آزادی اسلام کے بالکل منافی ہیں۔ مزید براں روسیوں نے کوئی دقیقہ اسلام کے عقیدہ کو برباد کرنے میں اٹھا نہ رکھا۔ پس مصطفےٰ کمال پاشا کی اصلاحوں میں بالشویکی اثر کا بھی معقول دخل ہے یہ تعجب ہے کہ سوویٹ (Soviet) حکومت کا اثر ٹرکی پر اسقدر کم ہوا اور باوجود تمام اصلاحوں کے مصطفےٰ کمال کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ ترکی کا سرکاری مذہب اسلام ہے۔

ایک اور اثر جو ترکوں نے قبول کیا وہ مغربی طرز حکومت کی نقل تھی ۱۹۰۸ء کے بعد سلطان کے اختیارات محدود کردیئے گئے اور مجلس شوریٰ قائم ہوگئی اگر میں ترکی کی ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۸ء تک کی طرز حکومت بیان کروں تو طوالت کا اندیشہ ہے صرف اسقدر کہنا کافی ہے کہ نمایندگی کا خیال ٹرکی ذہنیت سے بالکل مفقود تھا۔ تمام اختیارات امراء کے ہاتھ تھے اور وہ امرا ایک خاص جماعت کے ممبر تھے اس کے اصولوں کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ لیکن اس زمانہ میں ترکوں کو اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ وہ پارلیمنٹی اصول سے آگاہ ہو گئے دوسرا اثر جو ترکوں نے قبول کیا وہ فرانسیسی تھا جنگ کریمیا میں جو ترکوں اور روسیوں کے درمیان

ہوئی تھی انگریزوں اور فرانسیسیوں نے ترکوں کا ساتھ دیا۔ انگریزوں میں کچھ رومی ضرور موجود تھے اس لئے
یہ مشرقی قوموں سے ربط اور اشتراک عمل نہیں کرسکتے مگر فرانسیسی فوراً ترکوں سے مل جل گئے اور مصر کی آمدنی کی
ضمانت پر ترکوں کو مالی امداد بھی دی۔ یہ تو ایک تجارتی بات تھی مگر ترکی الجیل میں فرانسیسی زبان کا داخل ہونا ایک عجیب
بات تھی۔ ترکوں نے فرانسیسی زبان کو بہت پسند کیا اور فرانسیسی زبان نہایت عمدگی سے بولنے لگے۔ بہت سی فرانسیسی
کتابوں کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا۔ سب سے زیادہ اثر ترکی ذہنیت پر Leon Cahun لیون کیون کا ہوا۔

لیون کیون ایک امن پسند فرانسیسی اہل قلم تھا جو ۱۸۷۰ یا ۱۸۷۱ء میں پیرس کے ایک غیر مشہور کتب خانہ میں
کام کیا کرتا تھا۔ عہد نامہ برلن کے ۱۸۷۸ء میں ترکوں کو نقصان عظیم اٹھانا پڑا۔ اسی دوران میں سلطان عبدالحمید کو پان
اسلامزم کا خیال پیدا ہوا۔ لیون کیون کے نزدیک ترکوں کو سب سے زیادہ نقصان جب پہونچا جبکہ ترکوں نے
اسلام قبول کیا۔ اس کی رائے میں مذہب قومیت کو برباد کر دیتا ہے۔ جیسا کہ رومیوں کا زوال اس وقت سے
شروع جبکہ انھوں نے عیسائیت کو قبول کیا۔ لیون کیون کی رائے میں اگر ترک بجائے پان اسلامزم کے پان
تورانزم اختیار کریں تو ان کے حق میں نہایت مفید ہوگا۔ اس لئے چند تاریخی ناول لکھے مگر سب سے موثر کتاب
"تاریخ ایشیا کی تمہید" یہ کتاب تاریخ اور ناول کی مشترک خصوصیات رکھتی ہے۔ اس میں خاص کیریکٹر چنگیز۔
ہلاکو اور تیمور ہیں۔ لیون کیون کی رائے میں ترک لوگ ایشیائی شرفا میں سے ہیں اور عرب۔ ہندی۔ اور ایرانیوں
سے کہیں بالاتر ہیں۔ لیون کیون اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ چنگیز خاں نے خوارزم اور سمرقند کو جو کہ اس زمانہ میں
دنیا کے آکسفوڈ اور کیمبرج تھے تباہ و برباد کر دیا لیکن لیون کیون اس اعتراض کو دور کرنیکی کوشش کرتا
ہے وہ بیان کرتا ہے کہ چنگیز نے تمام کام ایک قانون کے ماتحت کئے۔ وہ یہ تھا "اختلاف۔ مقابلہ۔ موت۔ تباہی"
جلال الدین خوارزمی نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ چنگیز خاں تمام ترکی نسلوں کو متحد کرنا چاہتا تھا۔ ملک شاہ کی اولاد
نے یہ خیال نہیں کیا کہ ہلاکو اور تیمور کا بھی یہی نصب العین تھا قتل و خون بہت زیادہ تعداد میں ہوا اور نہایت
قابل افسوس تھا مگر صرف، اسی طریقہ سے ترک و تاتار مشرق و مغرب کے حکمراں ہو سکتے تھے۔ کیون کہتا ہے کہ ایرانی
و عرب نہایت ذلیل قومیں تھیں اور انھیں ترکوں کے مقابلہ میں حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں تھا۔

کیون نے سب سے زیادہ جسارت اور جرات سے کام لیا جبکہ اس نے تیمور کا حال بیان کیا۔ تاریخی
حیثیت سے امیر تیمور ایک نہایت سفاک اور بیرحم بادشاہ گزرا ہے وہ تیمور ہی تھا جو انسانی کھوپڑیوں کا انبار
کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا جس نے دلی۔ انگورا۔ نیشاپور اور دمشق میں قتل عام کرایا جس نے بایزید یلدرم کو قید کر کے

ایک پنجرے میں بند کر دیا جس صدمہ میں چھ مہینہ کے اندر غیور بادشاہ مرگیا۔ ایسے جابر بادشاہ کی کیوتن تعریف کرتا؛ اوراس کوشاہ آرتھر کے مقربوں کے برابر سمجھتا ہے۔ مگر تیمور نے ایک غلطی کی کہ اس نے اسلام قبول کرلیا اور وہ ایک کٹر مسلمان ہو گیا۔ اس کی دو وجوہ بیان کرتا ہے (۱) چونکہ تمام امرائے توران اسلام کے پھندے میں پھنس چکے تھے۔ (۲) اس کو اپنا اقتدار اور دبدبہ قایم کرنے کے لئے مذہبی امداد کی ضرورت تھی اور مذہب ہی کی قوت سے دو ایک مرتبہ پھر مشرق ومغرب کا مالک بن گیا۔

اس قسم کے مصنفین نے ترکوں کی ذہنیت پر ایک خاص اثر پیدا کیا۔ کیوتن کے اصولوں کی نکتہ چینی کرنیکی ضرورت نہیں ہے۔ بادشاہ نیرو بلکہ اس سے بھی قبل ملکہ مسیلنا سے لیکر نپولین۔ میرا و قیصر ولیم کے دامنوں سے خون کے دھبے دھونیکی کوشش کی گئی ہے۔ یہ اسی طرح سے ہے جیسا کہ تمام دنیا شیطان کو مذہب کا دشمن سمجھتی ہے مگر کچھ لوگ اب بھی موجود ہیں جو اس کو سب سے پہلا موا حد سمجھتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ کیون کا اثر اتنا ضرور رہوا کہ ترک لوگ اپنے نامور تاجداروں کی جنھوں نے قرون وسطے میں حکمرانی کی تھی بہت عظمت کرنے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۰۸ء کے ترکی پارلیمنٹ میں بجز ترکوں کے اور کوئی نہیں تھا یعنی ترک اپنے آپ کو عربوں، ایرانیوں۔ البانیوں اور دیگر سیاہ کوہیوں سے زیادہ معزز سمجھتے تھے۔ جنگ عظیم میں عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی۔ اس سے عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی۔ اس سے عربوں اور ترکوں کے درمیان نفرت اور زیادہ ہوگئی۔ لوزان کانفرنس میں یہ نفرت اس حد تک بڑھ گئی کہ دیگر دول کے نمایندوں کو اس طرف خاص توجہ کرنی پڑی۔

.....................................

۱۹۰۸ء کے انقلاب ٹرکی کے بعد ترک انقلاب پسندوں کا یہ دعویٰ تھا کہ بغاوت نہیں کر رہے بلکہ قانونی اور سیاسی ارتقاء کی کوشش کر رہے ہیں۔ سلطان عبدالحمید کے بجائے دوسرا سلطان ہوگا وہ بھی قصر یلدیز میں رہتا ہے۔ جیسا کہ پہلے تھا ایک وزیر اعظم ہے۔ قانون میں اصلاحیں غور کی جارہی ہیں مگر شریعت بدستور سابق قایم ہے۔ وہی قاضی اور وہی مفتی وہی محکمہ (عدالت) وہی مدرس وہی مدرسہ اور وہی سوختہ (طالبعلم) مگر کوں پر کثرت سے ترکی ٹوپیاں نظر آتی تھیں اور علما سیاہ جبہ اور سبز یا سفید پگڑی باندھے نظر آتے تھے۔ ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء کو جبکہ ترکی نمایندے لوزان سے واپس ہوئے تب بھی لفظ انقلاب کسی کی زبان پر نہیں تھا مگر درحقیقت ایسا انقلاب مد نظر تھا کہ تاریخ اسلام میں کہیں نہیں پایا جاتا۔

انقلاب قانون عامہ سے شروع ترکی نمایندوں کی لوزان کی روانگی سے قبل سلطان وحیدالدین نے ایک
بڑی جنگی جہاز پر پناہ لی اور ترکی کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہدیا۔ عبدالمجید افندی جو کہ ولی عہد سلطنت تھے اُن کو
ن نہیں تسلیم کیا گیا۔ انہوں نے صرف خلافت کے خطاب پر اکتفا کیا۔ عہدنامہ لوزان کے بعد ترکی نقطہ نظر
ضب العین میں بہت انقلاب ہوا۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو ترکی میں حکومت جمہوری قائم ہوگئی۔ ۳ مارچ
۱۹۲۴ء کو خلافت کی منسوخی کا حکم انگورہ نے شائع کیا جیسا کہ تاریخ میں اکثر ہوتا ہے بیگناہ نے گناہگاروں کا
رہ دیا عبدالمجید آفندی جو کہ ایک نیک نیت اور ہمدرد انسان تھا اور جو کہ عبدالحمید اور وحیدالدین کے
لوں کے مخالف تھا خلافت سے معزول کیا گیا۔ ۴ مارچ ۱۹۲۳ء کو عبدالمجید آفندی و دیگر خاندانی شہزادوں کو
ے سے خارج کر دیا گیا۔

ترکوں نے اس فتوے کو جس کی وجہ سے وہ کافر قرار دیدئے گئے فراموش نہیں کیا۔ کردستان میں
وت ہوئی اس میں بھی علماء کا دخل نظر آیا۔ شیخ الاسلام کا عہدہ تخفیف میں آگیا اور جملہ امور دینی ایک وزارت کے
ب ممبر کے سپرد کر دیئے گئے ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو یہ دفتر بھی بند کر دیا گیا اور ایک اور افسر کے ذمہ کر دیا گیا جو کہ
یر علم کے ماتحت تھا۔ ۹ اپریل ۱۹۲۴ء کو محکمہ قضا کی تمام عدالتیں تخفیف میں آگئیں اور بجائے انکے سرکاری
التیں قائم ہوگئیں۔ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو تمام مدارس جو کہ علما کے زیر انتظام تھے بند کر دئے گئے۔ اور تعلیمات کی
ب وزارت قائم کر دی گئی تمام اوقاف ضبط کر لئے گئے اور تعلیم کا خرچ شامل بجٹ ہوگیا۔ دینیات محکمہ تعلیم میں
ب شعبہ کی حیثیت سے رہ گئی اور چند مدرسے دینی تعلیم کے واسطے قائم کر دیئے گئے۔ ۷ ستمبر ۱۹۲۵ء قبا اور دستار
ی اجازت صرف مفتیوں اماموں اور خطیبوں کو دی گئی عوام کے لئے دستار و قبا پہننا لائق تعزیر قرار دیا گیا
س طریقہ سے تمام وہ لوگ جو اوقاف کی آمدنی سے اپنی زندگی بسر کرتے تھے اور ایک علیحدہ جماعت قائم
ہوئے تھے ترکی قومی لباس پہننے پر مجبور ہوئے اور لباس کا اثر اجتماعی بالکل زائل ہوگیا۔ ترکوں نے صرف
سی پر اکتفا نہ کیا۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۲۵ء بذریعہ ایک اعلان تمام درویشوں کے زاویوں اور تکیوں کو خلاف قانون قرار
یا۔ اور انکے عجیب و غریب لباس کے پہننے کو قابل تعزیر کر دیا۔ ۲۵ نومبر ۱۹۲۵ء کو ترکوں نے شپکہ یا انگریزی
ٹوپی کے پہننے کو لازمی قرار دیا۔ اور ہر شخص کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ شپکہ استعمال کرے۔ اسی کیساتھ
ستمبر ۱۹۲۵ء کو عمارت میں داخل ہوتے وقت ٹوپی اتارنے کی رسم بھی ترکی میں جاری ہوگئی۔ علما و مفتیوں کو
واس لباس سے مستثنے تھے مجبور کیا گیا کہ قومی جھنڈے کو سلام کرتے وقت اپنی دستاریں اتاریں اور سلام

انگریزی وضع سے جھک کر کریں۔

یہاں ترکی میں سب سے ممتاز رسم جو کہ یورپ والوں سے بالکل الگ تھی وہ عورتوں کا پردہ تھا۔ عورتیں غیر محرموں سے نہیں ملسکتی تھیں۔ ترکی عورتیں پولس کی حفاظت میں رہتی تھیں اور انکو یہ اجازت نہ تھی کہ بعد مغرب باہر پھر سکیں یا دن کے وقت کسی غیر مرد سے بات کر سکیں۔ ان کی نقابیں کسی موٹے کپڑے کی ہوتی تھیں اور ان کا برقعہ اکثر ڈھیلا ڈھالا ہوتا تھا اور بدن سے پیوستہ نہیں ہوتا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں ہو سکتا کہ ترکی عورتیں بدلیقہ اور پھوہڑ ہوتی تھیں۔ وہ اکثر مہذب اور تعلیم یافتہ ہوتی تھیں اور فرانسیسی۔ جرمنی اور انگریزی زبانوں سے واقف ہوتی تھیں ۱۹۰۸ء کے انقلاب نے بھی ترکوں کی معاشرت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی مگر جنگ جدال کی کشمکشوں میں بھی ترکوں اور ان کی بیگمات کو یہ خیال پیدا ہوا کہ مغربی اقوام کے قدم بقدم چلنے کے لئے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہر دو اصناف میں مساوات پیدا ہو جائے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نقاب اور ترکی چارشف سب غایب ہو گئے اور ترکی بیگمات کو مکمل آزادی حاصل ہو گئی۔

اب میں آپ کی توجہ ترکوں کی سب سے زیادہ حیرت انگیز تبدیلی کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں سلاطین عثمانیہ نے قانون تعزیرات اور قانون مبادلہ و تجارت میں تبدیلیاں کیں تھیں مگر قانون شریعت میں کوئی تبدیلی کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ سلطان عبد الحمید نے ۱۸۶۹ء و ۱۸۷۶ء کے درمیان اس بات کی کوشش کہ قانون شریعت کو منضبط کر لیا جائے۔ اس ضابطہ میں متعدد فصلیں اور ابواب تھے اور ۱۸۵۱ دفعات تھیں۔ اس اصلاح سے کوئی تبدیلی مدنظر نہ تھی۔ البتہ وہ قانون جو کہ علماء کے فہم اور ادراک کے علاوہ کسی اور عام آدمی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اس کا ترجمہ نہایت سلیس ترکی زبان میں کر دیا گیا

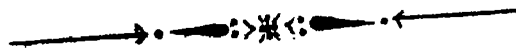
وہ کونسا قانون تھا جسکے تبدیل کرنیکی ہمت بڑے بڑے ترکی سلاطین کو نہیں ہوئی اور مصطفےٰ کمال پاشا نے اس میں کیا کیا تبدیلیاں کیں ؟

باوجود سلطان عبد الحمید خاں کی سخت کوششوں کی قانونی اصلاح صرف سطحی رہی یعنی ان کا ضابطہ بھی قانون اسلام پر حاوی نہیں۔ اور مسائل طلاق۔ وراثت۔ معاہدہ وغیرہ بدستور رہے۔ اس بحث کو شروع کرنے سے قبل چند مسائل کو صاف کر دینا بہتر معلوم ہوتا ہے عیسائی اقوام کی رائے کے مطابق مسئلہ کثرت ازدواج اسلام پر ایک بدنما دھبہ ہے۔ مگر نادان یہ نہیں جانتے کہ جدید ڈاکٹروں اور علم الاقوام کے ماہرین کے بیانوں کے مطابق دنیا میں جائز یا ناجائز کثرت ازدواجی رائج ہے۔ اسلام میں کثرت ازدواجی کا حکم نہیں بلکہ اجازت ہے

اور اس اجازت پر بہت سے قیود ایسے عاید ہیں کہ چند شرائط کے علاوہ کثرت ازدواج ناممکن ہے۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ مسلمانوں میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو ایک سے زیادہ بیوی ایک ہی وقت میں رکھتے ہیں۔ ممالک اسلامیہ میں وہ لوگ زیادہ بیویاں رکھتے ہیں جو مسائل اسلام سے ناواقف ہیں۔ قدرت نے عورتوں اور مردوں کی تعداد دنیا میں مقرر نہیں کی۔ یعنی یہ نہیں بتایا کہ عورتیں اور مرد ایک مقررہ تناسب کے ساتھ دنیا میں موجود ہونا چاہیئے۔

دوسری بات جو قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کے حقوق کی حفاظت سب مذاہب سے زیادہ کی ہے۔ اسلامی قانون جنگ کے مطابق عورتوں کا ستانا گناہ ہے۔ دشمن کی عورتیں اور بچے ہمیشہ فاتح کی امانت ہیں اور اُن کی تکالیف کا وہ ذمہ دار۔ ممالک اسلامیہ میں عورتوں کا چھیڑنا ایک سنگین جرم سمجھا جاتا تھا۔ ترکی میں جبکہ عورتیں اپنی آزادی کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ اُس وقت انھوں نے وزیر مال پر حملہ کیا اور بہت بُرا بھلا کہا مگر ان تمام باتوں کو وہ نہایت صبر کے ساتھ سنتا رہا مگر قانون طلاق میں عورت کی حفاظت خاطرخواہ نہیں کی۔ اگرچہ طلاق مذموم ہے اور رسول اللہ کو نہایت ناپسند تھی مگر شوہر جس وقت چاہے اپنی بیوی کو طلاق دیسکتا ہے مگر بیوی اپنے شوہر کو اپنی مرضی کے مطابق علیحدگی حاصل نہیں کر سکتی۔ عورت کی حفاظت بجز دین مہر کے اور کچھ نہیں ہے۔ باوجود ان تمام باتوں کے کثرت ازدواجی مہذب اور تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بہت کم ہے۔ امور بالا سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معاہدۂ شادی یک طرفہ ہے۔ ۱۹۲۵ء میں یہ بات مسلمہ ہو گئی کہ کثرت ازدواجی کا رواج ترکی میں بالکل متروک ہو چکا ہے۔ ترکی مجوزین قانون نے خیال کیا کہ امام اربعہ ان تمام قیود کے ذمہ دار ہیں، اوائل اسلام میں بہت حد تک قانون آزادی ہر مسلمان کو حاصل تھی۔ ترکوں نے سوئزرلینڈ قانون دیوانی اختیار کیا یہ قانون ۱۹۱۲ء میں جرمن و سوئز فقہا کی محنت کا نتیجہ تھا۔ اس قانون کے مطابق عورت و مرد کو مساوات حاصل تھی۔ مارچ ۱۹۲۶ء میں ایک ترکی گزٹ میں سوئز ضابطہ دیوانی کا لفظ بہ لفظ ترجمہ شایع ہو گیا اور یہی ملک کا قانون ہو گیا۔ مگر چونکہ ترکی مشیر قانونی ایک مصلح پیغمبر تھا اس لئے اس کے واسطے ہر بات ممکن تھی۔ جبکہ مجلس انگورہ میں قانون اسلامی کی منسوخی کا اعلان ہوا تو کسی عالم کو دم مارنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ نوجوان ترک اور صنف نازک اس تبدیلی سے بہت مطمئن ہوئی۔ ترکی سپاہ کو چونکہ اپنے جنرل پر اعتبار تھا سو وجہ سے اس کی ہر بات پر خون بہانے کو تیار تھی اس مضمون کے اختتام پر

ہمکو حسب ذیل امور پر غور کرنا ہے۔ کیا جمہوریہ ٹرکی نے قانون اسلام کو منسوخ کردیا ہے؟ کیا جمہور ٹرکی ایک اسلامی ریاست نہیں رہی۔ ٹرکی نے سلطنت کو ختم کردیا۔ خلافت کو منسوخ کردیا۔ اسلامی قانون وراثت و معاہدہ کو منسوخ کردیا۔ امام اربعہ کے اصول کو رد کردیا، قدیم قانون اسلامی یعنی کتاب۔ حدیث۔ آرئیہ السیمہ اور اجماع کو بے بنیاد ٹھیرادیا۔ اب اسلام کا ٹرکی میں کیا اثر رہا۔ اس کا جواب صرف ایک جملہ میں دیا جا سکتا ہے ٹرکی نے اسلام ترک نہیں کیا بلکہ قانون اسلامی کو نئے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ سلطنت اور خلافت کی منسوخی کے بعد پہلا اعلان جو شائع ہوا وہ یہ تھا کہ اسلام ٹرکی کا سرکاری مذہب ہے اور قانون جدید میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو اسلامی قانون کے خلاف ہو۔ البتہ جن باتوں کی اسلام میں اجازت تھی انکو ممنوع قرار دیدیا۔ مثلاً کثرت ازدواجی کی صرف ڈاکٹری مشورہ پر اجازت دی اور یہی قانون اسلام کا منشار ہے۔ البتہ یہ بات قابل افسوس ہے کہ زمانہ انقلاب میں بہت سختیاں ہوئیں اور ٹرکی آزادی غائب ہوگئی جمہور انگورہ نے بہت سے قابل قدر آدمیوں کا خون بہایا۔ مگر یہ بات اتنی قابل افسوس ہے جتنی کہ ہر ملک میں پر آشوب زمانہ میں ہوتی ہے۔ فرانس میں (Danton) اور (Desmontins) جوکہ آزادی کے شیدائی تھے پھانسی پر چڑھادیے گئے۔ انگلستان میں (Cromwell) نے بنوک سنگین ممبران پارلیمنٹ کو نکلوادیا۔ روس کا آزادی پسند جمہوری ٹراٹسکی استنبول میں جلاوطن کردیا گیا۔ ٹرکی میں اتحاد مذہب وملت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ البتہ کسی حد تک دَور سلطانیہ میں اس اتحاد میں کچھ فرق آگیا تھا۔ مثلاً اوقاف ومدارس کا انتظام بالکل الگ تھا اور یہ انتظام مداخلت سلطانی سے بے نیاز تھا۔ اب تمام امام، موذن اور علما سلطنت تنخواہ دار نوکر ہو گئے۔ اُن کا لباس جداگانہ اہمیت رکھتا ہے ایک کرنل کی وردی کی بھی قدر ہوتی ہے اور ایک عالم کی قبا کی بھی۔ اِس قانونی اصلاح نے دینی اور دنیا کے جھگڑوں کو طے کردیا مسیحی یورپ میں دَور وسطیٰ میں یہ جھگڑا چار سو برس تک رہا اور اس کا اثر ہر ملک میں رہا۔ ٹرکی میں چار برس میں ایک قانونی اشاعت کے بعد طے ہوگیا۔



# غزل

اثر خامہ مولوی رضی احمد صاحب رضیؔ بدایونی

اَلَم میں ڈوبی ہوئی ہے فضا زمانے کی — لکھی ہے خون سے سرخی ہر اک فسانے کی

چراغ صبح تھا میں جل کے ہوگیا خاموش — موافق آئی نہ مجکو ہوا زمانے کی

صلائے عام ہے صیاد و برقِ صرصر کو — کہ طرح ڈال رہا ہوں میں آشیانے کی

تلاشِ کحلِ جواہر تھی چشمِ باطن کو — اُٹھا کے لایا ہوں خاک اُنکے آستانے کی

قفس تک آئے جو اُڑکر چمن سے کچھ تنکے — نظر میں پھر گئی تصویر آشیانے کی

فروغِ جلوۂ رخسار ہے نقابِ جمال — نئی ادا ہے یہ عاشق سے منہ چھپانے کی

دکھایا جذبِ تصوّر نے لطفِ آزادی — قفس میں کھنچ گئی تصویر آشیانے کی

قفس سے چھوٹ کے حیران ہوں کسطرف جاؤں — ہر اک سے پوچھتا ہوں راہ آشیانے کی

وہ رشکِ مہر رضیؔ آج میہماں ہوگا
چمکنے والی ہے قسمت سیاہ خانے کی

# اِمتحان کی رات

## (افسانہ)

از مولانا سید عبدالواحد صاحب ایم - اے

اتفاق مجھکو ایک سوکھے، سہمے، امتحان کے مارے ہوئے طالب علم کے سامنے لیجاکر کھڑا کرتا ہے۔ میں اُن کی مزاج پُرسی کرنا چاہتا ہوں مگر ان کا دماغ کہیں اور ہے۔ میں اُن کو اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کی دعوت میں بلانا چاہتا ہوں مگر اُن کو فرصت نہیں ہے اِتنی بھی نہیں کہ وہ پوری طرح میری استدعا کو سُن سکیں۔ اُن کا دماغ چکر میں ہے اُن کی آنکھیں اُن کی آیندہ زندگی کے تاریک اور روشن پہلو باری باری سے دیکھتی ہے اُن کے قلب کی حرکت معمول سے بدرجہا زیادہ ضربیں مارنے پر مجبور ہے۔ اُن کے عزیز رشتے داروں کے ملاق اِس وقت سخت اضمحلال میں ہیں۔ کل امتحان کے کمرے میں ان کا اپنا سگا بھائی اُن کے قریب بیٹھے گا۔ مگر اُس کی امداد پر بھروسہ کرنا عقلمندی سے دُور بات ہے۔ ان کے اپنے مشفق اُستاد کل اُن کے نگراں ہونگے۔ مگر کل اُن کی نظریں ترچھی ہونگی۔

اُن کے سامنے کھانا آتا ہے مگر اُن کی طبیعت اُس پر مائل نہیں ہوتی وہ خود سکون کی مجسم تصویر ہیں مگر اُن کا باطن سخت ہیجانی حالت کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ اُنہوں نے سر میں تیل ڈالا ہے مگر اندرونی خشکی اُس پر غالب ہے۔ انہوں نے منوم دوا کا استعمال کیا ہے مگر نیند کا کوسوں پتہ نہیں ہے جس مضمون کا پرچہ کل آئیگا وہ مضمون اسوقت اُن کے دماغ میں جوش مار رہا ہے اُبلا پڑتا ہے سوڈے کی طرح نکلا آتا ہے مگر وہ اُس کو تھام نہیں سکتے۔ ممتحن کا مجسمہ اُن سے علیحدہ بر سر پیکار ہے امتحان کا بھوت علیحدہ گردن دبائے ہوئے ہے کہ یہ پہلا موقع ہے۔ اُٹھے اور ٹہلنے لگے۔ فکر سایہ کی طرح ساتھ ہے۔ چہل قدمی سے تنگ آکر پھر لیٹ رہے۔ آہوں کی دھونکنی برابر اُٹھتی اور بیٹھتی ہے غم غلط کرنے کو پھر کتاب اُٹھائی اور اُس میں نظر کو گاڑ دیا۔ مگر دماغ کو ایک مرکز پر کیسے لائیں۔ اب با جبر پڑھنا شروع کیا کہ دماغ متوجہ ہو مگر وہ بھلا کٹی پتنگ کی طرح کیا واپس آتا۔ مجبور ہو کر کتاب کو پٹک دیا۔ روشنی بڑھائی اور چادر میں مُنہ چھپا کر پھر دراز ہو گئے۔ معلوم نہیں کیا خیال آیا کہ استنجے کو جانے کے واسطے اُٹھ بیٹھے۔ روشنی کی۔ پانی بھرا

جادہ جا - میں سکتے میں کھڑا ہوں - واپس آئے - میں نے پھر سلام علیک کی اس دفعہ اتنا ہوا کہ سلام کا جواب
.یا - اور پھر غوطہ میں - میں نے پھر مزاج کا حال دریافت کرنے کی جرأت کی - مگر میں ایک پتھر سے گفتگو
رہا تھا - میری آواز جاتی - پھر کچھ نہیں - میرا اکلوتا لڑکا اُس کی دھوم سے شادی کرنے کا ارادہ - یہ اُسکے
مددوست اُس نے چلتے وقت سخت اصرار سے کہا تھا کہ ابا جان وہ شادی میں ضرور شرکت کریں
.نہ اچھا نہ ہوگا - وہ نہ آئے تو میں بھاگ جاؤں گا یا کچھ کھا لونگا - میں اِس مخمصہ میں گرفتار ہوں یہاں
.از کی پہونچ ہی نہیں - یہاں خوشامد کا گزار ہی نہیں - یہاں زاری کے واسطے کوئی دروازہ کھلا ہوا ہی
.ں - مگر ضرورت سب کچھ کرواتی ہے - میں ساکت کھڑا تھا کہ ایک دفعہ اُن کی نظر نے مجھکو گھیر لیا فرمایا
ن - میں نے کہا میں ہوں، علن میاں کا والد، اُنھوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے، ابھی بات
ی ختم نہیں ہوئی تھی کہ جواب دیا - مجھکو فرصت نہیں ہے، میں نے کہا یہ پرچہ دیا ہے - کہا بالکل فرصت
ہں ہے میں نے کہا صاحب وہ بلا آپ کے تشریف لائے ہوئے جلسہ عقد میں بیٹھنے سے انکار کرتے ہیں
مر جواب آیا ہمیں بالکل فرصت نہیں ہے - میں نے کہا، یہ دو سطریں ہیں ان کو پڑھ لیجئے - کہنے لگے
م مارنے تک کی فرصت نہیں ہے - کل امتحان ہے - یہ کہا اور کتاب لے کے پھر لیٹ گئے - اگر
.ئی بند جگہہ ہوتی یا کمرہ ہوتا تو شاید میں نکلوا دیا جاتا - مگر گرمی کے دن تھے - باہر پلنگ پڑے ہوئے
تھے - میں وہاں سے دو قدم ہٹ کر ٹھیر گیا - اپنے دل میں کہنے لگا اب کیا ہوگا - یہ بات نہیں
رتے، علن مانے گا نہیں - وہ ہے ہٹ کا پکّا، وہ ضرور کوئی بیکار بات کر بیٹھے گا - میری سُبکی
وگی، دل میں کہا لاؤ ایک دفعہ کوشش اور کر لو - میں پھر بڑھا اسوقت کتاب بند تھی - مگر آنکھیں آخری
مد تک پھٹی ہوئی اختر شماری میں مصروف معلوم ہوتی تھیں - میں نے کہا پھر مجھے کیا حکم ہے جھنجھلا گئے
میں نے سو دفعہ کہدیا میرا امتحان ہے، امتحان، مجکو بالکل فرصت نہیں ہے، مرنے تک کی فرصت
نہیں ہے، آپ کہتے ہیں یہ کیجئے وہ کیجئے، ہم کو پڑھنے پڑھانے کی فرصت نہیں - آپ خود ہی بتلا دیں
.قعہ میں کیا لکھا ہے، میں نے فوراً پرچہ نکالا اور پڑھنا شروع کیا :-

"پیارے حبیب - کل صبح ایک جلسہ نکاح میری عزت میں اضافہ کرنے کے واسطے قرار
دیا گیا ہے - شاید میں ہی اس میں صدر بنا یا جاؤں - پیارے حبیب اگر آپ اس میں
شرکت کرنے سے قاصر رہیں گے - میری عزت افزائی کامل طریقہ سے نہ ہوگی - لہذا

ملتجی ہوں کہ آپ ضرور تشریف لاکر مجھکو عزت بخشئے ورنہ میں وہ کروں گا جو این ٹونی نے کیوپٹرا کی جدائی میں کیا تھا۔

آپکا مخلص۔ نجیب

انھوں نے پرچہ لیکر ایک دفعہ خود پڑھا۔ اس پرچہ نے بجلی کا کام کیا۔ صاف طور سے معلوم ہوتا تھا پڑھنے والا اس سے غائت درجہ متاثر ہوا ہے۔ پہلی حرکات سست ہوگئیں۔ بشرے نے نیا رنگ، فکر مضاعف ہوگئی۔ نظر پرچے کے آخری جملہ پر پڑ گئی پیشانی نے گہری شکن ڈالی۔ رخساروں پر خون۔ ہجوم کیا۔ آنکھوں کے ڈورے سرخ ہوگئے اور اُنکے دونوں کناروں سے نہ بہت چھوٹے نہ بہت بڑ متوسط قامت کے دو بوند ایک اس طرف اور ایک اُس طرف ڈھلکتے ہوئے پرچے کی آخری سطر پر جا پڑے اُس کی روشنائی کو چھوٹے بڑے ستاروں میں پھیلا دیا اس وقت میرا سکون میرا ساتھ چھوڑ گیا میں گھ میں نے کہا جناب یہ کیا آپ رنجیدہ کیوں ہوگئے؟

کہا مولوی صاحب اس وقت دو ہستیوں کا سوال ہے کہ ان میں سے کون سی باقی رہے۔ کل۔ میرا امتحان شروع ہے۔ وہ اٹل ہے جیسے موت۔ آیندہ کی ترقی کے سب منازل اسی کی کامیابی میں مضمر میں اس میں گر گیا۔ تو دونوں جہاں سے گیا۔ میں نے کہا میرا کل ایک لڑکا۔ برسوں کی تمناؤں کے کل وہ دن آنیوالا ہے کہ ہمارے گھر خوشی ہوگی۔ مگر آپ میری زندگانی کی اکیلی خوشی کو ملیا میٹ کئے د ہیں۔ میری اس رنج بھری آواز نے صاحبزادے کو بیچین کر دیا۔ انھوں نے کاغذ نکالا اور کچھ لکھا پھر مجھکو پڑ سُنایا۔ پیارے نجیب دعوتی رقعہ کا شکریہ۔ میرا امتحان کل سے شروع ہونے کو تھا آپ جانتے ہیں کہ میں کسی ط آپ کی شادی میں بغیر اپنی زندگی کو ختم کئے ہوئے شریک نہیں ہوسکتا۔ لہذا میں نے نیت کر لی ہے کہ بر کی طرح زندگی میں ناکامیاب رہنے پر اپنی جان کھو دوں اور اس طرح آپ کی زندگانی میں اضافہ کا باعث پیارے نجیب میں شادی میں ضرور شریک ہونگا۔ فقط۔ ح۔ اتنا سُنا کر انھوں نے ایک لفافہ لیا۔ اُس پر بند کر کے میرے حوالے کیا اور سرہانے ڈھیر لگی کتابوں کو لات مار چارپائی پر لیٹ رہے۔ میں اپنی کا پر خوشیاں مناتا ہوا اپنے گھر واپس آگیا۔

قدرت ان کمزور اور سخت مضمحل اعصاب والے نوجوانوں کو جن کی بصیرت چھوٹی چیز کو بہت بڑی ا بڑی چیز کو بہت حقیر دیکھنے کی عادی تھی ایک زندگانی اور بخشتی ہے۔

صبح ہوتے ہی ایک بے فکرا چربیلا ہنسوڑ طالبعلم جوان کا ہم جماعت ہے یہ خبر اڑاتا پھرتا ہے کہ امتحان کسی دوسرے شہر میں وبا پھیل جانیکی وجہ سے ۲ ماہ کو ملتوی ہوگیا۔

میاں حبیب سچی خوشی سے بھرے ہوئے دل کے ساتھ میاں نجیب کی شادی میں شریک ہوئے اُن کو شادی کا اور تھوڑے دنوں کے بعد اُن کو کامیابی کا سہرا پہننا نصیب ہوا۔

---

# تنقید و تبصرہ

**ایشیا** یعنی براعظم ایشیا کا طبعی، سیاسی اقتصادی جغرافیہ، مصنفہ جناب ابرار حسین صاحب قادری، ایم اے ال ٹی، لکچرر تاریخ وجغرافیہ انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں۔ ہمنے یہ کتاب شروع سے آخر تک نہایت غور کے ساتھ پڑھی، اور ہمیں یہ دیکھکر نہایت مسرت ہوئی کہ جناب قادری صاحب نے تمام مسائل کو نہایت وضاحت اور سلاست کے ساتھ حل کیا ہے۔ انداز بیان دلکش اور موثر ہے، اس کتاب کی ترتیب میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ جغرافی مسائل کو حیات انسانی کی روشنی میں لایا جائے، ہمیں یقین ہے کہ اسی وجہ سے کتاب نہایت دلچسپ ہوگئی ہے۔ اردو زبان میں اغلباً یہ کتاب اس نوع کی پہلی کتاب ہے اس لئے ہم قادری صاحب کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ وہ اپنی علمی کوششیں اس سے بلند تر پیمانہ پر جاری رکھیں گے۔

ملنے کا پتہ

**نظامی پریس بک ایجنسی۔ بدایوں۔ (یو۔ پی)**

must be replaced by a system of occupying ownership and he shows that this occupying owner system prevails in every country in which agriculture is highly organised and flourishing. The author rejects nationalisation of land as a remedy but strongly urges continuity of agricultural policy.

Crown 8vo. Paper Covers 1/- net.

* * *

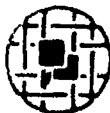
In these days when journalism is a recognised profession for women it is interesting to look back to the mid-eighteenth century when Mrs. Eliza Heywood entered the lists with Addison and Steele by starting her own journal "The Female Spectator," the second woman's periodical to appear in England and the very first to be edited by a woman. From its four volumes Mrs. Mary Pristley has now made a selection of the most amusing and characteristic passages which is being published under the title of "THE FEMALE SPECTATOR" by Messrs. John Lane The Bodley Head Limited on September, 20th with an introduction by J. B. Priestley, the novelist and critic. The effect of these selections is at once absurd and charming; and the decorations and initial letters in black and white by Constance Rowlands are admirably in keeping with the 18th century flavour of the book.

Illustrated Demy 8vo. 7/6 net.

* * *

" SHINJU ". H. B. Drake's new novel to be published by Messrs. John Lane The Bodley Head Limited on September 20th, is a story of Japan—not the Japan of Puccini or of Hollywood or even of Loti, but the Japan of religous mysticism, of traditions upheld to the death, of an outlook that is now gay, now utterly tragic. Mr. Drake, who has just returned to England after a long stay in Japan, has here written the love story of a Japanese girl with an understanding that is quite unusual for a Westerner; and his descriptions of Japanese scenery and manners in the wild and unfrequented interior will always remain in the memory of the reader.

Crown 8vo. 7/6 net.



# LITERARY NOTES

On July 5th Messrs John Lane The Bodley Head Limited published a new novel by Charles Kingston entitled THE INFALLIBLE SYSTEM: A Monte Carlo Mystery Mr. Kingston is not only the author of two successful mystery stories "The Guilty House" and "The Highgate Mystery", but he has also written a famous book "The Romance of Monte Carlo", so that the setting and atmosphere of the present story are thoroughly familiar to him. These adventures of Irma Chetwynd bring her into contact with strange people and her own fate is mysteriously connected with her luck at the tables. There is a peculiar fascination about Monte Carlo even to those people who have never been there and Mr. Kingston has *written an unusual story round this romantic* background.

Crown 8vo. 7/6 net

* * *

On July 12th Messrs. John Lane The Bodley Head Limited published HARLEQEINADE: The Story of My Life by Constance Collier with a Preface by Noel Coward. This autobiography describes in a delightfully personal vein the early struggles and hardships and later disappointments and triumphs of a stage career. Constance Collier was born and bread in the atmosphere of the theatre and it is the theatre which has filled her life ever since. Starting engagements as a child she later became one of the "Gaiety Girls" under George Edwards and her first real success was in the part of the Gipsy Girl in "One Summer's Day" when she played with Eva Moors and Charles Hawtrey. The turning point of her career however, was her meeting with Beerbohm Tree, and her description of how she got one of the chief parts in Stephen Phillips' "Ulysses" at His Majesty's Theatre is one of the most dramatic stories in the book. This began her long association with Tree and she has many interesting and amusing stories to tell of that remarkable man and his productions at that theatre. She has much to say here also about Coquelin, Stephen Phillips, Charles Frohman, Sir Frank Benson, Charlie Chaplin and many other friends. Altogether the book is thoroughly human, amusing and outspoken and alive with the fascinating personality of the author.

With twenty illustrations. Demy 8vo. 15/- net.

* * *

On August 16th Messrs John Lane The Bodley Head Limited published a new book by Walter G. Bell, author of "Unknown London", "The Great Fire of London", etc., entitled LONDON RE-DISCOVERIES AND SOME OTHERS. Mr. Bell here deals with a number of interesting matters revealed in recent years which throw additional light on the story of London. These include the recovery of The Great Seal of William the Conqueror's Charter to London; some new information concerning the famous Lord Mayor, Dick Whittington, the tombs of Plantagenet, Tudor and Stuart Kings, The Tower of London, The Abbey, The Inns of Court and the Origin of Hoare's Bank. Though embracing London topics Mr. Bell's outlook ranges over a wider field in this book, which throughout bears the stamp of authority and distinction which have made his previous books on London so popular. There are nineteen illustrations both unusual and varied, and Pepysians will be specially interested in the diarist's account from his banker's ledger, now by permission, reproduced in facsimile.

Illustrated Crown 8vo. 7/6 net.

* * *

On August 16th Messrs. John Lane The Bodley Head Limited published THE LAND: Agriculture and National Economy by Christopher Turner with a Foreword by Lord Bledisloe. The author's object in this little book is to give a sketch of the agricultural situation, which he divides into three sections—Past, Present and Future and in the last section he sets out a wide range of measures for the organisation and development of agriculture. His main thesis is that the Landlord—Tenant system is moribund and

is purified in liquid air and enclosed in test-tubes. These test-tubes are sent out by the Middlesex Hospital to other hospitals and doctors.

A salt spoonful of radium has been given to the London Hospital, and this new store will increase the supply of radon. Thousands of cures will be effected, for radium is a splendid cure for certain stages of cancer.

## An Education from the Air

It is interesting to note the American educationists are endeavouring to establish a 'University of the Air.' This is to be done through the medium of broadcasting and the project seems quite feasible. A few experiments in musical education have been made in each of which a sixty pieces orchestra, playing fine music for a whole hour and conducted by Mr. Walter Damrosch, has been broadcast throughout America. Before the playing of each selection, Mr. Damrosch sat at a Piano and told his unseen audience about the piece that was to be played, illustrating his remarks with chords and harmonies and little phrases of music. In this way all the prairie shools are brought into touch with the best music of the day. 'Give me three years', says Mr. Damrosch 'and I will make America the most musical country in the world."

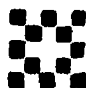
This, then, is the dream....the establishment of a great university of the air, which will bring the culture of the world and of the ages to the people of America. The American broadcasting company has elected an advisory council to work out this ideal. The New University is to be for the benefit of the adult listener-in. A beginning has been made in a scheme for Political education by the President of the National Broadcasting Company. Lectures are given on subjects connected with political science, and the American Library Association issues books for those who wish to follow the subject further. Lectures are also given on Phonetics and Psychology. It is hoped that television will soon be sufficiently developed to be added to the broadcasting system. If this is possible, the wildest dream of a perfect education will be materialized.

## How pictures are sent by Wireless

The Marconi system has been so wonderfully developed that scientists are able to send pictures by wireless. Pictures have been flashed from New York to Somerton in England by this system, at the same speed at which light travels. A cell has been invented which is known as the Photo Electric cell. It is so sensitive that when a ray of light falls on it, it transmits an electric current, which stops as soon as the light is shut off.

At New York a telegram or any printed matter is placed on a revolving cylinder. A beam of light is narrowed down to almost a needle point of brightness and, after being focussed on the cylinder, it traces out every word of the printed matter. Both the cylinder and the finger of light are constant. The light and dark effects which are caused by this constant motion are reflected into the Photo Electric cell, and this immediately transmits an electric cell. The current so caused is sent across the Atlantic Ocean wireless, and when the impulses arrive at Somerton, the currents are sent backwards. The electric cell which receives the currents acts differently from the one in New York, which is the transmitter. Instead of tracing out the picture, it writes, only allowing the spot of light to shine when the light comes through. The receiving cylinder at Somerton moves exactly in time with the cylinder in new York, but it is covered with Photographic paper. The spot of light which traced the drawing in New York, and the spot of light which traces it again on the receiving cylinder at Somerton keep exact time. In this way the fingers of light move together and they are able to draw a picture in New York and in Somerton which is 3000 miles away at the same time.

With apologies to
'The Treasure Chest'



Presently an extremely stout woman walk-
d heavily into the vehicle and sat down
pposite the child.

Mollie contemplated the new comer for
›me minutes, then turning to her mother
ıquired in a loud voice:

"Mummy, is that all one lady."

* * *

*Child*—"Papa, what is a king ?

*Papa*—" A king, my child, is a person
hose word is law, and whom eveybody
ust obey."

*Child*—"Papa, is Mamma a king ?

* * *

"Surely, you are not the big boy who
ved next door to me when I was a little
rl ?

"No, I am the little boy who lived next
ɔor to you when you were a big girl."

* * *

*Little girl*—"What do you think, auntie!"
There's something running across the
ıthroom floor without legs.

*Auntie*—"Good gracious child, what is
?"

*Little girl*—Water, auntie."

* * *

*Cubist*—"The gentleman, whose port-
it this is, has come and asked me to alter
s nose a little."

*Friend*—"And that makes you cross?"

*Cubist*—"No, but I can't remember where
put the nose."

* * *

*Man*—"Have I the pleasant expression
ıu require ?"

*Photographer*—"Perfectly, sir."

*Man*—"Then take the photograph quick-
; it hurts my face."

* * *

"With whom was your wife quarrelling
st night ?"

" Oh—er—She was scolding the dog."

Poor beast—I heard her threaten to take
e front door key away from him."

* * *

*Small boy*—"Will yer light me cigarette
r me mister?"

*Old gentleman*—"Light your cigarette
· you?"

*Small boy*—"Me mother don't allow me
to play with the matches.

* * *

(*Improving on nature*) Brisbane says
science will control weather. Then we'll
have summer in winter and winter in summer.

(*Schemctady Gazette*)

* * *

*Blind Test* - *Cora*—"Does that rich young
man of yours write convincing letters."

*Dora*—"I can't say. The case hasn't gone
to the jury yet."

* * *

*Present arms* ! *He*—"You are the breath
of my life."

*She* -- Let's see how you hold your breath.

(*Daily Oklhoman*)

* * *

"Your wife is talking of going to France
this summer.

Have you any objection ?

"No, certainly not. Let her talk as much
she likes."

* * *

Together the doctors examined their
patient and then retired, to discuss their views,
but unfortunately the door did not close pro-
perly and their conversation floated audibly
to the man in bed.

"You're wrong !" said one doctor.

"I am right !" protested the other.

Here the patient groaned loudly and the
doctors, realising the necessity of the case,
dropped their argument, but not before the
first one made a parting shot.

"Go your own way," said he. "But I'll
prove you were wrong at the post-mortem!"

(*The Times of India Illustrated Weekly*)

SYED FARIDUDDIN,
*Student of XI B, I.*

We must be more ; and
to be more we must more
often think of our ideal.

—A. S. Barnett

honour and "graceless" like a tigress. All the portraits of his heroines, such as Cleopetra, Raina, Candida and Blanche expound his extremist views about the corrupt nature of women. Wide may be his general outlook and varied may be his personal experience, but in this respect he seems to be driven to a wild delusion, the truth of which he can never prove. He has examined singular instances and on their force tried to establish a general proposition.

But even this star on women gets dim when compared to the blashphamy he has directed against the English nation. To him everything English is ignoble, their religion, their patriotism, their hopes, are all snares to which they decoy simple-hearted people. Their legal system, in his opinion, is tyranny ; their execution of a murder is the gratification of their vindictive instinct. The dying words of Nelson " kiss me hardy " have no appeal to his mind. He contemptuously calls the English people ' a nation of blackguards.'

His detestation for England and his vilification of English people, their manners and sentiments, have won for him esteem and adoration from the continental anti-British lands. This is why on the occasion of his 70th birthday Germany sent to him a message of good-wishes.

He is at the same time not a whit lagging behind in his disregard for science. Medicine, astronomy, physics and all other scientific developments are to him no real things. He calls surgery, which only too recently saved his life " the business of carpenter's shop."

The most revolting of his expositions is his sordid attitude towards religion. It is very difficult for any sensible man to bring his thoughts in line with Mr. Shaw's jesting mockery of religion. He once wrote to Count Tolstoy that " God does not exist." Sometimes he sneers at God with turbid language and passes taunting remarks at Christ and other Christian saints. In one place he says " Gentle, Jesus meek and mild is a swivelling modern invention with no warrant in the Gospels."

Indeed he professes no religion; but still pretends to give one. He maintains that by thoughts man can add much to his intellectual stature. He holds the sortness of human life to be wholly responsible for the deterioration of his physical and mental capacities, and suggests as a remedy, a stubborn fight with the forces of nature.

His greatest hatred, however, is directed towards warfare and such terrible outbursts of human passion. It is strange that a person of his temperament should evince a great liking for prize fighting.

In the end I may say that Mr. Shaw is not all that is said of him, but is much more and much less than is imagined by the mass of those who judge him from his books and speeches.

S. MOINUL HASAN

## WIT AND HUMOUR

*Husband*—"That beefsteak isn't cooked to suit me."

*Wife*—"Well, cook it yourself. You didn't marry a cook."

*Wife*—(In the middle of the night) "Get up, John. I think there are burglars in the house."

*Husband*—"Get up yourself; you did not marry a policeman."

* * *

*Teacher*—"Tommy, can you tell us the difference between Ammonia and Pneumonia?"

*Tommy*—"Sure, one comes in the bottles and the other in chests."

*She*—"Marry you, George! Of course not; you're too much of an ass"

*He*—"But then every one said we'd make such a wounderful pair."

* * *

*Actress*—"Well, how did you like my play?

*Admirer*—"Very much indeed. The Church scene was so realistic that I went sleep."

* * *

A little girl was riding inside a tram car with her mother, a woman of very splendid built.

**Himu.** (*raising Akber*) Rise my Lord. and let me die. Youn brutes' heart none can turn though you be Emperor (to Bairam) come strike. (to Akber) Noble youth to live, is to live and die, I set my heart on a large Empire, I lost. I now reap the fruit of my folly. Let me die thus.

**Akber** Would that I could die for you, Oh, my dear enemy

**Himu.** God bless thee. (to Bairam) come strike.

(Bairam Khan strikes Himu who falls down dead, Akber is horrified).

**Akber.** (*rushing away*) Oh God! Oh God! Is this war. Is this war.

*Curtain*

Have you learned lessons only of those who admired you, and were tender with you, and stood aside for you? Have you not learned great lessons from those who reject you, and brace themselves against you or who treat you with contempt or dispute the passage with you?

—Walt Whiteman

# BERNARD SHAW AND HIS OPINIONS

Keeping in view the influence exerted by the writings of Bernard Shaw upon our mind it is worthwhile to know what actually the opinions of Mr. Shaw are.

Some people profess him to be the greatest intellect of our time, while others depreciate his merit by calling him 'a conceited ass with his streak of genius, a bitter enemy of England and an incorrigible bore.' But all are undoubtedly unanimous about his extraordinary genius and power of grasping things as they are. It is no very easy task to decide the issue and assert one view or the other.

Those who have the honour of his personal acquaintance declare him, in his private life, to be a man of generous heart, magnetic power, width of vision and charitable judgment which mark him as a sublime being. But this is not the Bernard Shaw who reveals himself in the voluminous prefaces of his writings. The difference between the two is world apart.

Shaw was born in Dublin on July 26, 1856, his father being a retired civil service man. He was the only son of his parents and received more of his training at home than at school. Like Tagore, he was very wretched at school which goes to explain his great abomination for the modern educational system. He curses it as a thing which holds back the heart of the boy from cherishing affectionate feelings for his home, or in other words, it brings about an alienation between the child and the parents. His bondage with educational institutions was, however, soon cut short as he accepted the service of a land surveyor at the early age of fifteen.

He came to London in 1879 where his mother was teacher of music. Here he had to see hard days for some time, in course of which he wrote five of his novels out of which only three survive.

At the age of 25 he became a vegetarian and a year later embraced the political creed, to which he sticks even to this day. In dissiminating his new faith he addressed hundreds of meetings at streets and alleys. These proved to be of no material value to him as they failed to fill his pocket. It was only when he started his career as a journalist, as reviewer and a musical critic that he recovered from pecuniary stress.

At the age of 42 he married a charming woman with an excellent estate. But his fortune has been the product of his own unaided labour and inextinguishable genius, not a veritable godsend.

The dominant note in his writing is the 'disparagement of marriage,' ungentle remarks about women and 'acrid mockery of England' and everything English.

His opinion about women is, that they are devoid of character, regardless of truth and

(Enter G. Sawar Beg tottering).

**Akber.** *(rising and seeing him bleed)* Ah! you are wounded.

**G. S. B.** *(saluting)* No Sire I'm dying, your horsemen Sire, are routed (seeing the corpse) Ah,' General Mohammad Khan, wait I come. (Falls & dies beside the corpse).

**Akber.** *(mournfully)* Another brave man, cruel fate, Oh! terrible God of WAR is not the blood of such noble men enough to quench your thirst (kneels down beside the dead men and presses a kiss on their cold brows, enter G. S. K.).

**G. S. K.** *(seeing the dead)* Oh! Satwar Khan Oh! Mohrmmad Khan.

(Akber rises, & G. S. K. kneels).

**Akber.** Rise.

**G. S. K.** Sire we have captured the guns, but the right flank is nearly done for, Himu rides his elephant, like a god his life seems charmed, Sire your army is hard pressed, Sire, there is still time for a retreat.

**Akber.** Does Bairam Khan alive.

**G. S. K.** Yes Sire, but is hard pressed.

(Enter G. Nabi Khan, hastily).

**G. N. K.** Sire your army wavers, call a retreat.

**Akber.** Cowards, are you men, it were better if you had stayed at home wearing frocks, (they move to go) Stay, I go.

**G. N. K** Nay Sire, you are young, we'll go and die fighting like these valiant men. (They leave).

(Akber kneels down to pray for the souls of the dead in the meantime a soldier enters).

**Akber.** *(Rising)* Well.

**Soldier.** Your Imperial Majesty, your centre is doing very well, Bairam Khan fights like a devil, his sword is taking great till the Hindu army waver, before the rain of arrows.

**Akber.** Good, tell General Nabi Khan—

**Soldier.** General Nabi Khan is dead, an arrow peirced his skull.

**Akber** *(Mournfully)* Ah! well, tell General Sattaar Khan to collect the remanant of the cavalry and charge.

**Soldier.** Very well Sire—(Exit the soldier).

(After some time General Sattaar Khan enters hastily).

**G. S. K.** Sire, the day is yours, Bairam Khan is hero, Himu is captured, the Hindus fly.

**Akber.** Thanks God. But you are hurt.

(G. S. K. falls down dead).

**Akber.** *(kneeling beside the General)* Oh Allah! Great Allah! what is victory when I have lost all my brave Generals.

(Enter Bairam, with Himu who is badly wounded)

**Bairam.** Hail Akber! Emperor of India.

**Akber.** Great General, God has won us this battle.

**B.** Sire, here (pushes Himu forward) is Raja Vikramajit.

**A.** But he's wounded, quick call my physician, you there.

(A soldier moves).

**B.** Stay, Sire, take this sword and kill the infidel who dare to take your capital. (Akber stands dumb-founded). Strike and strike him, don't delay.

**Akber.** How can I strike a man who is as good as dead.

**Bairam.** *(angrily)* Then let me despatch him to hell.

(Lifts his sword to strike).

**A.** Stay, *(catches his arm)* don't kill him.

**B.** *(unloosening his arm)* Sire, he must die.

**A.** Then let me not witness the brutal murder (to Himu). Raja die like a man. (Akber leaves, Bairam lifts his sword to kill, Akber rushes in).

**A.** Tarry General, Raja 'tis no fault of mine that you are my enemy, were you my friend, it would have been a fault of mine. God has willed it.

**Himu.** Noble Emperor 'tis right that God had made us friends.

**Akber.** 'Tis not late (falls on his knees before Bairam) Oh General, kill him not, spare him for my sake, look your Emperor pleads. Oh! spare him, he is but dead.

**A.** Why? is his force large, has he 50000 men.

**G. M. K.** More than that Sire.

**A.** Then has he 200000 men.

**G. M. K.** More than that Sire.

**A.** (*losing his temper*) Then how ıany has he, has the devil taken possession of ɔu.

**G. M. K.** Your Majesty, his forces are ıe multitude of warriors, his forces, your lajesty, cannot be counted 'tis one sea of vords. Your Majesty, he has three divisions e centre of which only is comprised of 0000 horses, which are supported by 500 orses and elephants.

Your Majesty your troops are out num-:red.

**Akber.** Bairam Khan, what shall we o?

**B. Khan.** Sire, there is no alternative ut to advance, meet, fight, and conquer.

**G. S. K.** Sire, 'tis impossible to fight verwhelming numbers retreat I pray you.

**G. N. K.** Yes Sire, retreat.

**G. F. K.** Your Majesty, retreat.

**B. Khan.** Cowards, dare you give the outhful Emperor such disgraceful counsels, ou flatterers who just *swore* to die in his rvice (the Generals are humbled).

**Akber.** Bairam Khan, you are to hasty, onsider well, we have only 20000 men.

**Bairam.** Your Majesty, these hair *ouches his beard)* have grown white in the rvices of your father the Emperor Humayun the services of your grandfather the illustrious onqueror Baber. It was on this same field 0 years ago that I fought with the people of ıdia. It was on the same field your grand-ither founded his Empire, will the grandson n the same field lose the same Empire? 'ever ; I go to war even if I have to go lone.

**G. M. K.** Bairam Khan—

**B. Khan.** Ay, what is it? don't reason ;eneral, ther's but to do and die. (*to Akber*) 'our Majesty, how is it? are you the grand-on of mighty Baber going to show the back n these accursed infidels, speak Sire, is the vhole army going or am I going alone.

**Akber.** Bairam Khan, advance and fight, take the whole army, and command it, let Mighty Allah protect it.

Generals, your swords (Akber kisses the swords and returns them, they receive the swords kneeling) take them and prove your valour, Let the Hindu dogs taste real Moghul steel, ay, General Sarwar Beg. (G. S. B. bows).

**Bairam** General Mohammad Khan command the left flank, go.

**A.** God be with thee—(exit G. M. K.)

**B.** General Sattaar Khan command the right flank, go.

**A.** God be with thee—(exit G. S. K.)

**B.** General Sarwar Beg see to the cavalry, Moghul horse and horsemen will engrave their name in history. Go.

**A.** God be with thee—(exit G. S. B.)

**B.** Your Majesty, and I'ill command the centre, which will be composed of the archers.

**A.** Go, Bairam Khan go God be with thee, strike and strike hard—(salutes & leaves). Ah : cruel fate which brings such troubles. (kneels down) Oh ! Allah : you who have been with my father on this same field years ago, give my Generals your same protection. Oh Allah ! guide you my army this day.

(Enters the tent, the din of battle is heard, Akber is heard murmuring, Oh Allah! Oh Allah ! after some time G. M. K. enters bleeding profusely and calls fourth "Sire, Sire"

**Akber,** Who's there? Who's there?

**G. M. K.** General Mohammad Khan.

**Akber.** (*coming out*) General, what is it? Ah, I see my army is routed, unhappy Akber !

**G. M. K.** Sire, the left flank is no more, my men stuck to their post, but the Hindus, God Curse them charged and slew. Sire, I am done for, I am happy if I die thus, speak me fare in death let none say that I deserted my post. Fare you well my Emperor. (*Falls down and dies*).

**Akber.** (*kneeling*) My brave General, you die doing your duty, may your soul rest in peace.

**Akber.** (*weakly*) Father ! Father !

(The assembly rise and with one voice "Hail Akber ! Emperor of India," and they prostrate themselves before the Emperor).

**Akber.** Generals, my father's death is a sad blow to me, his death, leaves me heir to the throne and gives me a very responsible duty for which I'll have to answer to God after my death.

I who have not seen more than fourteen summers, have been ordained to rule the largest Empire in India
Generals, I will do my best ;
Oh ! Allah, give me the power to rule.
(The assembly Amen ! Amen).

**Bairam Khan.** Noble Emperor—

**Akber.** Bairam Khan, you who have been a father to me since my birth, I place on your shoulders the responsibility of the state till I get of age to rule without your fatherly aid (Bairam kneels) ; rise Bairam Khan, rise the Regent of the state.

**The assembly.** Brave and valiant Bairam Khan.

**Bairam.** Noble Emperor, and brave Generals this is a great honor conferred upon me, I had intended to go on pilgrimage to holy Mecca, but as God has willed it I will stay here by the side of the young Emperor and be his right hand in the time of need.

(Enter the usherer announcing "General Tardi Beg, Governor of Delhi" enter Tardi Beg—Followed by his men. Tardi Beg falls at the feet of Akber).

**Akber.** What now Governor, what is it ? Do you bring me the sad news of the death of my father ?

**G. N. K.** Then Sir, you are too late.

**Tardi Beg.** (*rising*) Your Majesty, I bring the sad news of humiliation, dissolution, and defeat (the assembly arise like one man) your Majesty, Delhi, is taken.

**Akber.** (*shouting*) Delhi taken ! are you mad Governor ?

**T. Beg.** Your Majesty, Rajah Vikramajit has crushed your Majesty's forces, your men Sire fought like heroes but overwhelmed by superior numbers they gave in. His troops now parade the city.

**Akber.** (*perplexed*) Raja Vikramajit ! Who is he ?

**T. Beg.** Himu, The Hindu, Sire.

**Akber.** Ah ! man, shame, do you dare stand here before me to tell of the defeat. (T. Beg hangs his head).

**Akber.** My father dead, my capital taken, a sad day for me. Bairam Khan arrest this man, and his Genreals.

**T. Beg.** (*pleadingly*) Sire—

**Akber.** Vile man ! You dare, enough, Bairam Khan show them the jail (exit B. Khan with T. Beg and generals).

**G. M. K.** Your Majesty—

**Akber.** General, waste no time, review the troops and give the Marching order to Delhi. (Exit G. M. K. enter B. K.).

**G. Sattaar Khan.** Your Majesty, (*drawing his sword*) let God be my witness, till there is life in this carcase, till there is strength in these arms, this sword will ever flash in your service, take it Sire and comman it. (Throws it at Akber's feet).

**G. Nabi Khan.** Sire, I am a man of few words (*drawing sword*) never has man recovered, who has tasted of my sword, Sire command it and its owner. (Throws it at his feet).

**G. Feroze Khan.** Sire, never will steel bite as hard as mine, Sire, in your front ranks you may see my sword flashing. Take it Sire 'tis at your command (throws it at his feet).

**G. Sarwar Beg.** Your Majesty, my sword is made of pure Moghul steel, my heart is made of pure Moghul blood, both Sire, I throw at thy feet. (Kneels at his feet).

**Bairam Khan.** And Sire, my arm has lost none of it's strength, although 'tis grown old in the service of your house. Sire, you may rely upon it still, (drawing sword) this proud steel will dig a firm foundation for your throne, Sire, command it. (Throws it at his feet).

(Enter G. M. K. hastily).

**G. M. K.** Sire ! retreat Himu with his force is coming to give battle.

**Akber.** Retreat ! you mean fly, how dare you ?

**G. M. K.** Sire, we are outnumbered.

a PASS for a week which he had formerly drawn out from his pocket and said "I hope you will forgive this man as he is a new person and by coming daily to our opera you give a proof that you are not displeased at all."

I said "Thankyou" and departed. I related the whole story to my friends who laughed very much. Then about three we reached our hotel and enjoyed a sound sleep, and for the rest of the days other Bombays attracted our attention.

> Whosoever thinks that he alone has wisdom, or a tongue, or a soul, such as no other, this man, when laid open, is seen to be empty.
>
> —Sophocles

# PANIPAT

BY

**Z. B. Kureishy, Class XI B**

(The scene opens on the field of Panipat. The Moghul army is encamped. A council of war is about to be held. Five Generals are seated outside the royal tent).

**General Mohd. Khan.** 'Tis a losing battle that our Emperor fights.

**General Nabi Khan.** As long as there is Bairam Khan with his hot-headed counsels there will be war, and war only.

**General Mohd. Khan.** You are right General, Bairam seems more the commander than Akber.

**General Sattaar Khan.** Akber is like a ship—

**General Mohd. Khan.** Yes, and Bairam Khan is it's steersman.

**General Ahmed Khan.** What did you say brother ? Is Bairam Khan the pilot.

**General M. Khan.** General, the pilot is Bairam Khan, the ship is the Moghul Kingdom.

(Usherer enters, announcing " Prince Akber " enter Akber ; on his right Bairam Khan, followed by men-at-arms. The assembly stand and bow, Akber waves them to sit, then takes his seat on a pile of pillows).

**Akber.** General Mohd. Khan.

**G. M. K.** Sire.

**Akber.** You are right for once, our brave and valiant Bairam Khan (Bairam Khan bows) is the pilot of the ship of state, and in this rough and bloody weather he is steering it to safety.

**Bairam.** He meant me no good (flashing his eyes on G M. K.) when he said those words.

**G. M. K.** You are wrong there General—

**Bairam.** (*impatiently*) Enough I know you well (to Akber) I pray your Majesty to get to business at once.

**Akber.** You are right! You are right! (addressing the assembly) Generals—(a messenger, a boy, clothed with blood and dirt enters and falls down at the feet of Akber, the assembly is startled.)

**Akber.** Rise (the boy rises, but falls down unconscious Bairam Khan lifts his foot to kick the boy).

**Akber.** Hold there Bairam Khan! Have you no heart ? The poor fellow is half dead. (to G. M. K.) Water ; Water ; be quick. (G. M. Khan leaves, Akber opens the torn shirt of the boy, the water arrives, water is smeared over the face, the boy opens his eyes and murmers " water ; water ; " Water is thrust through his parched lips. He rises in a daze).

**Akber.** Young man, what is it ? You come from my father's court, tell me, tell me, is all well.

Boy. (*bows*) Noble Sire, your father, the Emperor Humayun is no more. I bring you Sire, the sad news of the death of your father.

(Akber falls back, the Generals are startled).

Myself, a bit hoarsely " You sir, know in future, to pursuade a student for earnestness is a great insult and, which, I am sure justifies a smart blow on your forehead." Saying this I was about to raise my hand and put it on his forehead when a fellow student came between us.

While this was passing on here a shout came from backwords and entered our ears in the form of the following words " Look here please, he is not paying for the monkeynuts he has taken and the ticket checker hurried to the place. When he turned his back, I also slipped towards the forward benches and began to check the tickets with a solemn air. Persons who were sitting there were fortunately all Banias, and took me to be a real hand of the managing group of the opera. When I had checked about fourteen persons I came to a very lean and shabby looking fellow, whose looks displayed a sort of timidness.

Myself. " Your ticket please." He drew from his long pocket a bundle of papers very cruelly spotted hither and thither with the Biree tobacco and grease. And among them the itcket appeared. He handed it over to me. I, seeing it very minutely and turning it twice and thrice said very gravely rather authoritatively " Well, thirteen tickets of this sort were lost yesterday and though I don't think you to be a person to do such a thing, but I am very sorry I shall have to take you to the Manager." The poor fellow was so afraid, so confused and so distressed that pen cannot depict his confusion at all. He said, "Si-r-r to present, present myself before the — the manager, to present. Sir, sir. I have not stolen them, truly I say, I say on oath I have bought it from the office."

Myself. "But I don't mean you to be a person to do such a thing. I am sorry your presence is needed before the manager."

He. "Sir forgive me this time. I am not a thief. Have mercy on me."

Myself. "Well, You know I have detected you and either please give us the charges for the seat or follow me to the manager." He, hearing this, drew his money bag from the other pocket and presented a currency note of Rs 5. This I took silently and as a reward, noted the number of the ticket on my pocket book and signed it at the same time.

Having played this part I looked back and found the Ticket collector busy with the same fellow. I came to my seat, my friends laughed very much, who were watching me all the time and were anxious about the result.

Now the show has begun again but the ticket collector is busy in settling the quarrel of those fellows. Persons behind them were of course unable to see and called out "Turn them out. Turn them out." So compelled, they went away. We enjoyed the show very much without any further interruption. When the show finished people began to go outside and gave their tickets to the gatekeeper. While our party was about to pass the same fellow came in and got hold of my hand and said "Please, you come with me." I followed like a lamb. The others gave their tickets and stood outside to see the result.

He took me to the manager and said "Sir, this gantleman had no ticket and saw the whole show in the special class. The manager turned towards me and said "Sir, then you must pay."

Myself "What sir. I have already paid."

Manager "I don't understand this riddle. If you have paid for the ticket, where has it gone then."

Myself. "I have paid and let me tell you all the thing that happened. While I was sitting this fellow came to me and said "Sir. You can give me a match and a cigarette, I believe." I said "Sir. You have niether a match nor a cigarette. You seem to possess nothing but habit." At this he asked for my ticket and I showed him. Now when I had given my ticket to the keeper he has brought me before you. At this he sent for the doorkeeper and on his arrival spread all the tickets before me and said "Which is yours. I think you remember the number." I drew out my pocket book and showed him the number." Immediately the ticket was found out, and I showed my signatures on it."

He, very indignantly turned towards the ticket checker and said "You sir, I forgive you this time, for this is the first chance in your career that you have so misbehaved yourself, and as you have so insulted this gentleman, you will have to pay the penalty of Rs.15 and this will be deducted from your pay." Then turning towards me presented

rmining the order of Shakespeare's nas and tracing the development of his l. Moulton and his followers find in him perfection of dramatic art.

Whatever praise we may accord to espeare's sense of music or imagination character-drawing, our high eulogy is ned for the skill with which he links to-er his incidents, develops his plots, and gives to each and every feature its appropriate light and shade and setting. And so-called Aristotelean canons by which two centuries ago he was rashly tested and ignorantly condemned have passed away into scarcely deserved contempt."

....*Kellet*

MOHAMMAD ZAHURUL HASAN

## "A COLLEGE ACTIVITY"

BY

**A. S Arif Ali Shah**

*Class XII (Arts)*

About eight in the evening when we had rested after our tiresome journey, we out of the hotel and found ourselves ling in the street, exceedingly busy wel-ed and full of cars and buses. One of ompanions said " Well, I think it will be h while if we spend these lazy hours in Cinema or Opera house." All of us ed and meanwhile, as usual nine of our g Aligarions were seem moving among booths and crowds, pushing one and drag- the other out of the way.

When it was about half past eight we l ourselves at the gates of an American ra. Every body took a ticket for himself hen we were entering a friend of mine tunately happened to pass that way. I d him and asked if he wanted to see the . He answered candidly in the affirma- I gave my ticket to him and he joy- entered while I slipped to the tea-

The show began and I was busy taking tea outside and at the same time thinking some plan to see the show gratis. Sud- an idea came to my head and I was as y as anything After hastily finishing my went to the doorkeeper and said " Will please allow me to go in and see a certain eman." He was an American, and as I forgotten to say, the company had come America and had a full staff of Yankees. answered " Yes, but please return soon." nt inside and reaching the other end of w firmly seated myself among my friends old them of what had happened. They a bit puzzled at first but seeing myself collected and firm they were satisfied.

The first show is over and now the second is also ending but nobody has come either to enquire after me or to check the tickets. No, no there he is coming. Now come on let us call physiognomy to our aid and see if I can get out clean. Uncombed hair, beard like an old piece of rug about the face, nose like a signal above the rails eyes like shooting stars—now scrutinising something here then there, ears like the horn of a nineteenth century gramophone, present a picture the character of which it is impossible to make out. But the hasty steps, carelessness about the tie and the crease of the suit, reflect a sort of carelessness and of course this is the only loophole through which, I have some hope of escape. Yes, he is coming towards us. Now my friends were upset but seeing myself calm as ever selected other topics for conversation. O! I see the gentleman standing behind me. " Will you please," hearing this I moved a little and said " What sir, do you want a match but I am very sorry I don't smoke." He said earnestly " Will you please let me see your ticket," hearing this I intimated signs of fury and said " What sir. What tickets. Go to fools for tickets, I have none."

Ticket Collector. "Well then you will pay for it, I am sure."

Myself. "Man, have I not said I have no ticket, but if you insist on, I can give you a passport which I am sure will carry you out of the Opera right through."

He was partly wonderstruck at this and partly agitated and said " Sir, I want ticket and if you have none, you will have to pay. This is my duty and it can't be abandoned either by your fury or by your earnestness."

death that his fame was safely established on the continent.

The thing that endears him so much to his readers is the living and realistic colours in which he paints the characters of his play. He deals with human life as a whole with all its activities. The necessary things to appreciate him fully are not a deep knowledge of history or a thorough study of his works but a keen and clear insight into the feelings and emotions of humanity. It is absolutely essential to include his thoughts in ours and to note the marvellous coincidence. As we read his plays and become familiar with their characters, we are involuntarily urged to pronounce our judgment upon them, so simple and life-like they are. It is hardly necessary to add that from time to time Shakespeare has always attracted the attention of the thoughtful. To play the parts of Shakespeare has ever been regarded as the Crown of an Actor's part, and Shakespeare worship on the stage has been handed down to us through a chain of great actors like Batterton, Wilks, David Garrick, Kemble. Mrs. Siddons, and others.

Even at the time when Shakespeare was not fully appreciated on the stage, he was beloved of those interested in the beauties of Literature. He could extract words of praise from a puritan like Milton; he could be admired by Dr. Johnson, who had a natural aversion for actors and acting. Even during the Puritan rule when all other dramatists were neglected and theatres were closed, the works of Shakespeare were regarded to be, literary Classics.

The French critics of the time of Louis XIV who judged his plays according to the canons of poetry as laid down by Aristotle did not form a very favourable opinion of Shakespeare. They thought that his plays lacked unity and dramatic correctness and aimed less at rhetoric than at a representation of actual life. Thomas Rymer, a typical member of this school of criticism goes in favour of the poet, for, as has been said above, Shakespeare's genius lies in giving a life-like representation of actual life. The French critics seem to misunderstand the very nature of poetry and of the works of a poet's mind. A poet is not bound by anyone of the wordly conventions. He believes what he sees and gives utterance to his ideas that are the divinations of Experience. Dramatic genius cannot dispense with a capacity for widening and applying experience by intelligence and sympathy. It is the nature of man, when he meets with anything that is new and strange, to be unhappy until he has named it, and Shakespeare has given to France a cause of complaint because his mind is not small enough to be comprehended with ease. He owed everything to Nature and not to Art.

This criticism of France has utterly failed to effect the English public. John Dryden, the representative of English culture, had a profound reverence of everything connected with Shakespeare. To him he is an incomparable poet, and he recognises him to be the "largest and most comprehensive of all modern and ancient poets." Addison and Steele and all their friends had given a liberal praise to Shakespeare, and Dr. Johnson took much interest in defending him against any attack of his poetic genius. He rightly praises Shakespeare's mixture of comedy and tragedy as an example of life itself and his influence in the literary world of his day did a great deal towards establishing an undisputed supremacy of the poet and dramatist. One of his followers, Mr. Montague applied to Shakespeare's works the word 'natural.' The examination of Shakespeare's characters, now recognised as an unavoidable part of Shakespeare's criticism, really began with Morgan's Essay on Falstaff and was followed by Richardson, Mrs. Jameson, and Lady Martin down to this very day.

At the beginning of this century there arose another school of Shakespearean students who attributed a new meaning to the word 'criticism.' According to them, criticism of a poet means the revealing of his thoughts and unfolding his ideas. At the head of this group was Coleridge, who finds it "a strong instance of the fineness of Shakespeare's insight into the nature of the passions that Romeo is introduced already love-bewildered." His influence also effected Hazlitt, Lamb, and Goethe who are the beginners of the pyschological study of Shakespeare. Goethe's examination of Hamlet marks an epoch and is especially instrumental in creating a mania for the study of Shakespeare.

Coming to the more recent times we find Fleay and Dowden working in the field of

From the true seed of honour; and haw much honour
Pick'd from the chaff and ruin of the times
To be new varnish'd."

(*Merchant of Venice II, 9*)

He even goes so far as to challenge high birth and nobility of blood, and to think that money is the main vice of the world which corrupt justice and all other good qualities.

Yet he does not lay down any Utopia. He does not care to replace the Lords of his day with any new Lords of his creation. He expects nothing from people and his plays are full of his deep mistrust of the common folk. He is not in favour of universal sufferage, and would not allow any rights to the people in matters of government and state affairs.

In almost all his best productions the realities that he places before us are the heights of a single passion. They supply to us not only the facts of the play but also the real natures of the souls selected. Every soul has been selected very carefully. Passions are born and very quickly they are made to rise to their full height or to go to the greatest depths *Macbeth* from the beginning of his ambition forgets all reality of existence and his savage imagination urges him to commit any crime to bring about the fulfilment of the wicked prophecy of the witches. *Juliet* from the moment she falls in love, becomes the very embodiment of love, and when she hears of the banishment of her lover, she feels as if her father, mother, and all the world is dead. *Bassanio* is willing to sacrifice "his life itself, his wife, and all the world" to save his friend *Antonio*. He even parts with his wife's ring at his request, which he had vowed to keep with his life.

The sentiment of dream is the all-persuading element of Shakespeare's dramas. Nearly all of his important and tragic heroes find themselves suddenly suspended at the end of their sleepy wakefulness—According to *Macbeth*.

" Life's, but a walking shadow....
................ :........
.. .............it is a tale
Told by an idiot, full of sound and fury,
Signifying nothing."

(*Macbeth, V, 5.*)

Hamlet and Antonio are not fully conscious of their action, and the latter in his dream of self-reliance even goes so far as to sign the bond for a pound of flesh till he is suddenly caught by his enemy *Shylock*. The poet does not seem to care much for the world and its pleasures. His idea about this world is best illustrated by the lines

" All the world's a stage—
And all the men and women merely players,
They have their exits and their entrances.
And one man in his time plays many parts,
His acts being seven ages."

(*As You Like It, II, 7*)

He has a compassion for human sufferings and yet seeks enjoyment out of them. He can find "books in the running brooks, sermons in stones, and good in every thing." Jaques and Prospero are but living selves of Shakespeare, and through their mouth he gives expression to his feelings of melancholy which he regards to be but another form of joy. He seeks to find happiness through his own full spirit and in spite of every misery of the world, overthrows law and custom and dominates over time which he thinks to be the chief actor in human life.

## Shakespeare's Place in Literature

The age in which Shakespeare lived was too near to appreciate him fully. The people of his time only regarded him to be a successful member of the Actor-dramatist class and the critics of the day tell us only that he was a "handsome well shaped man, very good company, and of a very ready and pleasant smooth wit." The class to which he belonged was greatly despised, and it was not till the appearance of his Folio Edition in 1623 that his writings appealed to the great variety of readers. From that time onwards his fame steadily increased. Ben Johnson spoke of him as "some of the age, the applause, the delight, the wonder of our stage," and Milton considered him to be the writer of a "Marvellous book." The great mass of common readers however failed to appreciate him fully, and it was about two centuries after his

In one of his sonnets he expresses this disgust with life and speaks of

> " ......right perfection wrongfully disgraced
> And strength by limping sway disabled,
> And art made tongue-tied by authority."

The last line is of course notable. Yet Shakespeare managed to achieve success by virtue of his manifold qualities. He was rightly dissatisfied with the over-imperiousness, pseudo-refinement, and corruption of English nobility and he could not check himself from giving expression to it by a knack peculiar to himself. He confides his ideas to only two sorts of persons, each one placed on the two ends of human life. The persons of his plays who fling such criticism on the audience are either too high—so high that they can break through the barriers of life and existence—or they are so low as can tell any thing or every thing because no one counts for them. The persons to be placed in the first category are kings and heroes, men at the height of fortune or at the verge of death, who by virtue of their position and situation dare to see things to the last hour as they like. The feeble king *Henry VI* and the wanton *Cleopatra*, from the threshold of death judge with calmness the illusions of human things to which they had fallen dupes. The furious *Macbeth* perceives in his struggle a tragic end of all human ambitions. Many other examples of the type can be found in Shakespeare.

In the second category may be placed the fools, clowns, and others of the personal attendants of the noblemen so commonly found in his plays. They are quite free to say anything they like inasmuch as people think that they are only buffoons who entertain the audience with their vulgar talk and deformed jestures. The trick of Shakespeare in utilising such fools is best expressed by the melancholy *Jaques* when he says, "Invest me in my motley; give me leave to speak my mind and I will through and through cleanse the foul body of the infected world." People laugh and seem to think that the fool is not responsible for what he says, but the fact is to be seriously doubted. Shakespeare utilises his fools merely to create a free air by penetrating little into the despotism of the courts of his time. The slaves of *Coriolanus*, the clown of Winter's Tale, and the fantastical Spaniard of *Love's Labour Lost* are nothing but carricatures of Elizabethan absurdities. A little further we find the enormous *Falstaff* permitted to say what he likes, utilising his permission to speak out the vices and truths of those considered to be the "pillars of society." Even the princely *Hamlet* plays the role of a mad man to achieve the same.

The supreme vice that Shakespeare always attacks is hypocrisy. In all ages of civilization there is not a single vice which has been completely discovered, and hypocrisy is ever utilised as a garb to conceal it. But the greatest poets have ever found this vice to be their greatest enemy, and Shakespeare does not give it the least concession. In almost all his plays figures of hypocrites appear and are designed in a clear relief. "There is the "Honest I ago" enjoying the troubles of his victims; there is the queen of Cymbeline pretending to study medicine and yet divising poison; and then there are the figures of Henry VIII and Wolsey smiling at one another and yet hiding their malice in their hearts.

Although living in an aristocratic society, depending upon Lords and Dukes, and attached to the Court, Shakespeare cherishes and gives expression to a deep love for the common people and the poor peasants, so mercilessly disdained by political pretenders of the day. He almost feels that "the age is grown so wicked that the toe of the peasant comes so near the heel of the courtier." He is quite indifferent to titles and dignities and wishes that if,

> "........estates, degrees, and offices
> Were not derived corruptly, and that clear honour
> Were purchas'd by the merit of the wearer
> How many then should cover that stand bare;
> How many be commanded that command;
> How much low peasantry would be glean'd

that remain will serve. Shansab, after whom the dynasty is named accepted Islam at the hands of the Fourth Caliph, Hazrat Ali, who bestowed a standard and a covenant on him and to that covenant every prince had to subscribe before ascending the throne. The incident naturally drew the sympathy of the Ghorians to the Family of the Prophet, they refrained from cursing Hazrat Ali; and his sons, which was the custom of the Muslim world during the reign of the Omayyad, and, later on, when Abu Muslim raised the standard of revolt in Khorasan, Amir Faulad Shansabi marched to his help with all the forces of his territory. The reign of Harun-ur Rashid was marked by a struggle for power between the Sansabanian and Sheshanian clans of Mayandish, which may, or may not, have existed in the Eighth century but certainly existed in the eleventh. But the good sense of both parties decided to prefer the arbitration of the Caliph to the arbitration of the sword and a veritable storm, though only in a tea cup, was happily prevented. Shis, the Sheshanian, and Banji the Shansabanian candidate both started for Bagdad to plead their cause before Harun-ur-Rashid. At this stage a Jewish merchant intervened in the interest of his community and his shrewdness secured the success of the Shansabanian candidate. "It is said that there was a Jewish merchant in the country, i.e., a follower of the Prophet Moses, on whom be peace? He had travelled extensively and was experienced in the affairs of the world. He had visited the capitals of the neighbouring kingdoms and was well acquainted with the customs of the Caliph's court. Now this merchant had a great affection for Banji and on discovering the object of Banji's journey, he asked. 'If I teach you politeness and good manners and train you in the etiquette of the courts of kings and caliphs, so that the principality of Ghor is allotted to you, will you, on your part, permit me to establish colonies of the Israelities in whatever part of your dominion I may desire and promise them protection under your authority and the authority of your successors?' Banji replied in the affirmative. The Jew instructed him in the ceremonies of the Caliph's court and provided him with court-dress, horse and arms. His rival, Shis knew nothing of this; and while Banji reached Bagdad with the pomp of a prince, Shis reached the Caliph's court in the simple, homely dress of Ghor. They explained their case to the Wazir and were granted an audiance by Harun-ur-Rashid. Now Banji had not only been trained in polite manners but was also good to look at. 'He is a gentleman,' the Caliph said, 'and should be assigned the government of Ghor. The Command of the army may be given to Shis.' Both claimants returned with the Caliph's orders to Ghor. Ever since then the government (imarat) of Ghor has been in the hands of the Shansabanian while the Shesanians have commanded the army. All the Sultans of Ghor belonged to the Shansabania clan while generals like Moiduddin Fatih Kirmakh, Abul Abbas and Sulaiman were Shisanians."

*(To be continued)*

## SHAKESPEARE AND HIS DRAMAS

*(Continued from October [illegible])*

It has been customary with the world to peep into every thing and to find out the truth contained therein. People in all ages have in truth and the intellectual superiority of every art is best judged by the same. This element is all the more essential in the case of dramas where the dramatist has to speak to others through others and to spread his passions, emotions, and conventions among a number of persons all of whom go to make-up the story.

Shakespeare has been recognised to be the greatest dramatist of England. and the fact is established by the true and effective way in which he expresses his ideas at all places in his dramas. True, he lived at a time when he had to care much for the criticism of the society. A man in those days could think as much as he liked, but when he was exposed to public criticism the task became difficult, Shakespeare knew quite well that his success as a dramatist depended merely on the approval and the support of the people, and the fact disgusted him greatly in the beginning.

raged; some thing like tolerance was extended to men of secular learning ; and a modest allowance was granted to some poets who certainly did not write better than they were paid for. Still the erst—while unknown Turkish chiefs of Mayandish were to conquer the Empire of the Seljuqs and become partners of the Commander of the Faithful. It was the first duty of their Court poets to provide them with a respectable parentage. This Fakhruddin Mubarak Marwarrudi, author of the extinct 'Nibat Namah' and his colleagues proceeded to do.

Their first duty was to discover a sort of 'first ancestor' for the royal dynasty as well as its loyal subjects—a man notorious, if not respectable—to whom the long genealogical table might be firmly attached. It was a difficult task, for all well-known heroes—Alexander of Macedon, Gurshasp, Bahman, the Sassanian Emperors—had prior, if not better, claimants. Only one of the many first rate figures created by Firdausi's genius still remained, unclaimed and untouched, his horrid, the dragon—king Zuhhak. Him the kings, poets and people of Ghor proceeded to appropriate for their ancestor. Originally an Assyrian divinity, who has left some faint traces in the land of his birth, Zuhhak was duly assigned by the Zorastians to the pandemonium of devils into which they threw the gods of other religions. But a worst fate was in store for him. The Persian poet, searching for a representative of the type which he intensely disliked but could not afford to despise, abhorred and yet feared decided to make Zuhhak immortal. The forgotten Assyrian god was reincarnated as Saracenic Arab. The Zuhhak of Firdausi and the Ghorians ascended the thr[illegible]y killing his father and then, Saracen tha[illegible], proceeded to conquer Jamshed, the Persian king. That India and all the 'seven climes' should be prostrate at the feet of the conqueror of Persia was inevitable. For a thousand years, less a day and a half—in fact, quite as long as the Arab danger was on the Persian border—Zuhhak governed the world with tyrranic efficiency. His power was not to be despised. He had a flute with seven holes; if any of the 'seven climes' had the territory to revolt, he simply blew into the hole which represented that region, and plagues and famines devastated the rebellious land. He had deis (demons) and magicians under the command. The great paladins of Persia, as has been their wont, obeyed them from lack of patriotism and from fear for their own skins. Mankind had hitherto lived on vegetables, fruit and wine. But Zuhhak employed the Devil (Iblis) for his cook and the latter taught him to appreciate the delicious taste of egg, fish, fowl and animal flesh. Worse than that Zuhhak having allowed the devil to kiss his shoulders there grew from them two terrible snakes, who tortured the tyrant unless they were given their dinner of fresh human brain. Every day two innocent youths were killed for the purpose. Only a national rising could break the power of the Arab tyrant. But this came at last, Kawa, a respectable old blacksmith, placed his worn out leather on a standard as the symbol of revolt and Zuhhak, deserted by his ministers, magicians and even by his concubines, was imprisoned by Faridun, the hero of the Persian national revolution, in gorge of Mount Damavand in the Elburz range. But this did not prevent the tyrant's descendants from flourishing in Ghor-Bustam, the great-grandson of the great-grandson of Zuhhak—for when a man reigns a thousand years even his remote descendants will grow to manhood before his eyes—had been viceroy of India. Faridun's armies drove him from India to Bamian, the territory south of the Oxus in which the city of Balkh grew up later, but finding that place insecure, he retreated further south till he reached the foot of the Zar Murgh mountain. In that inaccessible valley appropriately named '*Mayandish*' 'do not be afraid'—the fugitive prince determined to make a stand. The Arab tribes scattered by Zuhhak's fall collected round their sole surviving prince, and their descendants multiplied with a rapidity characteristic of the Arab race. Faridun made three attempts to dislodge him, but his own sons were murdering each other and he consented to a permanent peace.

It may have been the personality of his patron Alauddin Jahansoz—of whom more hereafter—which suggested the legend of Zuhhak to Fakhruddin Mubarak. But the rest of his work was easy. It need not be much regretted that all 'the genealogical poetry' have not survived. The specimens

# THE HON'BLE JUSTICE SIR SHAH MOHAMED SULAIMANS' MESSAGE TO THE STUDENTS OF THE INTER. COLLEGE

*Allahabad*
*14. 10. 1929*

In compliance with your desire to send you some message for the Intermediate College students, I can only say that the College occupies a unique position among the Intermediate Colleges of these Provinces and many of the disadvantages which exist elsewhere do not exist at Aligarh. The students have the benefit of the liberalising influence of a University life, and yet pay fees and incur expenses on a scale much lower than the University scale. Although in one sense the institution is a separate and distinct unit, they feel as if they are part and parcel of the Muslim University itself. In the general training, in the building up of character and in the growth and development of the right spirit, they get almost the full advantage of the University life at a considerably cheaper cost. It is my earnest wish that the students would not lose the splendid opportunity which is offered to them to enhance the reputation of their College by their devotion to study uprightness of character and distinguished careers.

S. M. SULAIMAN

# HOUSE OF SHANSAB

BY

**Prof. Mohamed Habib B.A., (Oxon) Bar-at-Law**

Secluded from the general movements of history by the inaccessibility of their mountains, the inhabitants of Ghor, the ill-defined hilly region between Ghaznin and Herat, seem to have lived from the Fall of Adam to the rise of Sultan Mahmud without exercising any appreciable influence on their neighbours and resisted, not without success, the persuasive power of civilisation and culture. "The territory of Ghor," says a historian of the thirteenth century, "is intersected by five great mountain chains and the people of Ghor maintain that they are the loftiest mountains in the world. *First*, Zar Murgh in Mayandish, at the foot of which the palace and capital of the Shansabanis was situated. Here, it is said, Simurgh had brought up Zal-i-Zar, the father of Rustam, and some inhabitants of those parts declare that some time in the sixth century of the Hijra a voice came out of the mountain saying, 'Alas: Zal-i-Zar is dead.' The *second* mountain, known as Sar Khizr, is also in the territory of Mayandish, near Takhbar. The *third*. Ashk, is the largest and loftiest mountain in Ghor and the district of Tamran is situated round about it. The *fourth* is the mountain range of Warani, which runs through the districts of Dawar and Watesht and on which the palace (qasr) of Kahwaran is situated. Roeu, famed throughout Ghor for its inaccessible height, is the *fifth* range according to some, but others give the *fifth* place to the range of Hansar, which in length, breadth and height surpasses the comprehension of man." Here indeed was a splendid land for adventure and romance where heroes princes and dwarfs could have lived and deeds of chivalry recounted in the halls of warlike princes. But either the inhabitants of Ghor were immune to poetic influences or else the performances of their poets have not been spared by the ravages of time. Towards the end of Sultan Sanjar's reign, however, the Shansabaniyah chiefs of Bamian, whose ancestors had lived for generations round the hill of Zar Murgh, rushed madly into prominence and asserted their right, by war and conquest, to be considered equal to other princes. But conquest has its dangers ; for even as the warlike chiefs of Ghor invaded foreign countries, the poets ; priests and courtiers of foreign countries invaded their land and the territory was for a time, threatened with the grave danger of becoming a centre of civilisation. The formalities of a Persian court were introduced ; religious studies were respected, if not encou-

# CONTENTS





# The Intermediate College Magazine

NOVEMBER, 1929






# انٹرمیڈیٹ کالج میگزین

## علی گڑھ

جلد (۱) دسمبر ۱۹۲۶ء شمارہ (۴۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# انٹرمیڈیٹ کالج میگزین

جلد (۱) بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۹ء نمبر (۱۲)

## فہرست مضامین

# اورنگ زیب اور اُس کی قبر

از خان بہادر شیخ عبداللہ صاحب ایم ایل سی

ہندو دنیا میں اورنگ زیب بہت ہی بدنام بادشاہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اوس نے ہندوؤں پر بہت سختی کی۔ ان کو زبردستی مسلمان بنایا۔ اون کے مندر اور بت تڑوائے۔ اور اُن کو مذہبی تعصب کی وجہ سے ایذائیں پہونچائیں۔ اب ان الزامات میں سے ہر ایک کو واقعات کی دوربین سے۔ دیکھا جاوے تو ہر معقول پسند انسان ان کو غلط اور خلاف واقعہ قرار دیگا۔ یہ کہنا کہ اورنگ زیب نے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنایا اس الزام کی تردید خود اسوقت کے اعداد و شمار سے ہوتی ہے۔ اورنگ زیب کی زندگی زیادہ تر دہلی و آگرہ و دکن میں گزری۔ دہلی و آگرہ میں اُس کا پایہ تخت تھا اور دکن میں کم و بیش ۲۴ سال تک وہ دکن کی مسلمان ریاستوں سے لڑنے کے لئے مقیم رہا۔ اب اگر اورنگ زیب اس درجہ ظالم متعصب بادشاہ ہوتا جس قدر اوسکو ظاہر کیا جاتا ہے تو ان دونوں مقامات کی آبادی آج اگر کل نہیں تو کثرت آبادی مسلمانوں کی ہوتی۔ کیونکہ اورنگ زیب جیسے خود مختار باجبروت بادشاہ کے لئے کچھ مشکل نہیں تھا کہ وہ بہت سے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان کرلیتا۔ لیکن حالت کیا ہے۔ حالت یہ ہے کہ آج کم و بیش تین صدی گزرنیکے بعد صوبہ آگرہ کی آبادی میں مسلمانوں کی نسبت قریب ۱۰ فیصدی کے ہے اور دکن کے علاقوں میں جہاں پر اورنگ زیب کے ایک عرصہ دراز تک قیام رہا تھا وہاں کی آبادی میں مسلمانوں کی ملکیت قریب ۴ فیصدی کے ہے۔ اب ان اعداد و شمار کو دیکھنے کے بعد کوئی انصاف پسند نہیں کہہ سکتا کہ اورنگ زیب نے زبردستی ہندوؤں کو مسلمان بنایا تھا۔ برخلاف اس کے قیاس قوی یہ ہے کہ اورنگ زیب نے یا کسی مسلمان بادشاہ نے کبھی کسی ہندو کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا۔ اور جو لوگ مسلمان ہوئے وہ اپنی خوشی سے اور علما اور مشائخ کے اثر سے ہوئے وہی کاگر د نواح کا علاقہ یا جنوبی پنجاب میں واقعہ ہے، یا صوبہ متحدہ کے مغربی اضلاع میں اب پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی بہ نسبت ہندوؤں کے زیادہ ہے لیکن جنوبی پنجاب میں مسلمانوں کی قلت اور ہندوؤں کی کثرت ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے کبھی کسی کے مذہب میں دست اندازی نہیں کی۔ اور

تشدد کرکے کسی مسلمان بنایا۔

دوسرا نہایت سخت الزام اورنگ زیب کے ذمہ یہ عاید کیا جاتا ہے کہ اوس نے ہندوؤں کے مندر اور بت توڑے اور مندروں کی جگہ مسجدیں تعمیر کرائیں۔ یہ الزام پہلے الزام سے بھی زیادہ بے بنیاد ہے جس کسی کا دل چاہے وہ جاکر بنارس اور گیا وغیرہ میں تیرتھوں کے بڑے بڑے مندروں کے مہنتوں کے پاس وہ اسناد اپنی آنکھ سے دیکھے جو اورنگ زیب نے اپنے زمانہ میں اوس وقت کے مہنتوں کو عطا کی تھیں اور جن کے ساتھ اوس نے اِن مندروں کو جاگیریں دی تھیں۔ اِن اسناد کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب ایک بڑا زبردست مُدبر و سیاست داں بادشاہ تھا اور اوس نے اکبر کی پالیسی کو جاری و قائم رکھا تھا۔ اور ہندوؤں کے مذہبی پیشواؤں کی عزت و احترام کی تاکید اپنے عمال کے اوپر بار بار کی تھی۔ مندروں کو توڑ کر مسجدوں کا بنانا کسی تاریخ سے ثابت نہیں البتہ ایک مسجد ضرور بجائے مندر کے بنائی گئی تھی اور وہ بنارس میں اس وقت تک موجود ہے۔ اسلامی عہد کے وقائع نگار اور تاریخ نویس کبھی کسی بات کو پوشیدہ نہیں رکھتے تھے جو واقعہ جس طور پر عمل میں آتا تھا اوس کو بعینہ اوسی طور پر لکھدیتے تھے۔ چنانچہ بنارس کے مندر کی جگہ مسجد کا تعمیر ہونا تاریخ میں لکھدیا گیا ہے اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ مندر جو اورنگ زیب کے حکم سے توڑ کر مسجد بنائی گئی تھی وہ فاحشات اور بداخلاقیوں کا اور سیاہ کاریوں کا ایک بڑا مرکز تھا اور اورنگ زیب نے پنڈوں کی بدکاریوں کو روکنے کی بار بار کوشش کی لیکن وہ باز نہیں آئے اس وجہ سے اوس نے مندر کو توڑ وانے کا حکم دیا۔ اور اوس مندر میں بیسوں تہ خانے اور حجرے برآمد ہوئے جہاں پر ہر وقت افعال شنیعہ ہوا کرتے تھے۔ اب یہ کہنا کہ اس ایک مندر کے توڑنیکی وجہ سے اورنگ زیب دنیا کے مندروں کے توڑنیکا مرتکب قرار دیا جاوے اِس کو کوئی معقول پسند تاریخ داں قبول نہیں کریگا۔

اس الزام کی دوسری شق یہ ہے کہ اورنگ زیب نے ہندوؤں کے بتوں کو توڑا اور توڑوایا اور اُنکے ناک کان کٹواکر بیکار و ناقابل پرستش بنا دیا۔ اس الزام کی اصلیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ آج کل لوگوں نے جب دیکھا کہ پُرانے بتوں کے ہاتھ، پاؤں، یا ناک کان کٹے ہوئے ہیں تو اُنھوں نے قیاس قائم کرلیا ہے کہ یہ فعل اورنگ زیب ہی کا ہوگا جو بت پرستی کا شدت سے مخالف تھا۔ بتوں کے شکستہ حال ہونے میں تو کچھ شبہ نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ آیا انسداد زمانہ کے ہاتھ سے وہ اس حالت کو پہونچے یا اورنگ زیب نے اون کو اس حالت

بہونچایا۔ میری رائے ان غاروں اور بتوں کو دیکھنے کے بعد یہ قائم ہوئی ہے کہ زیادہ زمانہ گذرنیکی وجہ سے
ب و ہوا۔ بارش وغیرہ کے اثر سے یہ بت ٹوٹ گئے ہیں۔ فی الواقع قصداً اورنگ زیب نے یا کسی مسلمان بادشاہ
نے اِن کو کبھی نہیں توڑا۔ اس رائے کے قائم کرنے کے لئے سب سے اول اسباب کا دیکھنا ضروری ہے کہ
س پتھر سے یہ بت اور اُن کے اعضا ہاتھ پاؤں ناک کان وغیرہ تراشے گئے ہیں وہ پتھر کس قسم کا ہے۔ میں نے ا
یلورا واقع ضلع اورنگ آباد و سانچی واقع ریاست بھوپال کے بتوں اور غاروں کو بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ
ن پتھر سے بت تراشے گئے ہیں وہ نہایت بھربھرا اور نرم پتھر ہے۔ وہ پتھر وہی ہے جسکو لاج ریٹون کہتے ہیں جس کی
خت میں بہت سے چونہ کی آمیزش ہوتی ہے۔ یہ پتھر خود بخود رفتہ رفتہ زائل ہونیوالا پتھر ہے۔ ایسے پتھر میں اگر
ئی نازک ناک کان یا ہاتھ پاؤں کی انگلیاں تراشے گا تو اوس کو یہ امید نہیں ہوسکتی کہ وہ زمانہ دراز تک قائم
ہینگے۔ وہ رفتہ رفتہ خود بخود گل کر گرجاوینگے جس پتھر سے یہ بت تراشے گئے ہیں وہ پتھر اپنی اصلی حالت میں بھی
ن کے قریب موجود ہیں۔ اب اُن پتھروں کو دیکھنے کے بعد کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ یہ پتھر ایک مضبوط پتھر نہیں
بلکہ کمزور پتھر ہے اس پتھر کی چٹانوں میں سے خود بخود پرت الگ ہو رہے ہیں اور چٹیں اوکھڑ رہی ہیں۔ اور
ینکڑوں جگہ بڑی بڑی چٹانوں میں شق پڑ گئے ہیں۔ اب جبکہ لاکھوں من چٹانوں کی یہ حالت ہے تو پھر کوئی کیسے
ید کرسکتا تھا کہ ہزاروں سال گذرنے کے بعد بھی بت جو ان پتھروں سے تراشے گئے ہیں وہ ویسے کے ویسے ہی قائم رہتے
ا اون کے ہاتھ پاؤں۔ ناک۔ کان میں کوئی خرابی یا شکستگی واقع نہ ہوتی۔ اس کے متعلق ایک خاص واقعہ قابل ذکر ہے
ریاست حیدرآباد میں علاوہ ایلورا کے غاروں کے ایک اور مقام پر بھی غار ہیں اور اُن میں بھی بت تراشے گئے ہیں۔
ن غاروں کے نام اجنٹا کے غار ہیں۔ یہ غار بہت پرانے غار ہیں اور زیادہ زمانہ گذرنیکی وجہ سے اسلامی سلطنت
بل ہی مٹی میں دب گئے تھے اور اسلامی زمانہ میں کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ اِس مقام پر غار ہیں اور ان غاروں
ہتے ہیں۔ اب عرصہ ۹۰ سال کا ہوا کہ یہ غار مٹی میں سے کھود کر نکالے گئے ہیں اور ان کے اندر کے حالات معلوم ہوئے
اِن میں بھی ہزاروں بت پائے گئے جن کے ناک و کان اور ہاتھ پاؤں سب ندارد۔ ایک مرتبہ ایک مرہٹہ طالبعلم
ا ایک مسلمان طالبعلم اِن غاروں کے دیکھنے کے بعد آپس میں اولجھ پڑے۔ مرہٹہ طالبعلم نے اورنگ زیب کو بہت برا
لا کہ اوس نے ان بتوں کی یہ گت بنائی ہے مسلمان طالبعلم نے اوس کا جواب دیا کہ یہ سراسر جھوٹ ہے۔ اورنگ زیب نے

کبھی بت شکنی نہیں کی۔ یہ دونوں جب آپس میں الجھ رہے تھے تو اُن کے قریب ایک فرانسیسی ماہرِ فن جو ہندوستان میں
بغرضِ تحقیقات آیا ہوا تھا وہ کھڑا ان کی باتیں سُن رہا تھا۔ جب یہ دونوں تیز تیز باتیں کرنے لگے تو اُس فرانسیسی عالم نے مرہٹہ
طالبعلم کو اپنے پاس بلایا اور اُس کو سمجھانا شروع کیا کہ اورنگ زیب پر ان بتوں کے توڑنے کا الزام عاید نہیں ہو سکتا کیونکہ
اورنگ زیب کے زمانہ میں کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس مقام پر غار ہیں اور اُن میں بُت ہیں۔ یہ غار تو اب عرصہ
۴۰ سال کا ہوا ہے کہ دریافت ہوئے ہیں اور یہ بھی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ اسلامی زمانہ میں یہ زمین کے اندر بالکل
پوشیدہ رہے ہیں۔ اب نہ معلوم مرہٹہ طالبعلم کو اس کا یقین ہوا یا نہ ہوا لیکن یہ بات قابل اطمینان ہے کہ یورپ کے محقق اس
قسم کے واقعات دیکھنے کے بعد مسلمان بادشاہوں اور بالخصوص اورنگ زیب کو اُن الزامات سے قابل بریت سمجھتے ہیں
جو الزامات متعصب پادریوں نے یا آجکل کے بعض متعصب ہندؤں نے اُن کے ذمہ عاید کئے تھے۔

اِن بتوں کے ٹوٹنے اور شکستہ حال ہونے کی ایک دوسری وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جب برہمنوں نے بُدھ مذہب
کے پیروں کو تلوار کے گھاٹ اوتار کر ہندوستان میں اونکا خاتمہ کر دیا اور یا ان کو یہاں سے نکال دیا تو پھر
جاہل لوگوں نے بدھوں کے بتوں پر ضرور ہاتھ صاف کیا ہوگا اور اُن کو ناک کان سے بوچا کر کے ناقابل پرستش
بنادیا ہوگا۔ کیونکہ جو لوگ بودھ مذہب کے اتنے مخالف تھے کہ اُنھوں نے شہروں اور دیہات میں بودھ مذہب کے
لوگوں کا قتل عام کیا وہ بودھ مذہب کے بتوں اور پرستش گاہوں کے قائم رکھنے کے کیسے روادار ہو سکتے تھے۔

تیسری وجہ اِن بتوں کی شکستہ و خستہ حالی کی یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ متواتر انقلابات سلاطین کی وجہ سے اِن
غاروں کو جن میں بت تھے ٹھگوں۔ ڈاکوؤں۔ راہزنوں نے اپنا مسکن بنا رکھا تھا اور اون میں وہ خود بھی معہ اپنے
بال بچوں کے رہتے تھے اور اپنی مویشی اور جانوروں کو بھی اون میں رکھتے تھے۔ اور کھانے پینے کا سامان اور لکڑی
کپاس اور چربی بھی وہاں رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک غار میں کہیں چربی یا کپاس کو آگ لگ گئی ہوگی جس سے غار کی چھت
بالکل سیاہ ہوگئی ہے اور اس سے پتھر چٹخ گئے ہیں۔ اِن غاروں کے فرش پتھر کے ہیں اور اون کو کھود کھود کر دھان وغیرہ
کوٹنے کے لئے اوکھلیاں بنائی گئی ہیں۔ یعنی یہ غاریں باقاعدہ طور پر انسانوں کی سکونت گاہ رہی ہونگی۔ اب جبکہ تمام
در و دیوار پر بت نصب ہوں اور وہاں پر ایسے لوگوں کی رہایش ہو جو اُن بتوں کو نہ پوجتے ہوں اور نہ ان کی عزت
کرتے ہوں اور نہ انکا قائم رکھنا ضروری سمجھتے ہوں تو ایسے لوگوں کے ہاتھوں سے اگر بُت توڑے نہ جاتے تو ایک

تعجب کی بات تھی۔

پس مذکورہ بالا وجوہات سے میں نہایت وثوق کے ساتھ اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اورنگ زیب نے یا کسی مسلمان بادشاہ نے ان بتوں کو نہیں تڑوایا۔

اب رہا یہ معاملہ کہ آیا اورنگ زیب نے ہندوؤں پر تشدد کیا اور اون سے تعصب برتا یا نہیں میں تاریخ کی شہادت سے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اورنگ زیب نے نہ کبھی کسی ہندو سے سختی کا برتاؤ کیا اور نہ وہ ایسا برتاؤ کر سکتا تھا۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ اورنگ زیب کی فتوحات اور شان و شوکت کا دارومدار بہت کچھ راجپوت راجاؤں پر تھا جو اوس کی فوج کے بڑے بڑے جرنل تھے یہ راجپوت افواج اور راجگان راجپوتانہ و بندیلکھنڈ ہمیشہ اوس کی فوج کا جزو اعظم رہے اور انھیں کی مدد سے وہ ہندوستان اور کابل میں فتوحات حاصل کرتا رہا۔ چنانچہ اورنگ آباد میں اس کے جرنل راجگان نے اپنے اپنے محلات اور بستیاں بسالی تھیں اور اورنگ زیب کے ساتھ ہی رہتے تھے اور اورنگ زیب نے دکن میں اونکو جاگیریں بھی دے رکھی تھیں جن میں سے بہت سی جاگیریں اس وقت تک ریاست حیدرآباد نے قائم رکھی ہیں اور ریاست جے پور، جودھپور اور چھا وغیرہ کے منیجر اس وقت بھی ان جاگیروں میں موجود ہیں اور محاصل وصول کرتے ہیں۔

اب جبکہ اورنگ زیب کی سپاہ اور اُس کے جرنل ہندو ہوں تو پھر کوئی معقول پسند آدمی اس بات کا قیاس نہیں کر سکتا کہ اورنگ زیب ہندوؤں کی قوم سے تعصب کا برتاؤ رکھتا تھا۔

اورنگ زیب میں چند برائیاں بھی ایسی تھیں کہ جن کی وجہ سے اوس کے ہمعصر تاریخ نویسوں نے اوس کو ملزم قرار دیا ہے اور وہ برائیاں اُس میں قدرتی تھیں اوسکی طبیعت کا تقاضہ بھی ایسا تھا کہ لوگ اور ایک بہت برگزیدہ انسان سمجھنے سے انکار کریں۔ وہ ایک نہایت خشک طبیعت کا طاسیرت انسان تھا۔ اوس کی طبیعت میں رورعایت کا مادہ بھی خدا نے نہیں رکھا تھا لیکن اوس کی طبیعت کی خشکی و سخت گیری کا جو کچھ اثر تھا وہ اوس کے گرد و پیش کے کل انسانوں پر یکساں تھا اوس میں کسی کی تمیز و تفریق نہیں تھی اور اس کا باپ اوس کے بھائی اور اُس کی اولاد سب اوس کی سخت گیری اور خشکی طبیعت کے شکار ہوئے اور اُس نے باپ کو قید کرکے اوس سے تخت چھینا اور اپنے بھائیوں کو شکست دیکر پامال کیا اون کو اور اُن کی اولاد کو قتل و غارت کیا اور اپنے بیٹے کو بھی گرفتار

کرکے قیدخانہ میں ڈالدیا۔ ان واقعات کی روشنی میں جب اوس کو اکبرِ اعظم کے مقابل میں کھڑا کیا جاتا ہے تو اُس کی عظمت میں بہت کمی واقع ہوجاتی ہے۔ لیکن باوجود ان سب قباحتوں کے جو اوس کی طبیعت کا خاصہ نہیں ہم اس رائے کے قائم کرنے پر مجبور ہیں کہ شاہجہاں کی اولاد میں اگر کوئی بیٹا تخت و تاج اکبری کی اہلیت رکھتا تھا وہ اورنگ زیب ہی تھا۔ اور یہ بات صرف چند تاریخی واقعات کے دیکھنے سے قطعی طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ اورنگ زیب کے مقابل میں شاہجہاں کا کوئی دوسرا بیٹا سلطنت کی وراثت کا مالک ہوکر اوس کا حق ادا نہیں کرسکتا تھا۔ قبل اس کے کہ اورنگ زیب کی اون خصوصیات کا چند واقعات کی سند سے تذکرہ کیا جاوے۔ جن کی وجہ سے ہم اوس کا حق وراثت تخت شاہجہانی کے لئے فائق سمجھنے پر مجبور ہیں۔ ہم سلطنت مغلیہ کی وراثت تاج و تخت کے لئے ناظرین کے سامنے اس کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ مغلیہ خاندان نے گو دُنیا بھر کو اپنا محکوم بناکر اوس پر حکومت کی لیکن اپنے گھر کا انتظام یہ خاندان کبھی نہ کرسکا۔ اور تخت کی وراثت کے لئے بغاوت۔ خانہ جنگیاں اور خونریزیاں ہوتی رہیں۔ جہانگیر نے اکبر کے خلاف بغاوت کی۔ شاہجہاں نے جہانگیر کے خلاف بغاوت کی اور اس نے سب بھائیوں اور بھتیجوں کو تلوار کی گھاٹ اوتارا اور تیموری شاہزادوں میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ اب اپنی باری اگر اورنگ زیب نے شاہجہاں کے خلاف بغاوت کرکے اور اپنے برادروں کو شکست دیکر یا دھوکا دھڑی سے گرفتار کرکے قتل کرا دیا تو یہ اس خاندان میں کوئی نئی بات نہ تھی جسکے لئے خصوصیت سے ہم اورنگ زیب ہی کو ملزم قرار دیں۔ تاہم ہم نہ شاہجہاں کے افعال کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور نہ اورنگ زیب کی ان حرکات کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ہمارے کہنے کا صرف مطلب یہ ہے کہ اورنگ زیب نے جو کچھ اس بارے میں کیا وہ صرف ایک خاندانی رسم نبھائی یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔

اب ہم اُن چند واقعات کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جن کی وجہ سے ہم اورنگ زیب کو شاہجہاں کے جملہ پسران کے مقابل میں تخت و تاج کی وراثت کا اہل سمجھتے ہیں۔ شاہجہاں کے چار بیٹے تھے اُن میں سے اورنگ زیب تو دکن کے گورنر تھے۔ مراد بخش گجرات میں گورنر تھے اور شاہ شجاع بہار و بنگال کے گورنر تھے۔ مگر دارا شکوہ جو سب میں بڑا تھا اور شاہجہاں نے اپنا ولیعہد تسلیم کرلیا تھا وہ شاہجہاں کی آخر عمر میں اکثر پایۂ تخت آگرہ میں مقیم رہتا تھا اور شاہجہاں دل سے چاہتا تھا کہ میرے بعد اسی کو تخت ملے۔ یہ شاہزادہ بہت فیاض طبع آدمی تھا اور نیک مزاج بھی تھا۔

ے

جب شاہجہاں بیمار ہوئے تو اپنے داد و دہش کے دریا بہا دیئے اور تمام فوجی افسروں اور ملکی حکام و وزرا کو اپنا جانب دار بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ مگر اوس کی طبیعت میں غفلت بھی اس درجہ تھی کہ اورنگ زیب کو دکن میں بیٹھے بیٹھے دربار کے جملہ حالات کے ایک ایک لمحہ کی خبر پہونچتی رہتی تھی مگر داراشکوہ کو اورنگ زیب کے نقل و حرکت کی اس وقت تک خبر نہوئی جب تک چارسو میل کی مسافت طے کر کے ملک مالوہ میں نہیں پہونچ گیا۔ اورنگ زیب نے اس سے روانگی کے وقت مراد بخش حاکم گجرات کو بھی جھوٹے وعدے اور غلط امیدوں کے فریب میں لاکر آگرہ کیطرف روانگی کا اشارہ کیا تھا اور وہ بھی مالوہ میں آکر اورنگ زیب سے ملگیا۔ یہاں پر اوجین کے پاس راجہ جسونت سنگھ سے جو داراشکوہ کا حامی اور شاہی جنرلوں میں سے ایک جنرل تھا اوس سے اور اورنگ زیب اور مراد بخش کی متفقہ فوج کی مڈبھیڑ ہوئی۔ جسونت سنگھ نے شکست کھائی اور وہ بھاگ کر اپنی ریاست جودھپور کی طرف چلا گیا۔ اس کے بعد داراشکوہ کے پاس اورنگ زیب اور مراد بخش کی فوج سے دوچند فوج تھی اور کل شاہی سامان و آلات حرب جو دارالخلافہ میں موجود تھے اوس کے قبضہ میں تھے۔ اورنگ زیب کو ہنوز کم و بیش ۰۰ ۳ میل کی مسافت طے کر کے آگرہ پہونچنا تھا اور درمیان میں بیسیوں پہاڑ ٹیلے اور ندی نالے حائل تھے۔ بالخصوص دریائے چنبل جو ایک نہایت گہرا دریا ہے اوس سے اوتر کر آگرہ پہونچنا کچھ آسان نہ تھا لیکن اورنگ زیب اپنی اعلیٰ سپہ سالاری و تدبیر کی وجہ سے ان تمام دقتوں و مرحلوں کو طے کر کے اور دریائے چنبل سے اوتر کر آگرہ کے قریب پہونچگیا۔ داراشکوہ نے صرف آٹھ میل کے فاصلہ پر جا کر مقابلہ کیا اور شکست کھائی اور ایک ہی شکست میں ہار مان کر بھاگ نکلا اوس کے بعد جو کچھ اوس کے ساتھ گزری اوس سے ناظرین بخوبی واقف ہونگے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اورنگ زیب کے مقابلہ میں داراشکوہ بحیثیت سپہ سالار اور اعلیٰ مدبر ہونیکے کچھ بھی حقیقت رکھتا تھا۔

ایک دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ قابل ذکر ہے جس سے اورنگ زیب کی اعلیٰ فوجی قابلیت اور مستقل مزاجی ثابت ہوتی ہے۔ اورنگ زیب جب پنجاب میں داراشکوہ کا تعاقب کر رہا تھا تو اُس کو ملتان کے مقام پر معلوم ہوا کہ شاہ شجاع پٹنہ کی طرف سے دارالخلافہ آگرہ کی طرف بڑھ رہا ہے اور اُس کے پاس کافی سپاہ اور سامان جنگ ہے وہ اورنگ زیب کی غیر حاضری میں دارالخلافہ پر قابض ہو سکتا ہے اورنگ زیب نے داراشکوہ کے تعاقب کے لئے اپنے دوسرے جنرلوں کو تعینات کیا اور خود ملتان سے آگرہ کی طرف کوچ کیا اور مہینوں کی مسافت

ہفتوں میں طے کرکے الٰہ آباد کے قریب شاہ شجاع کو جاپکڑا الٰہ آباد سے کچھ فاصلہ پر کھجوا ایک مقام ہے وہاں پر شاہ شجاع سے اورنگ زیب کی مڈبھیڑ ہوئی۔ شاہ شجاع بھی ایک بہت بڑا جری شاہزادہ اور ایک بڑے پایہ کا سپہ سالار تھا۔ اورنگ زیب کو اگر کچھ خوف تھا تو اوسی سے تھا اورنگ زیب کے فوجی افسروں میں ایک راجپوت راجہ کے ماتحت جو دہ ہزار راجپوتوں کی جمعیت تھی۔ یہ راجہ شاہ شجاع سے جا گٹھا کیونکہ اورنگ زیب نے کسی بات پر اس کو ناراض کردیا تھا اور اوس کے اور شاہ شجاع کے درمیان یہ بات قرار پائی کہ وہ رات کو آدھی رات کے گذر کے بعد میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ جاوے گا اور اوس کے میدان جنگ چھوڑنیکی وجہ سے کل فوج میں ابتری پیدا ہو جاویگی اور اگر ایسے وقت میں شاہ شجاع حملہ کریگا تو اوس کو فتح نصیب ہوگی اور اورنگ زیب کو شکست ہوگی۔ چنانچہ آدھی رات کے گذرنے کے بعد راجہ صاحب مذکور معہ اپنی جمعیت کے میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ نکلے اور اوس کے بھاگنے کی وجہ سے تمام فوج میں سخت ابتری پیدا ہوئی۔ اورنگ زیب کے کل فوجی افسروں نے آکر اُس کا خیمہ گھیر لیا کہ اوس سے حکم حاصل کریں کہ کیا کرنا چاہیے۔ اوس وقت اورنگ زیب تہجد کی نماز پڑھ رہا تھا۔ چاروں طرف ایک قیامت کا شور برپا تھا۔ لیکن وہ شخص برابر نماز پڑھے گیا۔ جب غلاموں نے جاکر عرض کیا کہ کل فوجی افسر باہر کھڑے ہیں تو اشارہ سے اُن سے کہدیا کہ کہ باہر چلے جاؤ اور نماز ختم کرکے باہر نکلا اور حالات دریافت کرنے کے بعد سب سے کہا کہ ہاتھ اٹھاکر خدا سے دعا مانگو کہ یہ نالایق راجہ لڑائی سے پہلے ہی بھاگ گیا اگر عین لڑائی کے وقت بھاگتا تو ہماری کیا حالت ہوتی۔ اورنگ زیب کی اس مستقل مزاجی کو دیکھکر سب کی ہمت بندھ گئی اور سب نے اپنی اپنی جگہ پر قائم و مستقل کردیا اور صبح ہوتے ہی لڑائی ہوئی۔ شاہ شجاع کو شکست ہوئی وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا اور اوسیوقت سے اورنگ زیب بلا شرکت غیرے تخت اکبری کا مالک ہو گیا۔ ان مثالوں کے علاوہ اور بھی متعدد مثالیں ایسی ہیں جن کے دیکھتے ہوئے ہم اورنگ زیب کے حق میں فتویٰ دینے پر مجبور ہیں۔

اورنگ زیب کا انتقال بمقام احمد نگر ہوا تھا جو اورنگ آباد سے کم و بیش ۷۰ میل کے فاصلہ پر ہے اوس کی وصیت کے موافق وہ خلد آباد میں لاکر دفن کیا گیا تھا۔ خلد آباد اورنگ آباد سے ۱۴ میل کے فاصلہ پر اور دولت آباد سے ۴ میل کے فاصلہ پر ہے۔ دولت آباد وہی مقام ہے جس کو ہندوؤں کے عہد میں دیوگری کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور جس کو محمد شاہ تغلق نے دہلی کے بجائے اپنا دارالخلافہ قرار دیکر تمام دہلی کے باشندوں کو حکم دیا کہ وہ وہاں

جا کر آباد ہوں۔ دولت آباد کا قلعہ جو دُنیا میں ایک عجیب و غریب قلعہ ہے اس وقت تک موجود ہے۔ دولت آباد سے پہاڑی راستہ سے ۴ میل کے فاصلہ پر خلد آباد ہے اور وہاں پر ایک بزرگ سید زین الدین کے مزار کے متصل اورنگ زیب کی قبر ہے۔ مجھکو خلد آباد کی وجہ تسمیہ ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں ہوئی کہ آیا اُن بزرگوں کے مزار کے وجہ سے جو اورنگ زیب سے قبل یہاں دفن ہو چکے تھے اس مقام کو یہ مقدس نام عطا ہوا۔ یا اورنگ زیب کے دفن ہونیکی وجہ سے۔ کچھ تعجب نہیں کہ اورنگ زیب کے دفن ہونیکی وجہ سے اوس کا نام خلد آباد رکھا گیا ہو کیونکہ مغلیہ خاندان کے وقائع نگاروں و تاریخ نویسوں نے اورنگ زیب کو اُس کی وفات کے بعد خلد مقام کا خطاب دیا تھا۔ اورنگ زیب کی قبر اوس کی وصیت کے مطابق ہمیشہ کچی رہی۔ لیکن اب ۴ سال سے اوس کے گرد ایک سنگ مرمر کی چھوٹی سی چار دیواری بنائی گئی ہے اور قبر کا تعویذ بھی سنگ مرمر کا ہے۔ گو اوپر سے بالکل کچی ہے اور اُس پر گھاس اُگ رہی ہے۔ مجھے اورنگ زیب کی زندگی کے حالات پڑھنے کے بعد سخت تعجب ہوا کہ اُس نے ایک بزرگ صوفی کی قبر کے پاس اپنا دفن ہونا کیسے پسند کیا۔ اورنگ زیب کو صوفیاء اور مشائخ سے کچھ زیادہ اعتقاد نہ تھا۔ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ اخیر وقت میں اوس کو یہی بہتر معلوم ہوا کہ وہ کسی فقیر کے پڑوس میں جا کر سو جائے۔

ریاست حیدر آباد نے اورنگ زیب کی قبر کا بہت احترام کیا ہے۔ وہاں پر اس وقت تک حفاظ قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں اور محافظ و چوبدار ہر وقت کھڑے رہتے ہیں۔ یہ عزت یقیناً اس وجہ سے کی گئی ہے کہ ریاست حیدر آباد مغلیہ سلطنت کا ایک صوبہ تھا اور اس ریاست میں ایک جلیل القدر مغلیہ بادشاہ کا دفن ہونا خود ریاست کے لئے ایک فخر کا باعث سمجھا گیا ہوگا۔ گو اکبر۔ شاہجہاں۔ اور جہانگیر کے مقبرے اس وقت سلطنت انگلشیہ نے اپنی حفاظت میں لے لئے ہیں اور اون کی مرمت و صفائی و آراستگی باغات پر ہزار ہا روپیہ ہر سال صرف ہوتا ہے۔ لیکن سلطنت انگلشیہ کی یہ توجہ خوبصورت عمارات کی وجہ سے اِدھر مبذول ہوئی ہے نہ کہ مدفون بادشاہوں کی عزت کی وجہ سے۔ برخلاف اس کے اورنگ آباد میں مدفون بادشاہ کی یادگار میں اوس کی قبر کی عزت کی جاتی ہے۔

موضع خلد آباد ایک چھوٹا سا موضع ہے جس میں خُدام کی آبادی ہے۔ یہ خدام اُن مختلف مزاروں سے تعلق رکھتے ہیں جو مزار یہاں پر بعض مشائخ اور بزرگان دین کے قائم ہیں۔ لیکن ان خدام کی اپنی اصلی حالت نہایت قابل افسوس ہے۔ یہ لوگ نہایت کاہل الوجود لوگ ہیں اور مفت خوری نے اِن کے عادات و اطوار پر بہت ہی بُرا اثر ڈالا ہے۔ جب ہم

خلد آباد سے ایلورا کی پہاڑیوں کی سیر کے لئے گئے تو وہاں پر غاروں میں ان لوگوں کو گاتے بجاتے دیکھا۔ اوپر
میں سید زین الدین صاحب کے عرس کا موقع تھا اور سُنا ہے کہ عرس سے دو تین روز قبل یہ لوگ ایلورا کے غار
میں جا کر گاتے بجاتے ہیں اور کھانے پکا کر کھاتے ہیں۔ گھنے درختوں کے نیچے انہیں کھانا پکاتے دیکھا۔ اون کی
کوئی دو ہزار اشخاص کے قریب ہے۔ اگر ان کو کسی محنت و مزدوری میں لگایا جاوے تو یہ مفید افراد کا شعبہ ثابت
ہیں۔ مگر اب تو دوسروں کی کمائی میں سے حصہ بٹوانے کی امید میں زندہ ہیں۔

چونکہ اورنگ زیب کے بارے میں غلط خیالات متعصب پادریوں نے اور آریہ سماجیوں نے بہت پھیلا
ہیں اور خود مسلمان تعلیم یافتہ نوجوان بھی اس شخص کے نام سے نفرت کر رہے ہیں۔ اس لئے میں نے تاریخ دیکھنے کے
یہ چند سطور حوالہ قلم کئے ہیں تاکہ کم از کم ہمارے مسلمان نوجوان اس شخص سے بے انصافی نہ کریں اور جس تعریف
کا وہ مستحق ہے اُس سے زیادہ اُس کے سر نہ الزامات تھوپے جاویں اور نہ اوس کو بلا وجہ اسلام کا ہیرو قرار دیا
وہ ایک قابل بادشاہ تھا لیکن اسلام کا ہیرو ہونے کی اس میں کوئی خصوصیت نہ تھی۔

# شمع سے

از محترمہ جمال صاحبہ بریلوی

عشق کی دنیا لرزتی ہے ترے پیغام سے ‏ ‏ ‏ منزل ویراں ہے روشن روئے شعلہ فام سے
ہے ترا آغاز خونی تر ترے انجام سے ‏ ‏ ‏ بجلیٔ الفت مسکرا پڑتی ہے تیرے نام سے

محشر جذبات تیری چشم کافوری میں ہے
بحر محسوسات تیرے جلوۂ نوری میں ہے

نالۂ خاموش ہے تیرا رباب زندگی ‏ ‏ ‏ سوزشِ جذبات ہے تیرا شباب زندگی
شعلۂ آتش چکاں ہے تیرا خواب زندگی ‏ ‏ ‏ عالم اسرار میں تو ہے حجاب زندگی

حسن پنہاں ہے ترے ہنگامہ خاموش میں
عشق عریاں ہے جنوں آرا تری آغوش میں

سوز الفت سے مرکب تیرا ساز زندگی ‏ ‏ ‏ آتش خاموش ہے عشرت نواز زندگی
کاہش پنہاں ہے یکسر تیرا راز زندگی ‏ ‏ ‏ ہے کلیم منظر تیرا نیاز زندگی

حسن لرزے لے رہا ہے تیری بزم ناز میں
عشق تسکین پا رہا ہے عیسوی اعجاز میں

صبح جنت یعنی تیرے جلوۂ روشن میں ہے ‏ ‏ ‏ تجھ سے ایمن ہے کہ تو ہی جلوۂ ایمن میں ہے
کوئی کافر منہ چھپائے تیرے پیراہن میں ہے ‏ ‏ ‏ تیرا حسن نازنین اک آتشیں دامن میں ہے

حسرت پنہاں ہے تیرے نغمۂ تاہیدہ میں
آہ حسرت زا ہے تیرے جذبۂ کاہیدہ میں

عالم رنگیں ہے تو ہے "نغمۂ ساز حیات" ترے شعلوں میں نہاں ہے "جلوۂ ناز حیات"
تیرے نالے میں پیامِ "شعلہ پروازِ حیات" ہے تیرا انجام مبہم راز "آغاز حیات"

تیرا جذبِ منتشر آہ شرر پرواز ہے
تیری کاہش آرزوئے بزم کا فرساز ہے

محشر ایمن ہے یعنی تیری چشم کافری برق آتش زار ہے تیرا یہ حسن آذری
نکہت فردوس ہے تیری یہ زلف عنبری "بادہ عرفان" ہے ؟ یعنی تیرا رُوئے احمری"

تیرا حُسن منتشر گویا ہے پیغام الست
تیری موسیقی ہے نازِ سازِ الہام الست

تیرے ہونٹوں کی خموشی سے برستے ہیں شرار پرتو جذبات ہے حسن فضائے لالہ زار
سوز دل کو مرتعش کرتی ہے جب بادِ بہار کانپ اٹھتی ہے تری چینِ جبیں شعلہ بار

یہ سیاہی رات کی یہ "شبنمی تاروں کا نور
اور یہ تیری نگاہ نغمۂ خاموش طور

بزم کی خاموشیوں میں تو ہے پیغام جنوں رات کی ویرانیوں میں تو ہے الہام جنوں
تیری زلف منتشر ہے غربت شام جنوں تیری آہ شعلہ زا ہے شعلہ آشام جنوں

تیری بربط میں بھرے ہیں نغمۂ آتش فروش
تیرے نغموں میں چھپے ہے مری آہوں کے خروش

اے جمالِ نازنیں بھی کاہشِ جذبات ہوں　　اِن اندھیرے جنگلوں میں بستۂ ظلمات ہوں
وادیٔ غمناک میں خاموشیٔ نغمات ہوں　　حسرتِ شبنم سے آلودہ اندھیری رات ہوں

سوز تیرا مرتعش میرے دلِ پرغم میں ہے
نغمۂ آتش چکاں تیرا مرے ماتم میں ہے

آ۔ کہ تجھ میں جذب ہوکر میں بنوں جذباتِ نوش　　آ۔ کہ تیری مستیاں ہیں میری مخموری کا جوش
آ۔ کہ تیرے زمزمے ہیں۔ میری ہستی کا خروش　　آ۔ کہ تجھ میں میرے نالے ہیں تجلیات پوش

تیرے نغموں میں فنا ہے وحشتِ رازِ حیات
تیری آہوں میں نہاں ہے نغمہ سازِ حیات

دونوں ملکر جل بجھیں افسانہ خاموش میں　　دونوں باہم خاک ہوجائیں شرار جوش میں
دونوں خاکستر ہوں آتش خانۂ غم نوش میں　　پھونک دیں ہستی کو؟ یعنی الفتِ مدہوش میں

آگ جو تجھ میں ہے وہ میرے دلِ غمگیں میں ہے
لاگ جو تجھ میں ہے میری آہ آتش بیں میں ہے

جب تخیل آسماں کا منتشر ہوجائیگا　　جب ستارہ صبح کا ذوقِ نظر ہوجائیگا
روئے پژمردہ کسی کا جب قمر ہوجائیگا　　قطرۂ شبنم "چمن زارِ سحر" ہوجائیگا

اُس گھڑی حسرت فزا یہ منظرِ غمناک ہو
شمع خاکستر ہو یعنی؟ اور حبالہ خاک ہو

---

# وقتے خوش گزرے

پہاڑی ندی کے کنارے آبشار کے نزدیک بیٹھا ہوا احمد ڈوبتے ہوئے سورج اور رنگین بادلوں کے نظارے میں محو تھا۔ پانی کے گرنے کے علاوہ اور کوئی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ دور افق پر کوے قطار باندھے جا تے اڑتے نظر آتے تھے۔ یہی کوے جنھیں ہر انسان حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اس وقت سنہری بادلوں میں نگینوں کا کام دیکر قدرت کی خوبصورتی کو دوبالا کر رہے تھے۔

آبشار کے متواتر گرنے سے ایک حوض بن گیا تھا۔ جو شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں بہت گہرا اور ڈراونا معلوم ہوتا تھا۔ چاروں طرف کے پتھر پانی کے بہنے سے چکنے ہو گئے تھے۔ اور ان پتھروں کے بیچ میں کئی قسم کی بیلیں نکلی ہوئی تھیں کسی کسی جگہ ہنسراج کے جھنڈ بھی اُگے ہوئے تھے۔ جن کے عکس بہتے پانی میں عجیب عجیب شکلیں بنا رہے تھے۔ احمد اسقدر محو ہو چکا تھا کہ اسے رات ہو جانے کی بھی خبر نہ ہوئی۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ سردی لگ رہی ہے۔ سر پر ہاتھ پھیرا تو سر بھیگا ہوا تھا۔ کپڑوں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی شرابور تھے۔ آبشار سے جو چھینٹیں اڑ رہی تھیں وہ دور دور تک جاتی تھیں جن پر احمد نے اپنے عالم محویت میں غور نہ کیا تھا۔ وہ واپس جانے کے ارادے سے اٹھا مگر اس نے محسوس کیا کہ زیادہ دیر تک بھیگے رہنے سے اس کا سر چکرا رہا تھا اس نے دونوں ہاتھ کنپٹی پر رکھتے ہوئے آگے قدم اٹھایا لیکن دفعتاً اس کا پیر ان چکنے پتھروں پر پھسلا اور وہ حوض میں جا پڑا۔ پانی بڑے زور سے چکر کھا رہا تھا بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ تیرنا بھی معمولی سا آتا تھا۔ مگر اس نے ہمت باندھ کر اور دانت بھینچکر ہاتھ پاؤں چلانے شروع کئے...... اس کا دم قریب قریب ٹوٹ چکا تھا۔ ہاتھ پاؤں شل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ کہ اس کا ہاتھ کنارے کے پتھروں پر پڑا چکنے پتھروں میں کوئی جگہ ہاتھ سے پکڑنے کو نہ تھی۔ اور جس جھاڑی کو وہ پکڑتا تھا۔ پانی کے زور سے اکھڑ جاتی تھی........ پانی نے اسے پھر قبضہ میں لے لیا۔ اور بھنور میں گھمانا شروع کیا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ ڈوب رہا ہے تو دونوں مٹھیاں زور سے بند کر کے کسی خیالی چیز کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور آخر مرتبہ بڑا سانس لیکر زور سے

"ارے میں ڈوبا! دوڑو! ارے میں ڈوبا!"..................بھنور نے اس کو نیچے لیا........

.............................................................

"جنید اٹھو! جنید! دیکھو تو احمد کو کیا ہوگیا" جنید گھبرا کر اٹھ بیٹھا اتنے میں اسلام اور حامد بھی جاگ پڑے غرض ں بارک میں ایک شور مچ گیا۔ احمد پلنگ پر کھڑا ہوا تھا دونوں مٹھیاں بند تھیں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے ۔ آنکھیں بند تھیں اور زور زور سے چیخ رہا تھا۔

"ارے میں ڈوبا! دوڑو! ارے دوڑو!" ہم لوگ پریشان تھے کہ احمد کو کیا ہوگیا اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ریں کہ اتنے میں احمد پلنگ پر سے نیچے گرنے لگا مگر حامد نے جست کر کے اس کو گرتے گرتے بچا لیا ہم سب نے مد کو پلنگ پر لٹایا۔ احمد کے کپڑے اور پلنگ پانی سے سب تر بتر تھے بستر پر ٹوٹے ہوئے گھڑے کے ٹکڑے ے تھے۔ تب سارا قصہ سمجھ میں آیا سوتے میں بیچارے پر کسی نے ایکٹیوٹی [illegible] کی تھی۔ اور پانی کا گھڑا دیا تھا۔ یہ تھا سارا قصہ جس کو اس کے دماغ نے فوراً ایک ڈراؤنی خواب کی شکل میں تبدیل کر دیا تھا۔

---

# علی گڑھ کی یاد

از مظہر عزیز صاحب علیگ

"تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را"
"گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را"

کونسی تجھ میں کشش ہے اے حصارِ مرتضےٰ | ذرہ ذرہ سرزمیں کا تیری دل ہے کھینچتا
تیرے میدانوں میں کوسوں تک نہیں آب و گیاہ | ریگ زاروں میں ترے کوئی نہیں جائے پناہ
تجھ میں مفقود جتنے عیش کے سامان ہیں | سرزمیں پر تیری آتے خاک کے طوفان ہیں
تھیٹر و نکا یا سینما کا نشاں تجھ میں نہیں | اور شہروں کی طرح دلچسپیاں تجھ میں نہیں
چشمِ بینا پر مگر ظاہر تری ہر آن ہے | تیری ہر اک سادگی میں اک نرالی شان ہے

موسم گرما میں گو تو اک جہنم زار ہے
میری نظروں میں مگر فردوس کا گلزار ہے

سرد وہ راتیں تری ہوتی تھیں کتنی خوشگوار | گلشن کالج پہ چھایا جبکہ تھا ابر بہار
ہائے سیمیں چاندنی میں خوابِ شیریں کے مزے | گونجتے تھے ہوسٹل میں دوستو کے قہقہے
جھانکتا تھا صبح کو خاور سے جب دم آفتاب | عالمِ جذبات میں ہوتا تھا پیدا اضطراب
روح آتی تھی نظر مجھکو ہر ایک شے میں نئی | پاس آتی تھی نہ میرے بھول کر افسردگی
صبح اب ہوتی ہے پر وہ کیفیت باقی نہیں | مے نہیں بادل نہیں ساغر نہیں ساقی نہیں
ہائے میدانوں میں وہ آہو کا بے پروا خرام | دیکھنا فطرت کے وہ رنگیں مناظر صبح و شام

گردشِ ایام بتلا! وہ سماں اب کیا ہوا
قلزمِ تنسیخ میں طوفان تھا جب آیا ہوا

شورؔ کی رنگیں نوائی ہائے وہ فردوسِ گوش　　وہ تلطف وہ عنایت وہ خلوصِ گرمجوش
وہ عمادی اور قاسمؔ کا خلوص بے ریا　　وہ نیازؔ خوش بیاں، وہ پیکرِ حلم و وفا
حضرتِ عارفؔ سے اپنی عارفانہ گفتگو　　تذکرے جنت کے کرنا اور کسی کی جستجو
خواجہ حامدؔ اور مشرفؔ کی وہ ہر زندہ دلی　　بخشتی تھی روح کو ہر روز جو اک تازگی
یونسؔ کی ہے سیاسی گفتگو خواب و خیال　　وہ حسنؔ سے دوستانہ جنگ وہ رنج و ملال

آہ! وہ ایام جب میں اس طرح تنہا نہ تھا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

میری نظروں میں ہیں "سوئمنگ باتھ" کو وہ جمگھٹے　　ہائے وہ بےفکر گھڑیاں وہ خوشی وہ چہچہے
وہ ہوائیں ٹھنڈی ٹھنڈی "لان" کا وہ سبزہ زار　　دیکھنا وہ برج پر سے روز "ٹینس" کی بہار
شکل حیدرؔ کی نگاہوں سے نہیں ہٹتی کبھی　　وہ تبسم لب پہ اُس کے اور وہ سنجیدگی
مرتضیٰؔ کی خوش مزاجی اور ظرافت یاد ہے　　اور اظہرؔ کی ہر اک مہر و عنایت یاد ہے
اظہرؔ خوش خو وہ یعنی مظہرِ صدق و صفا　　جس کو "اخلاقِ مجسم" گر کہوں تو ہے بجا
آہ! میں ناشاد اب ان سب کو سوچ رہا ہوں　　کیا کروں مجبور ہوں مجبور ہوں۔ رنجور ہوں

اے علی گڑھ یاد ہے، مجھکو ابھی تو یاد ہے۔
یہ دلِ برباد تیری یاد سے آباد ہے

# وعدۂ ماہتاب

(از سید محمد عارف صاحب فاطمی ملیح آبادی)

(۱)

اے چاند شب کو اپنا جلوہ دکھانے والے — اے راہِ آسماں پر چکر لگانے والے

تو صدرِ بزمِ انجم، تو زینتِ جہاں ہے — تو شانِ دستِ قدرت، تو شمعِ آسماں ہے

فطرت کے سارے منظر ہیں ضو سے تیری روشن — صحرا و دشت و دریا، وادی و کوہ و گلشن

جلوے سے چاک تیرے پیراہنِ کتاں ہے — رنگت سے ماند تیری حُسنِ رخِ بتاں ہے

تمثیرِ نکایا تسیناکا لستاں بھی تجھ پہ صدقے یہ آسماں یہ اختر — بے وجہ شب میں ہرگز ان کے نہیں یہ چکر

چشمِ بینا پر گر ظاہر تری ہر آن جہاں ہے — تو ناز ہے زمیں کا، تو فخرِ آسماں ہے

موسیٰ تھا پہ تیری شیدا — یہ جزر و مد نہیں ہے، عالم ہے بیخودی کا

(۲)

سرد وہ راتیں تو یہ دل کی آرزو ہے — اُس کا نشاں بتاتا، جس گُل کی جستجو ہے

ہا سینے میں تیرے بھی ہیں، کچھ داغ سے ہویدا — میری طرح سے تو بھی، کیا ہے کسی کا کُشتا

مرغوب تجھکو تنہا، ہے سیر آسماں کی — اُس کے سوا مجھے بھی پروا نہیں جہاں کی

دونوں کے دل میں یکساں اک ہی آرزو ہے — میں محوِ جستجو ہوں تو محوِ جستجو ہے

تو ہے انیس میرا، میں ہوں انیس تیرا — میں ہمصفیر تیرا، تو ہمصفیر میرا

آ آج تو اُتر آ، باہم اک لمحہ گفتگو ہو — پہلے ہو ذکر اُس کا پھر اُس کی جستجو ہو

(۳)

ابرِ سیہ کی اُس نے رُخ پر نقاب ڈالی — یا روئے ماہوش پہ زلفیں تھیں کالی کالی

وادی و کوہ و گلشن، میدان و دشت و دریا — نظروں سے سب تھے اوجھل، تاریک سا جہاں تھا

اِس بیرخی کو اُس کی اور خامشی کو دیکھا ——— بیساختہ یکایک پھر یہ زباں سے نکلا
"خاموشی سے ہے ظاہر، سنتا نہیں گویا ——— کیوں چپ ہے اس طرح سے اے خاموشی کے گویا!
مانا کہ خامشی ہے، آئین بزم الفت ——— میری بھی ہے یہ عادت تیری بھی ہے یہ خصلت
لیکن سروں میں سودا، دونوں کو ہے کسی کا ——— مارا ہے جس نے تجھکو کشتہ ہوں میں اسی کا
تجھکو ہے صرف مطلب، خاموشی زباں سے ——— لیتا ہوں کام میں تو، آہِ شرر فشاں سے"

(۴)

اِس گفتگو کو سُنکر، کچھ چاند مُسکرایا ——— گیسو نے ابر اپنے، رُخ سے ذرا ہٹایا
دوڑی تجلی ہر سو، کالی گھٹا سے چمکا ——— تاریکی جہاں پر، پھر نور اُس کا دوڑا
اک آہ سرد کھینچی، اور یوں ہوا مخاطب ——— "اے کشتۂ محبت، اے گفتگو کے طالب"
"انساں میں نہیں ہوں، تجھکو خبر نہیں کیا ——— بیدرد و بے مروت ہوتے ہیں جن میں صدہا"
"رکھتا ہوں درد دل میں، اور چشم میں مروّت ——— غیروں کی بیکسی پر، رونا ہے میری عادت"
"دل بے خبر نہیں ہے، مطلب ہے تیرے میرا ——— قاصد بناکے شاید اُس کو پیام دیگا"
"کاذب نہیں ہوں ہرگز، صادق ہے قول میرا ——— وعدہ ہوں تجھسے کرتا، قاصد بنوں گا تیرا"
منزل سے ہوں میں واقف، شب بھر میں ڈھونڈ لونگا ——— بعد از سلام اُس کو، تیرا پیام دونگا"
دہرائے مجھسے قصہ، ایسی نہیں ہے حاجت ——— "آنکھوں سے اپنی میں نے دیکھی تھی تیری حالت"
"حالت پہ تیری بادل، آنسو بہا رہے تھے ——— تارے سر جھکائے، مغموم جا رہے تھے"
"تجھکو یقیں نہیں گر، موجودگی کا میری ——— قصہ بیاں ہوں کرتا، میں شام غم کا تیری"

(۵)

"مغرب کی وادیوں پر، جب خود تھا جلوہ افگن ——— غاروں میں تھا اندھیرا، اور چوٹیاں تھیں روشن"
"جنگل کے پاس دریا آہستہ چل رہا تھا ——— اور عکس بادلوں کا اُس میں مچل رہا تھا"
"پتنگے کو جب چشمے اُبل رہے تھے ——— تالاب کے کنارے سارس ٹہل رہے تھے"

"پانی کے پاس بگلے اُڑ اُڑ کے آ رہے تھے — کچھ پائے سر جھکائے بستی کو جا رہے تھے"

"سرخاب جھیل میں جب غوطے لگا رہے تھے — کچھ اُڑ کے آ رہے تھے کچھ اڑ کے جا رہے تھے"

"پودوں پہ جب چمن کے چڑیاں پُھدک رہی تھیں — تھی پتیوں کو جنبش شاخیں لچک رہی تھیں"

"طاؤس بولتے تھے اک رقص کر رہا تھا — آہو جھکائے گردن میدان میں چر رہا تھا"

"جھونکے تھے سرد اُس دم تھیں مشکبو ہوائیں — بادل کو کھینچتی تھیں ہر چار سو ہوائیں

"گنجان جھاڑیوں میں چڑیاں چہک رہی تھیں — موتی سی پتیوں سے بوندیں ٹپک رہی تھیں"

"آواز "پی کہاں" کی جنگل سے آ رہی تھی — گل کے قریب بلبل گلشن میں گا رہی تھی"

"بستی کے پاس کوئل باغوں میں تھی غزل خواں — "کو" کی صدا سے دل میں بھرتی تھی موجِ عرفاں"

"بارش سے سہپر کی میدان ہو رہے تھے جل تھل — زریں کرن سی خور کی رنگیں تھے سارے بادل"

"قوسِ قزح عیاں تھی مشرق میں آسماں پر — رنگِ شفق جما تھا مغرب کے گلستاں پر"

"وادی سے گیت گاتا چرواہا آ رہا تھا — اک لے سے بانسری کو اپنی بجا رہا تھا"

"ولہر سکوت شب کا آہستہ چھا رہا تھا — احساس کا تخیل پرچم اڑا رہا تھا"

(۶)

"اتنے میں چادرِ شب سورج نے رخ پہ ڈالی — مشرق میں آسماں پر بڑھنے لگی سیاہی"

"پھر ضَو سے میری باغ صحرا و دشت جھلکے — گاؤں کے جھونپڑوں میں دھندلے چراغ"

(۷)

"لیکن تو اب بھی پُل پر بیٹھا ہوا تھا حیراں — لَو دے رہی تھیں آنکھیں اور چاک تھا گریباں"

"رنگت بدل رہا تھا چہرے کی غم کا عالم — اٹھتا تھا درد گویا پہلو میں تیرے پیہم"

"آہِ شرر فشاں سے شعلے نکل رہے تھے — دل اور جگر ہی شاید سینے میں جل رہے تھے"

"آنکھوں سے تیری آنسو پیہم ٹپک رہے تھے — پتوں پہ جو پڑے تھے ضو سے جھلک رہے تھے"

"نظریں تھیں آسماں پر عالم تھا بیخودی کا — اتنے میں سمتِ مغرب کوندا سا ایک

"جنبش تھی پھولیوں کو، چہرے پہ تھی بشاشت — گویا بجا رہا تھا، وہ دل میں سازِ الفت"
"کیفیت شگفتگی جب، سرعت سے بڑھ رہا تھا — تو بار بار اُٹھ کر، یہ شعر پڑھ رہا تھا

"جب دل سکوتِ شب میں، فرقت کا گیت گاتا
کالی گھٹا میں تجھ کو، میں مسکراتے پاتا"

---

# حسن برہم

## ازجناب عزیز صاحب بریلوی

عجب کچھ لطف آتا ہے دلِ آشفتہ خاطر کو — کسی روٹھی ہوئی کمسن حسینہ کے منانے میں
ملے گر اہل دل کوئی تو اُس سے پوچھ کر دیکھو — مزہ ہے بس یہی کچھ بھی اگر ہے دل لگانے میں
غرورِ حُسن ہے اِن مہ جبینوں کا خفا ہونا — نیازِ عشق ہے ان کا بصد منت منانے میں
غلط ہے بارگاہِ حُسن میں احساسِ خودداری — کمالِ عاشقی مضمر ہے اپنے کو مٹانے میں
حماقت سے عبارت ندامت خود فروشی پر — مدارج اور بڑھتے ہیں یہاں توقیر جانے میں
وہ اِک اِک بات پر اونکا بگڑنا روٹھنا مجھ سے — وہ میری جانفشانی ہر دفعہ اُن کے منانے میں

غنیمت ہیں عزیزؔ اس زندگی کے بس وہی لمحے
ہوئے جو صرف اس کافر ادا کے ناز اُٹھانے میں

---

# احسن الکلام

از جناب احسن صاحب احسن مارہروی

یوں خریدارانِ اُلفت عشق کا سودا کریں
ہوش کا سرمایہ نذرِ حسنِ بے پروا کریں

ہو کے ناکامِ ازل اس کے سوا ہم کیا کریں
عمر بھر بیٹھے ہوئے تقدیر کو رویا کریں

ہم نہ ہوں لیکن زمانے میں ہمارا نام ہو
ایسی ہستی چاہیئے تو مر کے ہم پیدا کریں

غم دیا، تکلیف دی، بسمل کیا، دل لے لیا
تم تو سب کچھ کر چکے اب یہ کہو ہم کیا کریں

ہے خود آرائی کسی کی شانِ خود آرائی کے ساتھ
یعنی اُن کو ہم نہ دیکھیں وہ ہمیں دیکھا کریں

درسِ عرفاں کے لیئے ہر ذرہ ہے طورِ کلیم
دیکھنے والے مگر پہلے نظر پیدا کریں

زندگی کی سب بہاریں تھیں اسی غنچہ کے ساتھ
مر گیا جب دل ہی پھر ہم زندہ رہ کر کیا کریں

شیخ کو جنت مبارک۔ ہم کو دوزخ ہی قبول
فکرِ عقبےٰ وہ کریں، ہم خدمتِ دنیا کریں

ایک دل ہے۔ ایک حسرت! ایک ہم ہیں! ایک تم
اتنے غم کم ہیں؛ جو کوئی اور غم پیدا کریں

ہم دلاتے رہتے ہیں یاد اُن کو عہدِ حشر کی
آج ہی سے چاہیئے اندیشۂ فردا کریں

کھول دی ہے آپ نے بالائے بام آکر نقاب!
حکم ہو ہم کو تو چشمِ شوق ہم بھی وا کریں

ہم بتوں کو چاہ کر کافر نہیں اے تیری شان!
اور شیخِ کعبہ، پتھر کی طرف سجدا کریں

احسنِ رنجور کو دنیا سے ہے کیا واسطہ
آپ نے بیمار ڈالا آپ ہی اچھا کریں

---

# خاندان بہمنیہ

(از احمد)

یہ غالباً ایک قدرتی امر ہے کہ اکثر غلط اور بے بنیاد باتیں جو اپنے اندر دلچسپی کا پہلو رکھتی ہیں مقبول اور زبان زد خاص و عام ہو کر بہت جلد مشہور ہو جاتی ہیں اور پھر ان کی تردید میں کتنے ہی دلائل پیش کئے جائیں لیکن ان سے کوئی خاص فائدہ مترتب نہیں ہوتا۔ تاریخ ایسی بے شمار مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ قطب الدین ایبک کی فیاضی۔ اکبر کی نیکی۔ شاہجہاں کا تقدس۔ اورنگ زیب عالمگیر کی ولایت۔ ترک اور افغان بادشاہوں کی وحشت۔ مغل بادشاہوں کی عام شرافت اور سلاطین ماسبق پر ان کی فضیلت محض افسانے ہیں جو خوشامدی اور خود غرض مورخوں کی غلط بیانی کے رہین منت ہیں۔

جھوٹ کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ جو بات کسی بلند مرتبہ اور با اثر شخص کے قلم سے نکل جاتی ہے عوام کے نزدیک حدیث کا حکم رکھتی ہے اور رفتہ رفتہ زمانہ اس پر مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے۔ پھر اگر کوئی شخص خواہ وہ اس سے کہیں زیادہ معتبر ہو اس کے خلاف لکھے تو اس کی تحریر قابل التفات نہیں خیال کی جاتی۔ مثلاً شیخ ابوالفضل علامی نے اپنے آقا (اکبر) کی مفروضہ رحمدلی اور بزرگی کا سکہ جمانے کی غرض سے یہ قصہ تصنیف کیا کہ اس نے ہیموں کو قتل کرنے سے انکار کیا۔ حالانکہ "تاریخ سلاطین افاغنہ" میں جو اس معاملہ میں "اکبر نامہ" سے بدرجہا ثقہ ہے صاف طور پر لکھا ہے کہ ہیموں کو بیرام خاں نے نہیں بلکہ اکبر نے اپنے ہاتھ سے ہلاک کیا۔ مگر چونکہ ثانی الذکر ایک غیر معروف کتاب ہے اور اس کا مؤلف ابوالفضل کے مقابلہ میں کوئی بڑی حیثیت نہیں رکھتا تھا اس لئے اس کا بیان کس مپرسی کی حالت میں ہے۔

اسی طرح ابوالفضل نے اکبر کی اس شرمناک بدعہدی اور دغا بازی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے جو اس سے اسیر گڑھ کی فتح کے موقع پر ظہور میں آئی۔ "اکبر نامہ" اور "آئین اکبری" میں اکبر اپنے اصلی خط و خال میں نہیں نظر آتا۔

یہاں تک تو اصولی بحث تھی۔ اب میں اصل مطلب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ دکن کی تاریخ میں سلاطین بہمنیہ کے عروج۔ اصل و نسب اور "بہمنی" لقب کی وجہ تسمیہ کے سلسلہ میں جو حالات مشہور آفاق ہیں اور جن سے تاریخ کا ایک مبتدی بھی واقف ہے۔ بازاری گپوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے جن کو نامور مورخ مولانا محمد قاسم فرشتہ مؤلف "تاریخ فرشتہ"

کے شوق افسانہ طرازی نے تاریخی واقعات کے درجہ تک پہونچ دیا ہے۔ چونکہ تاریخ فرشتہ ہندوستان کی دوسری عام تاریخوں کی بہ نسبت زیادہ عام فہم اور کثیر الاشاعت ہے اس لئے اس کے بیان کو جو شہرت حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں نصیب ہو سکی۔ اور حقیقت پر پردہ پڑا رہا۔

## فرشتہ لکھتا ہے

"حسن نام شخصے بدار الخلافہ دہلی در ملازمت گانکو ی بہمن منجم کہ نزد شہزادہ محمد تغلق شاہ قرب و منزلتے داشت میبود و در کمال فلاکت روزگار میگذرانید۔ ......... حسن بامزراعت و قلبہ رانی مشغول گشت ناگاہ روزے قلبہ در زمین بند شد ......... چوں خوب ملاحظہ کرد زنجیر را در گردن ظرفے مملو از اشرفی دید ......... وقت شب بخانہ گانگوی بہمن برد ......... گانگوی بہمن بر امانت و دیانت او آفریں گفتہ الخ"

(تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۵۱۹ - ۵۲۰)

اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک غریب شخص حسن نام دہلی کے ایک نجومی مسمّٰی گانگوی بہمن کے کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ ایک دن حسن کو کھیت میں کچھ دفینہ ملا جو اس نے اپنے مالک کو دیدیا۔ مالک نے اس کی ایمانداری سے خوش ہو کر اس کو شاہ دہلی (غیاث الدین تغلق اول) کی سرکار میں سو سواروں کا سردار بنوا دیا جس سے درجہ بدرجہ ترقی کر کے وہ بادشاہ بن گیا۔

فرشتہ کا یہ بیان قابل قبول نہیں ہو سکتا جب تک کہ دوسری معتبر تاریخوں سے اس کی تائید نہ ہو کیونکہ محولہ فوق واقعہ ۱۳۲۱ء اور ۱۳۲۵ء کے درمیان ہوا اور فرشتہ نے اپنی کتاب ۱۶۱۱ء میں لکھی۔

لیکن دوسری تاریخی کتابوں کی ورق گردانی کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ ؎

| | |
|---|---|
| بقدر طاقت خود غوطہا زدم بسیار | دریکہ می طلبم آں بہیچ دریا نیست |
| این سخن باورت گر از من نیست | عہدہ بر روایت و بر من نیست |

کسی قدیم یا جدید تاریخ سے فرشتہ کی تصدیق نہیں ہوتی۔ میرا یہ کہنا کہ فرشتہ کا بیان ایک بازاری گپ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا دعویٰ بلا دلیل نہیں ہے۔ اور یہ دلیل میں خود تاریخ فرشتہ سے پیش کرتا ہوں۔ اس میں مرقوم ہے:

"پوشیدہ و پنہاں نماند کہ چہرہ کشایاں صور حکایات در کیفیت عروج و اصل و نسب سلطان علاؤ الدین حسن گانکوی بہمنی چوں احوال مختلفہ نقل کردہ اند از انجملہ آنچہ مشہور تر است دریں کتاب در سلک تحریر کشیدم ......

۔۔۔۔۔ القصہ بعضے از اصحاب خبر چنیں گفتہ اند کہ حسن نام شخصے بدار الخلافہ دہلی الخ! (فرشتہ صفحہ ۵۱۹)

فرشتہ کی مندرجہ بالا تحریر آپ اپنی شاہد ہے اور بلند آہنگی سے اس کی غلط نگاری کی غمازی کر رہی ہے یعنی فرشتہ کا بیان کسی مستند تاریخی کتاب پر نہیں بلکہ سُنی ہوئی باتوں پر مبنی ہے۔ لہذا معتبر نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ رائی کا پہاڑ بنانے اور بے سروپا خرافات کی تشہیر میں عام بازاری آدمیوں کو ید طولیٰ حاصل ہوتا ہے۔

اب ہم کو ہمعصر مورخوں کی طرف توجہ کرنی چاہئے جو فرشتہ سے پہلے گذرے ہیں۔ ان میں مولانا ضیاء الدین برنی کی تصنیف "تاریخ فیروز شاہی" سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس نے سلاطین خلجی و تغلق کے چشم دید حالات لکھے ہیں جیسا کہ اس کے بیان سے ظاہر ہے۔

"چنیں گوید دعاگوئی ہمہ مسلمانان ضیا برنی کہ آنچہ ایں ضعیف از اخبار و آثار جلالی و علائی و تا آخر دریں تاریخ نوشتہ است بر حکم مشاہدہ و معاینہ در قلم آوردہ۔ الخ" (تاریخ فیروز شاہی مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۲ء صفحہ ۱۷۵)

علاؤ الدین حسن بہمنی نے ۷۴۸ھ میں محمد بن تغلق کے عہد میں سلطنت بہمنیہ کی بنیاد ڈالی۔ اور یہ واقعہ بلاشبہ ضیا برنی کے سامنے ظہور پذیر ہوا۔ علاوہ ازیں وہ حسن بہمنی سے بھی کماحقہ واقف ہوگا۔ اپنی تاریخ میں اس نے کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً "از دیوگیر خبر رسید کہ حسن کانگو و دیگر باغیان و مشلطان کہ در روز محاربہ از پیش لشکر سلطان گریختہ بودند بر عماد الملک زدند۔۔۔۔۔۔۔۔۔

حسن کانگو در دیوگیر آمد و چتر برگرفت۔۔۔۔۔۔۔۔۔

بر حسن کانگو در دیوگیر جمعیت بسیار گرد آمدہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

(تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۵۲۰)

لیکن تمام کتاب میں ایسی کوئی بات نہیں لکھی جس سے فرشتہ کی تائید ہو سکے۔ کیا یہ قرین قیاس ہے کہ برنی حقیقت سے بے خبر تھا؟

شیخ عبدالقادر البدایونی جس نے ۱۵۹۵ء تک کی تاریخ قلمبند کی ہے اور جو فرشتہ کا ہمعصر تھا لکھتا ہے "حسن کانگو علاؤ الدین کا لقب اختیار کیا اور سلطنت پر قبضہ کر لیا اور اس وقت سے دولت آباد کے مضافات کی حکومت اور علاقہ کی سلطنت اس کے خاندان میں رہی۔ کتاب "فتوح السلاطین" اس کی شان میں لکھی گئی" (منتخب التواریخ مترجم

جارج رینکنگ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی صفحہ ۳۰۹ - ۳۱۰ - ۳۱۴ - ۳۲۷ —

فتوح السلاطین مجکو نہیں ملی اس لئے میں اس کی نسبت کوئی رائے نہیں قائم کر سکتا - مگر یہ ظاہر ہے کہ اس کا بھی فرشتہ سے مختلف ہوگا - کیونکہ بداؤنی نے اس کو ضرور پڑھا ہوگا اور جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباسات سے عیاں ہے بد نے گانگوی بہمن منجم کا مطلق نہیں ذکر کیا۔

خواجہ نظام الدین احمد اپنی تالیف لطیف "طبقات اکبری" میں جو غالباً ۱۰۰۵ھ میں تکمیل کو پہونچی رقمطراز ہے

" ناقلانِ آثار چنیں روایت کردہ اند کہ علاؤالدین حسن بہمنی کہ بحسن گانگو اشتہار دارد و بتقلب روزگار در زمان تغلق شاہ بدار السلطنت دہلی رسید روزے قطب العارفین شیخ نظام الدین دھلوی دعوتی تمام فرمودہ بودند۔ و جمیع بزرگان خاصہ بودند - چوں سفرہ برداشتند و سلطان محمد مرخص گردید شیخ بخادم فرمود کہ سلطان رفت و سلطان دیگر بر در است بروبیاد - خادم بیروں رفت حسن گانگو را بر در دید بخدمت شیخ در آورد و حسن از خلوص اعتقاد سر افتادہ بر قدم شیخ نہاد و نیازمندی نمود - شیخ گردہ نان بر انگشت نہادہ باو داد از انگشت و شیخ و گردہ نان صورت چتر چنانچہ حاضران و حسن بر بشارت شیخ آگاہ شدند و او مسرور و مبتہج از خدمت شیخ حسن بیروں آمد بشارت گرفتہ با جمعے از افغانان متوجہ دکن شد "

(طبقات اکبری - مطبوعہ نو لکشور پریس صفحہ ۴۰۰)

یہ بیان نہایت مفصل اور واضح ہے اور فرشتہ کے بیان سے زیادہ قابل وثوق ہے کیونکہ تاریخ فرشتہ کے بیان سے زیادہ قابل وثوق ہے کیونکہ تاریخ فرشتہ کے برخلاف طبقات اکبری کا بیان معتبر و مستند تاریخوں پر مبنی جیسا کہ ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے :- " ناقلاں آثار چنیں روایت کردہ اند کہ الخ " نظام الدین احمد حسن بہمنی کی بادشاہ کو محض شیخ نظام الدین اولیاء کی پیشگوئی سے منسوب کرتا ہے اور کسی منجم کی بابت کچھ نہیں لکھتا - مجکو تو اس میں بھی ہے کہ محمد تغلق کے دربار میں گانگوی بہمن نام کوئی آدمی تھا بھی یا نہیں۔

" ہفت اقلیم " مؤلفہ امین احمد (۱۰۰۲ھ) میں مسطور ہے :-

طبقۂ اوّل ملوک گلبرگہ است - و اول ایشاں علاؤالدین حسن است - چوں صاحب عیون التواریخ نسب او را بہ بہمن بن اسفندیار میرساند ہر آئینہ آں سلسلہ بہ بہمنی اشتہار یافتہ -

"ہفت اقلیم" تاریخ فرشتہ سے پہلے کی تصنیف ہے۔ علاوہ ازیں سراج التواریخ۔ برہان مآثر۔ تاریخ محمود شاہی اور تحفۃ السلاطین سے جو بہمنی خاندان کی معتبر تاریخیں ہیں اور تاریخ فرشتہ سے بہت پہلے لکھی گئی تھیں۔ فرشتہ کے بیان کی تردید ہوتی ہے۔

اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی کہ حسن گانگو کے اصل و نسب کے متعلق سب سے پہلے فرشتہ نے غلطی کی۔ اور مورخین مابعد میں سے جن کا بیان اس کے مطابق ہے انھوں نے اسی کی تقلید کی ہے کیونکہ فرشتہ سے پہلے کوئی مورخ خواہ کتنا ہی ادنیٰ ہو اس کا ہمرائے نہیں ہوا۔ ماسوا اس کے کسی سکہ یا کتبہ سے بھی فرشتہ کی مطلقاً تصدیق نہیں ہوتی۔

یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ فرشتہ کے بعد تمام مورخین نے اس کے بیان کو قبول کر لیا۔ اور صرف محض جدید تحقیقات نے ان کی تردید کی ہے۔ صرف چند مورخ ایسے گذرے ہیں جنھوں نے اس کی پیروی کی مثلاً لالۂ بہار لال (مؤلف "لب التواریخ ہند") اور طامس ولیم بیل (مولف "مفتاح التواریخ") وغیرہما۔ مگر ان کو صحیح معنوں میں مورخ کہنا کسی طرح جائز نہیں۔ یہ دونوں کتابیں کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتیں۔ لب التواریخ جیسا کہ اس کا مؤلف دیباچہ میں لکھتا ہے تاریخ فرشتہ کا خلاصہ ہے۔

بخلاف ان کے منشی سبحان رائے بھنڈاری بٹالوی (صاحب خلاصۃ التواریخ) و سید غلام حسین خان طباطبائی (صاحب سیر المتاخرین) و محمد شریف حنفی (صاحب مجالس السلاطین) و محمد ہادی (صاحب ہفت گلشن محمد شاہی) وغیرہم فرشتہ سے اختلاف رکھتے ہیں۔

منشی سبحان رائے اپنی کتاب میں جو عہد عالمگیر کے چالیسویں سنہ جلوس یعنی سنہ ۱۶۹۷ء کی تالیف ہے صاف لکھتا ہے کہ "از انجا کہ حسن گانگو از نسل بہمن بن اسفندیار بن گشتاشپ بود از یہجت اورا بہمنیہ گفتندے۔ سلطان محمد علاؤالدین عرف حسن گانگو کہ از معتقدان قدوۃ الاصفیا شیخ نظام الدین اولیا بود بموجب دعائے شیخ در ۷۴۸ھ دکھن را متصرف شدہ سکہ و خطبہ بنام خود کرد" (خلاصۃ التواریخ قلمی صفحہ ۲۹۳)

میر غلام حسین خاں جس نے سبحان رائے سے قریباً ستاسی سال بعد ۱۷۸۲ء یعنی عہد شاہ عالم میں قلم اٹھایا لکھتا ہے :۔

"و علاؤالدین حسن کہ بحسن گانگو مشہور بود از جملہ سپاہیان ملک لاچین بود باتفاق جماعۂ اوباش در دولت آباد

لوائے حکومت برافراشتہ خود را سلطان محمد علاؤالدین خطاب کرد۔ وحسن کانگو کہ از نسل بہمن بن اسفندیار بن گشتاسپ بود وازین جہت او را بہمنی چہل وہشت ہجری وکن را متصرف شدہ وسکہ وخطبہ بنام خود کرد۔[1]

یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ خلاصتہ التواریخ اور سیر المتاخرین کے مآخذوں میں تاریخ فرشتہ بھی ہے۔ لیکن باوجود اس کے انھوں نے اس سے کلی اختلاف کیا کیونکہ ان کے نزدیک فرشتہ کا بیان کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

پس ثابت ہوا کہ حسن کانگو بہمنی کا بہمن بن اسفندیار کی نسل میں ہونا کوئی نئی تحقیقات سے نہیں ہے بلکہ ابتدا سے تمام مورخ یہی مانتے اور لکھتے چلے آئے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ خود فرشتہ بھی اس حقیقت سے ناواقف نہیں تھا چنانچہ وہ لکھتا ہے:۔

"بر مطالعہ کنندگان احوال سلاطین بہمنیہ مخفی ودستور نماند کہ صاحب تاریخ تحفتہ السلاطین وسراج التواریخ و بہمن نامۂ دکنی کہ بزعم بعضے ناظم آں شیخ آذری علیہ الرحمتہ است دراصل ونسب سلطان علاؤالدین حسن کانگوی بہمنی صریحاً حرفے نگفتہ اند اما در وقت ستائش بعضے جا بجا او را بشاہان کیاں منسوب کردہ گفتہ اند...... او را بہ بہمن واسفندیار نسبت کردہ ستائش نمودہ اند........ ومثل ایں دیگر عبارات کہ مشعر است برانیکہ از تبار اسفندیار است دریں دو کتاب بسیار درج شد........ وقتے کہ مسودایں اوراق بلدۂ احمد نگر در سلک ملازمان مرتضیٰ نظام شاہ بحری انتظام داشت در کتاب خانۂ او رسالہ بود مشتمل بر تحقیق اصل ونسب سلطان علاؤالدین حسن کانگوی بہمنی ونام مصنف آں مذکور نبود بنظر ایں خاکسار بے مقدار درآمد وماحصل آں رسالہ اینکہ سلطان علاؤالدین حسن کانگوی بہمنی از نژاد بہرام گور است بر ایں نہج سلطان علاؤالدین حسن بن کیکاؤس بن محمد بن علی....... بن اسفندیار...... بن نوح......... وبہرام گور از نسل ساسانست وساسان از نسل بہمن بن اسفندیار....... واینکہ علاؤالدین حسن واولاد عظیم الشان او را بہمنیہ گویند دریں تقریب است........"

....... (تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۲۵-۵۲۵)

لیکن فرشتہ نے فاش غلطی یہ کی کہ حقیقت کو حقیقت نہیں سمجھا۔ اس نے جس قلمی کتاب کا ذکر کیا ہے وہ مستند ہوگی۔ تاہم اس نے سوء ظن کی بنا پر تمام معتبر تاریخوں کو نظر انداز کر کے سنے ہوئے قصوں اور کہانیوں پر یقین کیا۔

[1] (سیر المتاخرین جلد اول مطبوعہ نولکشور صفحہ ۲۰۰)

یہ امر بھی کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ اکثر جدید مورخین نے فرشتہ کی عبارت سمجھنے میں غلطی کی۔ تاریخ فرشتہ میں یہ لکھا نہیں لکھا کہ حسن گنگا نام ایک برہمن کا ملازم تھا۔ اور "بہمن" یا "بہمنی" لفظ "برہمن" کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے۔ تاریخ فرشتہ میں تو حسن کے مفروضہ آقا کا نام صاف طور پر کانگوی بہمن لکھا ہے۔

"روزے کانگوی بہمن بحسن گفت کہ از زائچہ طالع تو چناں می یابم کہ صاحب اقبال باشی و از جانب حق تعالے موفق و موید گردیدہ عنقریب بمدرجہ اعلیٰ واصل گردی۔ پس با من عہد و شرط کن کہ اگر بخشندہ بے منت دولت عظیم بتو ارزانی کند اسم مرا جزو اسم خود گردانی تا بمیامن نام تو نام من نیز صفت بقا و دوام پذیرد و دفتر خود را بمن و اولاد من رجوع نمائی الخ" (فرشتہ صفحہ ۵۲۰)

یہ "گنگا یا گنگو" اور "برہمن" آجکل کے مورخوں کے گھڑے ہوئے ہیں جنکی نسبت تاریخ فرشتہ میں اشارہ بھی نہیں پایا جاتا۔ ڈاکٹر وی اے اسمتھ (آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا صفحہ ۲۷۵) اور ڈاکٹر ایشوری پرشاد (ہسٹری آف میڈیول انڈیا صفحہ ۳۲۸) کا یہ لکھنا کہ حسن ایک سخت متعصب مسلمان تھا اس لئے "برہمن" کی نسبت ہرگز نہیں اختیار کر سکتا تھا گو بذات خود صحیح ہو لیکن دور از کار ضرور ہے۔ فرشتہ نے یہ کب اور کہاں لکھا ہے کہ حسن کا آقا ہندو یا برہمن تھا؟ اس نے صرف کانگوی بہمن منجم لکھا ہے جو ایک ہندو کا نام نہیں معلوم ہوتا۔ پھر اس کو برہمن کس بنا پر فرض کیا جا سکتا ہے؟ تعجب ہے کہ لکھے پڑھے آدمی بھی کانگوی بہمن کی بجائے گنگا برہمن سمجھے ہوئے ہیں اور اسکو فرشتہ کے ہی منسوب کرتے ہیں۔

حسن کانگو کے درباری مورخوں سے فرشتہ کی بدظنی بیجا ہے کیونکہ وہ اپنی تخت نشینی سے پیشتر ہی بہمن نژاد مشہور تھا جیسا کہ فرشتہ خود اقرار کر رہا ہے۔ ذیل کی عبارت قابل غور ہے:-

"........ ایشاں گفتند ہر کس را تو گوئی و فرمائی ما اطاعت نمودہ او را بشاہی برمیداریم ناصرالدین شاہ گفت کہ حسن کانگوی المخاطب بظفر خاں بہمن نژاد است و آثار بزرگی و شجاعت از ناصیہ او ہویداست و شایستۂ تاج و تخت است......." (فرشتہ صفحہ ۵۲۵)

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ناصرالدین شاہ کو حسن کانگوی کی خوشامد میں اس قدر سپید جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ اس وقت تک وہ محض ایک سردار تھا۔؟ اس سے ظاہر ہے کہ حسن کے بادشاہ ہونے کے بعد درباریوں نے اس کا سلسلۂ نسب بہمن بن اسفندیار سے ملانے میں کسی قسم کا مبالغہ کئے بغیر محض ایک حقیقت کا اظہار کیا۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ تحریر بالا میں فرشتہ اپنی تردید آپ کرتا ہے۔ اس کے سامنے فرشتہ کا یہ کہنا کہ حسن کی تاجپوشی کے بعد اس کے خوشامدی درباریوں نے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر اس کا شجرۂ نسب بہمن بن اسفندیار سے ملا دیا ایک دروغ بے فروغ ہے۔

لے مارسڈن کا یہ کہنا کہ "جب یہ (حسن) بادشاہ ہوا تو اس نے اپنے پرانے آقا گنگا مصر کو وزیر اعظم مقرر کیا اور خود سلطان حسن گنگو بہمنی کے لقب سے سریر آرائے سلطنت ہوا...... اس کے جانشینوں نے بھی برہمنوں کو اپنا اپنا وزیر بنایا اور اپنی ہندو رعایا کے ساتھ ہمیشہ نیک سلوک کیا" (تاریخ ہند حصہ اوّل صفحہ ۱۴۳) از سرتا پا لغو اور بے بنیاد ہے۔ مارسڈن نے نہ صرف کانگو کو گنگو بنا دیا بلکہ اپنی جدت پسندی کے ماتحت اس میں "مصر" کا دم چھلا بھی لگا دیا۔ تاریخ میں سلاطین بہمنی کے کسی ہندو وزیر کا نام نہیں ملتا۔ بہمنیوں کے وزیروں میں خواجہ محمود گاواں کو غیر فانی شہرت حاصل ہے مگر وہ ایک راسخ الاعتقاد مسلمان تھا۔

لفظ "کانگو" بھی تشریح طلب ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں جو "ہفت اقلیم" کا قلمی نسخہ ہے اس میں کانگو یا کانگو کی بجائے "کاکویہ" لکھا ہے جس کی نسبت بعض عالموں کا خیال ہے کہ یہ حسن کے باپ کے نام "کیکاؤس" کی مسخ شدہ صورت ہے۔ اہل دکن نے "حسن بن کیکاؤس" یا "حسنِ کیکاؤس" کو "حسن کاکویہ" بنا لیا۔ جو عین قرین قیاس ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کا پورا نام اور لقب یوں ہونا چاہیئے۔

علاؤ الدین حسن کیکاؤس بہمنی

کثرت استعمال سے "کیکاؤس" کا "س" حذف ہو گیا۔ اور رفتہ رفتہ "کیکاؤ" کا "ککاؤ" "کا کاؤ" اور "کاکاؤ" کا "کانگو" رہ گیا۔ (دیکھو جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔ جلد ۵۔ شمارہ ۱۱۔ مقالہ مولانا عبد الولی)

اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو خاندان بہمنیہ کی وجہ تسمیہ کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں باقی رہتی۔ اور یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ حسن نے کانگو بہمنی کا لقب اپنے آباؤ اجداد کی نسب سے اختیار کیا نہ کہ کانگوی بہمن منجم کی نسبت سے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بہرحال فرشتہ کی شہادت کو جو بقول اس کے محض بازاری افواہوں پر مبنی ہے دوسرے لاتعداد قدیم و جدید اور معاصر مورخوں، محققوں اور تذکرہ نویسوں کے بیانات پر ترجیح دینا اصول تاریخ کے قطعاً خلاف ہے۔

nd because of its magnificent scenery and realth of legend and romance, it is a district xtremely profitable for exploration. In this ook Mr. Christopher Marlowe takes his readers hrough the highways and byways of the Forest, etting before them its history and traditions nd describing fully the life of the people. It illustrated from photographs and contains a ketch-map.

Crown 8vo. 8|6 net

On November 22nd Messrs. John Lane The odley Head Limited are publishing a new novel entitled MARGARET DASHWOOD or INTERFERENCE, by Mrs. Francis Brown. The author who is the great-grand-niece of Jane Auston, has here written the story of the love and marriage of one of the minor characters of 'Sense and Sensibility', Margaret Dashwood, and of the interference in her affairs by John Dashwood, Sir John Middleton, Mrs. Jennings, Elinor Ferrars and Marianne Brandon and of how far they were successful. It is an intriguing literary experiment and it will be found that the author has inherited many of the gifts of her great-grand-aunt the immortal Jane.

Crown 8vo. 6|- net

matter of surprise that her work is almost unknown in this country. The present volume is not a collection of short stories but consists of three complete short novels (Novellen) a genre which the masters of German fiction seem to have made their own. The first, the title-story, is a fantasy in the "capriccio" vein, as witty in conception as it is deft and airy in execution, though with an underlying note of real sympathy; the second, "Dream Children", is a full length portrait of a woman, sensitive, introspective and apparently trivial, who yet has courage to face the sterner realities of life; the third, "The Burden" is a grim, moving tragedy of post-war Germany tempered by that gaiety of spirit which often flowers most brightly on the soil of distress.

Crown 8vo. 7|6 net

On September 27th Messrs. John Lane The Bodley Head Limited are publishing a new finely printed edition of Fielding's "JOSEPH ANDREWS" with illustrations by Norman Tealby and an Introduction by J. B. Priestley. Though not quite so well known as "Tom Jones", "Joseph Andrews is in some ways more characteristic of its period, and Parson Adams and Mr. Slipslop are among the great English comic characters. Norman Tealby's illustrations have just the right quality of boisterous realism.

Illustrated Royal 8vo. 25|- net

Mrs. Dorothy Una Ratcliffe, known principally for her poetry and prose about the Yorkshire Dales and their folk, has now written a book of poems for children under the title of "NIGHTLIGHTS" which Messrs. John Lane The Bodley Head Limited are publishing on September 27th. Unlike most so-called verses for children, these poems are really intended for children and not for their parents, and their simplicity and realism cannot but appeal to the little ones. The book is charmingly illustrated in black and white by Cecile Walton. Besides the ordinary edition there will be a special edition on mould-made paper limited to one hundred numbered copies signed by the author.

Illustrated Demy 8vo. 5|- net
and Special edition 21|- net

On September 27th Messrs. John Lane The Bodley Head Limited are adding William, J., Locke's "THE HOUSE OF BALTAZAR" and Muriel Hine's "TORQUIL'S SUCCESS" to their two shilling Popular Novel Series. Neither of these well known novels have till now been published at two shillings.

Small Crown 8vo. 2|- net each

On November 22nd Messrs. John Lane The Bodley Head Limited are publishing a new book by James Branch Cabell entitled THE WAY OF ECBEN: A Comedietta involving a Gentleman. This is the first long novel Mr. Cabell has written for some time and it contains the story of Etarre, the fairest of all the earth, many of whose adventures have been described in previous books by this author. It also introduces King Alfgar who gave up kingly position, power and wealth in order to enter on a life-long questioning after Etarre, and tells how that questioning was brought to a merciful end. Mr. Cabell has put some of his best work into the book, which contains at the end a most interesting epilogue in this form of a retrospect of his own work and of his intentions for the future.

Crown 8vo. 7|6 net

Messrs. John Lane The Bodley Head Limited are publishing a new book entitled THE BLACK FOREST: Its People, History and Traditions, by Christopher Marlowe, author of "The Fen Country" The South-Western corner of Germany where the district of the Black Forest lies, though under seventeen hours from London and abounding in good hotels and cheap living is almost unknown country to the average Englishman. It is, however, becoming increasingly popular for the winter-sports enthusiast,

# *Literary Notes*

On November 29th Messrs. John Lane The Bodley Head Limited are publishing a new book written and illustrated by Donald MaxWell entitled A DETECTIVE IN KENT: Landscape Clues to the Discovery of Lost Seas. In this characteristic book Mr. Maxwell applies the science of the unravelling of crime by means of observation and deduction to the re-discovery of Unknown Kent by means of infallible signs in the landscape. Its object is to improve the powers of observation and deduction of ramblers and explorers in Kent, and the trained eye of the author, who is a sailor as well as a painter, shows us dockyards in green fields, harbours in meadow-lands and deep sea channels in ditches. We are piloted by Mr. Maxwell, with the help of charts and sketches, upon an island voyage, and bit by bit the old coast line of the Isle of Thanet is revealed and lost seas are traced out on a region now covered by acres of grassland.

Crown 8vo. Illustrated 6|- net

On November 22nd Messrs. John Lane The Bodley Head Limited published a new edition of GRIEG AND HIS MUSIC by H. T. Finck, which has been recognised as a valuable contribution to musical biography.

Illustrated Demy 8vo. 10|6 net

On October 4th Messrs. John Lane The Bodley Head Limited are publishing THE MISADVENTURES OF A TROPICAL MEDICO a new book by Dr. H. S. Dickey, written in collaboration with Hawthorne Daniel. Dr. Dickey has been practising medicine in one corner or another of South America for twenty-five years and he has had some extraordinary experiences, chiefly among the natives. He has been across the Andes five times, he has travelled along the full length of the Amazon, he has been wounded by bullets and poisoned arrows and tortured by Indians. He also gives a sensational first-hand account of the Putumayo Rubber Company atrocities and his descriptions of Sir Roger Casement, then employed by the British Foreign Office, and of Arana, the inscrutable head of the Peruvian Amazon Rubber Company are among the special features in a vivid personal narrative. The book is fully illustrated from photographs.

Illustrated Demy 8vo. 15|- net

On January 10th Messrs. John Lane The Bodley Head Limited are publishing a new travel book entitled TURKEY AND SYRIA REBORN by Harold Armstrong, author of "Turkey In Travail" etc. The author has recently returned from a two years tour of Turkey and Syria as a delegate of an official Commission and he here describes the present conditions of those countries. It is a dramatic narrative of travel, with vivid pictures of places and people, for the author, whose wide knowledge of the Middle East was shown in his previous book "Turkey In Travail", has had by his experience, knowledge of languages and religions, and exceptional opportunity of studying and revealing the spiritual and mental outlook of these peoples. And while the reader is gripped by the colour and vitality of the narrative he can gain, under the author's guidance, a very accurate impression of modern Turkey and Syria.

With 21 illustrations and a Map. Demy 8vo. 15|- net

On January 10th Messrs. John Lane The Bodley Head Limited are publishing a new book entitled DON JUAN'S DAUGHTERS by Irene Forbes-Mosse, translated from the German by Oakley Williams, with an Introduction by Vernon Lee. Irene Forbes-Mosse, granddaughter of Goethe's friend Bettina Von Arnim, has won so considerable and distinctive a place in contemporary German literature that it is a

To The Editor
Inter. College Magazine Aligarh
Sir

I want to draw your attention to your remark in "The Aligarh Causerie in October number. I regret to say that inspite of the fact that our regular Cricket practice began from the other day the college re-opened after Summer Vacations. I believe, there you forget to mention this fact, along with that of Hockey practice.

I am at a fault to guess whether your view or interest is only limited to Tennis and Hockey Clubs activities only, or it was due to a slip of memory.

I strongly hope and trust that in future, you would be in keen touch with the cricket club, and there shall be no chance of your missing to mention in your next issue the activities and achievements of our club.

We had the previlege of entertaining two teams from outside during the month of Oct.

We met with Friends Union Club of Agra on the 20th and 21st October we got an easy victory of 11 wickets and 110 runs. Ahmed Kamal and Zahid Saeed Khan were responsible for skilful and fine bowling.

The other team came from St. Stephen's College, Delhi. This match was played on 26th and 27th October resulting in an easy victory of our home team by 7 wickets and more than century runs. Nasir Kurieshy scored easily his century. As he had also done against the Agra team. His game was faultless and fine. The other remarkable and triumphant bat was Mirza Shafi Ahmed, who scored 66 runs, at the critical moment, facing the bowling less carelessly including twelve fours. The same remarkable bowlers Zahid Saeed Khan and Ahmed Kamal made the batsmen of the opposite party feel uneasy and unsteady at the Crease. Yours truly

24 Minto, B MOHAMMAD SIDDIQ TOORI
Aligarh *Cricket Captain*

To
THE EDITOR
Intermediate College Magazine
Aligarh

SIR

Will you please insert the following few lines in your esteemed magazine and oblige.

"It has been pointed out so many times that more than 50% of the students of our college do not play any game in the evening. Out of these there are some who do not want to play at all, but the majority of them are such who find no vacancy in the playground.

Obviously the college cannot, under present circumstances, arrange games for all the students. I may, if allowed venture to make the following suggestions to remedy this difficulty.

1. The establishment of a large and up-to-date Gymnasium, where the students who are unemployed in the evening can get an opportunity of developing their bodies. This has been admitted by the University as well as college authorities to be an urgent need but no steps have been taken, so far in this direction.

May I request the authorities concerned to take an immediate step in this direction and to have a first class Gymnasium and apparatus, becoming of this institution, as soon as possible.

2. The installation of a dozen Badminton courts would solve the difficulty for more than hundred boys who want some light exercise in the evening. It will cost very little but will serve a very good purpose.

I hope that these words will have due effect on the authorities and these two arrangements will be soon made.

Thanking you in anticipation,

I am,
Yours truly
"A Student"

George—"He sells the tickets at the Cinema."

—

GOT THE JOB

"I 'ear Fred's got a job as'll last 'im three years."

"Go on! who said so.

"Mr. Justice Avory."

Master—"Here, I gave you an hour to write an essay on "what you would do if you were a millionaire, and you have done nothing!"

Smith—Yes, Sir,—please, Sir—that's what I'd do, Sir!"

—

# *The Editor's Post Bag*

We publish below a letter to the Editor from Mr. S. A. Rafy, Vice-President of our Union Club. The doughty Vice-President has taken exception to a remark made by the Editor about the activities of the Club. We respectfully point out to the Vice-President that the Editorial staff is perfectly within their rights to take note of the sins of commission of the various clubs and societies which form the nucleus of our everyday activities. The Editor is not bound to request the officers of the several clubs to furnish him with an account of their doings. It is the officers of the clubs whose duty it is to seek the courtesy of the pages of the Magazine to form a record of their activities, "Without or with offence to friends or foes.

The Editor sketches your world exactly as it goes."

In any case it is a matter of gratification that the Magazine is read by the students.

—EDITOR

The Editor

Inter. College Magazine

Dear sir

I would like to draw your attention to the remark you made in Aligarh Causerie in the October Number of your esteemed Magazine. Let me without the slightest fear of contradiction say at the very outset that I never received any gentleman connected with the magazine to submit my report about Union activities in the month of October. You have I do not know why made a statement in those remarks that you have been requesting me to do so. This is not correct. Apart from the fact that it is unfair from the judicious point of view I cannot help remarking that this is impolitic or inexpedient from the point of view of journalism. I hope this was by oversight and that such a thing will not reoccur in future.

During this session we have held six debates, two popular lectures, one delivered by our worthy President, Mr. A. M. Kureishy on 'Importance of Union' and the other by Mr. F. D. Murad on 'Radio' with practical demonstration.

We had the honour of welcoming Dr. Sir Iqbal, presenting him an address and making him life member of our Union.

This in short is the report of what we have done so far besides the rehearsals that we are having every day and then 'movie' show that we have been giving now and then.

We hope to stage an Urdu drama in the near future.

I have the honour to be

Sir

Your most obedient servant

S. A. RAFY

Here is another letter in the same strain as the above from our Cricket Captain. We have the same explanation to make to him as we have offered to our Vice-President.

—EDITOR

part in an endurance record attempt. But is isn't. It is simply one of the possibilities of the latest luxury afforded by the motor-coach-a-ball-room on wheels.

In this super-motor-coach the seats fold back, leaving a space of polished dance floor. Glass-topped refreshment tables appear from the backs of the seats, while there is a piano that folds up when not in use. Cigarettes and chocolates can be bought from automatic machines.

Heat pipes warm the "room," which is also fitted with coloured lamp shades and pretty curtains.

---

WORLD'S DEEPEST BUILDING

In America, continual efforts are being made to build the world's tallest building; in Japan, the reverse is happening. They are trying to build the world's deepest building.

It is proposed to construct a building downward in the heart of Tokio. It will be eighty floors deep, and constructed so that it can be made deeper from time to time as additional floor space is required.

The framework will be of steel, and the material to be used will be concrete and stones. The building will be in the form of a great cylinder, 155 ft. in diameter and 1,1000 ft. deep, with a circular ventilating air-shaft 75 ft. in diameter running full length through the centre of the structure.

It will be equipped with all the modern conveniences of a sky-scraper-electric lights, telephones, wireless, lifts, and with sunlight reflecting mirrors.

# *Wit and Humour*

A Great Place

Visitor—"So you really think Yarmouth is a healthy place."

Native—"Healthy! why, we cure herrings here after they're dead.

---

Teacher's Mistake

John—"Teacher, Can anyone be punished for something he didn't do."

Teacher—"Why, no; of course not."

John—"Well, I haven't done my Arithmetic."

---

Too Big an Order

Customer—I want a mouse trap, and hurry up, please, I have to catch a train.

Salesman—I'm sorry, madam, but our mouse traps won't catch anything so big as that."

Easily put

Mother—"You have made me."

Willie—Never mind other one.

Both v

"I'm sorry my boy, because I love

"I'm s-sorry, dad, I'm return your love.

---

He got the si

Little George—"Father, sixpence to give to a only one arm."

Father—"That's right, my s the afflicted. But wh man, George."

who
get an
...ies. This
...rsity as well
...gent need but
...far in this direc-
...iorities concerned to
this direction and
...sium and apparatus,
...on, as soon as pos-
a dozen Badminton
...ility for more than
light exercise in
...y little but will
...ave due effect
arrangements
...am,
...ly

speed of 362 miles per hour with some degree of safety and we have it from the famous expert, Louis Bleriot, that according to a graph of speed increases in motions since the beginning of aviation the speed of 750 miles per hour should soon be realized."

If these calculations are true it would be possible within a century for a student of our University to go to his home (even if it is in Bombay or Peshawar) after College hours, spend some hours with his parents and return in time for the roll-call. For the students whose homes are within a hundred miles it would be quite an ordinary thing to visit their houses in an aeroplane in vacant periods.

## X-RAY DETECTIVE

That a man is a carpenter may be revealed ... the X-ray by the shape of the bones in ...s. This is one of the novel conclu... ...cent investigation that recalls the ...ive feats of Sherlock Holmes. ... that peculiarities in the shape ...rs revealed that they had ...ilar wood-working tools. ...o gather sufficient data ...upation by his physical ... REVIEW.

## ... MARVELS

...entions were demons... the Telephone Pioneers' ...ce of the Bel' Telephone ...first appliance is for link... ...nd hand-worked Exchanges ...riber to dial a number (with-... ...hears the number enunciated ... An Irish girl has been spe... ...o phonograph records for the ... ...oice is known as "the voice with a ...ile." The second invention enables a person to store within himself electrically a message which he can subsequently deliver by placing a finger to another person's ear.

tc... take... rious... leus of ou... not bound t... clubs to furnish... doings. It is the... duty it is to seek t... the Magazine to form a... "Without or with offence... The Editor sketches... goes." In any case it is a mat... the Magazine is read by t... The Editor Inter-Colle... Dear sir I would like to... remark you made... October Number... Let me without t... tion say at the v... any gentleman c... submit my rep... month of...

## POISON GAS

A school boy, asked for a definition of civil war, wrote, 'Civil war is a war between civilized people, not savages. They try to kill each other without torture and with as little pain as possible.' This is the kind of 'civil' warfare that some have expected to accompany the use of poison gas. But a terrible object lesson of what the next war will mean was afforded a few months ago in an American hospital. More than a hundred and twenty men, women and children met their death when the hospital was filled with gas caused by the ignition of the X-ray plates stored in the basement. There were 8,000 pounds of these plates, and their ignition was due to spontaneous combustion. Some of the victims met death at once when the poisonous fumes spread through the building, others after lingering agony. Some who breathed the gas felt no ill effects at first, but died later and almost without warning.

The disaster has resulted in a nation-wide demand for greater safety in hospitals. It ought also to be a result in a nation-wide demand for scrapping the instruments of war. For, when the next war comes, poison gas will assuredly be used (whatever agreements nations may make against it on paper) and the victims will be not only men, but also women and children. One consolation, as an America editor remarks, is that among the dead and missing during the first days of fighting will be the politicians who voted for the war and the military experts who were chiefly responsible for bringing it about. THE TREASURE CHEST .

## BALLROOM ON WHEELS

"Will you dance with me from London to Brighton?" Sounds like an invitation to take

lution; he modifies it. Instead of evolution by a process of gradual developments, he believes it has come about by a series of jumps from one major form of life to another. He expresses his views in the Quarterly Review of Biology, a publication which has a limited circulation of animals, "he says," the creationists seem to have the better of the argument. There is not the slightest evidence that any one of the major groups arose from any other. Each is a special animal-complex related more closely to all the rest and appearing, therefore, as a special and distinct creation. "According to Dr. Clark's belief, " man appeared in the Pliocene age, just preceding the Ice age. He appeared suddenly and in substantially the same form as he is in today. There is not the slightest evidence of his existence before that time. He appeared able to walk, able to think, and able to defend himself." Dr. Clark holds that there are no missing links. "Missing links," he says, "are misinterpretations."

Dr. Clark's hypothesis does not scrap the Darwinian theory altogether. While he admits that variation plays a decisive part in the creation of varieties and breeds within a particular species, he does not allow that these variations, even at their widest, can create new species. Dr. Clark's opinion has by no means received with approval by other competent scientists.

"It sounds incredible that he should have had such a statement," says Roy Chapman Andrews, who has devoted years to exploration in the Gobi desert, as he is quoted in a United Press dispatch. Dr. William K. Gregory, professor of palaentology at Columbia University, finds Professor Clark's theory "distressingly vague," according to the same source, and Dr. Arthur H. Wesse, of Boston University Graduate School, is quoted as saying it is "absurd." "Dr. Clark's theory won't make a ripple," says Dr. Henry A. Pilsbury, curator of the department of molluses and invertebrates at the Philadelphia Academy of Natural Sciences, as he is quoted in the Philadelphia Record. "It conforms neither to the theory of evolution nor to the Fundamentalist doctrines, as I understand them. It is inconceivable to believe that two freaks so completely altered and modified as Dr. Clark suggests could propagate a race or separate species." The same paper quotes Dr. Henry Leffman, professor of chemistry in Franklin Institute, as saying that "science knows no accidents." Every thing that happens has a natural cause. If man appeared suddenly, in what form did he appear? Was he a white man, a red or black man? Dr. Clark substitute violent evolutions for successive evolutions."

—The Modern Review

# *Science and Invention*

ROUND THE WORLD IN 17 HOURS

Leave New York at 4 A.M., Breakfast at Reno, Lunch at Peking, Tea in Constantinople, Dine in Madrid and be back at New York by 9 P.M.

This feat can be accomplished if a man-made machine can obtain the speed of the fly known as 'Cephenemia' which, according to Dr. Charles Townstead, flies at an average speed of 850 miles per hour.

"The Schiender Cup Races," according to a correspondent in the Science and Invention showed that Aviation is still in its infancy. He further remarks that "The Schiender Cup Races recently showed that a plane could acquire the

wants on his journey to the other world. It is a startling and a moving thing to come upon this evidence that such long ago, when man was at the beginning of his development, the hope of immortality should have burned so unmistakably in his heart.

---

ARE WOMEN RICHER THAN MEN?

The phrases 'a rich man'—'the richest man in the world' have been on the world's tongue since the first fairy story was told up until the present. Men have been considered the natural owners and treasurers of the world's wealth, and women have followed after, receiving what they did, of the bounty—or sometimes unfortunately of the singiness—of their men folk. But with the rising tide of industrial and economic independence among women, the bank-books and the purses have begun to change hands, for to the common term 'business men,' has been added the equally practical one of 'business women.'

In the 'Ladies Home Journal' we learn some interesting facts concerning the wealth of America in the startling statement that forty-one per cent of the individual wealth of the whole United States is already controlled by women, and their accumulation of fortunes is growing by leaps and bounds. When the income tax in 1926 was paid, it was found that 44 women paid taxes on net incomes of over a million dollars, while there were only 42 men in the same class. There were 139 women whose yerly incomes were half a million dollars, and only 123 men with the same figures—THE TREASURE CHEST.

---

Mr. Bernard Shaw is quite ready to lose his body as long as he keeps his head. He is reported to have written to a Berlin friend in regard to a Russian experiment, in which a dog's head was kept alive for three hours by a process of pumping blood. "I am quite willing to have my head cut off so that I can continue to dictate my books, etc., without being troubled by sickness or by the necessity of dressing or eating, and have nothing else to do but to produce works of dramatic art and literature. I, of course, expect that one or two of the vivisectionists will try to experiment of themselves and convince me of its practicability."

—THE OUTLINE

A family where the male tendency is so strong that for four generations not a daughter has been born, although there have been thirty-five sons, has been discovered in California. There is not much sense of sex-equality there!

EVOLUTION AND MAN

After nearly sixty years of research, the theory of evolution as applied to the origin of the human species has not yet met with final acceptance at the hands of the scientists. Tennessee might become the butt or ridicule of the whole civilized world, but the opinion of a competent scientist, at any rate, deserves respectful consideration. The Literary Digest quotes the opinion of Dr. Austin H. Clark, the noted Biologist of the Smithsonian Institution, which has created some sensation in scientific circles:

Man is not cousin to the ape; he is an "accident" an "abnormality" to all intents and purposes, a product of special creation, announces Dr. Austin H. Clark noted Biologist of the Smithsonian Institution. The statement detonated through the press like the explosion of a bomb, and brother scientists sprang to the defence of the accepted theory of evolution with denunciations of Dr. Clark's evidences as so much "rubbish" "absurd" and "distressingly vague." But Dr. John Roach Staton, pastor of Calvary Baptist Church, New York, arch fundamentalist and foe of the theory of evolution, on the other hand, is "glad to hear a responsible man speak the truth," and believes the time for it is "most opportune." However, Dr. Clark does not discard the theory of evo-

sure, but sufficiently well preserved so that atomists can reconstruct the form of the ains from the fossils.

The cave man was equipped with a goodly pply of gray matter. The Russian scientist, ndze, who is preparing a report on the fossil ains is of the opinion that man in the Ice Age sessed a brain slightly smaller and less de- oped than recent dwellers of the same area.

—SCIENTIFIC AMERICAN

CRIMINAL TWINS

The study of identical twins (those born om a single cell) is expected to do much to ow whether heredity or environment plays greater part in the development of character, ofessor Johannes Lange of Munich gives an tance of two boy twins living some distance art who both fell sick at the same time and re operated for appendicitis, and of another r of twins, both of whom were petty swind- s, and simultaneously became bald, fat and betic. In studying prison records of thirty rs of twins, he found that in one quarter of cases of identical twins both twins of a pair re convicted of crime, but only one eighth the cases of fraternal twins. This seems to w that the hereditary factor in criminality stronger than that of environment—that is, t criminals are born rather than made, and not responsible for their actions. Professor ge believes that for this reason criminals uld not be punished since their punishment ld be of no benefit to them or to society. iety should be protected from the acts of minals, and to this end he advocates early ognition of delinquents through study of ldren of school age, and their removal to ces where they can be controlled while liv- a normal life—THE TREASURE CHEST.

A HARP FIFTY CENTURIES OLD

Excavations have been in progress for some time in Ur of the Chaldees, spoken of in the Bible as the home of Abraham. The most re- cent and interesting thing found is a gold and silver harp, inlaid with beautiful mosaic. Al- though the strings are gone and its music is silenced, we can imagine the melody that used to float through the halls of the king of the Chaldees, to the delight of his whole court, 5,000 years ago. The remarkable harp has the head of a bull, worked in gold on it, and is or- namented with a type of enamel mosaic very brilliant and very beautiful. When it was un- earthed in the ruins of ancient Ur the mosaic lay in its original position, but if it were touch- ed it would crumble to pieces. It was very carefully removed in so that it would be re- moved to the British Museum where it now stands, a thing of wonder and amazement to all who see it—THE TREASURE CHEST.

HOPE OF IMMORTALITY

'My Magazine' states that in a valley of Southern France has recently been discovered the oldest grave in the world. It belongs to the Mousterian period of the Old Stone Age, a period which existed in Europe 100,000 years ago. The men of those days are thought to have been very unpleasant-looking people, hav- ing long low skulls and projecting eyebrow ridges, and walking with a shambling and un- couth gait. They were not very far removed from the animals in their appearance and man- ner of life.

The archaelogists who discovered the grave in France had already found in this particular valley 2,300 implements of flint and quartz used by man in the Stone Age. Then they be- gan excavating a small cave in the valley, and found to their amazement a grave, and in this grave, with limb-bones doubled up in the con- tracted posture, the skeleton of a hunter. With the dead man were buried flint implements and food, doubtless intended to provide for his

tion and thereby to create a sensation in the minds of people.

The same kind of definition has been given by Hazlitt who says, "It is the power of exciting the sympathy of the reader by a faithful adherence both to truth and nature." Poetry is the emotional and imaginative interpretation of life."

Poetry deals with the life in its highest mood, for the poet "goes deep into the essence of life."

Poetry "holds mirror to the nature."

Poetry "is the rhythmical creation of beauty" and as beauty is truth, poetry in itself is truth.

Poetry lifts the veil from the hidden beauties of Nature.

These definitions will illustrate what Poetry is, and what its function is in the domain of literature. Another very powerful definition is this: "Poetry is the concrete artistic expression of the human mind in emotional, imaginative and rhythmical language." In poetry is revealed the human personality which fact makes a strong appeal to our heart. The poet discloses his innermost secrets of life in his work. If a poet is a keen lover of Natural beauty, he will surely depict the same scenes in his poems and therefore will attract the hearts of the people. The human personality revealed in poetry and specially in lyrics, makes the science of poetry far more superior to Prose and other branches of literature.

"Poet is not only a dreamer of dark but a speaker of the essential truth of nature."

His language is always inspiring, and passionate. He is always true and sincere to nature and beauty. It is therefore that Poetry "gives us treasure more golden than gold, leading us to higher and healthier ways than those of the world."

Good Poetry is always a consolation for the afflicted. Poetry as Wordsworth says, "adds sunshine to day light by making the happy, happier." Good poetry educates the mind, imparts serenity and joy to the life and teaches us to think and feel.

Poetry elevates the mind and inspires us with higher and nobler thoughts. How nicely Goethe has written regarding the function of good Poetry. He writes that "it is an earthly gospel, setting us free, by an inner serenity and outward soothing effect from the burden of life."

---

# *Our Contemporaries*

GOLF BALL MURDERS 74,000—FISH

A Golf ball is charged with the murder of 74,000 fish at Glacier National Park fish hatchery. A player sliced badly, the ball entered and clogged the intake water line and the thousands of fish had no water in which to swim.

---

CAVE MAN'S BRAIN FOUND IN RUSSIA

A Rare find of human brains, representing our ancestors thousands of years ago, has been announced from Odinzowo, near Moscow, in Central Russia. The two petrified brains were found associated with the teeth of wooly mammoth, and they were without doubt the very oldest fossilized human brains ever found.

It is reported that a commission of scientists has been selected to make detailed studies of these remarkable finds of man during the Ice Age when the huge mammoths and the rhinoceros were clothed with a thick coat of wooly hair.

These rare finds are not "casts," but actually petrified human brains, somewhat shrunken, to

nother. Before his birth, his father died and fter a short time of his birth his mother died. He was brought up by his uncle.

Budha and Christ both were brought up in he laps of their mothers, but they did not raise heir voice for the rights of women. Motherless Mohammad (Peace be upon him) was the irst to bring them the charter of their liberty nd equality. He said, "Paradise lies at the foot f a mother."

Once a follower of his came to him. He was feeling ashamed at the crime he had committed.

He related it to the true messenger and ought pardon. "Have you got your mother?" The prophet asked. The reply was in negative.

"An aunt?" he added.

He said, "Yes."

He said, "Go, do good to her and you will e pardoned."

It is well known to all that infanticide prevailed all over the world. The most beneficial tep taken by Islam was to abolish it. The birth of a daughter was very hateful to a father. He hid his face, looked very uneasy and sad, and had no rest till he had killed her and buried her in the dust.

Holy Quran forbids it, "Kill not your child for fear of want; for them and for you will I provide, verily this killing is a heinous crime." (Bani-Israil.)

There was an interesting dialogue between the Prophet and Qais of Bani Tamim.

Qais asked, "Who is this baby that you are fondling?" "Mine own," was the reply.

"I have killed a good many like this," Qais said.

Mohammad (May peace be upon him) said, "You are deprived of the blessing of God."

Islam allowed the marriages of widows.

Quran says, "Marry those among you who are simple (widowed or divorced) those who are pious among your male or female slaves; if they are poor, Allah of His bounty will enrich them. Allah is All bountiful and knowing."

# Poetry and its functions

By Sh. Mohammad Umar XI-B

*The writer gives us a choice collection of the "definitions of poetry". The article lacks originality. It resembles a "beggars bowl" which has got a nice collection of choicest morsels from different tables, but each morsel is the worse for the bowl in which it is placed*—Ed.

What is poetry? That is a question which several writers have tried to answer and each ew definition has only observed the first and d to an endless controversy.

Carlyle defines poetry as "a musical hought." Coleridge defines it as "vision and aculty divine." The well known critic of the English language, Mr. Mathews Arnold, gives is own interpretation of poetry. According o him, "it is the criticism of life."

Poe says that "poetry is the Rhythmical creation of beauty." Dr. Johnson, is of the opinion that "it is the art of uniting pleasure with truth by calling imagination to help. Hazlitt gives us another definition of poetry. He says, "It is natural imagery and feeling combined with passion and fancy.

The chief function of Poetry, according to the consensus of opinion is "to give pleasure and to appeal to the heart."

The Poet is required to give to common place topics the colour of imagination and emo-

my Musalman brothers because there are also many Hindus who compel them by their actions to do so. And this is their obstinacy in playing music before mosque. Every impartial Musalman knows that there is no such injunction in Islam which forbids the playing of music before mosque and therefore in my humble opinion, it is not a religious right of Muslims but it is only a question of feelings. When Hindus see that by playing music before mosques, their brother's feelings are hurt, why do they intentionally do it and thus widen the gulf of disaffection between the sister communities? So, in my humble opinion, the only 'Remedy of Hindu Muslim disunity' is this that *firstly*, religion should not be mixed with politics because the spirit of nationality never interferes with one another's religion, and if unfortunately they do, they are not fit to be called a nation because nationality and religion are such two different terms that they can never be synonymous and treated alike. It is only orthodox and fanatic group of people which in their utter ignorance mix religion into politics and thus increase the tension of Hindu Muslim bitter feelings. And *secondly*, I would like to request my fellow students not to be led astray by selfish and false religious preachers but to go through Quran and Bhagvatgita by themselves and find the truth. I believe and sincerely believe that there will be hundreds of passages acceptable to both Hindus and Muslims. But if I pull one way, the Hindu brother will pull another, but on the contrary if I bow to him gently, he is sure to return compliments and thus the 'Remedy of Hindu Muslim disunity' will have been found and thus an earthly paradise in India would have been discovered.

# *Women Under Islam*

*The author writes of some of the blessings which Islam conferred on women. He should have studied the subject more carefully*—ED.

In the pre-Islamic age women were considered unholy and unclean. Their parents regarded their birth an insult to the family and killed them at once. Never did any reformer issue an injuction that women should be respected.

In Islam their position is recognised and raised high.

The Budhists considered them unclean, the Brahmins thought them unholy, and the Jews who believed themselves the chosen race of God hated them more than an enemy.

When darkness prevailed in Arabia, ignorance was deeply rooted in the minds of people; Mohammad (May peace be upon him) raised his voice in their favour, preaching to the world "God and women should be respected devoutly."

What higher position than this can they acquire? It is not all that an enemy should be considered a friend; he should become not a mere friend but a respected and bosom friend.

I think that women of every caste and creed should ever remain grateful for these Islamic laws, which raised them out of calamity and distress in which they were thrown in the pre-Islamic days.

People should respect them if for no other reason than only for their motherly love, affection, and for their sacrifices, for Prophet became an orphan when he was a child. He knew nothing of the respect one owes to his father or

our inhospitable host; but as he was still enjoying his "beauty sleep," we started off. We hired a boat and rowed it across the lake. Then we bought certain articles and roamed in the bazars. We took our lunch at the residence of a friend and started back for Bhowali.

On the way back the rain fell heavily and we were drenched thoroughly, but at last we reached Bhowali at 5 P.M. after having walked about 30 miles within 30 hours.

Thus came to an end this adventurous and interesting trip.

# Remedy of Hindu Muslim Disunity

By SHAH MOHD. AMIN (MANGLORI) MINTO A. CLASS XI-E

*The writer of this article finds the cause of Hindu-Muslim tenison in the killing of cows by the Muslims and the playing of music before mosque by the Hindus. Respect for the feelings and susceptibilities of the sister communiti.s, he says, would go a long way to put an end to the distrust and fear which keeps the two apart.*—ED.

It is certainly my good fortune that I get an opportunity to express my views generally to all but in particular to my fellow-students through the columns of the Intermediate College Magazine, which has been newly started with the chief object of creating a literary taste and encouraging some of them at least to think and write, in the words of our worthy Principal. And so, I would like to attempt to write on the 'Remedy of Hindu Muslim Disunity,' though it is a very serious subject and requires a vast study and experience. Still I would try my best to have a clear idea of it and if succeed, I would deem myself fortunate as having served my fellow-beings in my student career to some extent.

Now coming to the real subject 'the remedy of Hindu Muslim disunity,' first I would like to ask one question. What is the perpetual source of the bitter feeling amongst Hindus and Muslims? I think many of us will have differences of opinion over this, but in my humble opinion, 'Cow-killing and Music before Mosques' is the perpetual source of Hindu-Muslim bitter ness; Hindus want to protect it because they revere it and Muslims want to kill it because they have a religious right to sacrifice it; but if unprejudiced we may trace the origin of sacrificial right to the historical sacrifice of Hazrat Ismail (may peace of Allah be on him) by his father Hazrat Ibrahim (may peace of Allah be on him). But it should be noted that cow was not offered as sacrifice but sheep and moreover sheep and camels are more frequently mentioned in Holy Quran for sacrificial purposes than cow. And also every body knows that Arabs and pilgrims, going to Arabia—the Home of Islam—sacrifice camels and sheep instead of the bovines. But nobody can say that in doing so, they disregard any injunction of Islam because they do not sacrifice the cow. If we go unprejudiced, through the pages of Moghal history, we find how Babar respected the religious sentiments of others and forbade the killing of cows, which is venerated by Hindus. Moreover every body knows that cow is a very useful animal especially to India because it is an agricultural country. And moreover there are many Muslims who eat beef but they do not hurt the susceptibilities of their neighbours but in my humble opinion, some ignorant and bigoted Muslims do intentionally sacrifice publicly and thus injure the feelings of their Hindu brothers. Here I should not be one sided and continue blaming

I want Indian women, celebrated from time immemorial for their purity and fidelity, to be sovereigns of their respective establishments, and remaining within their homes, acquire mastery over the pleasures, wishes and behests of their husbands. Thus alone can happiness be restored and, therefore, to that end, a carefully thought out programme of female education, supplemented with mamal and moral training, under modified Purdah, is the crying need of the day.

# *A Trip to Nainital*

*By* AHMAD ABBAS

We had been trying for many days to ask our brother to permit us to go to Nainital which was only 12 miles from Bhowali, where we were staying during the long vacations. At last, to our great joy, we were allowed to go on July 23, under the guardianship of an old tutor of our nieces, whom we called 'Hajiji'. On the 23rd morning we got up very early, took our breakfast hurriedly, dressed and started for Nainital. Every body took with him an overcoat and a small attache-case with a change of clothes. We started at about half past ten. It was a pleasant walk. The sky was cast with clouds of various colours, and a gentle breeze sped us on to Nainital.

When we had left the main motor road and had taken to the foot path, it began to rain heavily but this did not deter us from our purpose. After we had covered about 7 miles, the clouds cleared and we could see Nainital clearly lying in the distance bathed in sunlight. We enjoyed this scene heartily. It was delightful to see hills after hills and beyond them the green plain stretching away into the dim distance.

We reached Nainital at about half past two and asked the way to the house of a friend of our brother. Unfortunately his house was situated on the highest hill, and we reached there at 3-15 P.M. extremely tired. We sent our brother's letter to Mr. . . . who came out, asked after the health of our brother and then left us in the charge of one of his friends. This gentleman also went away after a few minutes, and we were left all to ourselves. My cousin Mahboob took the whole situation in his hand and asked us to put our luggage in a small room which appeared to be meant for the guests. The whole of Nainital lay open to our admiring gaze as we stood watching it from the window of our room and the beautiful lake nestling in the bosom of the hills was like a bright gem set against a green background.

We were much displeased at the attitude of our host and determined that if ever any of us became a poet, (which is very doubtful indeed!) he would write a satire on him.

After changing our clothes we started for the cinema where we reached at about 5 P.M. just when the show was to begin. The film 'Ben Hur' was an excellent one. At eight when it ended, we returned to our lodging. As no supper seemed forthcoming, we went to sleep, awfully tired. We were soon awakened by a 'Khansaman' who served us our dinner. We had not taken any lunch, not even tea and so did full justice to the meal.

When we were awakened in the morning by the old man, it was fairly late (about half past seven) but no one in the house had got up by that time.

After breakfast we wanted to take leave of

:entury that some feeling of unity, expressed by the desire for a common ancestor, began to lawn on the consciousness of the people. Neither re lawless tribal feuds an exclusive previlege of the Arab race; the tribes of the Turks, hough somewhat different in their organisation, vere even more warlike and blood-thirsty. Kutubuddin strove hard to establish his autho-ity in that land of warring chiefs and clans. He made up his mind to terrorise and suppress he contumacions and considered it his bounden luty to finish all rebels. We know nothing, unfortunately, of the difficulties he had to meet or the extent to which he surmounted them. His aspirations alone have been definitely re-orded. He died from an arrow-wound in the eye while besieging the rebel fort of Takab. His followers seeing him fall, redoubled their energies, the fort was captured and all its garrison was put to the sword. The whole dis-rict was devastated and till the end of the Shansabaniyan dynasty no Sultan allowed either the fort or its neighbourhood to be inhabited. Only Amir Kharnak (a Ghorian officer), who was in charge of that region, was allowed to maintain a castle. Izzuddin Husain, who suc-ceeded his father, Kutubuddin, was ordered with all good qualities. The people were prosper-ous during his reign and men of piety and learn-ing were treated with consideration. He was far-sighted enough to keep on good terms with the kings of Ghaznin as well as the Seljuq Emperor, Sultan Sanjar. The days of Ghor are famous, every one of them being equal to a tiger in bodily strength. Izzuddin used to send his tribute regularly to Sultan Sanjar along with Ghorian dogs and other valuable presents and Sanjar showed great favour to him in return. He was, also, one of those fortunate parents who are made famous by their off-springs. With Izzuddin's seven sons, known as the 'seven stars,' the history of Ghor as an Asiatic power begins.

# *Female Education in India*

*By* Jamiluddin Ahmad

There is no gainsaying the fact that in the matter of education of masses and particularly of the fair sex India has the unique honour of being the most backward of all countries. Al-together there are no more than six or seven per cent of the population of the country who have a smattering of the three R's, who can just read and write of this small proportion the number of literate women is almost negli-gible. Among the orthodox classes who form the bulk of the population it is really considered a sin to get their daughters educated. The most that a father would like his daughter to accomplish is to get a little smattering of the vernaculars, a cramming of the holy scriptures and that would be the be-all and the end-all of her education. Indeed, some would only get the girls to learn reading but would not let them learn to write, so that they might not on attaining the age of puberty, communicate with any undesirables.

While in other countries women are advanc-ing far ahead in social, political, economic and educational fields of activity, the problem of female education in India still remains unsolv-ed, and most Indians have not made up their minds as to the utility and desirability or other-wise of female education. Along with the fall

terrified and promised obedience and tribute. The chief of Tab saw that he would not be able to hold out for more than a week, if the Amir turned towards him; and frightened out of his wits, he sent a messenger to promise larger tribute and presents than he had offered before. Abul Hasan and Sherwan, whom he had requested to act as intermediaries, appealed on his behalf and Masud promised to forgive his sins provided he gave up all the forts he had seized in Gharjistan. The chief handed them over to the Kotwals of Masud and sent his tribute while the Amir was still in Ghor. Later on, after Masud's return to Herat, he came in person, and after receiving a robe of honour, returned to his territory with the other two chiefs.

The Amir next marched to Tur, which also was a strong and famous fort. It fell after a sieze of seven days. Many Ghorians were killed and plenty of spoils were obtained. Masud installed a kotwal of his own in the fort and returned to Herat. At Marabad, two farsangs from Herat, the Ghorians brought before him all the tribute and arms they had promised, in order to ward off his invasion of their territory. Never either in the days of Islam or of infidelity was Ghor subjugated so effectually as by Amir Masud.

The Ghor revealed to us by Baihaki is barbarous, warlike and disunited; it has been only partially converted to Islam and seems to know nothing of the great Shamsabaniya dynasty and Mayandish. The supremacy, so far as there is any political supremacy at all, belongs not to them but to the chiefs of Bab. Baihaki's narrative has a prosaic reality about it which more than outweighs tomes of Ghorian verse. The 'pearls of genealogy' displayed by Mubarak and his successors must be cast aside as false and artificially produced. The Shansabaniya chiefs of Mayandish, if they existed at all, must have been people of little reputation and less power, unknown to history and to song, who had built a fort at the foot of a snow chaffed hill and wring an unwilling tribute from such neighbouring villages of the Mayandish district as were unable to resist the onslaught of their handful of retainers. They are not to be mistaken for kings of all Ghor. The eleventh century, however, witnessed two important changes in Ghor—the struggle bewteen Islam and infidelity was decided completely in favour of the latter and the Shansabaniya dynasty rose into a prominence, which none of its rivals could challenge. When a hundred years after Masud the curtain raises again, infidels are not to be seen, and the hill chiefs, though occasionally recalcitrant, have become habituated to a regime of law and order.

The conversion of the Ghorians to Islam was probably a result of the 'New Mystic' movement which has been discussed elsewhere. The founder of the Shansabaniya dynasty, if our meagre information may be trusted, was Kutubuddin Hasan son of Mohammad son of Abbas. He certainly had a very clear conception of the duties of his office and the mission of his dynasty. "As the people of Ghor are the descendants of Arab tribes and have been nurtured and brought up on hilly tracts," says Minhajus Siraj, "obstinacy, lawlessness, disobedience and insurrection are a part of their nature. Every tribe is always at war with every other tribe. Every year some section or other of the people revolts and refuses to pay the taxes or to obey the laws. From that time till the present day—i.e., the reigns of Sultan Ghiasuddin and Sultan Shahabuddin—those tribes have always behaved in this fashion." No critic student will attach any importance to the Ghorian claim to Arab descent. The word 'Ghor' has never signified a racial unit of any sort; various Turkish tribes, whom history has not cared to notice, had settled in that mountain region, and it was not till the evolution of a common government in the twelfth

f, in parties, to advance by different paths. Hasan with his contingent was sent to the nd Sherwan to the left. The Amir him- d the centre, where the fighting was ex- to be severe. The accursed ones evinced tmost daring and pressed forward with iosity, disputing every inch of the ground. main attack was directed against the rd of the Amir, where fighting became ate. Three of their mounted warriors ded in getting close to the Amir. He one of them on the breast with his mace enty mans, and he lay sprawling on his never to rise again. The other two were sed by the ghulams. This was enough ie Ghorians, who gave way; but they ued, now and again, to face about and the ground, until a town was reached oot of the mountain (on the other side), he way thither numbers were slain and ive. The fugitives threw themselves wn, which was of vast strength and numerous fortified villages, after of the Ghoris, and sent away to a at a distance in the rear, all their d children and everything they could The unbelievers resisted obstinately ime of evening prayer; great numbers were killed and many Mussalmans were martyred. At the approach of darkness nbelievers decamped and the village was ed by the Ghaznavides, who spent the in plundering it.

ext morning the Amir ordered the drums beaten and started for the fort, which wo farsangs from there. The path was lt but the Ghaznavides succeeded in reach- nere at the time of afternoon (Zuhr) It was the strongest fort in Ghor and ever been taken by force. The Amir his troops to surround the fort on all The night was spent in getting the iqs and other machines ready; at dawn the Amir led the assault in person. The manjaniqs hurled their stones into the fort and two towers opposite to the Amir's position were mined. The Ghorians fought with the fiercest courage from the top of the towers and parapet; when a tower fell down both sides rushed to the spot, the Ghaznavides to force an entrance and the Ghorians to prevent it. Thus the struggle went on for four days; on the fifth day both parties determined to put forth all their strength. The Amir ordered his ghulams to overpower the Ghorians with their arrows, which flew towards them with the stones from the three besieging manjaniqs. He also directed the standard to be pushed forward and bravely followed behind it. Masud's personal courage could not fail to inspire his ghulams and soldiers; they made a heroic assault and the Ghorians began to think of flight. In the afternoon a portion of the strong parapet was knocked by the munjaniq stones, and amidst the dust and fire and smoke, a path into the fort was at last opened. The Ghaznavides rushed to the broken parapet from all sides. The accursed infidels fearlessly sacrificed their lives in defending the breach but they were overpowered and the fort was captured by assault. Many Ghorians were slain; others asked for quarter, which was granted to them. The number of slaves and the spoils obtained surpassed all comprehension. The Amir issued a proclamation granting all gold, silver and slaves to the army, but all arms captured were to be brought before him. A pile of these was collected before Masud's tent; the best pieces were selected for the government and the rest distributed among the troops. The captives were distributed equally between Abul Hasan Khalf and Sherwan who were to take them to their own territories. The Amir ordered the fort to be razed to the ground. So that no rebel may establish his power there again. When news that the town and fort had been captured reached the other Ghorians, they were

On Monday, 10th Jamadul Awwal, of that year the Amir started with a large force of horse and foot and seven light elephants. After passing the stages of Badshan and Bachsaban, he stopped for two days at Babriyan, where all the army joined him. He thence marched via Par and Nakshab to Bagh-i-Wazir-i-Bairam, which is the first stage on the frontier of Ghor. When the Ghorians heard of Amir Masud's movements, they withdrew to their forts and prepared for a struggle. But the Amir before starting had won over Abul Hasan Khalf, one of the strongest Ghorian chiefs, and the latter, to his promise joined the Amir at this stage with an army of three thousand horse and foot. Following him came Sherwan, another chief from the frontier of Ghor and Juzjan."

"Having been joined by these chiefs, Masud resumed his march, but went on in advance himself, slightly attended by fifty or sixty ghulams, and 200 foot selected from each dastah (band). He reached a fortress which they called Bartar, an exceedingly strong place and garrisoned by a numerous and well armed force. Masud prepared to attack it, his party not being patient enough to wait for the arrival of the army. He led the way himself, followed by his ghulams foot; they shouted the takbir while the accursed unbelievers sprang up in fury and set up a yell sufficient to end the ground. Masud ordered his ghulams to shoot and they kept up such an effectual fire of arrows that no Ghori dared show his head above the walls. This enabled the foot with their lassos to assault one of the bastions. They effected an entrance and drove the Ghorians before them. The ghulams hurried to their assistance. The walls and bastions were cleared after a fearful slaughter of the unbelievers. The main army now came up and was surprised to find that such a fort had been captured by a mere handful of men.

"From thence Masud marched towards the tract of Zaran, the people of which agreed to pay taxes and tribute, and presented contrib... tion in gold, silver and arms. From that p... to the district called Jarus, where Warmes... Bab dwelt, was a distance of ten farsakh. T... Amir did not commence hostilities against th... chief because he had sent an agent to the Am... tendering submission and allegiance, and h... promised that when Masud should return ... Herat, he would present himself before the A... and enter into stipulations respecting trib... That district and the place where that chief... dwelt were excessively strong, and the mo... difficult portion of the whole territory of Gh... its people the most warlike and the stron... men of that part. It had been the capita... the Ghoris in bygone times, and, whate... ruler held that tract, the whole territory ... to submit to him. The Amir now desp... an intelligent messenger to this chief and... men of Ghor from among the followers o... Hasan Khalf and Sherwan were sent al... him to act as interpreters, with a mess... bining threats and hopes, as is usual ... occasions. The Amir followed the ... at some distance. When his mes... delivered to those arrogant fellows, the... fested great fierceness and defiance a... that the Amir had made a great mista... imagining that the people of their district ... like those he had met before—and that he w... quite welcome to their land but would fin... sword, spear and stones ready to receive him. This insolent message roused Masud's ire. He halted his troops for the night at the foot of the mountain and moved forward at dawn. The drums and trumpets were sounded, and soldiers began to ascend the heights. The Ghorians, on high, looked like ants and locusts; but they were well armed, both horse and foot, and occupied all the paths leading to the ... They yelled and began casting stones at Ma... force, but, fortunately the mountain was ... and accessible from all sides. The troops ...

ous ancestry; though some of the Shansabaniya princes are tyrants, not one of them is a weakling, for weakness is the one vice the Ghorians abhored. But the Nisbat Namah has not survived and Minhajus Siraj when writing had to rack his brain for impressions left by a book he had read some hirty or forty years ago. "As these chapters are being written at Delhi," he apologises, "and the Muslim lands have been devastated by the Mongols, it is not possible for me to transcribe from the history (the Nisbat Namah) I read in Ghor. Consequently I have to depend for what I write on the Tarikh-i-Nasir and the Tarikh-i-Haizam Nabi (an official history composed in the reign of Shahabuddin Ghori) and the accounts I have heard from the old men of Ghor. The kindly reader should forgive my short comings." It would be unjust, after this frank confession; to blame an author for not supplying us with information that was not within his reach. We are, however, fortunate in being able to check the stories of the Ghorian panegyrists by reference to earlier writer, to whom the Ghorians seemed warlike but hateful infidels. Imam Abul Fazl Baihaki, writing in the reign of Sultan Farukhzad (son of Sultan Masud) gives an account of Masud's campaign in that wild region. His narrative, which is based on trust-worthy information, contracts strangely with the heroic tories of Mubarak and Minhajus Siraj and deserves being given at some length. It is an interesting transition from poetry to prose.

"When the Arabs conquered Persia and Yazdjurd was killed or died, they could not penetrate Ghor. In the days of the Samanis a general on their frontiers Abu Jafar Lahadi, attacked Ghor in full force at the orders of the Samanid king and the governor of Herat supplied him with men and material. He was nevertheless unable to go beyond Tajistan and Tulak. Sultan Mahmud attacked Ghore twice or thrice from the side of Zamin-i-Dawar but could not surmount the obstacle; it would, however, be incorrect to say that he failed, for his routes were different. No one has penetrated so far into Ghor or performed such exploits there as Sultan Masud son of Sultan Mahmud. Whether from compulsion or full choice, the chiefs (amirs) of Ghor came to pay him homage. They were terrified by his achievements and held there breath in fear. Neither books nor traditions record that the Ghorians have been so submissive to a king as to Masud."

"In 401 A.H. went on a holy war against Ghor by way of Bust in Zamin Dawar. He left his two sons, Masud and Mohammad in Zamin Dawar and also his younger brother, Yusuf. The heavy baggage of the army was also left there. Sultan Mahmud considered Zamin Dawar a place of good men because it was the first territory his father, Subuktigin, had assigned to him. Masud and Mohammad were then fourteen years old and Yusuf was seventeen.

In 405 A.H. Sultan Mahmud started from Bust and attacked Khwabin, which is the part of Ghor nearest to Bust, and Zamin Dawar. The infidels here were dirtier and stranger than elsewhere; their forts were strong and plenty of other obstacles had to be overcome. The Sultan had taken Masud with him. The young prince fought on horseback before his father's eyes and showed signs of remarkable courage and strength. A tribe of the infidels having taken refuge in their fort, their chief mounted a tower and showed great audacity and insolence towards the Mussalmans. Masud shot a wooden arrow at his neck and he fell dead from the tower to the ground. His followers lost heart and yeilded up the fort.

"In 411 A.H. Amir Masud, who was then governor of Khorasan, went to Herat and made up his mind to invade Ghor from the west.

fort that had been originally constructed by Bustam son of Zuhhak. Expert workers were called from all sides. The defensive wall surrounding the castle was on both sides, taken to the accessible height of Zar Margh, mountain (*a*) (within the wall) on a rising ground at the foot of that mountain, he built a lofty castle with twelve towers, six to the east and north and six to the south and East. (*b*) Every tower was built like one of the constellations of the fermament (signs of the Zedic) and had thirty apertures. The sun, on rising, shone through one of the apertures and Abbas could thus find out in what degree of the constellation the sun then was. The chiefs of Ghor at east Summarçand up their courage and invited Sultan Raziuddin Ibrahim of Ghaznin to rid them of their astronomer-tyrant. No hand was raised to defend Abbas when Ghaznavides approached and deserted by his people and his army, he was easily captured and taken to Ghaznin. (5) Mohammad son of Abbas whom Sultan Ibrahim placed on the throne of his deposed father at the request of the Ghorian nobles did his best to make his virtues shine in contrast against the vices of his predecessor. "He was just, merciful and generous, of an excellent disposition and kindly heart, and a protector of the weak and the oppressed." From weakness or from prudence, he kept on good terms with his overlord and never failed in sending the promised tribute to Ghaznin.

(*a*) The towers of the castle were astronomical observatories and could not be helpful in a siege. For fighting purposes a defensive outer wall or parapet had to be built. As one side of the castle was protected by the Zar Murgh mountain, the parapet, instead of surrounding the castle, was taken up the sides of the mountain till it reached the inaccessable upper rocks.

(*b*) The towers must have formed a circle and not a square, the circle being divided into twelve segments, each subtending an angle of 30 degrees at the centre. But my knowledge of Mathematics will not go any further.

So much for fable and romance. But the early Chiefs of Mayandish should not be taken seriously. The account given above is based on the very valuable history of Minhajus Siraj Jurjani, written in the reign of Sultan Nas'ruddin Mahmud of Delhi. Minhajus Siraj lived in Ghor till his eighteenth year, when the Mongol invasion of Central Asia drove him, like many others, to seek a refuge in India. His grandfather was the son-in-law of Sultan Raziuddin Ibrahim of Ghaznin and his father held high ecclesiastical office at the courts of several Ghorians. The Whole family seems to have been born with a silver spoon in the mouth; for Nizamuddin Tulki, whom Shahabuddin appointed governor of Bhatindah, was an uncle of Mihajus Siraj and our author himself attained to the high status of Sadrus Sadoor and Head Qazi of Delhi. Now Minhajus Siraj's testimony is of great value when he writes as an eye witness or bases his narrative on the information supplied to him by reliable persons. His life was passed among the high born and the great, and his evidence about the historic kings of Ghor is unimpeachable. But about the early chiefs of Mayandish his information was meagre. He had read the 'Nisbat Namah' of Fakhruddin Mubarak in the palace of the Princess Mah Malik, daughter of Sultan Ghiasuddin [illegible] A.H. 'Maulana Fakhruddin Mubarak Shah Marwarudi,' he tells us, 'has versified in his Nisbat Namah the geneology of the famous Sultans of the Shansabaniya dynasty, and begun it with Zuhhak Tazi. It was dedicated to Sultan Allauddin Jahansoz. The Princess Mah Mulik, however, told me that owing to Mubarak's illness, the poem was left unfinished in that Monarch's reign and it was not till the reign of Sultan Ghiasuddin that Mubarak succeeded in completing his work. The origin of the Nisbat Namah throws grave doubts on its historical value; it was the duty of Mubarak Shah to supply his patrons with a famous if not

# House of Shansab

PROF. MOHD. HABIB, B.A. (OXON), BAR-AT-LAW

*This is the second instalment of Mr. Habib's history of the Shansab dynasty. The talented author has the gift of making the dead bones of history live and it is a stirring tale of the rise of one of the most virile Muslim dynasties that Mr. Habib Proceeds to tell.*—ED.

From the beginning of the Persian Renaissance the Ghorian chroniclers commence to mix some history with their ethereal fables. When Yakub Bin Lais, the Saffarid ruler of Sistan (or Sijistan), conquered Lamin Dawar, Basb and Rakhkhaj (Takinabad), Ghor was saved by the inaccessibility of its mountains. 1. Amir Suri 'the head of the Shansabanis in Mayandish' was a great Malik, but Islam had divided the country into two warring camps, and Mussalmans and unbelievers fought 'from Kushk to Kushk and lived in a constant state of contention and strife.' 2. Mohammad Bin Suri, followed a dangerous policy towards the great Mahmad of Ghaznin, 'at times he would obey the Sultan but other times he would revolt and keep back the promised.' But Mahmud was not a man to be thus trifled with. He marched against the fool-hardy Ghorian in 1010; the high mountains of their country failed to prevent the advance of his army; Mohammed bin Sur was besieged in the fort of Ahaugaram and captured along with his younger son, Shis. The fallen, it is said, ended his life by sucking a poisoned jewel in his ring. 3. While Mohammad was rebelling against Sultan Mahmud, his eldest son, Abu Ali, kept assuring the Sultan of his loyalty and good-will. This act of loyalty or treason prevented the extinction of the dynasty and Abu Ali was placed on his father's throne by the Ghaznavide conquerer. 'Abu Ali was a man of generous disposition and pure faith. He behaved kindly towards the people and constructed mosques and schools. Men and learning were honoured during ... and his subjects lived in peace.' He even allowed his younger brother, Shis, whom Sultan Mahmud had permitted to return, to live unmolested under the protection of his authority. But Abbas, the son of Shis, repaid Abu Ali's kindness to his father with treason. On attaining to manhood in the reign of Sultan Masud, he collected a body of lawless young men and seized the throne and treasury of his uncle. Abu Ali was thrown into prison where he died. 4. Amir Abbas was a bold man, without pity and without fear. "He was extremely harsh and tyrannical. Lawlessness and cruelty were engrafted in his nature. He treated his subjects with scant regard and seized their lands and property in defiance of law. The army as well as the people was (were) helpless in his hands." Even the powers of nature resented this veritable reign of terror. "For a period of seven years during which Abbas reigned no animal such as horse, camel, cow or sheep brought forth young; no rain fell from the clouds; and it is even said—thanks to his cruelty, no children were born to the wives of men." Two original acts, of somewhat different merit, are attributed to this merciless tyrant. *First*, he kept two fierce dogs, one of which he named 'Abbas of Ghor and the other Ibrahim of Ghaznin.' Every day the two dogs were made to fight; if his namesake 'Abbas won, he would be in high spirits; if victory smiled on 'Ibrahim', he would be more cruel to his subjects that day. *Secondly*, Abbas inspite of his tyranny was an excellent astronomer. He spared himself no pains in learning the science and had mastered it well. At Sangah, in the territory Mayandish he rebuilt from its foundations the

## EDITORIAL STAFF

# The
# Intermediate College
# Magazine

DECEMBER 1929

# The Intermediate College Magazine.

U. Intermediate College, Aligarh.

Vol. 1 | December, 1929 | No. 12

ستم ظریفی بسا اوقات اپنے خاص رنگ میں جھلک دکھلا کر دلچسپ ترین جاتی ہے چنانچہ یہ بزرگ صفت میاں جی اس سے خالی نہ تھے آپ کے جسم کی اقلیت کو سر کی اکثریت نے پورا کر دیا تھا اور واقعی اُنھوں نے اسی نسبت سے زرخیز بھی کر رکھا تھا ہیئت - نجوم - رمل - جفر - ریاضی - فلسفہ - معاشیات - قیافہ شناسی - تاریخ جغرافیہ اور سائنس کی کل شاخوں پر حضرت کو عبور حاصل ہونے کا دعویٰ تھا خود کو دنیا کی چند مخصوص ہستیوں میں شمار کرتے تھے مگر چند لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں بھی وہ کسر نفسی سے کام لیتے تھے - اُن کا انداز کلام و قیل و قال پہلے ہی نظر میں لوگوں کو گرویدہ کر لیا کرتا تھا - مذہب کے سچے پیرو تھے - مسئلے مسائل ان کے نوک زباں تھے مگر وہ صرف اسی وقت تک کہ جب تک ان پر عمل پیرا ہونے کے قیود سے آزادی ہو - اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ مغرب کی انسائیکلو پیڈیا کے مقابلہ میں جو متعدد دماغوں کا کام ہے ہمارے میاں جی مشرقی بحر العلوم تھے تو بیجا نہ ہوگا اور سچ پوچھئے تو بعض بعض خصوصیات میں آپ اپنی نظیر خود ہی تھے کہتے ہیں کہ آپ کی آواز نہایت دردناک تھی انداز خاص رکھتے تھے آواز کا زیر و بم سامعین سے تحسین و آفرین کا خراج حاصل کئے بغیر نہ رہتا تھا - صوفی مشرب تھے تہذیب کے ساتھ شاہد پرستی گناہ کیا عین ثواب سمجھتے تھے - لباس سادہ اور اس حد تک کہ عیوب برہنگی کو چھپا لے - ہاں تیل و خوشبو کے شوقین تھے اور کبھی کبھی جب ملکوتی و لاہوتی پردوں کے طے کرنے کے شوق میں آتے تو حضور قلب کے ساتھ ریش مقدس کو روغن تلخ سے سیراب کرتے آنکھوں کی بینائی کو افزوں کرنے کی غرض سے سرمہ کو تکلیف دی جاتی تھی کہ ملاء اعلیٰ کے تمام جلوے ایک جنبش نظر میں نگاہ کے سامنے پھر جائیں -

گو صرف شمیم کے اتالیق تھے مگر اس شمع کی تنویریں فیض رساں تھیں - معتقدین کی ایک کافی جماعت ہو گئی تھی - ان معتقدین کو درجہ حضوری خاص حاصل کرنے کے لئے متعدد درجوں کو طے کرنا پڑتا تھا - جب کوئی طالب راہ حقیقت آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو رشد و ہدایت کی پہلی منزل یہ ہوتی کہ آپ ادائے خاص سے فرماتے "سنو جی تم ہم سے ملنا چاہتے ہو؟ روز آیا کرو - مجھ سے محبت کرو - کہو کیا شغل ہے؟ محبت کے فلسفہ سے بھی واقف ہو؟ تم کمزور معلوم ہوتے ہو دیکھو اگر روز نہ آیا کرو گے تو نقصان اٹھاؤ گے اور ہاں تمہارا نام کیا ہے؟" خوش قسمتی سے اگر طالب نے ان بے سر و پا نکیرین سوالوں کی بوچھاڑ کا جواب دیدیا تو خیر ورنہ چند دنوں محبت کے فلسفہ پر لکچر ہوتے تھے - اس صعوبت ناک منزل کو طے کرنے کے بعد ہفتخواں کی دوسری منزل کچھ زیادہ صبر آزما ہوتی تھی - میاں جی جب دیکھ لیتے کہ آہوئے وحشی کچھ مانوس ہو چلا ہے